خونِ وفا

غلام قادر

زندگی کو دیرینہ رشتوں کے چراغوں سے روشن رکھا جاتا ہے... جب انسان کسی بھی رشتے کی ڈور سے بندھ جاتا ہے تو ایک ہی آرزو اور خواہش ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ جو دکھ سکھ میں سانس لے رہے ہیں... انہیں اندھیروں سے نکال کے روشنی میں لایا جائے... ایک ایسی ہی خوبرو دلکش لڑکی کا فسانۂ حیات... زندگی کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر گرتے... سنبھلتے... وہ رشتوں کو نبھا رہی تھی... مگر سمجھوتوں کے باوجود حالات کی گردشیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں... اپنوں کی کمتر سوچوں اور اعتماد و اعتبار کے رشتوں سے مجبور ہو کے وہ ایسے جال میں الجھتی چلی گئی جو بظاہر بہت پُرکشش تھا... دولت کی طاقت ور کشش اور گدھ صفت مردوں کی ذہنیت اسے اپنے حصار میں لیتی چلی گئی۔

خوف...... خواہش...... اور محبت کی تکون سے آزاد ہو جانے والی پری کا زندگی نامہ

میری کہانی پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ میرے لیے وہ الفاظ استعمال کریں گے جو کسی شریف خاندان کے لیے استعمال ہوں تو قتل ہو جاتے ہیں لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ آپ میرے لیے وہ لفظ استعمال کریں گے تو کوئی طیش میں نہیں آئے گا بلکہ میں خود بھی ناراض نہیں ہوں گی کیونکہ میں جو کچھ ہوں، اس کے بعد مجھے ان ہی لفظوں سے نوازا جا سکتا ہے۔ میں اس مقام تک کس طرح پہنچی، اسے جان کر ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے گنہگار سمجھیں۔

میرا نام میرے والدین نے رانی رکھا تھا لیکن آپ میرے جس نام سے واقف ہیں، میں وہ نہیں بتاؤں گی اس لیے آپ مجھے رانی ہی سمجھیں۔ وہ رانی جو کبھی ماسٹر عزیز کی بیٹی اور اکلوتے بھائی کی بہن ہوا کرتی تھی جو کبھی اسکول میں سیکنڈ آئی تھی تو اس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا جسے اس کے باپ نے یہ کہا تھا کہ ”تم دوسرے نمبر پر آئی ہو تو یہ تمہاری اپنی وجہ سے ہے۔ تم اگر زیادہ محنت کرتیں تو پہلے نمبر پر ہوتیں۔“

ابا کی نصیحت کو میں نے اس طرح گرہ سے باندھا کہ دوبارہ میں

کبھی سیکنڈ نہیں آئی۔ میٹرک میں میری ضلع بھر میں تیسری پوزیشن آئی تھی لیکن میں نے ابھی خواب دیکھنے ہی شروع کیے تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے یتیم ہو گئی۔

ہمارا گاؤں ہری پور اور حویلیاں کے درمیان تھا۔ ابا روز صبح حویلیاں موٹر سائیکل پر جاتے تھے۔ کمال ان کے ساتھ حویلیاں تک جاتا تھا اور وہاں سے ایبٹ آباد سے آنے والی بس میں سوار ہو کر ہری پور اپنے کالج جاتا تھا۔ وہ انٹر میں تھا اور پولیس افسر بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ابا کے حادثے کی خبر ملی تو ہمارے گاؤں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اماں تو حادثے کی خبر کے ساتھ ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ عینی شاہدین سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ابا کی موٹر سائیکل جونہی مین روڈ پر آئی۔ ایبٹ آباد کی جانب سے آنے والی ایک تیز رفتار کار نے انہیں ٹکر ماری اور پھر اسی تیزی سے وہ ہری پور کی جانب روانہ ہو گئی۔ نہ کوئی کار کا نمبر دیکھ سکا اور نہ کچھ اور معلوم ہو سکا تھا۔ بلکہ کار کے رنگ پر بھی وہ متفق نہیں ہو سکے تھے کوئی کالے رنگ کی گاڑی بتاتا تھا تو کوئی اس کار کا رنگ نیلا بتا رہا تھا۔

ابا جس اسکول میں ٹیچر تھے، اس کے ہیڈ ماسٹر بہت نیک دل انسان اور امی کے دور کے رشتے دار بھی تھے۔ امی کا تعلق ایبٹ آباد سے کچھ دور ایک ایسے علاقے سے تھا جہاں پشتو بولی جاتی تھی۔ ابا کا اپائنٹ منٹ وہیں کے اسکول میں ہوا تھا لیکن بعد میں ابا نے اپنا ٹرانسفر کروا لیا تھا۔ ابا نے وہیں اماں کو دیکھا اور پسند کیا تھا۔

ہمارے گھر کا تمام تر دارومدار ابا کی آمدنی پر تھا۔ وہ اسکول کے بعد وہاں ٹیوشن بھی دیتے تھے۔ تنخواہ اور ٹیوشن کی آمدنی سے ہمارا گھر بہت اچھی طرح چل رہا تھا۔ ہم کچھ زیادہ خوش حال تو نہیں تھے لیکن پیسوں کی تنگی کا ہمیں کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس میں بہت کچھ دخل اماں کی کفایت شعاری کا بھی تھا لیکن جب تنخواہ اور ٹیوشن کی آمدنی بند ہوئی تو غربت کے سائے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے بھاگ دوڑ کر کے ابا کی پنشن تو ریلیز کروا دی لیکن یہ اتنی نہیں تھی کہ گھر کا خرچ آرام سے چل جاتا۔ ایسے میں ہیڈ ماسٹر صاحب پھر سامنے آئے۔ انہوں نے کوشش کر کے اپنے ہی اسکول کے گرلز سیکشن میں مجھے انگلش کا ٹیچر رکھوا دیا تھا۔

ابا سیکنڈری سیکشن میں تھے اور مجھے پرائمری سیکشن میں نوکری ملی تھی۔ اماں کی پریشانی یہ تھی کہ میں اسکول جاؤں گی کیسے اور میری واپسی کیسے ہو گی۔ اس کا حل بھی ہیڈ ماسٹر نے نکال لیا۔ اماں کو انہوں نے سمجھا دیا تھا کہ ''رانی میرے ساتھ جائے گی اور میرے ساتھ ہی واپس آ جائے گی۔'' اماں کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن میں جب تک واپس نہ آ جاتی، ان کی نگاہیں دروازے پر ہی رہتیں۔

گھر کے حالات تو ٹھیک ہو گئے لیکن اپنے اسکول سے فارغ ہو کر مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا ہوتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس کا حل یہ نکالا کہ چند انگریزی میں کمزور بچوں کی مجھے ٹیوشن دلوا دی اور ساتھ ہی مجھ سے کہا کہ جو وقت بچے اس میں انٹر کی تیاری شروع کر دوں۔ میرا ڈاکٹر بننے کا خواب تو ختم ہو گیا تھا لیکن کچھ بننے کی لگن مجھ میں اب بھی تھی اس لیے میں دلجمعی سے فرسٹ ایئر کے امتحان دینے میں جت گئی۔ جو سمجھ میں نہ آتا وہیں ماسٹر صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے لیکن اب اماں کو میری شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ہمارے علاقے میں لڑکیوں کی کم عمری میں شادی ہو جاتی تھی لیکن میری تمام تر خوب صورتی کے باوجود کوئی رشتہ ہماری دہلیز کراس نہیں کرتا تھا۔ ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا۔ کچھ رشتے آئے بھی تو کسی مستری اور ڈرائیور کے تھے۔ ایک رشتہ ایسا بھی آیا جس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس کی اپنی دونوں بیٹیاں مجھ سے عمر میں بڑی تھیں۔

رشتہ لانے والی نے اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ ''سال دو سال میں دونوں لڑکیاں اپنے گھروں کی ہو جائیں گی پھر تو رانی ہی راج کرے گی۔''

''نہیں کرنا مجھے ایسا راج کہ بیس سال کی عمر میں نانی بن جاؤں۔'' میں نے پہلی بار اس سلسلے میں زبان کھولی تھی۔

ہیڈ ماسٹر سے اماں نے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت ہنسے تھے پھر کہنے لگے کہ ''میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں ضرور رانی کو اپنی بہو بناتا۔''

ہیڈ ماسٹر کی وہ بات صرف بات نہیں تھی۔ میں انٹر کا امتحان دے رہی تھی کہ ایک روز وہ اپنے ایک کزن اور اُن کی بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آ گئے۔ ان کے کزن واہ میں کسی اچھے عہدے پر تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر تھا۔ میاں بیوی دونوں ہی کو میں پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ انہوں نے مجھ سے تصویر کی فرمائش کی تا کہ اپنے بیٹے کو بھیج کر اس پر مہر تصدیق لگائی جا سکے۔

میرے پاس ایسی کوئی تصویر نہیں تھی لیکن اماں میرے اسکول کی وہ تصویر لے آئیں جس میں مجھے بہترین ٹیچر کا ایوارڈ دیا جارہا تھا۔ ہرلڑکی کی طرح میرے دل میں بھی شادی کی خواہش موجود تھی لیکن اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے وہ خواہش دبالی تھی لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کے کزن اوران کی بیوی کا جس طرح کا رویہ تھا، اس سے میں دن میں بھی خواب دیکھنے لگی مگر پھر یہ خواب بھی دھوپ میں موم کی طرح پگھل گئے۔ ہیڈ ماسٹر کے کزن کے بیٹے نے باپ کولکھ دیا کہ دوبرس پہلے وہ امریکا میں شادی کر چکا ہے۔ خواب بکھرے تو میں نے امتحانوں کی زیادہ زوروشور سے تیاری شروع کردی۔

انٹر کا آخری پیپر دے کرگھر آئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب ایک خاتون اور ایک چھبیس ستائیس سال کے نوجوان کے ساتھ موجود تھے۔نوجوان کی آنکھوں میں مجھے دیکھتے ہی چمک آگئی تھی۔ اماں نے دوسرے کمرے میں مجھے جا کر بتایا کہ ''یہ نوجوان لیاقت ملک ہے۔ سردار یعقوب ملک مرحوم کا بیٹا ہے جس کی ملتان میں بہت اچھی نوکری ہے۔ ان کے تمام بہن بھائی باہر ملکوں میں ہیں' ان کا آبائی گھر اٹک میں ہے لیکن لیاقت ملتان میں اپنی نوکری کے سلسلے میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی خاتون اس کی پھوپی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کچھ وقت مانگا لیکن لیاقت کی پھوپی نے کہا کہ لیاقت دس روز کی چھٹی پر آیا ہے اور اس دوران شادی کرنی ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے چند روز کی مہلت مانگی اور پھر تین دن بعد انہوں نے بتایا کہ جو کچھ انہوں نے بتایا ہے، وہ سچ ہے۔لیاقت واقعی ملتان میں ملازم ہے اوراس کی دونوں بہنیں اور دونوں بھائی بیرونِ ملک ہیں۔ایک جمعہ کو یہ بات شروع ہوئی تھی اور اگلے جمعہ کو میں لیاقت کی بیوی بن گئی۔

لیاقت اوسط شکل وصورت کا شخص تھا۔ میرا اوراس کا کوئی جوڑنہیں تھا لیکن میں اس کے باوجود اللہ کی شکر گزار تھی کہ میری ماں اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئی تھی۔ ملتان پہنچی تو میری شکرگزاری اور بڑھ گئی۔ میرے اپنے گھر کے مقابلے میں لیاقت کے گھر کی ہر چیز بہتر تھی۔ وہاں کا فرنیچر، اس گھر کا کچن، لیاقت کی کار، لیاقت کا رویہ لیکن آہستہ آہستہ پردے اٹھنے لگے۔ لیاقت اپنے والدین کی سب سے نالائق اولاد تھی۔ اس کے بڑے بھائی بہن اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے جبکہ لیاقت نے بڑی مشکلوں سے بی اے کیا جب تک اس کی والدہ حیات رہیں، لیاقت کی زندگی میں عیاشیاں تھیں لیکن والدہ کے انتقال پر بہن بھائیوں نے اس سے ناتا ختم کردیا تھا۔ والد نے اپنی زندگی میں تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے ایسے محکمہ میں لگوادیا تھا جہاں تنخواہ سے کہیں زیادہ اوپر کی آمدنی ہوتی تھی۔

ان سب باتوں کو میں برداشت کر لیتی لیکن جب یہ راز کھلا کہ لیاقت عادی شرابی بھی ہے تو میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ''میں اس کے ساتھ رہوں یا نہیں'' میں ایک ایسے ماحول سے آئی تھی جہاں شراب کا نام لینا بھی حرام تھا۔ میں نے لیاقت سے اس پر بات کرنی چاہی تو اس نے کمالِ ڈھٹائی سے کہا۔ ''پیتا ہوں تو اپنے پیسوں سے پیتا ہوں، تیرے باپ سے نہیں مانگتا۔'' میں نے ہار نہ مانی تو اس کی دلیل تھی کہ ''تیرے خرچے میں تو کوئی کمی نہیں کرتا اس لیے مجھے اپنا شوق پورا کرنے دے۔''

بات کسی حد تک صحیح بھی تھی۔ رقم کے معاملے میں کوئی کنجوسی نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ مجھے بلا مانگے گھر کے نام پر اچھی خاصی رقم دیتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر یہ کرنا شروع کیا تھا کہ جب وہ نشے میں گھر آتا تو میں اس کے قریب نہ جاتی مگر یہ بھی اس سے برداشت نہ ہوا۔ ایک بار اس نے نشے کی حالت میں قریب کرنا چاہا اور میں نے انکار کیا تو اس نے میری پٹائی کردی پھر یہ اس کا معمول بن گیا وہ نشے میں گھر آتا اور صبح نشہ اترنے کے بعد معافیاں مانگنے لگتا۔

زندگی گزارنے کا یہ انداز میرے لیے بالکل نیا تھا۔ اُس انداز سے یکسر مختلف جو میں اب تک گزارتی آئی تھی۔ وہاں میرے آس پاس جتنے لوگ تھے، وہ مہربان تھے۔ اماں، ابا ہوں' بھائی ہوں، ہیڈ ماسٹر صاحب یا دوسرے لوگ۔ ان کے پاس پیسے یقیناً کم ہوتے تھے لیکن ہر وقت ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے مگر یہ میرے لیے ایک بالکل مختلف ماحول تھا جہاں خرچ کرنے کے لیے رقم کی تو کمی نہیں تھی مگر ماحول میں شراب کی بُوبسی ہوئی تھی۔ اس ماحول میں عورت پر ہاتھ اٹھانا یا تشدد کرنا ایک قبیح فعل تھا۔ اتنا قبیح کہ لوگ ایک طرح سے ایسے شخص کا سوشل بائیکاٹ کردیتے تھے لیکن اب میرے لیے ایک معمول کی بات تھی۔

میں اس ماحول سے اس قدر بیزار تھی کہ سانس لینا دوبھر تھا لیکن میرے پاس دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ چند ایک بار یہ سوچا بھی کہ واپس چلی جاؤں لیکن پھر اماں کا سوچ کر وہیں رہ جاتی تھی۔ فون پر ان سے تقریباً روز ہی بات ہوتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں کوئی سستا سا موبائل خرید

دیا تھا۔ میں اپنے قیمتی موبائل سے انہیں فون کر لیتی اور دیر تک باتیں کرتی تھی۔ ایک روز ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ "اتنے اچھے نمبروں سے انٹر کر لیا ہے اب بی اے کی تیاری کیوں نہیں کرتیں؟"

لیاقت سے ذکر کیا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری مارکس شیٹ اور دیگر کاغذات بھجوائے تو میں نے بی اے میں رجسٹریشن کروا لیا۔ اس سلسلے میں لیاقت نے بھی پورا تعاون کیا۔ وہ متعلقہ دفتر میرے ساتھ گیا تھا۔ میرا رجسٹریشن لیٹ فیس کے ساتھ جمع ہوا تھا اور امتحان میں صرف دو ماہ رہ گئے تھے لیکن میں نے ان دو ماہ میں بھرپور محنت کی۔ امتحان شروع ہوئے تب بھی لیاقت کا رویّہ صحیح رہا۔ وہ شراب اب بھی پیتا تھا لیکن اپنے کمرے میں بند ہو کر اور مار پیٹ بھی تقریباً ختم کر دی تھی۔ امتحانی سینٹر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتا اور جب تک پیپر ہوتا، وہ امتحانی مرکز کے باہر رہتا۔

میری زندگی میں کچھ سکون سا آنے لگا تھا لیکن یہ سکون زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ لیاقت کے ذہن میں نہ جانے کہاں سے یہ بات آئی کہ آبائی گھر بیچ دیا جائے لیکن اس کے باقی بہن بھائی اس کے حق میں نہیں تھے۔ لیاقت نے ان کی زیادہ پروا نہیں کی اور اپنی پھوپی کو ملتان شفٹ کر کے اس نے مکان بیچنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کسی سے مل ملا کر اس نے جعلی کاغذات بھی بنوا لیے لیکن بات چھپی نہ رہ سکی اور اچانک ہی اس کے ایک بھائی اور ایک بہن پاکستان پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے تو علاقے میں پہنچ کر اس شخص کو گرفتار کروایا جس نے جعلی پیپر تیار کیے تھے پھر ایک رات اچانک ملتان پہنچ گئے۔

"ہم سمجھے تھے کہ اتنا بڑا جرم کر کے تُو شرمندہ ہو گا لیکن تیرا تو ذہن ہی کرمنل ہے۔" بڑے بھائی نے لیاقت کا سامنا ہوتے ہی کہا تھا۔ لیاقت نے انہیں روکنے، بات کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن ان کا غصہ کسی طور کم نہ ہوا اور وہ لیاقت کو دل بھر کر باتیں سنا کر چلے گئے۔

میں اسی کمرے میں موجود تھی لیکن انہوں نے مجھے کوئی لفٹ نہیں کروائی صرف اس کی بہن نے جاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "لڑکی جتنی جلدی اس کرمنل سے پیچھا چھڑوا سکتی ہے، چھڑوا لے ورنہ یہ تجھے بھی کہیں کا نہیں رہنے دے گا۔"

وہ دونوں چلے گئے اور پھوپی کو بھی ساتھ لے گئے۔ جس کے جانے پر میں نے شکر ادا کیا کیونکہ اس نے اپنی آمد کے کچھ دن بعد ہی مجھ سے بچّے کا تقاضا شروع کرنے کے ساتھ ساتھ لیاقت کے بھی کان بھرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ دونوں ہمارے گھر کچھ ہی دیر رکے تھے لیکن لیاقت نے مجھے بتایا تھا، وہ ملتان سے گئے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے لیاقت کے دفتر میں بھی شکایت کر دی ہے۔ لیاقت نے ان سے ملنے کی کوششیں کیں لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوئے۔

لیاقت کے خلاف ابتدائی طور پر کچھ تحقیقات ہوئیں اور دو ماہ بعد اسے معطل کر کے باقاعدہ انکوائری شروع ہوئی۔ معطل ہونے کے بعد لیاقت کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ وہ صبح دیر سے اٹھتا تھا اور ناشتا وغیرہ کر کے اپنے کسی دوست کے دفتر چلا جاتا تھا جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ وہ ... اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتا تھا۔ وہ رات گئے تک آتا اور اکثر کھانا کھا کر ہی آتا تھا اور پھر آتے ہی سو جاتا تھا۔

میرا زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک نیا شوق جو مجھے ان دنوں ہوا تھا وہ ناول پڑھنے کا تھا۔ شوق تو شاید شروع سے تھا لیکن اتنے پیسے پاس نہیں ہوتے تھے کہ ناول خرید سکوں اب پیسوں کے معاملے میں ہاتھ میں کچھ خلاصی ہوئی تو میں نے ناول خریدنے شروع کر دیے اگرچہ اب لیاقت اتنے پیسے نہیں دیتا تھا جتنے پہلے دیا کرتا تھا۔ مجھ سے اپنی معطلی کے بارے میں کم ہی بات کرتا تھا۔ اگر میں پوچھ لیتی تو جواب دے دیتا۔ لیکن اس کے بھائی کا یہ فقرہ کہ "ہم سمجھے تھے کہ اتنے بڑے جرم کے بعد تو شرمندہ ہو گا لیکن تیرا تو ذہن ہی کرمنل ہے" میرے ذہن میں پھانس کی طرح چبھ گیا تھا اور رہ رہ کر مجھے تنگ کرتا تھا لیکن اتنی ہمت مجھ میں نہیں تھی کہ لیاقت سے براہِ راست سوال کر سکوں۔ میرا خیال تھا اور شاید غلط بھی نہیں تھا کہ وہ اس سوال پر بھڑک بھی سکتا ہے اور میری نیم سکون والی زندگی میں بھونچال آ سکتا ہے۔

بی اے فائنل کی ڈیٹ شیٹ آ گئی لیکن لیاقت کی معطلی ختم نہیں ہوئی تھی۔ معاشی تنگی سے تنگ آ کر اس نے کار بیچ دی تھی اور موٹر سائیکل پر آ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں جھلاّہٹ بڑھتی جا رہی تھی لیکن مجھ پر اس کا نزلہ کم ہی گرتا تھا۔

فائنل ایئر کے پرچے شروع ہوئے تو اماں کی طبیعت کی خرابی کی اطلاعات بھی ملنے لگیں۔ ان ہی دنوں میری طبیعت بھی کچھ بوجھل رہنے لگی تھی۔ لیاقت مجھے ڈاکٹر کے

پاس لے گیا تو اس نے کم سونے اور ٹینشن کی خبر دی تھی۔
آخری پرچہ دے کر آئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اماں کے اسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع دی تھی۔ میں اُڑ کر امی کے پاس جانا چاہ رہی تھی لیکن لیاقت نے خاصی دیر لگائی۔
اپنی گاڑی وہ بیچ چکا تھا اس لیے کسی دوست سے گاڑی مانگ کر لایا تھا اور پھر ہم دونوں ملتان سے چل پڑے تھے۔ راستے میں لیاقت نے بتایا کہ ٹرین کا ٹائم نہیں تھا۔ بس ہوتی یا ٹرین ہمیں پہلے پنڈی جانا ہوتا اور وہاں سے ہم ایبٹ آباد والی گاڑی میں سوار ہوتے اور راستے میں ہمارے گاؤں پہنچتے اس لیے اس نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔
راستے بھر میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے امی کی طبیعت کا معلوم کرتی رہی۔ انہوں نے بتایا کہ واہ کینٹ کے اسپتال سے اب انہیں پنڈی کے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہم رات ایک بجے اسپتال پہنچے تو امی اس وقت تک ہوش میں تھیں لیکن اس کے ایک گھنٹے بعد وہ بے ہوش ہو گئیں اور پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ شاید ان کی روح مجھ سے آخری بات کرنے کے لیے اٹکی ہوئی تھی۔
امی کی میت کو گاؤں منتقل کرنے اور تدفین وغیرہ کے انتظام سب لیاقت اور ہیڈ ماسٹر نے مل کر کیے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیاقت کو بتا دیا تھا کہ امی نے اپنی تدفین کے تمام اخراجات کی رقم بچائی ہوئی ہے اور کہاں رکھی ہے۔
وہ سوم کا اگلا روز تھا جب لیاقت میرے پاس آیا تھا کہ ہمیں فوری طور پر واپس جانا پڑے گا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی میں امی کی یادوں کے سہارے وہاں کچھ دن گزارنا چاہتی تھی لیکن جب لیاقت نے بتایا کہ ”دفتر سے فون تھا، اس کی انکوائری مکمل ہو گئی ہے اور وہ بری ہو گیا ہے مگر اس کا تبادلہ لاہور ہو گیا ہے۔“
نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے وہاں سے آنا پڑا تھا۔ لیاقت نے اس بات کا ذکر ہیڈ ماسٹر صاحب سے کیا تو انہوں نے بھی مجھ سے وہی کہا جو لیاقت کہہ رہا تھا۔ ملتان آ کر مجھے فرصت نہیں ملی، میں پیکنگ میں مصروف ہو گئی اور لیاقت دو روز بعد لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ ملتان کی طرح ہمیں لاہور میں سرکاری گھر نہیں ملے گا اس لیے وہ نئے دفتر میں چارج لے کر اور کرائے پر گھر کا بندوبست کر کے فوری طور پر واپس آ جائے گا۔
لیاقت تین روز بعد آیا۔ میں پیکنگ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اس لیے ہم اگلے ہی روز لاہور کے لیے روانہ ہو

گئے۔ لاہور میں اپنے نئے گھر کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اس لیے کہ اس میں ٹوٹل دو کمرے تھے۔ ایک چھوٹا اور دوسرا نسبتاً بڑا کمرا تھا اور باہر ایک برآمدہ تھا۔ بڑا کمرا چونکہ گیٹ کے سامنے تھا اس لیے اسے ڈرائنگ روم بنانا پڑا جبکہ چھوٹے کمرے کو بیڈ روم بنا دیا۔ برآمدے میں بھی صوفے رکھ دیے اور پچھلی طرف کے کھلے حصے میں ڈائننگ ٹیبل وغیرہ رکھ دی تھی۔

گھر کی حالت کو ایک شکل دینے میں مجھے ایک ہفتہ لگ گیا لیکن اس دوران میں یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی کہ نئے شہر اور نئے دفتر سے لیاقت بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ اس کے مزاج کا چڑچڑاپن لوٹ رہا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ آ رہا تھا۔ دو تین بار میں نے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا مگر پھر ایک روز خود ہی اس نے بتایا کہ دفتر میں کام بہت ہے اور اوپر کی آمدنی بالکل نہیں ہے۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''ہمارا افسر ایک پیر کا بیٹا ہے اور باپ کی نصیحت کے مطابق نہ رشوت لیتا ہے نہ کسی کو لینے دیتا ہے مگر......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''مگر کیا......؟'' میں اس کے ادھورے فقرے میں اُلجھ گئی۔

''نہ خود کھاتا ہے کیونکہ اسے ضرورت نہیں ہے کیونکہ باپ پیسے بھیجتا ہے نہ کسی کو کھانے دیتا ہے مگر عورت کے معاملے میں ......حرام حلال سب بھول جاتا ہے۔'' لیاقت کا لہجہ یہ کہتے ہوئے عجیب تر ہو گیا۔

''یہ تو عجیب بات ہوئی۔'' میں اپنی حیرت چھپا نہیں سکی تھی۔

''مجھ سے پہلے میری پوسٹ پر جو شخص تھا وہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ اپنی بیٹی کو میرے پاس بھیج دو اس نے انکار کیا تو اس کمینے نے نہ صرف اسے نوکری سے نکلوا دیا بلکہ جیل بھی بھجوا دیا۔'' لیاقت یہ کہہ کر چپ ہوا تو میری حالت عجیب سی ہو گئی۔ لیاقت کی جو تنخواہ تھی، اس میں گزارہ ممکن نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے لیاقت کو رشوت سے دور رہنے کے لیے کہا۔

''ایک دو ماہ کی بات ہے۔ میرا بی اے کا رزلٹ آ جائے تو میں نوکری کر لوں گی۔'' میں نے کہا۔ میرے ذہن میں یہی آیا تھا اور میں نے کہہ دیا لیکن لیاقت ہنسنے لگا۔

''کتنے مل جائیں گے تمہاری نوکری سے دو ہزار، تین ہزار زیادہ سے زیادہ چار ہزار لیکن میری ضرورت اس سے بہت زیادہ ہے۔'' لیاقت نے کہا اور مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ انہی دنوں اس نے مجھے بتایا کہ وہ دوبارہ ملتان ٹرانسفر کروانے کی کوششیں کر رہا ہے۔

دوبارہ ملتان جانے کی باتیں اب وہ صبح و شام کرنے لگا تھا۔ اتنی زیادہ کہ مجھے کوفت سی ہونے لگی تھی۔ اس کی زبان پر ہر وقت پیسوں کی کمی کا رونا ہوتا تھا۔ گھر کے لیے خرچ کی رقم بھی اس نے بہت کم کر دی تھی لیکن میں اس میں گزارہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی شراب میں بھی کمی کر دی تھی۔ اسی دوران اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ آنکھ بچا کر اوپر کی کمائی کر لیتا ہے۔

''صرف تنخواہ میں گزارہ ممکن نہیں ہے رانی۔'' میرے اس اندیشے پر کہ وہ کہیں پکڑا نہ جائے اور اس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو اس سے پہلے والے کا ہوا تھا، اس نے کہا تھا۔

جس روز میرا بی اے کا رزلٹ آیا اسی روز اس نے مجھے بتایا کہ اس کے دفتر میں سالانہ ڈنر ہے جس میں دفتر کے تمام لوگ اور ان کی بیویاں آئیں گی۔

''مجھے نہیں جانا کسی ڈنر میں۔'' میری جانب سے انکار پر وہ ناراض ہو گیا۔

''کیسی جاہلانہ باتیں کر رہی ہو؟'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''لیاقت میں کبھی اس طرح کی پارٹی میں نہیں گئی۔'' میں نے اپنی مجبوری بتائی۔

''ہر کام پہلی بار کرنے میں جھجک ہوتی ہے لیکن دوبار اور تیسری بار کرنے میں جھجک ختم ہو جاتی ہے۔'' لیاقت نے کہا۔

''یہ کوئی ایسا غیر معمولی فقرہ نہیں تھا۔ ایک عام سی بات تھی لیکن جس انداز میں اس نے کہا تھا، وہ بہت عجیب تھا اور میں خاصی دیر اس کے فقرے، اس کے لہجے اور اس کے انداز پر غور کرتی رہی لیکن کچھ سمجھ نہیں آیا۔

''میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو کر واہ کینٹ شفٹ ہو گئے ہیں جہاں وہ ایک پرائیویٹ اسکول کے پرنسپل بن گئے ہیں۔

میں نے اُن کی نئی جاب پر مبارک باد دی تو انہوں نے عجیب سی بات کی۔ ''پہلی تنخواہ ملی تو مجھے احساس ہوا کہ سرکاری اسکول میں تو میں نے وقت ہی ضائع کیا۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب کے پرنسپل بننے کے ساتھ ہی نظریات بھی تبدیل ہو گئے تھے لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایسی بات کی کہ میں اس رات لیاقت کے گھر آنے پر اسے بتائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب نے پرائیویٹ اسکول جوائن کر لیا ہے اور انہوں نے مجھے بھی آفر کی ہے کہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے لیے لاہور برانچ میں انگلش ٹیچر کے لیے بات کر سکتے ہیں۔'' میرا خیال تھا کہ لیاقت اس بات سے خوش ہوگا کیونکہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے جو تنخواہ بتائی تھی، وہ لیاقت کے اندازوں سے دوگنی سے بھی زیادہ تھی مگر لیاقت نے پوری بات سن کر بُرا سا منہ بنایا تھا۔

''یہ ہیڈ ماسٹر کا نمبر تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟'' اس نے کسی قدر تلخ انداز میں کہا تھا۔ مجھے حیرت یہ ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی خبر کو اس نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا اور اس نے وہ سوال کیا تھا جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا۔

''ملتان جاتے ہوئے میں نے اماں والا موبائل انہیں دے دیا تھا اور اس پر بات ہوئی تھی۔'' میں نے وضاحت تو دے دی لیکن وہ سب کچھ عجیب سا لگا تھا۔

اس شام لیاقت مجھ پر بہت مہربان رہا۔ وہ مجھے بازار لے گیا اور تین قیمتی سوٹ ہی نہیں دلوائے بلکہ ان کے ساتھ کے میچنگ جوتے اور آرٹی فیشل جیولری بھی دلوائی۔

میں نے پیسوں کی تنگی کا ذکر کیا تو اس نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ یہ سب تمہاری بی اے کی کامیابی کا انعام ہے۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ شادی کے اتنے برسوں میں وہ کبھی اس طرح مہربان نہیں ہوا تھا۔ اس رات جب ہم کھانے پر بیٹھے تو اس نے پھر سے سالانہ ڈنر کی بات کی۔ ''ڈنر کے لیے وہ سرخ والا جوڑا سلوانا تم دیکھنا اس میں تم کتنی خوب صورت نظر آؤ گی۔''

لیاقت کے منہ سے تعریف سن کر میں شرما گئی تھی لیکن اس کی اگلی بات نے مجھے پھر سے چونکا دیا۔ ''ڈنر کے لیے تم پارلر سے تیار ہونا۔''

''میں کبھی پارلر نہیں گئی۔'' میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تو وہ ہنس دیا تھا اور اس نے پھر سے وہی فتویٰ دہرایا جسے سن کر میں پہلی بار بھی چونکی تھی۔ ہر کام کو پہلی بار کرتے ہوئے جھجک ہوتی ہے۔ پہلی بار زیادہ ہوتی دوسری بار کم ہوتی ہے اور پھر جھجک ختم ہو جاتی ہے۔'' اس بار بھی اس کا لہجہ عجیب معنی خیز سا تھا۔ جس سے میں پہلی بار سے زیادہ

بوکھلائی تھی لیکن خاموش رہنے کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس رات لیاقت بہت دیر تک نشہ کرتا رہا اور پھر نشے میں دھت آ کر سو گیا۔ اس کے سونے کے بعد بھی بہت دیر تک میں نہ سو سکی۔ نہ جانے کیوں وہ فقرہ اور اس کے ساتھ لیاقت کا معنی خیز انداز مجھے پریشان کر رہا تھا۔

جب تک درزی کے یہاں سے کپڑے سل کر نہیں آئے۔ لیاقت روز ہی پوچھتا تھا کہ تمہارے سوٹ سل کر نہیں آئے۔ اس کی یہ مہربانیاں مجھے پریشان کیے دے رہی تھیں اور اس روز جس روز پارٹی تھی میری پریشانی عروج پر آ گئی جب لیاقت مجھے..... موٹر سائیکل پر لے کر ایک پارلر پہنچا اور وہاں بطور خاص ہدایات دیں۔ وہ سب اتنا عجیب اور غیر متوقع تھا کہ مجھ سے کچھ نہیں کہا جا رہا تھا۔

''میں سرخ جوڑے میں ڈنر پر پہنچی تو ہر نگاہ مجھ پر تھی۔ کافی لوگ ہم سے پہلے آ چکے تھے۔ سب سے آخر میں لیاقت کے باس آئے تو ان کا تعارف ہر فیملی سے کروایا جانے لگا۔ ہماری میز پر آئے تو چند لمحے تو مجھے دیکھتے رہے پھر لیاقت سے بولے۔ ''تم جنت کب گئے تھے؟''

لیاقت کی طرح میں بھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ تب ہی لیاقت نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں سر۔''

''جنت گئے ہو گے تبھی تو یہ حور تم وہاں سے لائے۔ زمین پر تو حوریں نہیں ملتیں۔'' انہوں نے کہا اور میں شرم سے سرخ ہو گئی مگر لیاقت باس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ لیاقت کا باس نوجوان تھا۔ مقابلے کا امتحان پاس کر کے آیا تھا۔ امارت اس کے چہرے سے ظاہر تھی لیکن مجھے اس کی آنکھ میں ایک شیطانیت سی نظر آئی تھی۔ میں اس کی تعریف پر خوش نہیں تھی حالانکہ پارلر میں جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا تو خود کو پہچان نہیں سکی تھی۔

میں اور لیاقت اپنی میز پر ہی تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے لیاقت سے کہا۔ ''باس بلا رہے ہیں۔''

لیاقت مجھے وہیں چھوڑ کر اپنے باس کے پاس چلا گیا اور میرے ذہن میں وہ باتیں تازہ ہونے لگیں جو لیاقت نے بتائی تھیں۔ میں اس جانب دیکھتی رہی جہاں لیاقت اپنے باس کے ساتھ تھا۔

لیاقت کی واپسی ہوئی تو مجھے پریشان دکھائی دیا تھا۔ میں نے پوچھا بھی کہ کیا بات ہوئی مگر وہ ٹال گیا کہ ''گھر چل کر بتاؤں گا۔''

ہم گھر پہنچے تو لیاقت صوفے پر گر سا گیا۔

''میں نے جس بندے سے کام کروانے کے پیسے لیے تھے، وہ باس کا آدمی تھا۔'' لیاقت نے کہا اور میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''مطلب یہ ہے کہ.....'' مجھ سے اس سے آگے کچھ نہیں کہا گیا۔

''باس نے اپنے اسٹاف کو چیک کرنے کے لیے یہ جال بچھایا تھا اور میں اس میں پھنس گیا۔''

''لیاقت اب کیا ہو گا؟''

''اس کے پاس سب ثبوت ہیں میری ویڈیو، میری باتوں کے ٹیپ۔'' لیاقت یوں بول رہا تھا جیسے اُسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔

لیاقت خاموش ہوا تو مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر وہ بات آ رہی تھی جو لیاقت نے اپنے سے پہلے والے شخص کے بارے میں بتائی تھی کہ ''باس نے اس کی بیٹی کی فرمائش کی تھی۔ اس نے انکار کیا تو نہ صرف نوکری سے گیا بلکہ سزا بھی ہوئی۔''

مجھے پارٹی میں باس کا کہا ہوا فقرہ بھی یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی وہ آنکھیں یاد آئیں جس میں شیطانیت بھری ہوئی تھی۔

''میں نے باس سے معافی تو مانگی ہے۔ ہو سکتا ہے معاف کر دے۔'' لیاقت نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا تھا۔

''ہو سکتا ہے ایسا ہو۔'' میں نے سوچا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ'' مجھے یہ بات کھانے سے پہلے نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ پریشانی میں اب تم کھا نہیں سکو گے۔'' لیاقت نے کہا۔

''انہوں نے کل ہمیں ہوٹل میں کھانے پر بلایا ہے تاکہ.....'' لیاقت نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے انکار کیا تو لیاقت چیخ پڑا۔

''تم نہیں جاؤ گی تو باس اسے اپنی توہین سمجھے گا اور مجھے جیل جانا پڑے گا۔ لیکن اگر میں جیل گیا تو تمہارا کیا ہو گا۔'' لیاقت نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ اس زاویے سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''انہوں نے فائیو اسٹار ہوٹل میں بلایا ہے جہاں ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔'' لیاقت نے اس انداز میں کہا جیسے وہ میرا ذہن پڑھتا رہا ہو۔

وہ پوری رات میں نے جاگ کر گزاری۔ صبح کے.....

وقت کچھ دیر کو آنکھ لگی تو ڈراؤنے خواب ستاتے رہے۔
اس روز لیاقت نے مجھے نہیں اٹھایا بلکہ خود ہی چائے بنا کر پی اور دفتر چلا گیا۔ شام میں آیا تو مجھے کچھ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔
''باس کو میں نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ اگر میں جیل گیا تو تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' لیاقت نے کہا۔
''پھر کیا بولے؟'' میں نے سوال کر دیا جس کے جواب میں وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔
''باس نے میری بات ہمدردی سے سنی لیکن کہا کہ ''میں معافی پر سوچوں گا اگر تمہاری بیوی گارنٹی دے کہ تم آئندہ یہ سب نہیں کرو گے۔'' لیاقت نے کہا۔
جو لہجہ اس کا تھا، اس میں مجھے سچ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا یقین کرنے کے سوا راستہ بھی کیا تھا۔
میں تیار ہوئی۔ لیاقت نے مجھے نیا سوٹ پہننے کو کہا اور ہم اس کی موٹر سائیکل پر ہوٹل پہنچ گئے۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں ہو سکتی۔
ہم ہوٹل پہنچے تو لیاقت نے موبائل فون پر کال کی۔ ''باس ہم پہنچ گئے ہیں۔'' پھر جواب سن کر فون جیب میں رکھ لیا۔
''باس اوپر کمرے میں بلا رہے ہیں۔'' لیاقت نے اس انداز میں کہا جیسے معمولی بات ہو۔
''لیاقت میں......'' میں نے انکار کرنا چاہا لیکن لیاقت نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تماشا نہ بناؤ......چلو......''
میں اُس کے پیچھے چلنے پر مجبور تھی۔ ہم لفٹ میں داخل ہوئے تو اس نے کہا۔ ''رانی یہ ہوٹل ہے......''
میں اس سے یہی سمجھی تھی کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں محفوظ ہوں لیکن لفٹ سے باہر نکلے تو وہاں کوریڈور میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا پھر لیاقت کونے کے کمرے کے باہر جا کر رکا اور اس نے بیل بجائی تو تھوڑی دیر بعد اس کے باس نے دروازہ کھولا۔
''آیئے......آیئے...... میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔''
ہم کمرے میں آ کر بیٹھے تو باس نے کہا چائے یا ٹھنڈا پھر ہمارا جواب سنے بغیر اس نے انٹر کام اٹھایا۔ ''سینڈوچ لے آؤ۔ دو کولڈ ڈرنک اور ایک چائے لیکن ذرا جلدی......'' اس نے فون پر ہدایات دیں۔
میں لیاقت کے باس کے سامنے والے صوفے پر

بیٹھی تھی لیکن بالکل کونے پر اس طرح کہ موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ جاؤں گی۔
"اگر تم ہمیشہ صوفے پر اسی طرح بیٹھتی ہو جس طرح سے بیٹھی ہو تو میں تمہاری عادت سمجھ کر نظر انداز کردوں بلکہ تب بھی میں یہی کہوں گا کہ صوفہ آرام سے بیٹھنے کے لیے بنایا جاتا ہے اور اس پر پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا جاتا ہے۔" لیاقت کے باس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"جی اچھا......" میں صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"ویسے ایک بات بتاؤ تم اس کنجوس کے ہاتھ کیسے آ گئیں؟ میں سیدھی ہو کر بیٹھی تو باس نے کہا اور میں لیاقت کی جانب دیکھنے لگی جس کی نظریں کسی اور جانب تھیں جیسے اس کا باس کسی اور کی بات کر رہا ہو۔
"ان کا رشتہ آیا تھا تو اماں نے ہاں کر دی۔" لیاقت کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا لیکن مجھے لیاقت پر غصہ آرہا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح کسی غیر مرد سے ہم کلام تھی۔
"تمہاری اماں سوتیلی تھیں؟" میرا جواب ابھی مکمل ہی ہوا تھا کہ باس نے ایک اور سوال کر دیا۔
"جی نہیں......" میں نے پہلی بار سخت لہجہ اپنایا۔
"سوتیلی نہیں تھیں تو کیا انہیں آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا؟" اس نے ایک اور سوال کر دیا اب کی بار میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔
"یہ آپ کس طرح کے سوال کر رہے ہیں؟" میں نے ترش لہجے میں کہا لیکن وہ مسکرانے لگا۔
"اپنی اتنی خوب صورت بیٹی کو ایسے شخص کے حوالے کرنے سے پہلے انہیں کچھ سوچنا چاہیے تھا۔" باس نے کہا۔ اس کا جواب میرے پاس تھا مگر میں نے خاموشی کو ترجیح دی۔
"میں نے تمہیں پارٹی میں دیکھا تو واقعی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہو لیکن آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارا حسن تو سادگی میں اور نمایاں ہے۔ میک اَپ نے تو تمہارے حسن کو نکھار انہیں دبا دیا تھا۔" لیاقت کا باس اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ میں توقع کر رہی تھی کہ لیاقت کسی مرحلے پر کچھ بولے گا لیکن وہ اسی طرح خاموش رہا تھا۔
ویٹر نے میز پر چیزیں سجائیں تو باس نے اسے ٹپ دی اور وہ جانے لگا۔ تب باس نے اسے روکا۔
"جب تک میں نہ بلواؤں اس طرف کوئی نہ آئے۔" اس نے ویٹر سے کہا۔
"ٹھیک ہے سر۔ میں باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا ٹیگ لگا دیتا ہوں۔" باس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
ویٹر جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رکا، اس کی نظریں مجھ پر تھیں پھر وہ بغیر کچھ کہے چلا گیا۔
اس وقت ویٹر کا یوں رکنا اور مجھے یوں دیکھنا سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن بعد میں غور کیا تو سمجھ آیا کہ ویٹر نے مجھے یوں کیوں دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ پہلا موقع تھا لیکن ویٹر کے لیے تو وہ روز کا تماشا تھا۔
"لیاقت بتا رہا تھا کہ تم نے فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے سوال کیا۔
"جی......" میں نے مختصر جواب دیا جس کے بعد اس نے اچانک لیاقت کو مخاطب کیا۔
"تم کچھ دیر باہر رکو مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"
میں نہیں چاہتی تھی کہ لیاقت کمرے سے جائے لیکن وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔
ایک بار میرا دل چاہا کہ لیاقت کو جانے سے روک دوں پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وہ یہیں پاس دروازے کے باہر موجود ہو گا۔
"بی اے کے بعد تم انگریزی میں ایم اے کرنا چاہ رہی ہو؟" اس نے سوال کیا اور میں جواب دینے سے پہلے سوچتی رہی کہ کیا کہوں۔
"ابھی کچھ سوچا نہیں۔" میں نے جواب میں کہا اور اس نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔
میری پوزیشن ایک بار پھر وہی ہو گئی تھی کہ جیسے فوراً ہی نکل بھاگوں گی۔
"اب آتے ہیں اس معاملے کی طرف۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا لیکن اس بار فرق یہ تھا کہ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔
"لیاقت نے تمہیں بتایا ہو گا کہ وہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا ہے اور اس کے تمام ثبوت میرے پاس ہیں؟" وہ یہ کہہ کر رک گیا لیکن میرا دل اس طرح دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔
"اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ اپنی معافی کے لیے اس نے مجھ سے سودا کیا ہے؟" وہ کہہ رہا تھا لیکن میرے کان جیسے کن نہ رہے ہوں۔
"پولیس اُسے گرفتار کرے گی۔ وہ جیل جائے گا تو ظاہر ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسے گا۔ اخبار میں تمہاری

تصویریں بھی چھپیں گی۔ بدنامی ہوگی۔'' اس نے مجھے ڈراؤنی تصویر دکھانی شروع کی اور تصویر دکھاتے ہوئے میرے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔

''خاموشی سے میری بات مان لوگی تو کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ وہیں قالین پر بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔اُس نے مجھے چھوا تو میرے پورے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ میں نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن اس نے مضبوطی سے انہیں پکڑا ہوا تھا۔

''مجھے جانے دیں۔'' میں بمشکل کہہ پائی تھی۔ میرے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔

''کہاں جاؤ گی؟'' اس نے سوال کیا لیکن اس کا انداز عجیب سا تھا۔

''تمہارا شوہر وعدے کے مطابق تمہیں میرے پاس چھوڑ گیا ہے اور جاتے ہوئے انگریزی شراب کی وہ بوتل بھی میرے ڈرائیور سے لے گیا جس کا میں اس سے وعدہ کر چکا تھا۔

''میں جاؤں گی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے آنسو بہانے شروع کر دیے۔

میں رو رہی تھی لیکن وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا۔ میرا جی چاہا کہ لیاقت کو آواز دوں کہ وہ دروازہ کھول کر اندر آ جائے لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔

''میری بات مان لوگی تو لیاقت کی نوکری بھی بچ جائے گی، وہ جیل بھی نہیں جائے گا۔ اخبارات میں تمہاری تصویر بھی نہیں چھپے گی۔'' وہ یہ کہتا جا رہا تھا اور ساتھ آنسو پونچھنے کے بہانے میرے چہرے پر ہاتھ بھی پھیر رہا تھا۔

''میں ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے جانے دیں۔'' میں نے ایک بار پھر درخواست کی۔

''میرا ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا لیکن صبح سے پہلے تم دونوں گرفتار ہو جاؤ گے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

میرے آنسو ایک بار پھر بہنا شروع ہو گئے اور آنسو بہاتے ہوئے میں نے سوال کر دیا۔''میں کیوں......؟''

''مجرم کا ساتھ دینا بھی تو جرم ہے۔'' اس نے کہا۔

''جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، پولیس والے وہ زبردستی کریں گے اور ان کے سامنے تم اس طرح آنسو بھی نہیں بہا سکو گی۔'' اس نے کہا اور ایک بار میرا جی چاہا کہ کھڑکی کھول کر چھلانگ لگا دوں لیکن اس سے پہلے کہ میں

کچھ کرتی، اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔
بچپن سے ذہن میں تھا کہ جب بھی ایسا کوئی موقع آیا کہ کوئی زیادتی کرے گا تو میں مزاحمت کروں گی...... بھرپور مزاحمت...... لیکن جب موقع آیا تو حوصلہ ہار گئی۔ حوصلہ ہارا تو سب کچھ ہارتی چلی گئی۔ بے جان مورتی یا ربر کی گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ بے جان مورتی اور ربر کی گڑیا کے آنسو نہیں نکلتے ہیں مگر میں آنسو بہا رہی تھی۔ نہ جانے وہ آنسو اپنی بے بسی کے تھے یا لیاقت کی بے غیرتی کے تھے مگر آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے مگر اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔
میں بے ہوش نہیں تھی۔ ہوش میں تھی جب اُس نے مجھے آواز دی تھی۔
''میں جانتا ہوں کہ تم ایسی عورت نہیں ہو لیکن کیا کروں تم پر پہلی نظر ڈالتے ہی میں تمہارا ہو گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ اس کا ہاتھ میرے جسم پر تھا۔ وہ برابر لیٹا تھا لیکن مجھے اس کی آواز میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ میں خاموش رہی۔ وہ آنسو جو کچھ دیر کے لیے رکے تھے، دوبارہ بہنے لگے تھے۔
''جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ تم میرے ساتھ ہو اور مزید دو دن رہو گی اس لیے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' اس کے لفظ کانوں میں سیسے کی طرح اترتے چلے گئے۔ میں نے اس کا ہاتھ خود پر سے ہٹایا اور اسی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''لیاقت اور میرا یہی سودا ہوا تھا۔'' اس نے مجھے یوں تڑپ کر اٹھتے دیکھ کر کہا۔ اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے صرف اسے دیکھتی رہی تھی۔
''میرا نام ذیشان ہے اور مجھ میں بہت سی برائیاں ہیں لیکن میں جھوٹ نہیں بولتا اور شراب نہیں پیتا۔'' اس نے کہا۔
شراب نہ پینے کی بات وہ ثابت کر چکا تھا اور جھوٹ نہ بولنے کی بات بھی تقریباً سچ ہی ثابت ہو رہی تھی۔
''کچھ کھاؤ گی؟'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا اور میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''اچھا یہ سینڈوچ ہی لے لو۔'' اس نے اصرار کیا لیکن مجھے تو خود سے نفرت ہو رہی تھی۔
میرے کانوں میں لیاقت کے کہے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''کوئی بھی کام پہلی بار کرنے میں بہت جھجک ہوتی ہے۔ دوسری بار جھجک کم ہو جاتی ہے اور پھر تیسری اور چوتھی بار کے بعد جھجک ختم ہو جاتی ہے۔''
میں اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اس نے ایک بار پھر اپنے قریب کر لیا۔ میں کچھ نہ بولی تو اور قریب کر لیا اور میں قریب ہوتی چلی گئی۔ وہ پہلی جھجک جو مجھ میں تھی، ختم ہو چلی تھی اور اس کے احکام پر عمل کرتی چلی گئی تھی۔ اب میری آنکھیں آنسو بہانا بھی بھول گئی تھیں۔ شوہر کی بے غیرتی اور اپنی بے بسی پر بلاوجہ آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔
''تھینک یو رانی۔'' اس نے اپنی پھولی سانسوں کے ساتھ کہا تھا اور میں سوچنے لگی کس بات کا شکریہ۔ بے بسی کا، مظلومیت پر پہنچا دینے کا شکریہ یا......
''میں جاؤں گی۔'' میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا لیکن وہ خاموش رہا۔
''کل پھر آ جاؤں گی۔'' نہ جانے میرے ہونٹوں نے وہ لفظ کیسے ادا کیے۔ شاید میرے ذہن میں تھا کہ وہ اس طرح مجھے نہیں جانے دے گا۔ جو سودا اس نے لیاقت سے کیا تھا، اسے پورا ضرور کرے گا۔
''پہلے کچھ کھا لو؟'' اس نے نیم رضامندی ظاہر کی تو میں نے اس کی بات مان لی۔
وہ فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر لایا اور گلاس میں انڈیل کر میرے ہاتھ میں دے دیا جسے میں نے منہ سے لگا لیا۔
اس نے موبائل پر نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بیل ہوتی رہی اس نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ دوسری طرف بجنے والی بیل کی آواز مجھے سنائی دیتی رہی تھی۔
''یہی نمبر ہے نا تمہارے شوہر کا؟'' اس نے اپنا موبائل میرے سامنے کر دیا۔ نمبر صحیح تھا لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔
''شراب پی کر پڑا ہو گا۔'' اس نے کہا اور میں خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔
''جاتے ہوئے وہ برانڈڈ شراب کی بوتل لے گیا تھا تو اب پی کر پڑا ہو گا۔'' اس نے کہا اور میرے قریب آ گیا۔
''ذیشان پلیز۔'' میں نے پہلی بار اُس کا نام لیا تھا۔ میں نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا مگر وہ اپنا خراج پورا وصول کرنے کے موڈ میں تھا۔ لیاقت کا قول پورا ہو رہا تھا، میری جھجک اور کم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد کا وقت میں نے جاگ کر گزارا مگر وہ بے سدھ میرے قریب سوتا رہا تھا۔ میں نے اس کے موبائل سے لیاقت کا نمبر کئی بار ڈائل کیا مگر دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں تھا۔

کھڑکیوں کے پردے سے صبح کی روشنی چھن کر آنے لگی تو میں نے اسے اٹھایا اور وہ اٹھ گیا۔

''مجھے جانا ہے۔'' میں نے کہا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

''بات تو یہ ہوئی تھی کہ تم تین دن رکو گی لیکن تمہاری ضد ہے تو......'' اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دو کام کیے۔ ایک تو اپنے ڈرائیور کو فون کیا کہ گاڑی لے آئے اور دوسرا ہوٹل کے روم سروس کو فون کر کے دو چائے کا آرڈر دیا تھا۔

اس نے مجھے فریش ہونے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس نے میرے لیے بھی چائے بنائی اور میں نے پی بھی لی تب ہی اس کے ڈرائیور کا فون آیا۔

''مگر ذیشان مجھے تو گھر کا راستہ نہیں معلوم۔'' مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ میں گھر جاؤں گی تو کیسے۔ میں زیادہ سے زیادہ گھر کے پاس والی مارکیٹ تک گئی تھی۔

''مجھے اندازہ ہے تمہارے علاقے کے قریب پہنچ کر ڈھونڈ لیں گے۔'' اس نے کہا تھا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دے گا لیکن وہ تو خود جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

ہم ہوٹل سے نکلے تو اس نے کہا۔ ''امید ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی جس سے ہم سب کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔'' اس نے کہا اور میں سوچنے لگی کہ کون سی حرکت کیسی حرکت...... جب حرکت کرنے کا وقت تھا تو اس وقت تو میں خاموش رہی تھی۔

''میرے پاس اب کھونے کو بچا کیا ہے جو میں کوئی حرکت کروں گی۔'' میں نے کہا اور وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔

''زندگی بہت طویل ہے رانی اس میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

''بہت سے سمجھوتے ایسے کرنے پڑتے ہیں جس کے لیے ذہن تیار نہیں ہوتا مگر جو سمجھوتے کر لیتے ہیں، ان کی زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔'' اس نے کہا لیکن میں خاموش رہی۔

ہم اپنے علاقے سے کچھ دور تھے کہ اس نے جیب سے پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ نکالے۔

''یہ کیا......؟'' میں نے سوال کیا۔

''رکھ لو کام آئیں گے مگر اس کے بارے میں اُسے نہ بتانا ورنہ وہ اسے بھی شراب میں اُڑا دے گا۔'' اس نے کہا اور میں نے نوٹ رکھ لیے۔

''یہ میری قیمت تھی۔'' میں نے معلوم نہیں کس جذبے سے کہا جس کا وہ فوری جواب نہیں دے سکا تھا۔

''تمہاری جو قیمت ہے، اس کا اندازہ نہ تم لگا سکتی ہو نہ میں۔'' اس نے کہا اور پھر ایک لمحے رک کر بولا۔

''کاش اس سنیچو سے پہلے مجھ سے ملتیں تو آج میں شادی شدہ ہوتا اور تم مسز ذیشان۔''

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا گیا اور میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔

کسی بھی شادی شدہ عورت سے کوئی شخص یہ فقرہ کہے تو اس کے لیے یہ گالی سے کم نہیں ہوتا لیکن جس وقت ذیشان نے یہ فقرہ ادا کیا، اس وقت تو میں خود ایک گالی بن چکی تھی۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ذیشان مجھے---'' میرے ذہن میں آیا تھا جس کا جواب نفی میں تھا لیکن میرا ذہن اس سوچ سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ میں بار بار ڈرائیونگ کرتے ذیشان کو دیکھ رہی تھی۔

گھر ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مارکیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے اسے گائڈ کیا تھا۔ ذیشان اس دوران مسلسل لیاقت کو کال کرتا رہا تھا لیکن اس کے موبائل سے کوئی جواب نہیں تھا۔

''میں نے پرس میں سے چابی نکالی اور گھر میں داخل ہوئی تو میں اُسے روک نہ سکی۔ ہم آگے پیچھے بیڈ روم میں آئے تو لیاقت بستر پر اوندھا پڑا ہوا تھا اور شراب کی تقریباً ختم ہوئی بوتل میز پر تھی۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے اسے ہلایا تو وہ اونہہ کہہ کر پھر سو گیا۔

''میں شام میں فون کروں گا۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا اور میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ذیشان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر خاموش کھڑی رہی اور پھر میں باتھ روم میں گھس گئی۔

''جسم پر لگی گندگی تو صاف کر لو گی، روح کی گندگی کیسے صاف ہو گی؟'' ذہن نے سرگوشی کی۔

''اس نشے میں پڑے شخص کو قتل کر کے بدلہ لے سکتی ہوں۔'' میں نے خود سے کہا لیکن اس کے بعد کا تصور کر کے فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔

باتھ روم سے دوبارہ بیڈ روم تک آئی تو یہی خیال دوبارہ آیا لیکن میں کچن میں گھس گئی جہاں چھری کو دیکھ کر پھر خیال آیا مگر میں چائے بنانے لگی۔

کچن میں صرف اپنے لیے چائے بنائی۔ وہیں پر مجھے ڈبل روٹی اور انڈے بھی نظر آئے لیکن میں نے صرف سلائس لیے تھے۔

''اس کا مطلب ہے ذیشان صحیح کہہ رہا تھا۔ ان کے درمیان تین دن کی ہی بات ہوئی ہوگی۔'' میں نے سوئے ہوئے لیاقت کو دیکھ کر سوچا تھا۔

لیاقت ایک بجے کے بعد بیدار ہوا۔ پہلے کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا لیکن جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی، ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''رانی...... تم......؟'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا ہو۔

''تمہارے کیے گئے سودے کے مطابق تو مجھے ابھی بھی ذیشان کے ساتھ اس کے بستر میں ہونا چاہیے تھا؟'' میں نے اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو کم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

لیاقت نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ صرف ایک بار اور مجھے نظر اٹھا کر دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ صرف نظریں جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

''تم نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ میری عزت کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا مگر......'' اس سے آگے مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔

''رانی یقین کرو مجھے اس کے سوا اور کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا تھا۔'' لیاقت نے کہا۔ وہ بستر کے کنارے کھسک آیا تھا، ہمارے درمیان اب صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا پھر اس نے یہ فاصلہ بھی ختم کرنا چاہا اور آگے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھونا چاہا۔

''ہاتھ پیچھے کر بیوی کے دلال۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے آنسو نکل پڑے تھے۔

''ایک وقت آیا تھا جب میں ذہنی طور پر جیل جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔'' لیاقت نے آنسو پونچھ کر دوبارہ بات شروع کی تھی۔

''میں نے سوچا تھا کہ تم ہیڈ ماسٹر کے یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ وہ اپنے اسکول میں جگہ دے دیں گے مگر جب باس نے اعانتِ جرم میں تم پر بھی ایف آئی آر کٹوانے کی بات کی تو میں بالکل ہی ٹوٹ گیا۔'' لیاقت نے یہ کہا اور ایک بار پھر رو دیا تھا۔

جس انداز میں اس نے بات کی تھی، اس سے مجھے لیاقت سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے جیسے مجھے اس سے ہمدردی ہو رہی تھی ویسے ویسے ذیشان کے لیے میرے دل میں نفرت جگہ بنا رہی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ لیاقت وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر بہت دیر بعد وہ باہر آیا اور جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔ ''باس تمہیں لینے آ رہے ہیں۔''

میں اس کے اس انداز پر حیران رہ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مجبور بن رہا تھا اور اب پھر سے وہی کچھ کرنے کا اصرار کر رہا تھا۔

''جو کچھ ہو چکا اسے انجام تک پہنچانے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کا خیال تھا کہ میں کچھ کہوں گی لیکن میں خاموش رہی تو اس نے کہا تمہارے کپڑے استری کر دیے ہیں۔'' اور یہ کہتے ہی چلا گیا۔

کپڑے واقعی استری تھے مگر ساتھ ہی میچنگ کی لپ اسٹک رکھی تھی اور لپ اسٹک دیکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے لیاقت کی وہ مہربانیاں یاد آنے لگیں جو ڈنر میں جانے کی تیاریوں پر اس نے کی تھیں اور پھر مجھے ڈنر والی رات اصرار کر کے پارلر تیار ہونے کے لیے لے جانا اور اس سے پہلے میرے انکار پر اس کا چراغ پا ہونا یاد آتا چلا گیا۔

''خدایا......'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور جو کچھ آ رہا تھا اسے ذہن قبول کرنے کے لیے رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ میں ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی کہ لیاقت نے اطلاع دی...... ''صاحب بس پہنچنے والے ہیں۔''

میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ وہ چار بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔

لیاقت کے ساتھ ذیشان گھر پہنچا تو مجھے تیار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔

''سر مجھے آپ آگے راستے میں اتار دیجیے گا...... مجھے ایک دوست کے یہاں جانا ہے۔'' لیاقت نے کہا تھا۔ وہ آگے کی سیٹ پر تھا اور میں پیچھے تھی۔ مین روڈ پر کچھ آگے لیاقت نے رکنے کو کہا جس پر ذیشان نے کہا ''ڈکی سے اپنی چیز نکال لو مگر راستے میں پولیس نے روکا تو......؟''

''بس سر یہ پچھلی گلی میں ہی جانا ہے۔'' لیاقت نے

جواب دیا۔
ذیشان نے ڈکی کھولی اور لیاقت نے اس میں سے ایک بڑا پولی تھین کا تھیلا نکالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر ذیشان کا شکریہ ادا کیا اور مجھے ہاتھ ہلا کر چلا گیا۔
''آگے آجاؤ'' کچھ آگے جا کر ذیشان نے گاڑی روک کر مجھ سے کہا تھا۔
''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' میں نے بیٹھتے ہی کہا۔
''میں جلدی اسی لیے آیا تھا کہ کچھ شاپنگ کر لیں گے۔'' اس نے کہا تھا۔
''میں بات نہیں کروں گی تو دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے کہا اور ذیشان نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر گاڑی موڑ لی تھی۔
''دوپہر میں کچھ نہیں کھا سکا اور تم نے بھی شاید کچھ نہیں کھایا ہو گا اس لیے ہائی ٹی لے لیتے ہیں اور ساتھ بات بھی کر لیں گے۔''
ذیشان کی پیشکش ایسی نہیں تھی کہ میں اسے رد کرتی۔ ہم ایک فائیو اسٹار ہوٹل جہاں کا ہائی ٹی بہت مشہور تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آئی تھی۔ ہائی ٹی کا تو میں نے صرف نام ہی سنا تھا۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوتا اور کیسے ہوتا ہے۔ ذیشان نے پلیٹ ہاتھ میں دی اور ڈشز کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''جو چاہو ان میں سے لے لو۔''
اتنے سارے لوگوں کے درمیان ویسے ہی نروس ہو رہی تھی کہ ڈشز کو دیکھ کر اور نروس ہو گئی۔ ذیشان نے آگے بڑھ کر میری مدد کی۔ میں منع کرتی رہی اور وہ پلیٹ بھرتا رہا۔ ہم واپس اپنی ٹیبل پر آئے تو اس نے مجھے آہستہ آہستہ کھاتا دیکھ کر کہا۔
''جلد ختم کرو ہمیں شاپنگ پر بھی جانا ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔
''آپ نے کہا تھا......'' میں جو کہنا چاہتی تھی، اس کو اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
''میں نے وعدہ کیا تھا اور میں وہ سب بتا دوں گا جو سچ ہے اور وعدہ ہے کہ بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' اس نے وعدہ دہرایا۔
''ذیشان میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔'' میں نے رُندھے ہوئے انداز میں کہا۔
''میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن ایک وعدہ تم کو بھی کرنا ہو گا۔'' اس نے کہا اور میں چونک گئی۔
''کیسا وعدہ؟'' میں کسی قدر بوکھلا گئی۔
''آج دوسرا دن ہے اور کل تیسرا......'' اس نے کہا اور میری گردن ہل گئی۔
''صرف یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ کل جب تم جاؤ گی تو وہ ہمارے تعلق کا آخری دن نہیں ہو گا۔'' اس نے اتنے آہستگی سے کہا تھا کہ اگر میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ نہ ہوتی تو سن نہ پاتی۔
''اس کا انحصار اس پر ہے کہ تم کتنا سچ مجھے بتاتے ہو اور کتنا چھپاتے ہو۔'' میں نے کہا نہ جانے وہ اعتماد مجھ میں کہاں سے آیا تھا لیکن میں نے کہہ دیا۔
''جو کچھ میں کہوں گا، اس کی تصدیق بھی میرے ذمے۔'' اس نے کہا اور میں ''ٹھیک ہے'' کہہ کر رہ گئی۔
''لیاقت نہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا تھا نہ اس کا کوئی اعترافی کیسٹ میرے پاس ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میرے ردِعمل کا منتظر ہو لیکن میں اسی انداز میں بیٹھی رہی، گھر پہنچنے کے بعد جتنی دیر میں اس پر غور کرتی رہی۔ میری سمجھ میں یہی آیا تھا۔
اس کے رونے اور آنسو بہانے کے بعد اور میرے تیار ہونے اور اس کے لپ اسٹک، کپڑوں کے بعد میں نے مزید غور کرنا شروع کیا تو اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔
''لیاقت میرے پاس آیا تھا۔ اپنا ٹرانسفر دوبارہ ملتان کرنے کی درخواست لے کر میرے اس سوال پر کہ میں کیوں تمہاری سفارش کروں؟ اس نے کہا تھا۔ ''باس میں آپ کو اس طرح خوش کر دوں گا کہ آپ زندگی بھر نہیں ہوئے ہوں گے۔'' ذیشان نے بات آگے بڑھائی لیکن میں بُت بنی سنتی رہی۔
''پورا پلان لیاقت کا ہی تھا مگر میں نے اس رات تم سے ڈنر پر ملنے سے پہلے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ تم سے ملا تو احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھا جب لیاقت میرے پاس آیا تو اس نے دوبارہ سے اپنا منصوبہ دہرایا اور میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔'' ذیشان نے اپنی بات مکمل کی اور میں جو پہلے ہی بہت آہستہ کھا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گلے سے کوئی چیز نیچے نہیں اتر رہی ہے۔
''ذیشان یہاں سے چلو۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ذیشان بھی میرے ساتھ ہی اٹھا تھا لیکن اسی وقت ... دو لڑکیاں تیزی سے ہماری طرف آئیں۔
''آپ میاں بیوی ہیں؟'' ان میں سے ایک نے کہا تھا۔ وہ

دونوں ہی جینز میں تھیں اور کُرتیاں بھی چھوٹی تھیں۔
"ابھی تو نہیں ہیں۔" ذیشان نے کہا اور وہ لڑکی جس نے سوال کیا تھا، دوسری لڑکی سے بولی۔
"لولی کپل۔" اس نے کہا اور دوسری مسکراتے ہوئے بولی۔ "اوکے۔"
میری طرح ذیشان بھی انہیں دیکھ رہا تھا لیکن میری طرح وہ بھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہمارے چہرے دیکھ کر انہوں نے خود ہی کہنا شروع کیا۔
"یہ سمی ہیں اور میں سائرہ۔" اس لڑکی نے تعارف کروایا جو بولے جا رہی تھی۔
"میں ذیشان ہوں اور یہ رانی۔" ذیشان نے جواب میں تعارف کروایا۔
"واقعی رانی ہیں۔" وہ لڑکی بولی تھی جو مستقل بول رہی تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی چھوٹے قد کی لڑکی تھی۔ اس کے یوں اچانک تعریف کرنے پر میں سرخ ہو گئی۔
"تھینک یو۔" میرے بجائے ذیشان نے شکریہ ادا کیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔
"ہم دونوں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہے تھے۔" اس نے دوبارہ بات شروع کی۔
"سائرہ کا خیال تھا کہ آپ نیو میریڈ کپل ہیں جبکہ میں کہہ رہی تھی کہ مردوں کے یہ سب چوچلے شادی سے پہلے کے ہیں اور اسی بات پر شرط لگ گئی۔"
"اور آپ شرط ہار گئیں؟" ذیشان نے کہا اور اس نے کاندھے اچکا دیے۔
ہم دوبارہ آگے بڑھے تو وہ لڑکی جواب تک خاموش تھی، اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "رانی صاحبہ شادی میں مجھے ضرور بلانا کیونکہ میں آپ کی وجہ سے دس ہزار روپے ہاری ہوں۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر میرے بجائے ذیشان نے "ضرور" کہا اور ہم آگے بڑھ گئے۔
ان دونوں کے اچانک اور یوں بولڈ تبصروں نے مجھے شرم سے لال تو کر ہی دیا تھا لیکن میرے ذہن کی رو اس طرف لپک گئی تھی کہ "کیا یہ ممکن ہے؟"
ہم کار تک پہنچے اور ذیشان نے میرے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا جب تک میں اسی ٹرانس میں تھی۔
"بولڈ لڑکیاں تھیں۔" میں خاموش بیٹھی تھی تو ذیشان نے کہا اور میں ایک بار پھر سے سرخ ہو گئی۔

ذیشان مجھے لے کر ایک بوتیک میں گیا اور وہاں میرے لیے کپڑے پسند کرنے لگا۔ میں اسے روکتی رہی لیکن وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک جوتے کی دکان میں پہنچے اور یہاں بھی پسند کرنے کی ذمے داری ذیشان نے سنبھالی۔ قریب ہی وہاں میک اَپ کی چیزوں کی دکان تھی جہاں سے پھر ذیشان نے خریداری شروع کی تو میں نے کہا۔ "ذیشان مجھے میک اَپ کرنا نہیں آتا۔"
"میں جانتا ہوں۔" اس نے میری بات پر خاص توجہ نہیں دی۔ وہاں سے نکل کر ذیشان مجھے لے کر ایک پارلر پہنچا اور اس کی مالکہ سے مجھے ملوایا۔
"یہ رانی ہیں۔ یہ کل سے آپ کی گرومنگ کی کلاس اٹینڈ کریں گی۔" اس نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کیا۔
"کل سے نہیں منگل منڈے سے۔" ذیشان کے جواب میں انہوں نے کہا۔
ہم وہاں سے نکلے تو میں چیخ پڑی تھی۔ "یہ سب کیا ہے؟"
"دیکھتی جاؤ...... لیکن خاموش رہو۔" ذیشان کا انداز حاکمانہ تھا۔
ہوٹل جانے سے قبل ہم نے ایک مشہور ہوٹل میں ڈنر کیا۔ یہاں بھی بیشتر نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی تھیں کیونکہ پارلر میں انہوں نے میرا ہلکا سا میک اَپ کیا تھا اور میرے بال تھوڑے گھونگریالے کر دیے تھے۔
"بار بار مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن پھر کہتا ہوں۔ کاش اس احمق لیاقت سے پہلے مجھے ملی ہوتیں۔" ہوٹل پہنچ کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ شرم سے میری یہ حالت تھی کہ لبوں تک آئے فقرے کو میں ادا نہ کر سکی۔
"پہلے نہیں ملی تھی اب تو مل گئی ہوں۔"
ذیشان سینے سے لگائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے بھی اس کے سینے سے ہٹنے کی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کی۔ میرے کانوں میں ہوٹل میں ملنے والی ان دونوں لڑکیوں کے الفاظ گونج رہے تھے یا وہ فقرے گونج رہے تھے جو ذیشان میری تعریف میں کہتا رہا تھا۔
ہم بستر میں تھے کہ ذیشان نے کہا۔ "ایک تحفہ ہے تمہارے لیے لیکن وعدہ کرو تم کبھی اسے خود سے جدا نہیں کرو گی۔" اس نے کہا۔
میرے ہاں کہتے ہی جیب سے ایک پیکٹ نکالا پھر اس میں سے گلے کا ہار نکالا جس میں نیچے اس کے نام کا پہلا

حرف "Z" لکھا تھا۔ اس نے مجھے وہ پہنایا اور میں آسمانوں میں اُڑنے لگی۔

"تم بھی کبھی مجھ کو خود سے الگ نہ کرنا۔" میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا اور اس نے مجھے پھر سے بانہوں میں بھر لیا۔

وہ رات کا پچھلا پہر تھا کہ مجھے یاد آیا کہ ذیشان نے بتایا تھا کہ لیاقت نے یہ سب پلان اس لیے بنایا تھا کہ وہ ملتان ٹرانسفر چاہتا ہے۔

"مجھ سے ایک وعدہ کرو ذیشان۔" میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"تم صرف حکم کرو۔" اس نے کہا لیکن میں سوچ میں پڑ گئی۔

"تم لیاقت کا ملتان ٹرانسفر نہیں ہونے دو گے۔" میں نے کہا اور وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔

"ملتان تبادلے کا مطلب ہے کہ تم بھی ملتان چلی جاؤ اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔" اس کا انداز بھی سرگوشی کرنے والا تھا۔

صبح کے قریب ذیشان سو گیا تو میں سوچنے لگی کہ چند گھنٹوں میں مجھ میں کیسی تبدیلی آئی ہے۔ اب نہ آنسو ہیں، نہ تو یادیں ہیں نہ واسطے دیے جا رہے ہیں بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ رضامندی سے ہو رہا ہے۔ اس وقت میرے کانوں میں لیاقت کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ "کوئی بھی کام پہلی بار کیا جائے تو بہت جھجک ہوتی ہے لیکن دوسری بار جھجک کم ہو جاتی...... تیسری بار اور کم اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔"

ذیشان کے ساتھ گزرے لمحوں کو یاد کرتے ہوئے میں بھی نیند کی وادیوں میں اترتی چلی گئی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی تو میں نے خود کو دیکھا۔ ذیشان اب بھی سو رہا تھا۔ میرے بدن پر صرف ذیشان کا دیا ہوا لاکٹ تھا۔ میں آہستہ سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ فریش ہو کر واپس آئی تو ذیشان جاگ رہا تھا۔

"اتنے کپڑے کل لیے ہیں اُن میں سے کوئی پہن لیتیں۔" ذیشان نے مجھے کل کے کپڑوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

"ایک تو یہ کہ میں کپڑے نکالتی تو تمہاری نیند خراب ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ ذیشان وہ کچھ ویسٹرن اسٹائل کے ہیں۔" میں نے اپنا اعتراض کہہ ڈالا۔ بوتیک میں بھی جب وہ میرے لیے خریداری کر رہا تھا، میں نے یہی کہنا چاہا تھا لیکن اس نے میری چلنے نہیں دی تھی۔

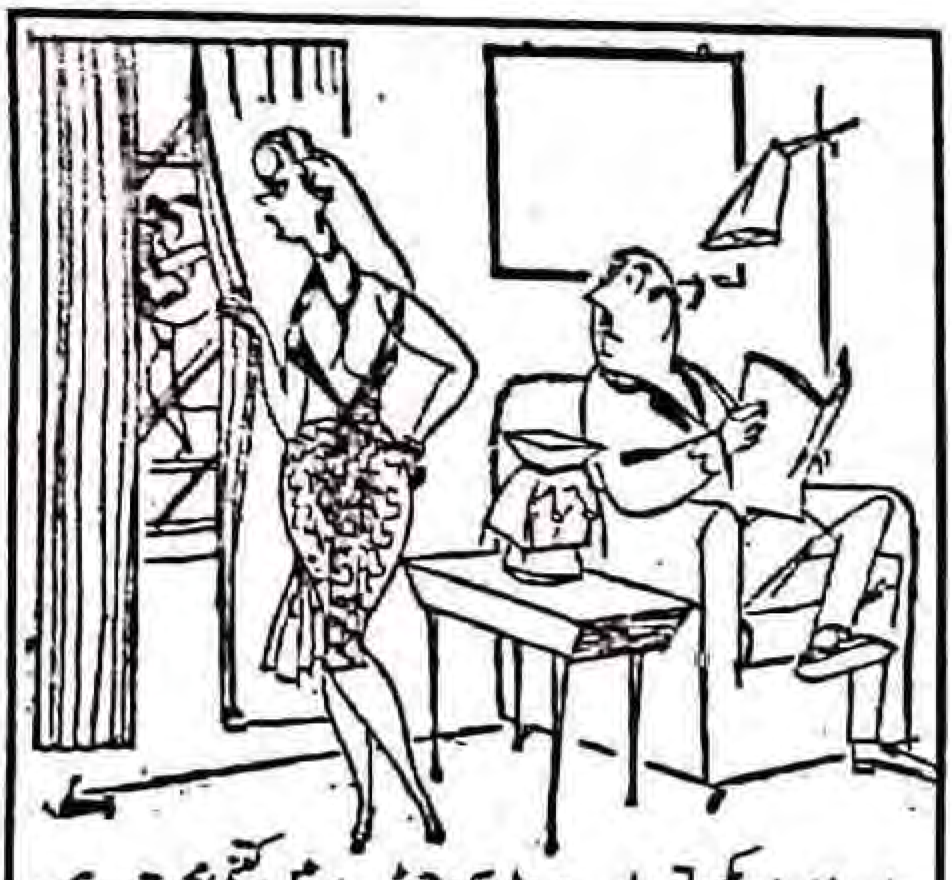

جان! ذرا دیکھو تو ہمارے پڑوسی جوڑے میں کتنی محبت ہے۔

"اب خرید لیے ہیں تو تم نے پہننے تو ہیں۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"میری بات مانتی رہیں تو میں تمہیں شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچا دوں گا کہ دولت تمہارے قدموں تلے ہو گی۔" اس نے کہا تھا لیکن میں کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔

"میں سمجھی نہیں؟" میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"سب سمجھا دوں گا۔ بس ایک بات یاد رکھنا کہ میری کسی بات کو منع نہ کرنا۔" وہ عجیب سے انداز میں بات کر رہا تھا۔

ذیشان کی وہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی لیکن میں اُس سے وضاحت نہ مانگ سکی کیونکہ اسی وقت ناشتا آ گیا جو میرے فریش ہونے کے دوران ذیشان منگوا چکا تھا۔

"سیلف گرومنگ کا تمہیں بہت بہت فائدہ ہو گا۔ تم دیکھنا کہ تم بالکل بدل جاؤ گی۔" ذیشان نے ناشتے کے دوران میں کہا تھا۔

"وہ جگہ تو ہمارے گھر سے بہت دور ہے۔" میں نے کہا اور وہ ہنس دیا۔

"ابھی دفتر جا کر میں لیاقت سے بات کروں گا۔" اس کے پاس ہر مسئلے کا حل تھا۔

"گلبرگ کے پاس ایک سوسائٹی ہے جہاں میرا ایک مکان ہے لیاقت سے کہوں گا کہ تم وہاں شفٹ کر جاؤ۔" اس نے کہا۔

"ذیشان...... میں......" میں کہنا کچھ اور چاہ رہی تھی۔ میں کہنا چاہ رہی تھی کہ اب میں لیاقت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی لیکن اس نے کوئی اور مطلب لیا تھا۔

"اس روز جب میں تمہیں چھوڑنے گیا تھا تو واپسی پر

مجھے ایک صاحب نے روکا تھا اور پوچھا تھا کہ میں کون ہوں۔"

"کون تھا...." میں نے سوال کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس طرح کوئی شخص کیسے.... کسی کو روک سکتا ہے۔

"اسی گلی کے کسی گھر کا تھا۔" ذیشان نے کہا۔

"تو پھر کیا ہوا؟" میں کچھ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔

"میں نے کہا کہ لیاقت کا باس ہوں۔ رات میری بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے مسز لیاقت رک گئی تھیں اب چھوڑنے آیا ہوں۔" ذیشان نے اپنی چالاکی بتائی۔

"میں معلوم کروں گی۔" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن دل میں سوچا کہ کیا معلوم کروں گی۔ سوالات ہوئے تو کیا جواب دوں گی۔

"کل پھر جب تم اور لیاقت گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو دروازوں کے پیچھے سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔" میں خاموش رہی تھی۔

"اب جب میرا ڈرائیور تمہیں روز لینے آئے گا اور گرومنگ کلاس کے بعد چھوڑنے جائے گا تو جانے کیا باتیں بنیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم شفٹ کر جاؤ۔"

ذیشان نے جو بتایا تھا، اس میں بہتر حل یہی نظر آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ سب کچھ بہتر نہیں لگ رہا تھا۔

ذیشان تیار ہو کر کچھ دیر بعد چلا گیا۔ اسے گھر جا کر تیار ہونا تھا اور پھر دفتر جانا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تم آرام کرو اور کھانے کے لیے جو منگوانا ہے، وہ روم سروس سے منگوا لو۔"

"کوشش کروں گا جلدی آجاؤں۔" اس نے نکلتے ہوئے کہا۔

میں تنہا رہ گئی تو پھر سے ذیشان کا فقرہ ذہن میں گونجا تھا۔ "کبھی میری کسی بات سے انکار نہ کرنا" مگر میں زیادہ دیر اس پر غور نہ کر سکی۔ تھکن اور کم نیند کی وجہ سے جلد ہی میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

میں سوئی تو ایسا سوئی کہ ذیشان نے آ کر اٹھایا۔ میں نے آنکھ کھول کر اسے سرہانے کھڑا دیکھا تو شرمندہ سی ہو گئی۔

"نیند میں وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔" میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"تھکن بھی تو بہت ہو گئی ہو گی۔" ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں اس کے فقرے کے ساتھ معنی خیز مسکراہٹ سمجھی تو شرم سے لال ہو گئی۔

"چلو فریش ہو جاؤ، ہم باہر جا کر کھانا کھائیں گے۔" ذیشان نے کہا۔

"پہلے میں سلیکٹ کروں گا کہ تم نے پہننا کیا ہے۔" مجھے اٹھتا دیکھ کر ذیشان نے کہا۔

اس نے جو کپڑے میرے لیے منتخب کیے تھے، وہ بغیر آستین کی کرتی اور جینز تھی۔ مجھے وہ عجیب سی محسوس ہوئی لیکن میں نے کہا کچھ نہیں۔

میں چینج کر کے آئی تو ذیشان بھی کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے بھی خاصا اہتمام کیا تھا۔ ذیشان کے اصرار پر اس کے دلائے ہوئے میک اپ کے سامان سے میں نے لپ اسٹک بھی لگائی تھی۔ اس کا تو اصرار تھا کہ میں میک اپ کر لوں لیکن میں نے کہا۔ "میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں۔"

ہم کار میں بیٹھے تو ذیشان نے بتایا کہ اس نے تین دوستوں کو بھی مدعو کیا ہوا ہے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔

"ریاض شیخ صاحب ملک کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک ہیں، ان سے ہی وابستہ ندیم چیمہ ہیں جو اشتہارات بناتے ہیں اور کوثر صاحب ہیں جن کی پرائیویٹ پروڈکشن کی کمپنی ہے۔" ذیشان نے ان کا غائبانہ تعارف کروایا تھا۔

"میرا وہاں کیا کام؟" میں نے سوال کر دیا اور وہ ہنس دیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچاؤں گا کہ دولت کے انبار تمہارے پیروں تلے ہوں گے۔"

"مجھے نہیں چاہیے یہ شہرت۔" میں نے کہا تھا۔ میں تو اس سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے یہ شہرت اور دولت نہیں چاہیے، میں صرف تمہاری ہو کر رہنا چاہتی ہوں لیکن میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا۔

ذیشان نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹیبل بک کروا رکھی تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو کچھ دیر بعد ہی وہ لوگ بھی آنے لگے۔ سب سے پہلے ریاض شیخ آیا۔ وہ عجیب سا ناٹے قد کا آدمی تھا جس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی اور سر کے بال بھی غائب تھے۔ ذیشان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا تم نے جتنی تعریف کی تھی، یہ اس سے زیادہ حسین ہے۔

ریاض شیخ نے تعریف تو کی تھی لیکن اس کا لہجہ عجیب معنی خیز سا تھا مگر ذیشان نے اس کے جواب میں اس کا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا۔
باقی دونوں بھی کچھ دیر میں آ گئے لیکن ریاض شیخ اس میز کی جان بنا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے اچانک ندیم چیمہ کو مخاطب کیا۔
''کیا خیال ہے وہ جو سوپ کا اشتہار تم بنا رہے ہو، اس میں انہیں نہ لے لیں۔'' اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔
''اس کے لیے تو ہم ماڈل سلیکٹ کر چکے ہیں بلکہ اس سے معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔ ایک دو روز میں ہم ریہرسل بھی شروع کرنے والے ہیں۔'' ندیم نے جواب دیا۔
''چلو آئندہ کسی اشتہار میں لے لیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر جب تک کوثر نے اپنے ڈرامے میں نہیں لیا تو......'' اس کا مخاطب کوثر تھا۔
''ابھی میں نئے ڈرامے کے اسکرپٹ پر کام کر رہا ہوں۔ چانس بنا تو ضرور لوں گا۔'' اس نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی تھی۔
وہ لوگ میرے بارے میں بات کر رہے تھے لیکن مجھ سے انہوں نے کچھ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
''رانی نے سیلف گرومنگ کی کلاس جوائن کر لی ہے۔ کچھ دنوں میں آپ ان کا مختلف روپ دیکھیں گے۔'' ذیشان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ندیم نے مجھے مخاطب کیا۔
''یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے ماڈلنگ میں سیلف گرومنگ بہت کام آتی ہے۔'' اس نے کہا اور میرا دل چاہا کہ کہہ دوں۔ ''نہیں بننا مجھے ماڈل واڈل۔'' مگر میں خاموش رہی۔
ذیشان کا کہا ہوا فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''کبھی میرے کہے سے انکار نہ کرنا۔''
''تمہارا یہ نام کچھ دقیانوسی نہیں ہے...... رانی؟'' ریاض شیخ نے کہا۔
''والدین نے رکھا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا تھا۔ اس کی بات مجھے ناگوار گزری تھی۔
''نام میں کیا رکھا ہے جہاں اتنے نام تبدیل کیے ہیں ایک اور سہی۔'' ریاض شیخ نے کہا اور باقی دونوں نے اس کا ساتھ دیا۔
''ذیشان یہ سب کیا تھا۔'' کار میں بیٹھتے ہی میں نے سوال کیا۔ وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔
''میں کچھ پوچھ رہی ہوں ذیشان؟'' میں نے دوبارہ سے اسے مخاطب کیا۔
''میں سب کچھ تمہارے لیے کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور میں نے فوراً ہی کہا۔
''مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔'' مگر وہ خاموش رہا پھر اس نے موضوع ہی بدل دیا۔
''لیاقت میرے پاس آیا تھا۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ وہ آج تمہیں لینے آئے گا لیکن میں نے روک دیا۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔
''مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔'' میں نے کہا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔
''میں نے اس سے کہا کہ وہ نئے گھر میں شفٹنگ کرے رانی اسی گھر میں آئے گی۔'' اس نے جیسے اپنی بات مکمل کر لی لیکن میں اسے دیکھتی رہی تھی۔
وہ میری ذات سے متعلق ہر فیصلہ کر رہا تھا لیکن مجھ سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔
''صبح تک تمہارے نئے گھر میں نیا فرنیچر بھی پہنچ جائے گا اور میں خود تمہیں نئے گھر میں چھوڑنے جاؤں گا۔'' اس نے ایک اور فیصلہ سنایا۔
''ذیشان...... میں......'' میرے ہونٹوں سے صرف اتنا نکل سکا تھا۔
''کل ہی مجھے گاؤں جانا ہو گا بابا جان نے بلایا ہے۔'' اس نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کہا۔
''خیریت......'' میں کہنا کچھ اور چاہ رہی تھی لیکن ہونٹوں سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔
''یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا۔ ویسے بظاہر تو خیریت ہی ہے۔'' ذیشان نے کہا اور میں بھی خاموش ہو گئی اور ہوٹل پہنچنے تک خاموش ہی رہی۔
ایک بار میرے ذہن میں آیا کہ کہہ دوں کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وہاں کس حیثیت میں جا سکوں گی۔ ذیشان میرا تعارف کیا کروائے گا۔ ''یہ رانی ہے، میرے دفتر میں کام کرنے والے لیاقت کی بیوی۔ جسے اس کے شوہر نے اپنے ٹرانسفر کے لیے مجھے پیش کیا ہے اور اب یہ میری بیوی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔''
ہوٹل پہنچنے تک ذیشان بھی خاموش رہا۔ معلوم نہیں

میری طرح وہ بھی خیالوں میں بھٹک رہا تھا یا کوئی اور وجہ تھی لیکن کمرے میں پہنچ کر اس نے جب مجھے قریب کرنا چاہا تو میں پھٹ پڑی۔ ''ذیشان میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' میں نے کہا۔

''تو میں کون سا تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور میرے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

میں ذیشان کہہ کر اُس سے لپٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے آنسو نکل گئے۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم ایک سپر ماڈل اور سُپر اسٹار بن جاؤ اور تب......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تو میں خود کو روک نہ سکی۔

''تو پھر......؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس کی طرف سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔

''اخبارات میں یہ خبر آنی چاہیے کہ سُپر ماڈل رانی نے ایک سی ایس پی افسر سے شادی کر لی تا کہ ہمیں کوئی نوٹ بھی نہ کرے۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی تو میں روتے روتے اس سے لپٹ گئی۔

''اس راستے میں مشکلات بہت ہیں تمہیں بہت سے کٹھن مرحلوں سے گزرنا ہو گا۔'' وہ کہتے کہتے رکا تو میں پوچھ بیٹھی۔

''کیسے مشکل مرحلے؟'' میں نے کہا۔

''منزل حاصل کرنا ہے تو ان مرحلوں سے گزرنا ہو گا۔'' اس نے کہا اور میں اس بار اپنے اظہار کو روک نہ سکی۔

''میری منزل تو تم ہو ذیشان۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

''مجھ تک پہنچنا ہے تو میں جو کہتا ہوں، وہ مانتی جاؤ کوئی سوال کیے بغیر۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''مجھے تم چاہیے ہو اور کچھ نہیں۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔

''اور مجھے ایک سیلیبرٹی چاہیے جسے میرے ساتھ دیکھ کر لوگ جل اٹھیں۔'' اس نے مجھے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

وہ رات بھی باقی راتوں سے مختلف نہ تھی۔ ابتدائی پہر میں ہی ذیشان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا ڈرائیور روز مجھے نئے گھر سے اس گرومنگ سینٹر لے جائے گا اور چھوڑ جائے گا۔

رات کا نہ جانے وہ کون سا پہر تھا کہ میں نے اس سے کہا۔ ''ذیشان مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''میں دیکھ رہا تھا کہ تم سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔'' ذیشان نے مجھ سے پوچھ کر سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا تھا۔

''وہاں باتیں ہی کچھ اس انداز سے ہو رہی تھیں۔'' میں نے کہا۔ وہ خیال جو میرے ذہن میں آیا تھا کہ جب لیاقت مجھے لایا تھا تب بھی ذیشان نے یہی آرڈر دیا تھا لیکن اس وقت میری حالت مختلف تھی لیکن آج میں فرمائش کر کے وہی آرڈر دلوا رہی ہوں۔

''ان کی باتوں پر غور کرنے کے بجائے تمہیں ذہن میں یہ رکھنا ہو گا کہ یہی لوگ ہیں جو تمہیں شہرت کی بلندیوں تک لے جا سکتے ہیں خاص طور پر وہ ریاض شیخ۔'' ذیشان نے کہا۔

''وہ شخص جسے میرا نام بھی دقیانوسی لگا تھا۔'' میں نے کہا اور ہنسنے لگی مگر اسی وقت بیل بجی اور ذیشان نے آ رہا ہوں کہہ کر خود کو اس قابل بنایا کہ آرڈر لے سکے۔

''ریاض شیخ اس انڈسٹری کا گرو ہے۔'' ذیشان نے کہا اور میں کہتے کہتے رک گئی۔ ''مجھے تو بھالو لگا تھا۔'' مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ ذیشان، ریاض شیخ کے بارے میں منفی ریمارکس کو شاید پسند نہ کرے۔

ذیشان اس کے بعد بھی ریاض شیخ کی باتیں کرتا رہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اپنی بات کرو اور میری۔'' میں نے کہا۔

اگلی صبح میں سو رہی تھی جب ذیشان نے مجھے اٹھایا۔ ''تیار ہو جاؤ تمہیں تمہارے نئے گھر چھوڑ کر گاؤں جانا ہو گا۔'' اس نے کہا تھا۔

میں سست رفتاری سے تیار ہوتی رہی۔ ذہن میں تھا کہ ایک بار پھر لیاقت کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ذیشان کی رفتار تیز تھی۔ جیسے جانے کی جلدی ہو۔ ہم کمرے سے نکلنے والے تھے کہ ذیشان نے ایک قیمتی موبائل مجھے دیا۔ ''اس میں سم بھی ہے اور تمہاری نئی زندگی کی پہلی پہچان ہے اب تم تمام لوگوں کو یہی نمبر دو گی۔'' اس نے کہا۔

کار اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا اس لیے کار میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ خاموشی سے راستہ طے ہوا اور ہم نئے گھر پہنچ گئے۔ لیاقت وہاں موجود تھا اور ہوش میں تھا۔ اس نے ہمیں یوں گھر دکھانا شروع کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ نیا علاقہ تھا اور کم مکانات بنے ہوئے تھے۔ مکان کے دائیں جانب چار پلاٹ خالی تھے اور بائیں جانب تین پلاٹ خالی تھے۔ سامنے کی جانب بھی یہی

صورتِ حال تھی۔

مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ نیچے ایک بیڈ روم تھا اور اوپر دو بیڈ روم تھے۔ ''یہ میرا بیڈ روم ہے اور یہ تمہارا۔'' ذیشان نے اوپر آ کر کہا تھا۔ دو بیڈ رومز میں نیا اور قیمتی فرنیچر تھا۔

لیاقت کا بیڈ روم نیچے ہے۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے سنتی رہی۔

''کب تک واپس آؤ گے؟'' میں نے کہا۔

''یہاں سے سیدھا گاؤں جاؤں گا۔ میرا خیال ہے چار پانچ دن لگیں گے۔'' اس نے کہا۔

وہ زیادہ دیر رکا نہیں لیکن جانے سے پہلے اس نے ڈرائیور کو دوبارہ سے مجھے گرومنگ سینٹر لے جانے اور واپس لانے کی ہدایات دی تھیں۔

جب تک ذیشان رہا، لیاقت خاموش اور مؤدب سا رہا لیکن ذیشان کے جاتے ہی اس نے مجھے خود سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا تو وہ دور تو ہوا مگر مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔

''رانی، تم اب تک میری بیوی ہو۔'' لیاقت کا لہجہ بھی عجیب سا تھا۔

''شوہر ایسے ہوتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''جب سمجھوتا کیا ہے تو پھر پوری طرح کرو۔'' وہ بولا۔

''سمجھوتا......؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ ہوا، وہ تمہاری سازش اور میری مجبوری تھی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''وہ تو تب تھا...... اب کیا ہے؟'' اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''اب وہی ہے جو تم چاہتے تھے۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے خاموشی سے گھورتا رہا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

''تم پہلی عورت نہیں ہو جس پر ذیشان یہ عنایات کر رہا ہے۔'' لیاقت نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے اُس کے فقرے پر غور کیا تو مجھے اس کی بات غلط نہیں لگی تھی۔

''ذیشان کو چھوڑو تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کیسے مرد ہو؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''تمہارے سامنے وہ کہتا رہا کہ یہ میرا بیڈ روم ہے۔ یہ رانی کا بیڈ روم ہے اور تم خاموشی سے سنتے رہے۔'' میں نے کہا اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

''تم میرے ملتان ٹرانسفر کی بات کرو، ہم دوبارہ سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔''

میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا صرف ایک طنزیہ نظر اس پر ڈالی اور اپنا رخ پھیر لیا۔ اس سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں نے ہی تمہارے ملتان ٹرانسفر نہ کرنے کی بات کی ہے۔

''ملتان جانے میں اب میرا نقصان ہے۔'' لیاقت کچھ دیر بعد بولا تو میں نے اس کی جانب نگاہ اٹھائی۔

''باس نے میرے پروموشن کی بات کی ہے اور یہ بھی اجازت دے دی ہے کہ آنکھ بچا کر کما سکتا ہوں تو کما لوں۔'' اس نے بتایا اور مجھے حیرت ہوئی کہ ذیشان نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''لیاقت اب دیر ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ کچھ کہے بغیر دیکھتا رہا۔

''جو خواب ذیشان تمہیں دکھا رہا ہے، وہ صرف سراب ہے۔'' لیاقت نے کہا اور میں ہنس دی اس کے بعد وہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔

''یہ بیس ہزار روپے مجھے تمہاری کتابوں میں سے ملے ہیں۔'' لیاقت نے پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ میری جانب بڑھائے تھے جو ذیشان نے مجھے دیے تھے۔

''یہ میری پہلی کمائی تھی۔'' میرا لہجہ بہت ہی تلخ تھا۔

''تم چاہو تو اس میں سے اپنا حصہ رکھ سکتے ہو۔'' میرا لہجہ اور بھی تلخ ہو گیا۔

''نہیں......'' اس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا۔

''کیوں......؟'' میں نے کہا اور وہ بغیر کچھ کہے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ میری جانب اسی طرح بڑھے رہے تھے۔

''تم جیسے مرد ہم جیسی عورتوں کی کمائی میں حصے دار ہوتے ہیں لیاقت۔'' میرے لہجے میں اتنی کڑواہٹ تھی کہ وہ کڑواہٹ مجھے حلق تک میں محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ نوٹ لیے اور جانے لیے اٹھی ہی تھی کہ لیاقت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟'' اس نے کہا۔

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا صرف اپنا ہاتھ چھڑایا

اور کچن کی جانب چل دی۔

''میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی کہ لیاقت وہاں بھی آ گیا۔'' چائے میں بھی پیوں گا۔''

اس چھت کے نیچے ہمارا اتنا ہی تعلق ہو گا کہ تم بھی یہاں رہو گے۔'' میں نے اپنے لیے چائے انڈیلی۔

''اپنا رول تم سمجھ چکے ہو اس سے آگے نہ بڑھنا۔'' میں نے خبردار کیا تھا۔

''کیسا رول.....؟'' وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بول رہا تھا۔

''ذیشان جب واپس آئے گا تو اپنے بیڈ روم میں آئے گا۔'' میرا لہجہ پھر سے تلخ ہو گیا تھا۔

''وہ مجھے طلب کرے گا اور میں اس کے پاس چلی جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور لیاقت نظریں چرانے لگا۔ میں یہ کہتے ہوئے کچن کے دروازے تک آ گئی تھی۔ لیاقت اب تک کچن میں تھا۔ میں دروازے پر رکی اور لیاقت کی جانب نگاہ کی۔

''تمہارا رول یہ ہو گا کہ بیڈ روم میں ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو وہ پہنچا دو یا کوئی آ گیا تو گیٹ کھولو۔'' میں یہ کہہ کر باہر نکلی اور اوپر اپنے بیڈ روم کی جانب چل دی۔

میرے ذہن میں جو ہلچل مچی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کچھ دیر تنہائی میں رہوں۔ لیاقت کا یہ کہنا کہ ''یہ سب سراب ہے'' میرے ذہن میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

''کیا مجھے اسی طرح باقی زندگی ذیشان کی داشتہ بن کر گزارنی ہو گی۔'' یہ سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

میں نے لیاقت کے کچھ لفظوں پر بھی غور کیا کہ مجھے ملتان جا کر اس کے ساتھ دوبارہ سے زندگی کا آغاز کرنا چاہیے لیکن وہاں سے جواب نفی میں تھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر میں نے اپنی کتابیں ترتیب دینی شروع کیں جو ایک کونے میں رکھی تھیں اور پھر ان میں سے ایک ناول نکال کر پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے سو گئی۔

آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی اور بھوک بھی محسوس ہوئی۔ صبح ناشتا بھی صحیح نہیں کر سکی تھی۔ اب سے پہلے گھر میں کھانا میں ہی بناتی تھی لیکن اُس روز لیاقت کے ساتھ تلخ گفتگو کے بعد میں نے اس سے گریز کیا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر باہر آئی تو لیاقت بھی نظر نہیں آیا۔ میں کچن کی طرف جا رہی تھی کہ لیاقت ڈرائنگ روم سے نکل آیا تھا۔

''اٹھ گئیں.....؟'' لیاقت نے کہا۔ میں خاموش رہی۔

''ذیشان کے دو فون آ چکے ہیں۔ وہ تمہارے نمبر پر ڈائل کر رہے تھے لیکن جواب نہیں ملا تو مجھے کر لیا۔'' لیاقت نے کہا۔ میں اس پر بھی خاموش رہی۔

''کچھ کھانا ہے؟'' اس نے کہا۔ میں ہاں کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

''بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کے لیے لے آتا ہوں۔'' میں خاموش رہی تو وہ کچھ کہے بغیر گیٹ کی جانب بڑھ گیا اور میں خاموشی سے اُسے جاتا دیکھتی رہی۔

لیاقت چلا گیا تو میں دوبارہ سے اپنے کمرے میں آ گئی اور ذیشان کا دیا ہوا موبائل فون اٹھایا۔ ذیشان نے کالز کی تھیں۔ میں نے اس کا نمبر ملایا تو دوسری بیل پر اس نے اٹھا لیا اور کچھ کہے بغیر پہلے فقرے میں کہا۔ ''اٹھ گئیں؟''

''گہری نیند آ گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''لیاقت کہاں ہے؟'' ذیشان نے سوال کیا۔

''کچھ کھانے کے لیے لینے گیا ہے۔'' میں نے کہا جس کے جواب میں ذیشان کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''زندگی میں اگر آگے جانا چاہتی ہو تو سمجھوتے کرنے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی.......'' میں نے کہا اور وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ابھی تمہاری ترقی کا سفر شروع بھی نہیں ہوا ہے اور لیاقت کی قانونی پوزیشن یہ ہے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔'' ذیشان نے وہ بات کی تھی جس کی میں اس سے توقع نہیں کر رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ یوں لیاقت کو جھڑکنے پر وہ خوش ہو گا لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔

''جب کسی مقام پر پہنچ جاؤ اور کوئی اسکینڈل بنے تو وہ فائدہ مند ہوتا ہے لیکن اس موقع پر کوئی اسکینڈل تمہارا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ختم کر دے گا۔''

''کیسا اسکینڈل......؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکی۔

''لیاقت اگر کورٹ میں چلا گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''اس میں اتنی ہمت نہیں......'' میں نے کہا لیکن اس

نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔
''یہی میں کہہ رہا ہوں کہ اس سے ایسا رویہ نہ رکھو کہ وہ دیوار سے لگ جائے۔'' ذیشان نے مجھے سمجھایا۔
''میں ابھی ذیشان سے بات کر رہی تھی کہ مجھے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے ذیشان سے کہا تو اس نے کہا۔ اپنا رویہ کم سخت رکھنا ایسا نہ کرنا کہ وہ دیوار سے لگ جائے۔ میں نے اگر اسے کچھ رعایت دی ہے تو اسی لیے دی ہے۔
لیاقت کھانا لے کر آیا تو میں نیچے اتر آئی۔ وہ میز پر کھانا لگا چکا تھا۔ ہم نے کھانا شروع کیا تو میں نے پوچھا۔
''تم نے ذیشان سے میری شکایت کی ہے؟''
''شکایت نہیں کی صرف دوبارہ سے ملتان ٹرانسفر کی بات کی تھی اور یہ کہا تھا کہ لاہور میں رہا تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔'' لیاقت نے کہا۔
اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''جو کچھ ہوا ہے لیاقت اس میں میرا قصور کیا ہے؟'' میں نے کہا۔
''میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمام قصور میرا ہے لیکن مجھے تلافی کا تو حق ہے۔'' اس نے کہا تھا۔
''میں سب کچھ بھول کر دوبارہ سے اپنی زندگی کو پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے کہا اور میں اسے دیکھتی رہی۔
''میں چاہوں بھی تو یہ سب نہیں بھول سکتی۔'' میں نے سخت انداز میں کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ذیشان کے کہے لفظ یاد آ گئے۔
''کم از کم اتنی جلدی نہیں بھول سکتی۔'' میں نے فقرہ مکمل کیا لیکن لیاقت پر اس کا خاص اثر نہیں ہوا۔
''جو راستہ ذیشان تمہیں بتا رہا ہے، اس پر اتنا آگے نہ چلی جانا کہ واپسی کا راستہ نہ ملے۔'' لیاقت نے کہا۔
''یہ راستہ تم نے ہی میرے لیے منتخب کیا ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ لیاقت میرے ساتھ اٹھ کر ساتھ آنا چاہتا ہے لیکن پھر اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنی جگہ پر ہی رہا۔
''میں اپنے کمرے میں آئی تو ذہن مختلف زاویوں پر سوچتا رہا۔ سب سے زیادہ ذیشان کی باتوں نے پریشان کیا ہوا تھا۔
''وہ تمہارا قانونی شوہر ہے۔'' اس کے الفاظ ذہن میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

''تو کیا پھر سے اُس کے ساتھ وہی زندگی گزارنا شروع کر دوں...... کیا میں گزار سکتی ہوں...... میں وہ سب کیسے دوبارہ سے شروع کر سکتی ہوں۔''
وقت گزرتا رہا مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ سورج کب ڈھلا، اندھیرا کب پھیلا نہیں جان سکی تھی۔ اس وقت احساس ہوا جب لیاقت نے آ کر بلب جلانے کے لیے بٹن دبایا۔
''کچھ لے آؤں یا باہر جا کر کھائیں گے؟'' لیاقت نے سوال کیا۔
''میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں کچھ لے آتا ہوں۔'' اس نے پیشکش کی لیکن میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''میں دودھ پی کر سو جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور لیاقت کچھ لمحے رکنے کے بعد چلا گیا۔
لیاقت کو گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ذیشان کا فون آیا۔ میرا حال پوچھنے کے بعد اس نے لیاقت کے ساتھ رویہ نرم رکھنے کی بات کی تو میں کہے بغیر نہیں رہ سکی۔
''میں جتنا رویہ نرم کر سکتی تھی نرم رکھ رہی ہوں ایک ساتھ میں سب کچھ نہیں بھول سکتی۔'' میں نے کہا اور ذیشان کچھ دیر خاموش رہا۔
''دو چار دن کی بات ہے، میں آ کر سب ٹھیک کر لوں گا۔'' اس نے کہا۔
ہماری گفتگو زیادہ دیر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ گاؤں تو پہنچ گیا تھا مگر اس وقت تک لاعلم تھا کہ اسے کیوں بلوایا گیا تھا۔ ایک بات وہ دوپہر میں نہیں کر سکا تھا۔ وہ اس نے بطور خاص کی تھی۔ ''تمہیں گھر چھوڑنے کی جلدی میں وہ رقم دینا بھول گیا تھا جو تمہارے لیے رکھی تھی۔''
''تم آ جاؤ بس......'' میں نے کہا۔
''ڈرائیور تمہیں صبح لینے آئے گا اس کو میں نے رقم دے دی ہے۔'' ذیشان نے کہا اور میں خاموش رہی۔
ذیشان نے بات ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر لیاقت کے ساتھ نرم رویہ رکھنے کی بات کی تو میں اس پر بھی خاموش رہی تھی۔
لیاقت میرے لیے دودھ لے کر آیا تو وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھنا چاہا مگر میں نے نیند آنے کا بہانہ کیا۔ اس نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ ''تم بہت بدل گئی ہو۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا لیکن میں خاموش رہی۔

لیاقت کے جانے کے بعد میں نے لائٹ تو آف کر دی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا۔ میں نیچے گئی تو لیاقت سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے شراب کی بوتل رکھی تھی۔ میں چائے لے کر بیٹھی ہی تھی کہ وہ اٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔

''چائے بناؤں تمہارے لیے؟'' میں نے کہا۔ میرے ذہن میں ذیشان کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''نرم رویہ رکھو۔''

''نہیں میں بنا لوں گا۔ دفتر سے بھی لیٹ ہو رہا ہوں۔'' اس نے ایک ساتھ دو باتیں کی تھیں۔

''تم تیار ہو جاؤ میں چائے بناتی ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ تیار ہونے چلا گیا۔

لیاقت تیار ہو کر ابھی چائے پی رہا تھا کہ ذیشان کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے لیاقت کو گرومنگ سینٹر کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

''یہ چابیاں ہیں۔'' اس نے روانہ ہونے سے پہلے کہا اور چابیاں دے کر چلا گیا۔

میں تیار ہو کر آئی تو ڈرائیور کو انتظار کرتے ہوئے پایا۔ ہم روانہ ہوئے اور کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ڈرائیور نے کہا۔ ''ڈیش بورڈ میں لفافہ ہے صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو دے دوں۔''

میں نے لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا جہاں ذیشان کے دیے ہوئے بیس ہزار بھی رکھے ہوئے تھے۔

گرومنگ سینٹر میں کیا ہونا تھا اور مجھے کیا کرنا تھا، مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن پہلے ہی دن مجھے اندازہ ہوا کہ میں جتنا آسان سمجھ رہی تھی، اتنا آسان نہیں ہے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ صرف کھانے کا وقفہ ہوا تھا۔ پہلے ایک گھنٹے تو اس میں خرچ ہوا تھا کہ وہ میرا انٹرویو لیتی رہی تھیں۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز انگریزی میں کیا تھا اور میری انگریزی سن کر مجھے انگریزی کی کلاسوں سے استثنا دے دیا تھا۔

میری سینٹر سے واپسی ہو رہی تھی کہ ذیشان کا فون آ گیا۔ ''کیسا گزرا پہلا دن؟'' اس نے سوال کیا۔

''بہت مصروف لیکن بہت کچھ سیکھا۔'' میرا جواب تھا۔

جتنی جلدی یہ سیکھ لو گی اتنا ہی تمہارے لیے بہتر ہو گا۔'' ذیشان نے کہا۔

گفتگو کا اختتام اس نے ایک بار پھر لیاقت سے نرم رویہ رکھنے پر کیا لیکن میں کچھ کہہ نہ سکی کیونکہ میں ڈرائیور کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

گھر پہنچی تو لیاقت گھر پر نہیں تھا مگر کچن میں سامان رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لیاقت گھر آیا تھا اور پھر گیا تھا۔ میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کچن میں جانے کا دل ہی نہیں چاہا لیکن کچھ سوچ کر میں نے کھانا بنانا شروع کر دیا۔ کھانا بن گیا مگر لیاقت نہیں پہنچا پھر میں نے اکیلے ہی کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک بار خیالات کی رُو تھی جو کبھی ایک جانب دھکیلتی تھی کبھی دوسری جانب اور میں ان میں بہتی جا رہی تھی کسی منزل پر پہنچے بغیر۔ ایک خوف تھا گھر میں اکیلے ہونے کا جس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

نیند کی وادی... میں ابھی پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چونکی اور سیڑھیوں تک آئی تو لیاقت آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی لڑکھڑاتی ہوئی چال بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں تھا۔ میں کمرے میں واپس آئی تو وہ اوپر چلا آیا۔

''تمہارا فون بند تھا۔ میں فون کرتا رہا تھا۔'' اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔

''تم پرانے نمبروں پر ڈائل کرتے رہے ہو گے۔ میرا نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کب کیا تبدیل؟'' اس نے سوال کیا۔

''جب سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے تو نمبر بھی تبدیل کر لیا۔'' میں نے جواب دیا اور وہ کچھ کہے بغیر واپس ہو گیا۔

میں نے پرانا فون نکالا اور دیکھا تو لیاقت کی کالز موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کا فون نمبر بھی مس کال میں تھا۔ میں نے پہلے سوچا کہ انہیں ڈائل کر لوں لیکن گھڑی کی جانب دیکھا تو اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ وہ جلد سونے اور جلد جاگنے والوں میں سے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ذیشان رات میں ڈائل کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تو میں سونے کی کوشش کرنے لگی اور پھر سو گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو سرہانے لیاقت موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ میں نے چائے لی اور وہ سامنے بیٹھ گیا۔ ''مجھے ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں کل بھی لیٹ ہو گئی تھی۔'' میں نے بہانہ کیا مگر وہ بیٹھا رہا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے کیا سوچا؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ غیر ضروری سوال نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ

مجھے کچھ کہے بغیر دیکھتا رہا۔

''تمہیں پروموشن چاہیے اور وہ میں دلوا سکتی ہوں اور تم بھی یہی چاہتے ہو گے کہ جلد سے جلد تمہارا پروموشن ہو جائے۔'' میں نے کہا ..... میں نے نہیں چاہا تھا کہ میرا لہجہ تلخ ہو جائے لیکن نہ چاہنے کے باوجود لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا گیا۔

میں خاموش ہوئی تو لیاقت نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''تم ذیشان کو اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو کہ وہ مجھ پر لاکھوں روپے یونہی ضائع کر رہا ہے؟'' میں نے سوال کیا جس کا جواب فوری طور پر نہ دے سکا۔

''کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' لیاقت نے کچھ دیر بعد کہا۔

''کہنا یہ چاہ رہی ہوں کہ جس طرح میں حالات سے سمجھوتے کر رہی ہوں، تم بھی سمجھوتا کر لو۔'' میں نے کہا لیکن وہ سمجھ نہ سکا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے اپنے چہرے پر ابھرنے والے سوالوں کو الفاظ کی شکل دی تھی۔

''اگر اس نے پروموشن کا وعدہ کیا ہے اور تمہیں رشوت لینے کی آزادی دی ہے تو اس کو غنیمت جانو اور وہ خواب دیکھنا چھوڑ دو جنہیں تم نے خود کرچی کرچی کر دیا ہے۔'' میں نے کہا اور لیاقت خاموشی سے سنتا رہا۔

''میں چاہتا تھا کہ جس طرح میرے خواب ٹوٹے ہیں اس طرح تمہارے خواب بھی نہ بکھریں۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھے سمجھانا چاہ رہا ہو۔

''میرے کوئی خواب نہیں ہیں تو بکھرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

لیاقت وہاں سے چلا گیا لیکن میں کمرے میں ہی رہی تھی۔ اب اس سے تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ خواب تو میں نے دیکھنا شروع کیا تھا لیکن ابتدا میں ہی وہ خواب ٹوٹ گیا تھا۔ جس رات ذیشان نے مجھے ریاض شیخ اور اس کے ساتھیوں سے ملوایا تھا اسی روز اپنے طور پر میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میرے نصیب میں مسز ذیشان بننا نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص اپنی ہونے والی بیوی کے حسن کی تعریفیں غیر مردوں سے کروائے۔ میں نے اس پر جتنا غور کیا اتنا ہی مجھے یقین آتا چلا گیا۔ بہرحال لیاقت اور ذیشان دو مختلف شخصیات تھیں۔ اس نے مجھے خواب دکھائے ضرور تھے لیکن میں ہوشیار ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے چاہتا کیا ہے۔ لاکھوں روپے مجھ پر خرچ کرنے کے پیچھے اس کا مقصد کیا ہے۔

خیال کی رُو میں بہتے ہوئے میں تیار ہوئی۔ ایک روز پہلے حاصل کیا ہوا میک اپ کا ابتدائی سبق خود پر دہرایا اور ذیشان کا دلوایا ہوا نیم مغربی لباس پہنا۔ ڈرائیور کے ساتھ گرومنگ سینٹر پہنچی اور پھر ایک روز قبل کی طرح مصروف ہو گئی۔ شام میں اس وقت وہاں سے نکلی جب سب جا چکے تھے۔ میں کم سے کم لیاقت کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں رک کر تِکا کباب وغیرہ لیے کیونکہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔

لیاقت گھر پر تھا۔ اس نے مجھے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ میں نے کھانا لگایا تو اس نے کہا تم کھا لو میں کچھ دیر بعد کھا لوں گا۔ میرا اندازہ تھا اب وہ شراب کا شغل کرے گا اور پھر کھانا کھائے گا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں آ گئی اور ناول نکال لیا۔ مجھے اچانک احساس ہوا تھا گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ وہ پرانا ٹی وی جو پرانے گھر سے شفٹ ہوا تھا، وہ لیاقت نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

دن بھر ذیشان سے بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے ڈائل کیا مگر دوسری جانب سے اٹھایا نہیں گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے نمبر ملائے لیکن وہاں سے جواب نہیں آیا۔ صبح اسی طرح اٹھی اپنا اور لیاقت کا ناشتا بنایا اور تیار ہو کر چل دی۔ دو بار ذیشان کو بھی ٹرائی کیا لیکن وہاں سے بھی وہی حال رہا۔ واپسی پر میرا خیال تھا کہ کھانے کے لیے کچھ لوں لیکن اس وقت ذیشان کا فون آ گیا۔

''کہاں ہیں آپ؟ کل سے فون کر رہی ہوں۔''

''کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا اور اب اسلام آباد

جلیبی

ایک اطالوی سیاح نے کراچی کے برنس روڈ پر جلیبیاں دیکھیں تو بہت حیران ہوا اور کچھ خرید کر اپنے ساتھ اٹلی لے گیا۔ وہاں اس نے جلیبیاں اپنے ایک محقق دوست کو دیں اور کہا۔ ''ذرا یہ سراغ لگاؤ کہ اتنی پتلی اور پُر پیچ نلیوں میں گاڑھا شیرہ کیسے پہنچایا گیا ہوگا؟''

دوست نے پوچھا۔ ''پاکستان سے لائے ہو؟''

اثبات میں جواب ملتے ہی محقق نے اپنی دراز سے ایک تھیلی نکال کر اس کے سامنے الٹ دی اور بولا۔ ''میں پریشان ہوں کہ اس بند تکون میں آلو کہاں سے ڈالے گئے ہوں گے۔ وہ لوگ اسے سموسہ کہتے ہیں۔''

حیدرآباد سے علی زاہد کا تعاون

کے لیے نکل رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''تم کہہ رہے تھے دو تین دن میں آ جاؤں گا۔'' میں نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔
''پروگرام تو یہی تھا مگر بابا جاتے ہوئے کہہ گئے کہ اسلام آباد پہلے پہنچو۔'' ذیشان نے کہا۔
''اب اور کتنے دن......؟'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔
''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بغیر خوش ہوں؟'' اس نے کہا اور میں خاموش رہی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں شرما جاتی۔ شرم سے لال ہو جاتی لیکن اب ایسا نہیں ہوا۔ ذیشان سے گھر پہنچنے تک گفتگو ہوتی رہی۔ وہ گرومنگ سینٹر کے حوالے سے سوال کرتا رہا اور میں جواب دیتی رہی۔ لیاقت کے بارے میں نہ اس نے کوئی سوال کیا اور نہ میں کچھ بولی تھی۔
گھر پہنچنے کے بعد میں کھانا پکانے کے لیے کچن میں تھی۔۔۔ ابھی میرا کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ لیاقت آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں لایا تھا اور آتے ہی اس نے کہا۔ ''بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''
میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور چولھے بند کر دیے اور لیاقت کے لائے ہوئے کھانے کو میز پر لگا دیا۔
''آج دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھا سکا تھا۔'' لیاقت نے کہا پھر اس نے تفصیل بھی بتائی۔ میں زیادہ متوجہ نہ رہی۔
''ایک کام کے آج میں نے سب سے زیادہ پیسے کمائے ہیں۔ پورے ایک لاکھ۔'' اس نے تفصیل بتائی اور میں اس پر صرف ایک نظر ڈال کر رہ گئی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ سننے کے موڈ میں تھا لیکن میں خاموش رہی۔
اس کے بعد کا پورا ہفتہ اسی طرح گزرا۔ میں صبح نکل جاتی۔ لیاقت اور میں آگے پیچھے گھر پہنچتے تھے۔ وہ کھانا لے آتا کبھی میں کچھ پکا لیتی۔ ذیشان سے روز بات ہوتی تھی لیکن کچھ تفصیل سے نہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد بھی اس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد میں ہیں لیکن کام نہیں ہو رہا تھا۔
اسی معمول میں اس روز فرق آیا جب میرے فون پر ندیم چیمہ کا فون آیا۔ اس نے اپنے تعارف میں اس میٹنگ کا حوالہ دیا جو ریاض شیخ کے ساتھ ہوئی تھی۔
''آپ کا فوٹو شوٹ کرنا ہے۔'' اس نے کہا اور میں جی کہہ کر رہ گئی۔ میں جانتی تھی کہ فوٹو شوٹ میں ہوتا کیا ہے۔

رات میں نے ذیشان صاحب سے بات کی تھی انہوں نے ہی یہ نمبر دیا تھا۔'' ندیم نے کہا تھا۔
''میری بات نہیں ہو سکی تھی۔'' میرے پاس اس سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ اس لیے وہ بھی کچھ دیر خاموش رہا تھا۔
''رات جب میں نے فون کیا تب بھی وہ ڈنر پر اپنے والد کے ساتھ تھے۔ اس لیے معروفیات میں فون نہیں کر سکے ہوں گے۔'' اس نے کہا لیکن میرے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں تو میں کیا کہتی اس لیے خاموش رہی تھی۔
''پرسوں تین بجے آپ کو شوٹ کے لیے آنا ہوگا۔'' اس نے کہا تھا۔
''جی بہتر......'' میں نے اتنا کہہ کر خود کو روک لیا تھا۔
میرے ذہن میں یہ تھا کہ جب ذیشان سے اس کی بات ہو گئی ہے اور اس نے میرا فون نمبر بھی انہیں دیا ہے تو یقینی طور پر اس کی اس میں رضامندی شامل تھی۔
''میں آپ کو اسٹوڈیو کا ایڈریس بھیج دوں یا آپ کو گاڑی چاہیے ہوگی؟'' اس نے مجھے خاموش دیکھ کر سوال کیا تھا۔
''آپ ایڈریس بھیج دیں۔'' میں نے کہا اور وہ بھی ''جی بہتر'' کہہ کر رہ گیا۔
''میں بے چینی سے ذیشان کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ ایک بار اس کے فون پر ڈائل بھی کیا لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔
''ہم اس وقت لنچ پر تھے۔ جب ذیشان کا فون آیا تھا۔ اس نے ہیلو ہی کہا تھا کہ میں نے ندیم چیمہ کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا۔
''میری رات اُس سے بات ہوئی تھی اور میں نے ہی اسے فون نمبر دیا تھا لیکن جب سے بابا کے ساتھ ہوں اس لیے مبارک باد بھی نہیں کہہ سکا۔'' اس نے کہا۔
''مبارک باد کس بات کی؟'' میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔
''تمہارا فوٹو شوٹ ہو رہا ہے تمہارے پہلے اشتہار کے لیے اور تم کہہ رہی ہو کہ مبارک باد کس بات کی؟'' اس نے کہا۔
''میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہوں اور تم بھی یہاں نہیں ہو کہ کچھ بتا سکو۔'' میں نے کہا۔
''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔'' ذیشان نے مجھے سمجھانا شروع کیا تھا۔

''دو تین اچھے جوڑے ساتھ لے جانا۔ باقی کا انتظام وہ خود کرلیں گے۔'' ذیشان نے تفصیل بتائی۔
''وہ کار بھیجنے کی بات کر رہے تھے۔'' میں نے کہا تو ذیشان نے میری بات درمیان سے اچک لی تھی۔
''میں ڈرائیور کو سمجھا دوں گا تمہیں جس وقت جانا ہو گا۔ وہ اس سے پہلے آجائے گا اور پھر تمہارے ساتھ ہی رہے گا۔'' ذیشان نے کہا تھا۔
''اور وہاں کتنی دیر لگے گی؟'' میں نے سوال کیا۔
''چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔'' ذیشان کا جواب تھا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم اس لیے پریشانی تھی۔'' میں نے کہا۔
''پہلی بار ہر کام مشکل محسوس ہوتا ہے۔ بعد میں یہی مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔'' ذیشان نے کہا اور مجھے لیاقت کا فقرہ یاد آگیا۔

''پہلی بار کرنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ دوسری بار جھجک کم ہو جاتی ہے اور پھر عادی ہو جاتے ہیں۔''
''ندیم نے تمہیں بتایا نہیں ہوگا۔'' ذیشان نے بتانا شروع کیا۔

''جس ماڈل کے ساتھ انہوں نے شوٹ کرنا تھا وہ دو بار تاریخ دے کر ہٹ گئی اب معلوم ہوا ہے کہ وہ لندن چلی گئی ہے اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اشتہار تمہارے ساتھ شوٹ کیا جائے۔'' ذیشان نے بتایا۔
ایک عجیب سی خوشی مجھے محسوس ہوئی تھی لیکن اس فقرے کے ساتھ میں نروس بھی ہوئی تھی۔

مشہور برانڈ کا اشتہار ہے اس لیے یقین ہے کہ تم پہلے ہی اشتہار سے ہٹ ہو جاؤ گی۔'' ذیشان نے کہا اور میں مزید نروس ہوگئی۔
میں نے گرومنگ سینٹر پر اس کا ذکر کیا تو ہر طرف سے مبارک باد کا شور بلند ہوا تھا۔
''بہت لکی ہو تم۔'' یہ فقرہ اس روز کئی بار سننے کو ملا تھا۔
''میں کتنی خوش قسمت ہوں، یہ تم لوگوں کو کیا بتاؤں۔'' میں یہ فقرہ کہہ نہیں سکی تھی لیکن جب بھی مجھے لکی کہا گیا، میں نے دل میں یہ فقرہ دہرایا ضرور تھا۔ اس سے اگلے روز میں گرومنگ سینٹر گئی تھی لیکن جس روز فوٹو شوٹ کے لیے جانا تھا، میں نے چھٹی کی تھی۔ ذیشان کی ہدایت کے مطابق میں کپڑے پیک کرنے لگی تو لیاقت نے سوال کر دیا۔
''کہیں باہر جا رہی ہو؟''
''فوٹو شوٹ ہے آج میرا تین بجے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا اس لیے مجھے اس کے تاثرات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اس کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔
''تو تم نے اپنے لیے نئی راہ چن لی ہے؟'' وہ کچھ دیر بعد بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔
''کیا کروں......؟'' میں نے جواب دینا شروع کیا۔ ''کوئی تو راہ جینے کی تلاش کرنی ہی تھی۔'' میں نے اس بار بھی اس کی جانب دیکھا نہیں تھا۔
''میں تمہیں روکنے کا حق کھو چکا ہوں مگر......'' اس نے آہستہ لہجے میں کہا تھا مگر فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔
اپنا فقرہ مگر پر چھوڑ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔
میں خاموشی سے اپنی تیاریاں مکمل کر رہی تھی اور لیاقت اتنی ہی خاموشی سے یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔
''میں ساتھ چلوں؟'' اس نے اس وقت کہا جب میری تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں اور میں ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھی۔
''کیا کرو گے ساتھ چل کر؟'' میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا اگرچہ میں کہنا چاہتی تھی کہ ''میری عزت کی حفاظت کرنے کا حق تو تم نے خود ختم کیا ہے۔''
مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ لیاقت تیار ہونے کے باوجود دفتر نہیں جا رہا تھا، صرف خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔
ڈرائیور آیا تو میں اس کے ساتھ نکل آئی تھی۔ وہاں پہنچی تو میرا انتظار ہو رہا تھا اگرچہ میں وقت سے پہلے آ گئی تھی۔ ندیم ابھی نہیں پہنچے تھے مگر میک اَپ کے لوگوں نے میرا میک اَپ شروع کر دیا۔ وہ دو تھیں اور اپنے کام میں ماہر دکھائی دیتی تھیں لیکن ساتھ ہی ان کی زبان بھی اسی تیزی سے چل رہی تھی۔
''مجھے اس پروفیشن میں بیس سال ہو گئے ہیں، بہت سی ماڈلز کو پہلی بار کے لیے تیار کیا ہے لیکن آپ ان سب میں منفرد ہیں۔'' ایک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''جب آپ مشہور ہو جائیں تو ہمارے چہرے یاد رکھنا۔'' دوسری نے لقمہ دیا۔
ندیم آئے...... دو تین ہدایات دیں اور چلے گئے۔ مجھ

سے صرف اتنا کہا کہ اسی طرح وقت کی پابندی کروگی تو جلد اوپر جاؤ گی۔

ان دونوں نے مجھ پر کافی وقت خرچ کیا تھا لیکن جب آئینے کے سامنے پہنچی تو میں حیران رہ گئی۔ ''واقعی یہ میں ہوں؟'' میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

اس جگہ پہنچی جہاں وہ شوٹ کرنا تھا تو پہلا فقرہ کانوں میں پڑا وہ کیمرامین نے کہا تھا۔

''سر...... وقت ضائع کررہے ہیں ڈائریکٹ ٹیک لے لیں۔ یہ پرفیکٹ ہیں۔'' ان کے مخاطب ندیم چیمہ تھے لیکن میں یہ سن کر شرما گئی۔

''فوٹوشوٹ رات بارہ بجے تک چلا تھا اس دوران میں نے مختلف ڈریس تبدیل کیے۔ دو بار میک اَپ بھی تبدیل ہوا۔ کانوں میں پیک اَپ کی آواز آنے تک میں تھکن سے نڈھال ہو چکی تھی۔

''رزلٹ دو دن بعد آئیں گے آپ چاہیں تو پرسوں آکر دیکھ لیجیے گا لیکن میری جانب سے ڈن ہے۔ ریاض صاحب دیکھیں کیا کہتے ہیں۔'' ندیم چیمہ نے کہا۔

''ریاض صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے ندیم سے اس وقت سوال کیا تھا جب ہم سب کھانے کی میز پر تھے۔

''دبئی میں ہیں پرسوں تک ہی آئیں گے۔'' ندیم کا جواب تھا۔

کھانے کے دوران اس نے انکشاف کیا کہ مجھے منتخب کرنے میں اس کی انا بھی شامل ہے جو ماڈل.... اسے وقت دے کر ٹالتی رہی تھی اسے وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ایک نئے چہرے کو اس کی جگہ لے کر وہ اسے سبق سکھانا چاہتا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں پوچھتی کہ وہ اچانک لندن کیوں چلی گئی تو اس نے ایک اور انکشاف کیا۔

''شک تو ہمیں پہلے سے تھا۔ اس نے ایک بڑے سرمایہ دار کا نام لے کر کہا تھا کیونکہ اپنی ہر پروڈکٹ میں اسے ہی لیتا تھا۔ کئی بار شوٹنگ پر آیا تھا پھر یہ اطلاعات بھی ملی تھیں کہ وہ اکثر اس کے فلیٹ میں بھی پایا جاتا ہے لیکن یوں اچانک وہ اس سے شادی کرلے گی اس کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔''

''واپس تو آئیں گی؟'' میں نے سوال کیا لیکن ندیم کی گردن نفی میں ہل گئی۔

''سنا یہی ہے کہ اب وہ لندن میں ہی رہے گی وہاں اس نے فلیٹ بھی خرید لیا ہے۔''

ندیم اس کے بعد بھی بہت کچھ کہتا رہا مگر میرے ذہن پر ذیشان نے قبضہ کرلیا تھا۔ مجھے ذیشان کے الفاظ یاد آنے لگے تھے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اخبارات میں یہ خبر آئے کہ مشہور ماڈل نے ایک سی ایس پی افسر سے شادی کر لی ہے۔''

خوابوں کے وہ دیے جنہیں میں بجھا چکی تھی، ایک بار پھر روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔

گھر پہنچی تو لیاقت اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اپنے کمرے میں آ گئی، آنکھوں میں خواب پھر سے آن بسے تھے۔ جاگتی آنکھوں سے پھر ان خوابوں کو دیکھتی رہی اور ان خوابوں کو دیکھتے دیکھتے سو گئی۔

آنکھ کھلی تو دبیز پردوں میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ میں اٹھنے سے پہلے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ لیاقت نے دروازے پر آکر جھانکا اور مجھے جاگتا دیکھا تو وہیں کھڑا رہا۔ میں نے کچھ نہ کہا تو اس نے ہی مخاطب کیا۔ ''ڈرائیور آیا ہے تمہیں لینے۔''

''اس سے کہو تیار ہو کر آتی ہوں۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ایک دل چاہا کہ دن بھر لیٹ کر تھکن دور کروں پھر سوچا ایک روز پہلے ہی چھٹی کرلی ہے اس لیے جانا چاہیے۔

چائے بنانے کچن کی طرف جانے لگی تو لیاقت دفتر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

''رات بہت دیر سے آئی تھیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں تین بج گئے تھے۔'' میں نے کہا اور کچن میں گھس گئی۔ لیاقت ایک لمحے کے لیے کچن کے دروازے پر کھڑا رہا پھر بغیر مخاطب کیے گیٹ کھول کر چلا گیا۔

''سوری تمہیں انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

''ہماری تو ڈیوٹی ہے جی۔'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

میں نے ذیشان کا نمبر ڈائل کیا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں بار بار نمبر ڈائل کرتی رہی لیکن بیل ہوتی رہی، کسی نے اٹھایا نہیں۔

گرومنگ سینٹر پہنچی تو لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ ہر کوئی فوٹوشوٹ کے بارے میں... معلوم کرتا رہا اور میں جواب دیتی رہی۔

لنچ سے کچھ دیر پہلے ذیشان کا فون آیا لیکن اس نے

زیادہ دیر بات نہیں کی صرف فوٹو شوٹ کے بارے میں چند باتیں کیں اور کہا تفصیل آکر معلوم کروں گا۔

''مگر آؤ گے کب......؟'' میں نے کہا۔ میرے لہجے میں وہ خواب اتر آئے تھے جو میں نے پھر سے دیکھنے شروع کردیے تھے۔

''بہت جلد......'' اس نے کہا۔

ذیشان سے بات کرنے کے بعد میرا دل وہاں نہیں لگ رہا تھا لیکن میں وقت گزارتی رہی۔ فارغ ہو کر گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تو رات کی تھکن نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ گھر جاتے ہی بستر پر لیٹ کر آرام کروں گی۔ گھر میں داخل ہوئی تو لیاقت سامنے ہی نظر آ گیا تھا۔

''باس اوپر ہیں۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا اور میں مزید کچھ سنے اوپر کی جانب بھاگ گئی۔ ذیشان بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گیا اور آگے بڑھ کر اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

''سرپرائز پسند آیا؟'' اس نے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

''بہت بُرے ہیں آپ۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے اور قریب ہو گئی۔

وہ مجھے لے کر بستر پر دراز ہو گیا اور مجھ سے فوٹو شوٹ کی تفصیلات معلوم کرتا رہا۔ ہم دیر تک اس طرح لیٹے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔

''ندیم سے میری بات ہوئی تھی، وہ بہت مطمئن تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آج یا کل کسی وقت ریاض شیخ آئیں گے تو فائنل ہو گا۔'' ذیشان نے بتایا۔

ریاض شیخ کا نام آیا تو اس کا تصور بھی ذہن میں آیا اور مسکرا دی۔ ''بڑی سی توند اور گنجے سر والا ریاض شیخ فائنل کرے گا۔'' میں نے سوچا۔

ذیشان نے میری مسکراہٹ کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن میں نے ٹال دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ذیشان، ریاض شیخ کی برائی پسند نہیں کرتا۔

''ایک بار ریاض شیخ نے فائنل کر دیا تو تمہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' ذیشان نے وہ بات دہرائی تھی جو وہ اس سے پہلے بھی کرتا رہا تھا۔

''ریاض شیخ کو چھوڑو اپنی بات کرو کہ کہاں اتنے مصروف رہے؟'' میں نے کہا مگر ذیشان نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔

''میں یہ بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارا مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی طور پر ناراض نہیں کرنا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''اچھا بابا نہیں لگاؤں گی ناراض تم تو ناراض مت ہو۔'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کے لیے منگوا لیتے ہیں۔'' ذیشان نے کہا تو مجھے یہ سوچ کر وحشت ہوئی کہ ایک میز پر لیاقت اور ذیشان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہو گا۔

''باہر نہ چلیں۔'' میں نے فرمائش کی۔

ذیشان نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور منظوری دے دی۔ ''تیار ہو جاؤ۔''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے خود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ دیکھنا ہے کہ تم نے گرومنگ سینٹر سے کچھ سیکھا بھی۔'' اس نے کہا اور میں ہنس دی تھی۔

''تمہیں اپنی بات منوانا آتا ہے۔'' میں اُس کے پاس سے اٹھ آئی تھی لیکن جب میں چینج کر رہی تھی۔ جب آئینے کے سامنے میک اَپ کر رہی تھی میرا ہی فقرہ میرے کانوں میں گردش کرتا رہا تھا۔ اسے واقعی اپنی بات منوانا آتی تھی۔ جو چاہتا تھا حاصل کر لیتا تھا اس کے لیے راستہ بھی خود ہی نکالتا تھا۔

میں اپنے روم سے تیار ہو کر آئی تو ذیشان بھی چینج کر چکا تھا۔

''تم نے بھی چینج کر لیا۔'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

میں پوچھنا یہ چاہ رہی تھی کہ تم نے چینج کیسے کر لیا لیکن بوکھلاہٹ میں کچھ اور سوال کر بیٹھی لیکن ذیشان میرا سوال سمجھ گیا۔

''میرا بیگ میرے ساتھ ہے۔'' اس نے مجھ پر ستائشی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''اور تم کیا سمجھ رہی ہو، میں تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں نظریں چُرانے لگی۔

میرے نیچے اترنے سے پہلے اس نے ڈرائیور کو اپنی گاڑی دی اور اسے گھر جانے کو کہا اور پھر ہم اس گاڑی میں بیٹھ گئے جو میرے استعمال میں تھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے لیاقت سے صرف اتنا کہا۔ ''ہمیں آتے ہوئے کچھ دیر لگے گی۔''

''شکر ہے اس نے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔'' میں نے اس وقت کہا جب کار کچھ آگے بڑھ گئی۔ میری بات سن کر ذیشان ہنسنے لگا۔

''ہم کہتے بھی تو وہ ساتھ نہ چلتا۔'' اس نے ہنسی کے دوران کہا۔

''تمہارے گھر آتے ہی پہلے میں نے اسے ڈانٹ پلائی تھی کہ میں نے اسے نظر بچا کر رشوت لینے کو کہا تھا مگر وہ تو دھڑلے سے کام کر رہا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''ڈانٹ پلانے کے بعد میں نے اس کے شغل کی دو بوتلیں اس کے حوالے کی تھیں تو اب اسے کھانے کی کیا فکر۔'' اس نے کہا اور میں کار کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

ذیشان نے ایک فائیو اسٹار کو پسند کیا تھا۔ ہم ہال میں داخل ہوئے تو بہت سی نظریں ہم پر جم گئیں۔ ذیشان اس دوران چل رہا تھا تو کچھ ایسا تھا کہ اس نے ان نظروں کو محسوس نہ کیا ہو مگر پہلی بار میں نے محسوس کیا تھا کہ ذیشان ان نظروں سے خوش ہے۔ اس نے ٹیبل بھی وہ منتخب کی جس پر ہر آنے والے کی نظر پڑے۔

میں ان نظروں سے نروس ہو رہی تھی اس لیے کھانا بھی صحیح نہ کھا سکی۔ کھانے کے بعد میں نے وہاں سے چلنا چاہا مگر وہ رکا رہا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے اور میرے لیے آئسکریم کا آرڈر دے دیا۔

ہم گھر پہنچے تو توقع کے عین مطابق لیاقت مدہوش پڑا تھا۔ ذیشان مجھے لے کر بستر میں گھس گیا پھر اچانک ہی اس نے پوچھا۔

''جب مشہور ہو جاؤ گی تو بھول تو نہیں جاؤ گی؟''

میں نے فوری طور پر اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں تو مشہور ہونا نہیں چاہتی۔ یہ تو تم......'' میں آگے بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے میرے ہونٹ بند کر دیے۔

''میری باتیں مانو گی تو دنیا تمہارے قدموں میں ہو گی۔'' اس نے کہا مگر میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ کہہ دیا جو کہنا چاہتی تھی۔

''میں دنیا کو اپنے قدموں میں لانے سے بہتر یہ سمجھتی ہوں کہ مجھے تمہارے قدموں میں جگہ مل جائے۔'' میں نے کہہ تو دیا لیکن وہ صرف مجھے دیکھتا رہا۔

''ایک بار دنیا تمہارے قدموں میں آ گئی تب میں تم سے پوچھوں گا کہ اب تم کیا چاہتی ہو؟'' ذیشان نے کہا۔

''میرا جواب تب بھی یہی ہو گا۔'' میں نے کہا اور وہ کچھ کہے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔

''جب تم شہرت کی بلندیوں پر ہو گی تب میں تم سے پوچھوں گا۔'' اس نے کہا اور مجھے اپنے قریب کر لیا۔

''ابھی پہلا قدم اٹھانے میں کچھ وقت ہے۔'' ذیشان نے مجھے اپنے اندر چھپاتے ہوئے کہا جب تم شہرت کی راہ پر سرپٹ دوڑنے لگو گی تب میں تم سے سوال کروں گا۔ فی الحال تو میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرتی رہو۔''

وہ جو کچھ کہتا رہا، میں اس کی بات مانتی رہی پھر بہت دیر اپنی باتیں منوانے کے بعد وہ سو گیا لیکن اس بار بھی نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔

ذیشان وہی کچھ دہرا رہا ہے جو اَب سے پہلے کہتا رہا تھا کہ اخبار میں یہ خبر آنی چاہیے کہ مشہور ماڈل نے ایک افسر سے شادی کر لی۔

''مگر وہ کیا تھا جو اس نے مجھے ریاض شیخ کے سامنے پیش کیا تھا؟'' ذہن کے ایک گوشے سے بغاوت کی لہر اٹھی پھر میں ذہن اور دل کی اس لڑائی میں سو گئی۔

صبح ذیشان نے مجھے اٹھایا تھا۔ وہ مجھ سے بہت پہلے اٹھ چکا تھا۔ ''اچھی سی چائے پلا دو۔'' مجھے آنکھ کھولتا دیکھ کر اس نے کہا تھا اور میں نے بستر چھوڑ دیا۔

میرا خیال تھا کچن میں جاؤں گی تو لیاقت سے سامنا ہو گا لیکن لیاقت نہ اپنے کمرے میں تھا نہ کچن میں۔ چائے بناتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ناشتا تیار کر لوں۔ میں نے آس پاس دیکھا تو انڈوں کے ساتھ آلو بھی نظر آئے۔ جتنی دیر میں چائے بنتی، میں نے تمام چیزیں نکال لی تھیں۔ ٹرے میں چائے لے کر اوپر آئی تو ذیشان بیڈ پر تھا۔

''خرابی اس گھر میں یہ ہے کہ کچن کے کام کے لیے نیچے جانا پڑتا ہے۔'' میں نے کہا اور ذیشان ہنس دیا۔

''زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے پھر جب اپنا گھر خریدو تو اس کا خیال رکھنا۔'' ذیشان نے کہا اور میں چائے اس کو پکڑا کر بستر پر بیٹھ گئی۔

''تیار ہو جاؤ، ہم ناشتا باہر کریں گے۔'' اس نے چائے کا پہلا گھونٹ لے کر کہا تھا۔

''ناشتا ہم گھر پر ہی کریں گے۔'' میں نے کہا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر چائے پیتا رہا۔

''اگر ایسی ہی چائے ناشتے کے بعد بھی دینے کا وعدہ کرو تو تمہاری آفر پر غور کیا جا سکتا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

تعریف کرنے کا اس کا اپنا ایک اسٹائل تھا۔ یہ اس کے اسٹائل ہی تھے کہ کوئی بھی شخص اسے اپنا سمجھنے لگتا تھا۔

چائے کی ٹرے واپس لے کر میں باہر نکلی تو ذیشان

پھر سے بستر پر دراز ہو رہا تھا۔ میں کچن میں مصروف ہو گئی۔ یہ سوال ایک دو بار ذہن میں آیا کہ آج لیاقت اتنی جلدی کیوں چلا گیا لیکن میں نے ذہن کو جھٹک دیا تھا۔

ناشتا تیار ہوا تو میں نے ٹرے سجائی اور اوپر آ گئی۔ مجھے ٹرے کے ساتھ آتا دیکھ کر ذیشان اٹھ گیا۔ ''مجھے نیچے بلا لیا ہوتا۔''

''میں نے کہا راجا صاحب آرام فرما رہے ہیں، کہاں تشریف لائیں گے۔'' میں نے ٹرے تھماتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔

''رانی کے ساتھ راجا اچھا جوڑا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کاش ایسا ہو۔'' میں نے دل میں کہا۔

''کہاں......؟'' مجھے ایک بار پھر نیچے جاتے دیکھ کر بولا۔

''وہ چائے لینے جس کے وعدے پر ناشتے کے لیے راضی ہوئے تھے۔'' میں نے کہا اور نیچے اتر آئی۔

واپس آئی تو ذیشان نے بستر پر پلیٹیں سجائی تھیں لیکن ابھی شروع نہیں کیا تھا۔

''لیاقت آج جلدی چلا گیا؟'' میں نے ناشتا شروع کرتے ہوئے کہا۔

''صبح اپنی حرکت پر ڈانٹ کھائی تھی۔'' ذیشان نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا اور میں اسے دیکھنے لگی۔

''صبح تم سو رہی تھیں لیکن میں جاگ گیا تھا تو وہ اوپر آیا تھا اور دروازہ کھول کر جھانک رہا تھا۔'' ذیشان کے لہجے میں غصہ تھا۔

''میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو کہنے لگا، میں نے سوچا آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' ذیشان نے اپنی بات مکمل کی۔''

میرے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن میں خاموش رہی۔

''وہ دیکھ رہا ہو گا کہ اس کا پروموشن کہاں تک پہنچا؟'' خود کو روکنے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن پھر میں نے کہہ دیا۔ ذیشان نے بھی میرے الفاظ کی تلخی کو محسوس کیا لیکن وہ بھی خاموش رہا تھا۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ ذیشان نے فون اٹھا لیا اور نمبر ڈائل کر دیئے۔

''ندیم، ذیشان بول رہا ہوں۔'' اس نے فون پر کہا تو میں چونک گئی۔

''ریاض صاحب واپس آ گئے ہیں اور تقریباً فائنل کر لیا ہے۔ دوپہر میں رانی صاحبہ کو فون کر کے دفتر بلوا لوں گا تب تک ریاض صاحب سے آخری بات بھی ہو جائے گی۔'' ندیم نے کہا۔ ذیشان نے بات کرتے ہوئے مائک آن کر دیا تھا تا کہ میں بھی سن سکوں۔

''اعتراض نہ ہو تو میں بھی ساتھ آ جاؤں؟'' ذیشان نے کہا۔

''اعتراض کیسا ذیشان صاحب؟'' ندیم نے جواب میں کہا۔

تین بجے کا وقت طے کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا، تیار ہو جاؤ اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''ابھی سے...... ابھی تو بہت وقت ہے۔'' میں نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

''پہلے شاپنگ کریں گے اور پھر کھانا کھائیں گے تب تک وقت ہو ہی جائے گا۔'' اس نے کہا۔

''اچھی طرح تیار ہونا، آج تمہاری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔'' میں اٹھ کر باہر جانے لگی تو ذیشان نے کہا۔

ذیشان کی بات میرے ذہن میں تھی اس لیے میں نے تیاری میں وقت لیا اور جب واپس آئی تو ذیشان بھی تیار تھا۔

پروگرام کے مطابق ہم پہلے شاپنگ پر گئے جہاں ذیشان نے پچھلی بار سے زیادہ شاپنگ کروائی۔ وہ خود ہی میرے لباس منتخب کرتا اور مجھ سے صرف اتنا کہتا ''اچھا ہے نا'' اور میں اثبات میں سر ہلا دیتی۔

ہم کھانے کے لیے ایک بار پھر ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں گئے اور اس بار بھی ذیشان نے ایسی میز منتخب کی جہاں ہر آنے والے کی نظر پہلے ہم پر پڑتی تھی۔ ان کی نظروں میں ہمارے لیے ستائش نمودار ہوتی تھی۔

ہم ندیم کے دفتر پہنچے تو تین سے زیادہ کا وقت ہو رہا تھا لیکن ریاض شیخ وہاں نہیں تھا۔ ذیشان نے ریاض شیخ کے بارے میں معلوم کیا تو جواب ملا۔

''ریاض صاحب کا فون آیا تھا، وہ راستے میں ہیں۔''

''ریاض شیخ نے آنے میں مزید آدھا گھنٹا لگایا اور اس دوران ہم وہ تصاویر دیکھتے رہے جو فوٹو شوٹ میں لی گئی تھیں۔ تصویریں واقعی اچھی تھیں۔ ریاض شیخ آیا تو اس نے آتے ہی معذرت کی لیکن اس موضوع پر بات کرنے کے بجائے اس نے ذیشان سے کہا۔ ''کیا ہوا آپ کے کام کا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' ذیشان نے مایوسانہ انداز میں کہا۔
''بابا میرے کام کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ ہمارے سامنے وزیر صاحب نے فون بھی کیا تھا لیکن اس نے ٹال دیا۔'' ذیشان نے کہا اور ریاض شیخ سوچ میں پڑ گیا۔
''جس روز آپ نے فون کیا تھا، میں نے اسی روز فون کر دیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کا نام ضرور بھیجے گا۔'' ریاض شیخ نے کہا۔
''وعدہ اس نے پورا کیا مگر میرے ساتھ دو نام اور بھیج دیے۔'' ذیشان نے کہا۔
''جب وزیر تک آپ کی پہنچ ہے تو باقی نام نکلوا دیتے۔'' ریاض شیخ نے کہا۔
''تین نام بھیجنا قانونی مجبوری ہے اور اسی کا سہارا وہ لے رہا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔
''میں پھر فون کر دیتا ہوں۔'' ریاض شیخ نے آفر کی مگر ذیشان نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''اب تو نام چلے گئے ہیں، آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔
''تو آپ کو مبارک ہو...... صاحبہ۔'' ریاض شیخ نے اچانک مجھے مخاطب کیا اور وہ نام لیا جس سے آپ سمیت مجھے ہر شخص جانتا ہے جو میری پہچان بنا۔ میرے والدین کا دیا نام اس روز وہاں اس دفتر میں دفن ہو گیا تھا۔
''بہت اچھا نام دیا ہے آپ نے۔'' سب سے پہلے ندیم نے اس نام کی تائید کی تھی۔
''آپ نے اس روز بھی کہا تھا کہ دقیانوسی نام ہے رانی۔'' ذیشان نے بھی تائید کی تھی۔
''اس نام کی ایک بہت بڑی فنکارہ گزر چکی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''وہ زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔'' ریاض شیخ کا انداز دلیل دینے کا سا تھا۔
''دوسری بات یہ کہ ایک برانڈ جو بک جاتا ہے، اس کے بعد کوئی کمپنی اس نام سے پروڈکٹ نہیں بناتی۔'' ریاض شیخ نے کہا اور ندیم چیمہ نے اس کی حمایت کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کی۔
''اگر اس نام سے تم سامنے آئیں تو لوگ پہلے دن سے تمہارا مقابلہ اُن سے کرنے لگیں گے اور اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔'' ندیم چیمہ نے کہا۔

''آپ متفق ہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں، آپ سینئر لوگ ہیں بہتر سمجھتے ہیں۔'' میں نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔
''یہ اسپرٹ رکھو گی تو کامیاب ہو گی ورنہ ہر معاملے میں مین میخ نکالی تو آو پر نہیں جاسکو گی۔'' ریاض شیخ نے کہا۔
''رانی مین میخ نہیں نکال رہی ریاض صاحب۔'' ذیشان نے کہنے کی کوشش کی مگر ریاض شیخ نے ٹوکا۔
''رانی نہیں......'' اس نے میرا وہ نام لیا جو کچھ ہی دیر پہلے اس نے تجویز کیا تھا۔
''جی...... وہی۔'' ذیشان نے فوری طور پر کہا۔
''پرسوں سے ہم ریہرسل کرنا شروع کریں گے اور تین دن کے بعد دبئی جائیں گے۔'' ندیم نے پروگرام بتایا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''دبئی۔''
''آپ دبئی پہلے نہیں گئیں؟'' ندیم چیمہ نے سوال کیا۔
میں کہنا چاہتی تھی کہ دبئی کیا میں نے تو اسلام آباد بھی نہیں دیکھا لیکن میں نے صرف نفی میں گردن ہلا دی۔
''پاسپورٹ ہے؟'' اب بھی سوال ندیم نے ہی کیا اور میری گردن ایک بار پھر نفی میں ہل گئی۔
''پاسپورٹ تو میں کل ہی اپلائی کروا دوں گا۔ جب تک آپ کی ریہرسل مکمل ہو گی پاسپورٹ آجائے گا۔'' ذیشان نے دخل دیا۔
''پھر ایسا کرتے ہیں ریہرسل ایک روز آگے بڑھا دیتے ہیں۔'' ندیم نے کہا۔
''تین دن آگے کرو۔'' ریاض شیخ نے دخل دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی آگئی۔
''ویزا میں بھی دو دن لگ جائیں گے۔'' ریاض شیخ کی سنجیدگی گہری ہوتی چلی گئی۔
''ویزا میں ایک دن میں دلوا دوں گا۔'' ذیشان نے کہا۔
''مجھے کل شفٹ کو اب نئی تاریخ دینی ہوگی، پہلے ہی وہ ماڈل بدلنے پر ناراض تھے۔'' ریاض شیخ نے کہا۔
''آپ انہیں ملوا دیں ان سے اُن کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔'' ندیم چیمہ نے مشورہ دیا۔
''وہ رہتے بھی دبئی میں ہیں تو ملواؤں کیسے؟'' ریاض شیخ کا انداز جھڑکنے والا تھا۔
ماحول کی سنجیدگی بڑھتی جارہی تھی کہ اچانک ریاض شیخ نے کہا۔ ''اب جو ہونا ہے، وہ اِن کی پرفارمنس پر منحصر

ہے۔'' ریاض شیخ نے کہا۔

''پانچ کروڑ کی کمپین ہے اور بڑی مشکل سے میں نے چھینی ہے۔'' ریاض شیخ نے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا ریاض صاحب آپ فکر نہ کریں۔'' ذیشان نے تسلی دی۔

ریاض شیخ اس کے بعد زیادہ دیر رکا نہیں۔ ''مجھے ایک ضروری پارٹی میں جانا ہے اس لیے اجازت۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا لیکن جاتے جاتے وہ ایک بار پھر رکا۔

''کل کسی وقت مل لیں۔ ایگریمنٹ کا ڈرافٹ دیکھ لیں۔'' اس نے ذیشان سے کہا۔

''جس نے دستخط کرنے ہیں، اس سے بات کریں۔'' ذیشان نے میری جانب اشارہ کیا تھا۔

''دستخط تو اسی وقت بھی ہو جائیں گے، آپ چیک تو کرلیں۔'' ریاض شیخ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں فون کر کے آجاؤں گا۔'' ذیشان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ریاض شیخ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ذیشان نے بھی وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم باہر نکلے تو ذیشان نے کہا۔ ''رات کے کھانے میں ابھی دیر ہے اور گھر میں جانا نہیں چاہتا۔''

''مجھے آپ سے باتیں کرنی ہیں بہت ساری۔'' میں نے کہا اور ذیشان سوچ میں پڑ گیا۔

''چلو پھر گھر چلتے ہیں تمہارے۔'' اس نے کہا۔

''وہاں لیاقت ہوگا۔'' میں نے کہا اور ذیشان مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

''اس نے کوئی بات کی ہے؟'' ذیشان نے سوال کیا۔

''وہ جو کہتا ہے، اس کی میں پروا نہیں کرتی لیکن اُسے دیکھ کر مجھے ایک کوفت سی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا اور ذیشان سوچ میں پڑ گیا۔

''کچھ دن مزید برداشت کرلو پھر میں کچھ انتظام کر لوں گا۔'' اس نے مجھے تسلی دی اور کار کا رخ گھر کی جانب ہو گیا۔

''توقع تھی کہ لیاقت گھر پر ہوگا لیکن وہ نہیں تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ذیشان نے چائے کی فرمائش کردی۔

ذیشان اوپری حصے کی جانب چلا گیا اور میں کچن کی جانب بڑھ گئی۔

چائے لے کر اوپر کمرے میں گئی تو ذیشان کو گہری سوچ میں پایا۔ اس نے میرے ہاتھ سے چائے تو لی لیکن میری جانب دیکھا تک نہیں۔

''کیا بات کرنا چاہتی تھیں؟'' اس نے میرے بیٹھنے کے بعد کہا۔

''پہلے یہ بتائیں کہ اسلام آباد میں کیا کام ہے کہ اتنے فون کروانے کے باوجود نہیں ہو رہا ہے؟''

ذیشان نے سنا لیکن فوری جواب نہیں دیا بلکہ سوچ میں ڈوب گیا۔

''معاملہ میرے ٹریننگ پر جانے کا ہے۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تھا۔ ''اس ٹریننگ کے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔'' اس نے کہا۔

''وقت گزرنے کے ساتھ جو ترقی ہوتی ہے، وہ تو ہو گی لیکن اگر ٹریننگ ہو جاتی ہے تو پروموشن جلدی ہوگی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں کچھ سمجھی اور بہت کچھ نہیں۔ میں ابھی اس سوچ میں تھی کہ ذیشان نے مجھے مخاطب کیا۔

''اس موقع پر سب کچھ بھول کر اپنے کیریئر کی جانب توجہ دو۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن کہہ نہ پا رہا ہو۔

''جس طرح سے تم نے میرے بارے میں سوال کیا، وہ مجھے بہت اچھا لگا لیکن میری مدد بھی کر سکتی ہو اگر تم اپنے کیریئر میں آگے بڑھو۔'' اس نے کہا اور میرے ذہن میں سوال اٹھ گئے۔

''میں سمجھی نہیں......؟'' میں نے کہا اور ذیشان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''میں نے کہا نا کہ فی الحال اپنے کیریئر پر توجہ دو۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آجائے گا۔'' اس نے کہا پھر کچھ دیر بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''جب تم اس قابل ہو جاؤ گی کہ میری مدد کرسکو تو میں خود تم سے مدد مانگنے آجاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''شاید ہی ایسا ہو کبھی لیکن میں آج بھی جو کچھ کرسکتی ہوں، وہ ضرور کروں گی اور کل ایسا وقت آیا تو تمہارے کچھ کہنے سے پہلے تمہاری مدد کو پہنچ جاؤں گی۔'' میرا فقرہ ابھی مکمل ہی ہوا تھا کہ اس نے مجھے بانہوں میں بھر لیا پھر وہ بہت دیر اسی طرح رہا۔

''آج جلدی سو جائیں گے کیونکہ صبح جلد پاسپورٹ آفس پہنچنا ہوگا۔'' اس نے کہا تو مجھے یاد آیا کہ دبئی جانا

ہے۔

''تم چلو گے نادیہ میرے ساتھ؟'' میں نے کہا لیکن وہ ہنس دیا۔

''انگلی پکڑ کر کب تک چلو گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''وقت آ گیا ہے کہ اپنے قدموں پر چلنا سیکھ لو۔'' اس نے کہا۔

''ذیشان میں نے اکیلے کبھی سفر نہیں کیا اور یہ تو ملک سے باہر جانے کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم میں اتنا اعتماد تو آ گیا ہے کہ ریاض شیخ کے نام تبدیل کرنے پر اعتراض کر سکتی ہو تو یہ تو آسان سی بات ہے۔ یہاں سے جہاز میں بیٹھو گی اور وہاں اتر جاؤ گی اور وہاں سے ہوٹل پہنچ جاؤ گی۔'' ذیشان نے معاملہ آسان کر دیا۔

''تم نے تو اسے انڈا آملیٹ بنانے سے بھی آسان بنا دیا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''جب تم نے پہلا انڈا آملیٹ بنایا ہو گا تو اس وقت اتنا آسان نہیں ہو گا جتنا اب ہے۔'' ذیشان بولتے بولتے رکا تو مجھے لیاقت یاد آ گیا۔

اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ ''پہلی بار کوئی بھی کام کرتے ہوئے جھجک ہوتی ہے۔ دوسری بار جھجک کم ہوتی ہے اور پھر......''

''کن سوچوں میں گم ہو؟'' ذیشان نے کہا اور میں صرف مسکرا دی۔ کہنا چاہتی تھی کہ اب جب میرے فیصلے دوسرے کر رہے ہیں تو میں حالات میں بہنے کے علاوہ کیا کر سکتی ہوں لیکن میں خاموش رہی۔

''جو راستہ تم نے منتخب کیا ہے، وہ تمہیں شہرت کی بلندیوں پر لے جائے گا اور میں تمہیں وہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ذیشان نے کہا۔

''شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئی پھر کیا ہو گا؟'' میں نے کہا حالانکہ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ راستہ میں نے کب منتخب کیا ہے یہ تو مجھ پر تھوپ دیا گیا ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔

''وہ سب کچھ حاصل کر لو گی جس کا تم نے تصور نہیں کیا ہو گا اور وہ بھی جو تمہارے خواب ہیں۔'' ذیشان نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''جو بھی کام کیا جائے، اگر اسے مجبوری سمجھ کر کرو تو اس کام میں کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کی بہترین مثال میں تمہارے سامنے ہوں۔'' ذیشان نے کہا اور میں بُری طرح چونک گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے کہا لیکن اس سوال کا جواب فوری طور پر نہیں آیا تھا۔

''تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟'' اس نے کچھ دیر کے بعد سوال کیا اور میں سوچ میں پڑ گئی۔

''بہت کم۔'' میں نے وہی کہا تھا جو حقیقت تھی۔

''صرف یہ کہ میں لیاقت کا باس ہوں اور ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہوں۔'' میں نے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں گردن ہلا دی۔

''شاید یہ بھی کہ میں نے لیاقت کے ساتھ مل کر تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف حاصل کیا اور شاید ماضی میں بھی یہی کچھ کرتا رہا ہوں۔'' ذیشان بولے جا رہا تھا۔

''ذیشان...... میں......'' میں نے بولنا چاہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

''یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں ایسا کیوں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا میں جان سکتی ہوں؟'' میں نے کہا۔

''لمبی کہانی ہے کبھی فرصت میں بتاؤں گا۔'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ''فی الحال تو ہم کھانے کے لیے جا رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''ذیشان تم نے ادھوری بات کر کے مجھے بے چین کر دیا ہے۔'' کار چلی تو میں نے کہا۔

''یہ ایک دکھی کہانی ہے اس لیے پھر کبھی کیونکہ اب تمہاری خوشیوں کا سفر شروع ہونے والا ہے اس لیے پھر کبھی۔'' ذیشان نے کہا۔

''پھر کبھی کب......؟'' میں نے کہا لیکن وہ مسکرانے لگا۔

''ٹائم کا تعین تو نہیں کر سکتا لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ تم وہ پہلی شخصیت ہو گی جس سے میں یہ شیئر کروں گا۔'' ذیشان نے یہ کہا اور چپ ہو گیا۔ کھانے پر بھی وہ کچھ کھویا کھویا سا رہا اور یہی حالت اس کی اس وقت تک رہی جب ہم گھر پہنچ کر کمرے میں نہیں آ گئے۔

اگلی صبح میں پہلے بیدار ہوئی۔ لیاقت کے کمرے میں جھانکا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ چادر کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ بستر پر رات کوئی نہیں سویا تھا۔ چائے لے کر اوپر کمرے میں آئی تو ذیشان بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے لیاقت کے بارے میں بتایا تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''کسی دوست کے ساتھ نشے میں دھت پڑا ہوگا۔''
اس نے تبصرہ کیا اور ساتھ مجھے تیار ہونے کا کہا۔ ''ہمیں پاسپورٹ آفس جانا ہے۔''

پاسپورٹ آفس جاتے ہوئے اس نے راستے میں فون کیے تھے اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ ہمیں کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی لیکن پھر بھی کافی وقت لگ گیا تھا۔

''صبح ناشتے کا منع کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو چائے اور بسکٹ کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔'' میں نے دفتر میں منگوائی گئی چائے پر تبصرہ کیا تو وہ ہنس دیا۔

''ہم دیہاتی لوگ ہیں۔ کھانے کے بعد جب تک زور سے ڈکار نہ لیں ہمارا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔'' ذیشان نے اس انداز میں کہا تھا کہ میری ہنسی نکل گئی۔

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور زیادہ لگ رہی ہے کیونکہ میں نے تو بسکٹ بھی نہیں کھائے تھے۔'' میں نے کہا اور ذیشان مسکرا دیا تھا۔

''مسئلہ ایک اور ہے اور وہ یہ کہ مجھے ریاض شیخ کی طرف بھی جانا ہے ایگریمنٹ کے لیے۔'' ذیشان نے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک سوچ تھی پھر خود ہی اس نے مسئلے کا حل بھی نکال لیا۔ ''میں تمہیں شاپنگ مال پر اتار دیتا ہوں جب تک تم شاپنگ کر لینا۔'' اس نے کہا۔

''مجھے کیا شاپنگ کرنی ہے؟'' میں نے کہا، میں کہنا چاہتی تھی پہلے ہی اتنی شاپنگ کر لی ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔

''دبئی جا رہی ہو اپنی پسند کی چیزیں لے لینا۔'' اس نے کہا۔

''وقت گزاری کے لیے ونڈو شاپنگ کر لوں گی....
اس نے نوٹوں کی گڈی میری جانب بڑھا دی۔

''ذیشان مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا لیکن وہ اسی طرح نوٹ تھامے رہا۔

''زندگی میں کبھی آئے ہوئے نوٹوں کو واپس نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔'' ذیشان نے کہا۔

ویسا ہی ہوا کھانے کے بعد ذیشان نے مجھے مال پر اتارا اور خود ریاض شیخ کے دفتر کی جانب چلا گیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

میں کچھ دیر تو وہاں ونڈو شاپنگ کرتی رہی پھر مجھے ایک دکان پر چاندی کی جیولری نظر آئی اور میں دکان میں گھس گئی۔ دکان پر رش نہیں تھا اور دکاندار بہت تیز تھا اس نے یکے بعد دیگرے اس طرح کی چیزیں دکھائیں کہ کوئی بھی چیز چھوڑنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں ابھی چیزیں فائنل ہی کر رہی تھی کہ ذیشان کا فون آ گیا بحث کر کے باہر نکلی تو ذیشان انتظار میں تھا۔

''کچھ خریدا ....؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چاندی کی کچھ جیولری ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ گڈ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس نے جو پوچھا تھا، میں نے اس کا جواب دے دیا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ آج میں ایک نئے جذبے سے روشناس ہوئی ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے پیسے دینے کا بھی ایک نشہ ہے۔

''بہت جلد فارغ ہو گئے۔'' میں نے اس کی خاموشی توڑنے کی غرض سے کہا۔

''ایگریمنٹ تو پندرہ منٹ میں دیکھ لیا تھا، کچھ تھوڑے سے اعتراضات تھے اس پر بات ہوئی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جس اشتہار میں تم کام کرنے جا رہی ہو، وہ کون ہے؟'' ذیشان نے کہا۔

''کون ہے؟'' میں نے یونہی سوال کر دیا تھا۔

''کبھی عرفان کا نام سنا ہے؟'' ذیشان نے کہا اور میرا سر نفی میں ہل گیا۔

''شہر کے ہی نہیں ملک کے ہر بڑے کرائم میں اس کا نام آتا ہے۔ منشیات کی اسمگلنگ سے لے کر اغوا برائے تاوان سے لے کر کسی بھی بڑے جرم کا نام، عرفان کا اس میں ہاتھ ضرور ہوگا۔'' ذیشان نے کہا۔

''ندیم نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا۔'' میں نے اس برانڈ کا نام لیا تھا اور ذیشان مسکرا دیا۔

''یہ کمپنی اور اس کے کرتا دھرتا سب عرفان پچھی کے بیٹے کے ملازم ہیں ''احسان کمپنی''۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' میں نے کہا اور ذیشان کچھ دیر خاموش رہا۔

''احسان جب یہاں تھا تو مری میں پڑھتا تھا پھر عرفان نے اسے برطانیہ بھجوا دیا جہاں سے آ کر اب وہ دبئی میں بیٹھا ہے اور ان تمام کاروبار کا نگراں ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''دبئی میں کیوں جب اس کا باپ اتنا طاقتور ہے تو وہ پاکستان میں بھی رہ سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور ذیشان نے

تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔
''تمہارا اعتماد روز کی بنیاد پر بڑھ رہا ہے۔'' ذیشان نے تعریف کی۔
''میں نے غلط بات کہہ دی کیا؟'' میں نے سوال کیا اور ذیشان نے نفی میں سر ہلایا۔
''یہ ایک مثبت بات ہے لیکن یہ اعتماد اگر حد سے آگے نکل جائے تو منفی ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔
''میں نے تو ایک سوال کیا تھا۔'' میں نے کہا۔
''سوال کرنا ہی اعتماد کی دلیل ہوتی ہے لیکن اس اعتماد کو اس طرح بڑھا دینا کہ خود کو عقل کل سمجھنا منفی ہوتا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔
''مجھے اندازہ ہوتا کہ میرے ایک سوال کے جواب میں اتنا لیکچر ملے گا تو میں سوال نہ کرتی۔'' میں نے کہا اور ذیشان صرف مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا۔
''عرفان کچھی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔'' ذیشان نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔
''بیٹی سب سے بڑی تھی۔ چھ سال پہلے اس کا کینسر میں انتقال ہوا تھا مگر اس سے پہلے اس کے شوہر کا اس وقت قتل ہوا جب وہ عدالت سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔'' ذیشان نے کہا۔
''وہ بھی میرا مطلب ہے۔ عرفان کچھی کے داماد کا تعلق بھی انڈرورلڈ سے تھا؟'' میں نے سوال کیا۔
''اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، وہ تو ڈاکٹر تھا۔'' ذیشان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں سوال اٹھے لیکن میں نے ان سوالات کو اپنے ذہن تک محدود رکھا۔
''ہوا یہ تھا کہ عرفان کچھی کا مخالف گروہ سے کوئی تصادم ہو گیا تھا جس میں عرفان کچھی بُری طرح زخمی ہوا تھا۔ اسپتال میں ڈاکٹر عارف نے اس کے آپریشن کیے۔ وہ اس کے زیر علاج رہا۔ عرفان ڈاکٹر کا مشکور تھا کہ اس نے اس کی جان بچائی۔'' ذیشان کہتے کہتے رکا تو مجھے بولنے کا موقع مل گیا۔
''انعام میں عرفان کچھی نے اسے اپنا داماد بنا لیا؟'' میں نے تبصرہ کیا تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
''عرفان کچھی کی بیٹی خوب صورت تھی مگر باپ اور بھائیوں کی شہرت نے اس کی شادی روک رکھی تھی۔ باپ کی بیماری میں وہ اسپتال جاتی رہی تھی وہیں ڈاکٹر عارف اس سے متاثر ہوا اور اس نے پرپوز بھی کر دیا۔'' ذیشان نے کہا اور میں پھر بیچ میں بول پڑی۔
''اس کے باپ اور بھائی کی شہرت کے باوجود؟'' میں نے کہا لیکن ذیشان نے اس پر توجہ نہیں دی۔
''شادی کے بعد عرفان کچھی نے انہیں اسلام آباد منتقل کروا دیا تھا اور وہ دونوں وہیں تھے۔ عرفان اور اس کے بیٹوں کو ان سے ملنا ہوتا تو وہ اسلام آباد چلے جاتے تھے لیکن ڈاکٹر عارف کو اس کیس کی گواہی کے سلسلے میں کراچی آنا پڑا تھا جس میں عرفان کچھی زخمی ہوا تھا۔'' ذیشان نے کہا۔
''عرفان کچھی نے جہاں اتنی احتیاط کی تھی وہیں اسے یہ احتیاط بھی کرنی چاہیے تھی کہ داماد کی حفاظت کرتا۔''
''اس حملے میں ڈاکٹر عارف کے علاوہ چار اور افراد مارے گئے تھے۔ ایک اس کا ڈرائیور اور تین گارڈز۔'' ذیشان نے کہا اور میں مزید سوال نہ کر سکی۔
''حملہ آوروں نے وہ وقت منتخب کیا تھا، جب عارف گاڑی میں سوار ہو رہا تھا اور اس کے گارڈ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔'' ذیشان نے کہا۔
''کتنا عرصہ رہی یہ شادی؟'' میں نے سوال کیا۔
''چار سال سے بھی کم مدت رہی۔ اس دوران ان کے یہاں دو بیٹے ہوئے تھے۔'' ذیشان نے کہا۔
''اب وہ بچے کہاں ہیں؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔
''عرفان کچھی نے بیٹی اور نواسوں کو احسان کے پاس بھیج دیا تھا جو اس حادثے سے چند ماہ پہلے ہی برطانیہ گیا تھا اب شاید وہ ماموں کے ساتھ دبئی میں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔'' ذیشان نے کہا تبھی میری نظر ونڈ اسکرین کے باہر پڑی۔
''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔
''ہم لانگ ڈرائیو پر ہیں۔'' ذیشان نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔
''مجھے اس سلسلے میں بات کرنی تھی جس ایگریمنٹ پر تم کو سائن کرنے ہیں۔'' میرے کچھ کہنے پر ذیشان نے کہا۔
''پہلے اشتہار کے وہ تمہیں پانچ لاکھ روپے دیں گے۔'' ذیشان نے کہا اور میں نے حیران کن نظروں سے اسے دیکھا۔
''ریاض شیخ تمہیں دبئی میں وہ سائٹس دکھا دے گا جہاں شوٹنگ ہونی ہے۔ دو روز بعد پوری ٹیم آ جائے گی اور اشتہار کی شوٹنگ شاید تین روز میں مکمل ہو۔'' ذیشان میری

جانب دیکھ نہیں رہا تھا لیکن اس کی اُن کہی باتوں سے مجھے بُو آرہی تھی جن نظروں سے ریاض شیخ مجھے دیکھتا رہا تھا، اس کے بعد بہت کچھ سمجھ آرہا تھا۔

''دبئی میں تمہارے قیام کی ذمے داری احسان بھی کی ہے۔'' ذیشان نے بتایا۔

''کیا مجھے اکیلے دبئی جانا ہوگا؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''اب تو چھوٹے چھوٹے بچّے اکیلے سفر کرتے ہیں۔'' ذیشان نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''ذیشان ان بچوں نے پہلے سفر کیا ہوگا، میرا تو یہ پہلا سفر ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''جہاز کا سفر کار کے سفر سے بھی آسان ہے۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''مجھے یہ سوچ کر ہول آرہا ہے کہ مجھے اکیلے سفر کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بعد تمہیں نہ جانے اور کتنے سفر کرنے ہوں گے اس لیے یہ ہول ابھی سے دور کرلو۔'' ذیشان نے کہا اور میرے ذہن میں لیاقت کا فقرہ ایک بار پھر گونجا تھا۔ ''پہلی بار ہر کام کرتے ہوئے جھجک ہوتی ہے دوسری بار یہ کم ہو جاتی ہے......''

ہمارا سفر جاری تھا کہ ذیشان کے فون کی بیل بجنے لگی۔ ذیشان نے موبائل اسکرین پر نام دیکھا اور مجھے خاموشی کا اشارہ کرکے فون ریسیو کیا۔

''جی بابا......'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''بابا ایک کام سے گوجرانوالا جارہا تھا۔'' اس کے لہجے میں ادب تھا۔

''جی بابا، یہیں سے گاڑی موڑ لیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''جی نہیں موٹروے پر نہیں جی ٹی روڈ پر ہوں۔'' اس نے کہا۔

''جی حاضر ہوتا ہوں۔'' اس نے آخری فقرہ کہا اور کچھ دور سے گاڑی موڑ لی تھی، واپسی پر اس کی رفتار بھی تیز تھی۔

''رات میں آؤ گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے کہا۔

''بابا لاہور کا رخ کم ہی کرتے ہیں، پتا نہیں آج کیسے آگئے۔'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

میری توقعات کے عین مطابق ذیشان تو رات میں نہیں آیا لیکن لیاقت آگیا۔ میں اُس سے کچھ ہی دیر پہلے کچن میں آئی تھی تاکہ اپنے لیے کچھ بنا سکوں۔

''میں کھانا لے آتا ہوں لیکن میں نے منع کر دیا۔ دال چاول بنا رہی ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ کچن میں رکا رہا۔

''تم دبئی جا رہی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''کس نے بتایا؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

''باس نے فون کیا تھا۔'' اس کا جواب تھا۔ تفصیل نہ اس نے پوچھی، نہ میں نے بتائی۔

''کب تک جاؤ گی۔'' لیاقت نے ایک اور سوال کیا۔

''ابھی تو پاسپورٹ بننے دیا ہے، دیکھو کتنا وقت لگتا ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

لیاقت کچن میں کچھ دیر رکا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اسی طرح خاموش رہنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے کھانا میز پر لگایا تو اسے آواز دی۔ وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک نظر میز پر ڈالی۔

''تمہیں یاد ہے۔'' اس نے کہا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گئی تھی لیکن کچھ کہنے سے گریز کیا۔ میز پر دال چاول کے ساتھ آملیٹ دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ لیاقت ہمیشہ دال چاول کے ساتھ آملیٹ ضرور لیتا تھا۔

''میں نے کچھ کہا تھا؟'' اس نے میرے کچھ نہ کہنے پر کہا۔

''میں کچھ بھی نہیں بھولی نہ تمہارا وہ نشے کی حالت میں مجھے لاتیں، گھونسے مارنا اور نہ اپنے مقصد کے لیے تمہارا وہ اپنے جال میں پھنسانا۔'' میں نے کہا۔ لیاقت کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ خاموشی سے کھاتا رہا۔

ابھی وہ میز پر تھا کہ اس کے موبائل پر کال آئی اور اس نے ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''آج نہیں آسکوں گا۔''

''ایک ضروری کام ہے اس لیے......'' اس نے اپنے مخاطب کو ٹالا تھا۔ فون بند ہوا تو میں نے کہا۔

''تمہیں جانا ہو تو چلے جاؤ، میں اکیلے رہ جاؤں گی۔''

اس نے سنا لیکن کچھ کہا نہیں، خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

اپنے کمرے میں آکر تنہائی ملی تو میں نے ان باتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ بالکل واضح نظر آرہا تھا کہ دبئی میں

مجھے کن کن مراحل سے گزرنا ہوگا۔

میں ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار کرتی رہی۔ ایک اندرونی کشمکش تھی جو مجھے وہ سب کچھ کرنے سے روک رہی تھی... جو مجھے نظر آرہا تھا لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کا نمبر ڈائل کردیا۔ فون ان کی بیٹی نے ریسیو کیا تھا۔

''میں رانی بول رہی ہوں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا اور دوسری جانب کچھ دیر سکتہ رہا۔

''ابا تو بستر پر ہیں، انہیں فالج ہوگیا ہے۔'' کچھ دیر رکنے کے بعد اس نے کہا۔

''کب......؟'' میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

''ابا بارہ دن اسپتال میں رہ کر آئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ان سے بات ہوسکتی ہے؟'' میں نے کہا اور اس کا جواب نفی میں تھا۔

''فالج سے ابا کی زبان بند ہوگئی ہے۔ اشاروں سے بات کرتے ہیں۔'' اس نے تفصیل بتائی تھی۔

''میں آؤں گی۔'' میں نے نہ جانے کیوں کہہ دیا شاید میرے دل کی آواز تھی۔

''ہم پرانے گھر میں واپس آگئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''وہاں میں نہیں ہو؟'' میرا سوال شاید غیر مناسب تھا لیکن اسے اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

''ابا اسپتال میں تھے کہ انہوں نے گھر خالی کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ان کی آخری تنخواہ بھی نہیں دی کہ کرائے میں کاٹ لی ہے۔'' اس نے کہا۔

ذیشان ہوتا تو میں جانے کی بات کرتی۔ لیاقت سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رات دیر تک ہیڈ ماسٹر صاحب کی باتیں یاد کرتی رہی اور پھر انہی باتوں کو یاد کرتے کرتے سوگئی۔

صبح ہوئی تو ذیشان کا ڈرائیور گرومنگ سینٹر لے جانے کے لیے آیا۔ میرا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں تیار ہوکر چلی گئی۔ لیاقت میرے اٹھنے سے قبل نکل چکا تھا۔ گرومنگ سینٹر میں ایک بار پھر مبارک بادیں دی گئیں کہ میں دبئی جارہی ہوں۔

شام میں ذیشان کا فون آیا کہ کل جاکر ایگریمنٹ سائن کردینا۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' میں نے ضد کرنے والے انداز میں کہا۔

''انگریزی میں ہے اور اتنی انگریزی تو تمہیں آتی ہے۔'' میں نے اپنی ضد جاری رکھی۔

''ٹھیک ہے میں ٹائم طے کرکے تمہیں بتاتا ہوں۔'' ذیشان نے میری بات مان لی تھی۔

گھر پہنچی تو لیاقت موجود تھا۔ میں اُس سے کچھ کہے بغیر اوپر جانے لگی تو اس نے آواز دے کر روکا۔ میں دوبارہ نیچے اتر آئی تو وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

''باس نہ میرے پروموشن کے کاغذات بھیج رہا ہے اور نہ ہی میرا ٹرانسفر کررہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا کہ دو چار دن میں کاغذات تیار کرکے بھیج دے گا۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر اطمینان آتا چلا گیا۔ میں دوبارہ سے اوپر جانے کے لیے بڑھی تو اس نے کہا۔ ''میں کھانا لے کر آتا ہوں۔''

میں اوپر آئی تو میں نے سوچا کہ اتنا بڑا جھوٹ اتنے آرام سے کیسے بول گئی اور ذیشان کی بات یاد آگئی۔ تمہارے اعتماد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

''کم از کم اتنا اعتماد تو آگیا کہ اب میں پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول سکتی ہوں۔'' میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے سوچا۔

اگلے روز ذیشان آیا لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ ہم نے ریاض شیخ کے دفتر جاکر ایگریمنٹ سائن کیے وہیں معلوم ہوا کہ کل سے ریہرسل شروع کررہے ہیں۔

دیے گئے وقت سے پہلے ریہرسل کے آغاز پر مجھے حیرت تو ہوئی لیکن کچھ کہا نہیں۔ صبح وہی روٹین ناشتا کیا، گرومنگ سینٹر گئی اور مقررہ وقت پر ریہرسل کے مقام پر پہنچ گئی۔ ندیم چیمہ وہاں موجود تھا۔ ایک کیمرا مین بھی تھا۔ ندیم چیمہ نے بتایا کہ ریاض شیخ کا کہنا تھا کہ ''نئی لڑکی ہے اس لیے شوٹ پر وقت ضائع کرنے کے بجائے ریہرسل زیادہ کی جائے۔''

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ریہرسل میں کیا ہوگا لیکن جو کچھ ہوا وہ بہت آسان تھا۔ کیمرا مین بھی میری پرفارمنس سے خوش تھا۔ ریہرسل اس وقت تک ہوتی رہی جب تک میں نے تھک جانے کا نہیں کہا۔

اس رات ذیشان کا فون آیا اور اس نے ریہرسل کی تفصیل پوچھی اور ایک روز بعد آنے کو کہا لیکن جس وقت

آنے کا وعدہ کیا، اس کے اگلے دن شام میں اس وقت آیا جب میں ریہرسل سے واپس آئی تھی۔

اُس روز میں تھکی ہوئی نہیں تھی لیکن وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"شاید آج بھی نہ آتا مگر پاسپورٹ آفس سے فون آیا تھا کہ آج رات میں پاسپورٹ نہیں آیا تو صبح ضرور آئے گا۔" اس نے اپنے تھکے ہونے کے اظہار کے ساتھ کہا۔

"میں اس لیے یہاں آ گیا کہ صبح یہیں سے پاسپورٹ آفس جائیں گے اور پھر ویزا کے لیے اپلائی کریں گے۔"

مجھے حیرت تھی کہ پاسپورٹ اتنی جلدی کیسے آ گیا لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اس ملک میں سفارش سے کیا نہیں ہو سکتا۔

میں نے کھانے کا معلوم کیا لیکن ذیشان نے کہا کہ وہ صرف سونا چاہتا ہے، اس نے نیند کی گولی لی اور سو گیا۔ ذیشان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی نیند کی گولی لی اور نیند کی وادیوں میں اترتی چلی گئی لیکن سونے سے پہلے میں نے دروازے کی کنڈی لگالی تھی۔ ذیشان نے جب سے بتایا تھا کہ "صبح اٹھا تو لیاقت کمرے میں جھانک رہا تھا۔" میں کچھ خبردار ہو گئی تھی۔

صبح میں ذیشان سے پہلے بیدار ہوئی تھی۔ میں کچن کی جانب جا رہی تھی تو لیاقت نکلنے کے لیے تیار تھا۔ "باس سے بات کی پرموشن کی؟" اس نے کہا۔

"رات وہ بہت تھکا ہوا تھا، میں آج ضرور بات کروں گی۔" میں نے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا جیسے اس نے میری بات کا یقین کر لیا ہو۔

میں چائے لے کر پہنچی تو ذیشان فون پر بات کر رہا تھا۔ "میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ذیشان کچھ کہتا، میں تیار ہونے چلی گئی۔ پاسپورٹ لینے کے بعد ہم وہاں رکے نہیں اور ریاض شیخ کے دفتر گئے جہاں ان کے دفتر کا وہ شخص منتظر تھا، جو اُن کے یہاں ویزا ڈیل کرتا تھا۔ ذیشان نے کہا۔ "تمہیں گھر چھوڑ کے میں کام سے جاؤں گا لیکن رات ضرور آؤں گا۔"

ذیشان نے گھر کی جانب کار موڑی تو میں نے لیاقت کی بات کی، جسے ذیشان نے سنا اور کہا۔ "اس سے کہنا مجھ سے بات کرے۔"

میں نے اپنے جھوٹ کے بارے میں بتایا تو کہا۔ "ابھی کچھ دن انتظار کرے۔"

ذیشان نے مجھے گھر کے باہر ہی ڈراپ کیا۔ جتنی دیر میں گھر میں جاتی، وہ گاڑی لے کر چلا بھی گیا۔

میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ آرام کروں یا گرومنگ سینٹر جاؤں کہ ندیم چیمہ کا فون آیا کہ "اگر آپ آ سکتی ہیں تو آ جائیں کہ کاسٹیوم فائنل کرنا ہے۔" میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی لیکن جواب دیا کہ "جیسے ہی ڈرائیور آتا ہے میں آ جاؤں گی۔"

"آتے ہوئے فون کر لیجیے گا۔" اس نے کہا۔

"وہیں آنا ہے جہاں ریہرسل کے لیے آتی رہی ہوں؟" میں نے کنفرم کیا اور اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ڈرائیور آیا تو روانگی سے پہلے ندیم چیمہ کو فون کیا اور کار میں آنکھ بند کر کے بیٹھ گئی۔ رات کی لی گئی نیند کی دوا کا اثر باقی تھا۔ میں وہاں پہنچی تو ندیم منتظر تھا۔ میں نے اس تبدیلی کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو ندیم بولا۔ "حکم حاکم۔"

اب بالکل علیحدہ کاسٹیوم کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی کچھ تصویریں میری جانب بڑھائیں۔

یہ بیرونِ ملک کسی رسالے سے لی گئی تصاویر تھیں۔ تصویروں میں کاسٹیوم بہت اچھے نظر آ رہے تھے۔ پانچ مختلف طرح کے کاسٹیوم تھے۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دو افراد وہاں پہنچے اور ندیم نے کہا۔ "آئیے ماسٹر صاحب۔"

اس کے بعد ندیم ان سے باتیں کرنے لگا اور میں اس کی منگوائی ہوئی چائے کے مزے لینے لگی۔ اس کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوئے اور میرا ناپ لینے لگے۔ وہ ناپ رہے تھے لیکن ان کا انداز شریفانہ نہیں تھا۔

"کب تک مل جائیں گے؟" ندیم نے سوال کیا۔

"چار دن تو لگیں گے۔" ان میں سے جو سینئر تھا، اس نے جواب دیا۔

"آپ کے پاس دو دن ہیں کیونکہ ہمیں شوٹنگ کے لیے دبئی جانا ہے لیکن اس سے پہلے فائنل ریہرسل بھی کرنی ہے۔"

میں ایک بار پھر اس گفتگو سے لاتعلق رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ندیم سے سوال کیا۔ "مجھے رکنا ہے یا جاؤں؟"

"لنچ کر کے چلی جایئے گا۔" ندیم نے کہا لیکن میں نے معذرت کر لی اور نکل آئی۔

ندیم چیمہ کی آفر قبول نہ کرنے کا افسوس اس وقت ہوا

جب گھر پہنچ کر بہت دیر بستر پر دراز رہنے کے بعد بھوک کا احساس ہوا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن جسم ایسا ہو رہا تھا کہ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا عجب کسلمندی سی تھی۔ ڈرائیور کو گھر آتے ہی روانہ کر دیا تھا کہ مجھے کہیں نہیں جانا۔ ذہنی تھکن کا اثر جسم پر بھی ہو رہا تھا۔ دبئی جانے اور وہاں کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دماغ شل ہو چکا تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی کہ ذیشان کا فون آ گیا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔

میں نے اسے اپنی حالت بتائی تو اس نے کہا، دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور نیچے اتر آئی۔ ذیشان آیا تو اس نے طبیعت کا پوچھا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا لیکن اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔''

''تمہیں اپنی نئی زندگی میں پہلا قدم رکھنا ہے اس لیے سو فیصد فٹ ہونا ضروری ہے۔'' اس نے کہا۔

ہم اس کے ایک جاننے والے ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ اس نے ذہنی تھکن بتائی اور کچھ دوائیں لکھ دیں۔ ذیشان نے میڈیکل اسٹور سے دوائیں لیں۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے، تم مجھے گولیوں پر ٹرخا رہے ہو۔'' میں نے کہا اور اس نے کار اس جانب موڑ دی جہاں ایک بار پہلے بھی ہائی ٹی لے چکے تھے۔

میں نے اس کی مصروفیات کے بارے میں جاننا چاہا تو اس نے عجیب سا لہجہ اختیار کیا۔ ''آج کل ستارے کچھ گردش میں ہیں۔'' اس نے کہا۔

اس عجیب سے فقرے کی میں نے وضاحت چاہی تو وہ ٹال گیا۔

''تم نے اُس روز عرفان کچھی کی کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ہائی ٹی پر بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں اچانک دبئی آ گیا تو سوال کر ڈالا۔ ذہن میں تھا کہ دبئی میں احسان کچھی کا سامنا کرنا ہوگا۔

''عرفان کے تین میں سے دو بیٹے قتل ہو چکے ہیں اب احسان بچا ہے جسے عرفان ملک میں آنے نہیں دیتا۔'' ذیشان نے بتانا شروع کیا۔

''بظاہر باپ بیٹے کا کوئی رابطہ نہیں ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ عرفان اپنی بلیک منی اسی کے ذریعے وائٹ کر رہا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ احسان باہر پڑھتا رہا ہے۔'' میں نے سوال کیا اور ذیشان کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''احسان کے کیا کاروبار ہیں، کن کے ذریعے وہ اپنا کاروبار آپریٹ کرتا ہے، اس بارے میں مختلف لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں لیکن مستند کسی کی بات نہیں۔'' ذیشان کہتا رہا تھا ''وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے اور اس کی زیادہ تصویریں بھی لوگوں کے پاس نہیں اور جو ہیں وہ مستند نہیں۔'' ذیشان اس کا جو خاکہ بنا رہا تھا، اس سے میری تشویش بڑھ گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ ذیشان رات رکے گا لیکن وہ مجھے گھر چھوڑ کر دوائیں باقاعدگی سے لینے کا کہہ کر چلا گیا۔

جو دوائیں مجھے دی گئی تھیں، اس میں شاید نیند تھی کہ میں گھر آ کر بغیر کپڑے تبدیل کیے جو سوئی تو اگلی صبح کی خبر لی اور اس وقت بیدار ہوئی جب ذیشان کی کال آئی۔ ''کل تمہارا ویزا آ جائے گا اور پرسوں صبح تم دبئی روانہ ہو رہی ہو۔''

ذیشان سے بات ختم ہوئی تو ندیم چیمہ کا فون آیا، اس نے بھی اس کی تصدیق کی۔ ساتھ ہی اس نے کل صبح آنے کی بات کی کہ فائنل ریہرسل کرنی ہے۔

میں نے اپنی پیکنگ کے بارے میں بات کی تو وہ ہنسنے لگا۔ ''لوگ شاپنگ کے لیے دبئی جاتے ہیں اور تم یہاں سے کپڑے لے جا رہی ہو؟'' اس نے کہا۔

''روزمرہ کے چند سوٹ رکھ لو کافی ہوں گے۔'' میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے کہا۔

میں چائے بنانے نیچے اتری تو لیاقت کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ''تم دفتر نہیں گئے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آج چھٹی ہے۔'' اس نے کہا۔

چائے بناتے ہوئے میں نے اس سے چائے کا معلوم کیا تو اس نے ہامی بھر لی۔ چائے لے کر میں وہیں ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو اس نے وہی سوال کیا۔ ''باس سے بات کی؟''

''ذیشان نے کہا ہے چند دن انتظار کرو۔'' میں نے کہا۔

''اور کتنے چند دن......؟'' لیاقت چڑچڑے انداز میں بولا لیکن میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہی۔

چائے پی کر میں دوبارہ اوپر جانے لگی تو اس نے ایک بار پھر کہا۔ ''اس سے بولو جلدی کرے دن گزرتے جا رہے ہیں۔'' میں نے اس کی بات سنی اور بغیر کچھ کہے اوپر آ گئی۔

میرے پیٹ سے صدائیں بلند ہوئیں تو میں نے ڈرائیور کو دیکھا جو صبح سے آیا کھڑا تھا۔ میں چینج کیے بغیر اس

کے ساتھ نکلی اور اسے ہوٹل کے لیے کہا۔ کار ہوٹل کی جانب جا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ ایک روز پہلے والی حالت ہے۔ ذہن کسی حد تک پُرسکون ہے۔

''دوائیں اپنا کام کر رہی ہیں۔'' میں نے سوچا اور سوچ پھر آنے والے وقت کے بارے میں گھوم گئی۔ میں ذہنی طور پر ہتھیار ڈال چکی تھی۔

پھر اسی کیفیت میں وہ دن بھی آ گیا جب مجھے دبئی جانا تھا۔ ذیشان سے صرف فون پر بات ہوتی رہی تھی اور وہ بھی کچھ زیادہ نہیں اس نے بتایا تھا کہ وہ پھر سے اسلام آباد پہنچ گیا ہے اور اس کے بابا اس کے ساتھ ہیں۔ لیاقت کے کام کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ واپس آ کر کر دے گا اور وہی میں نے لیاقت کو بتایا تھا۔ ایگریمنٹ سائن کرنے سے لے کر فائنل ریہرسل تک کا وقت آرام سے گزر گیا تھا۔

ائرپورٹ جاتے ہوئے ایک بار پھر کچھ نروس ہوئی لیکن جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ لگائی تو وہ بھی ختم ہو گئی اور میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ اب اگلے مرحلے کا انتظار تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ائرپورٹ پر احسان شیخ کا ڈرائیور آئے گا اور مجھے ہوٹل پہنچا دے گا جہاں سے مجھے ریاض شیخ لوکیشن دکھانے آ جائیں گے۔

''ڈرائیور مجھے پہچانے گا کیسے؟'' میں نے سوال کیا تو کہا گیا اس کے پاس تمہاری تصویر ہو گی۔

''کوئی پریشانی ہو تو اس نمبر پر ڈائل کر دینا۔'' مجھے ایک نمبر دے کر کہا گیا۔

دبئی ائرپورٹ پر اترنے کا اعلان ہوا تو میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ جہاز اترا اور ایک ایک کر کے مسافر اترنے لگے۔ لاؤنج سے اپنا سامان لینے اور امیگریشن تک پہنچنے تک بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ امیگریشن کروا کر ٹرالی گھسیٹتے ہوئے باہر نکلی تو ایک شخص میری جانب بڑھا۔ ''میں احسان ہوں۔'' اس نے کہا اور میں اسے دیکھتی رہی۔ یہ نہ کہہ سکی کہ مجھ سے تو کچھ اور کہا گیا تھا۔

''جو نمبر آپ کو دیا گیا تھا، اسے ڈائل کر کے دیکھ لیں، وہ میرا ہی نمبر ہے۔'' اس نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

''جی...... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اس نے بڑھ کر مجھ سے ٹرالی لے لی۔

میں اُس کے پیچھے چل رہی تھی۔ جو خاکہ ذیشان نے اس کے بارے میں بیان کیا تھا، وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کے چہرے پر بھی نرماہٹ تھی اور درشتگی نہیں تھی جو کرمنل لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز بہت نرم تھا۔

ہم عمارت سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک مرسیڈیز ہماری جانب بڑھی۔ اس کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر میرا بیگ لیا اور احسان نے اس سے چابی لی۔ لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے مزید حیران کر دیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

کار کچھ آگے بڑھی تو اس نے کہا۔ ''ہوٹل یا گھر؟''

اس کا سوال ایسا تھا کہ میں فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔ ''ہوٹل میں گھر کا آرام ملے گا اور گھر پر ہوٹل کا جو مناسب سمجھیں۔'' اس نے کہا۔

''جو آپ مناسب سمجھیں۔'' میں نے کہہ دیا۔

''پھر ایسا کرتے ہیں ہوٹل کا مزہ لینے گھر چلتے ہیں۔'' اس نے اپنا فیصلہ بتایا۔

''کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' کچھ دیر بعد اس نے پھر سے خاموشی توڑی۔

''میزبان آپ ہیں پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے کہا اور وہ ہنس دیا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ میں دبئی کی سڑکیں اور ان پر ٹریفک کی روانی دیکھنے میں مصروف تھی اور اس کے پاس بھی شاید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

ہم سمندر کے کنارے ایک ولا پر پہنچے اور اس کے پہلے ہارن کے ساتھ ہی گیٹ کھل گیا اور وہ کار اندر لے کر چلا گیا۔ فوراً ہی ایک شخص آگے بڑھا اور احسان نے کار کی چابی دی اور مجھ سے کہا۔ ''تشریف لائیے۔''

ہم ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور ایک ملازم فوراً ہی حاضر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی احسان نے میری طرف دیکھا۔

''چائے، کافی یا کچھ اور......'' احسان نے مجھ سے سوال کیا۔

''صرف...... چائے......'' میں نے جواب دیا۔

احسان نے ملازم کی طرف دیکھا، میرے لیے کافی اور خاتون کے لیے چائے۔ ساتھ کچھ لے لینا۔'' احسان نے کہا اور ملازم واپس چلا گیا۔

آپ سے پوچھے بنا چائے کا آرڈر دینے پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل ایک میٹنگ کی وجہ سے لنچ بھی نہیں لے سکا۔ سوچا تھا راستے میں کچھ لے لوں گا لیکن راستے میں ٹریفک اتنا تھا کہ ایک گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔'' احسان نے کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

میں ذہنی طور پر تیار تھی کہ مجھے گھر لانے کا اس کا مقصد کیا ہے لیکن اس نرم رویّے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ چائے آنے میں دیر نہ لگی۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے۔

احسان نے ان لوازمات کے ساتھ انصاف شروع کیا اور ساتھ مجھے بھی کچھ لینے کے لیے کہتا رہا لیکن میں نے خود کو چائے تک محدود رکھا۔ چائے ابھی جاری تھی کہ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دیتا ہوں۔ آپ فریش ہو جائیں پھر طے کرتے ہیں کہ ڈنر گھر پر لیں گی یا باہر۔'' اس نے کہا۔

پھر ویسا ہی ہوا جیسا اس نے کہا تھا۔ چائے کے بعد وہ مجھے اوپر لے گیا اور ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ جب ہم داخل ہوئے تو کھڑکیوں پر پردے ڈلے تھے لیکن جیسے ہی پردے اس نے ہٹائے۔ میں وہ نظارہ دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ سامنے سمندر تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے سمندر اور اس کی موجیں دیکھی تھیں۔ درمیان میں ایک سڑک تھی اور اس کے ساتھ ہی شور مچاتا سمندر تھا۔

''آپ چاہیں تو پردہ گرا کر آرام بھی کر سکتی ہیں۔'' اس نے کہا لیکن میرے ہونٹوں سے فوراً نہیں، نہیں نکلا تھا۔

''میں کچھ دیر دیکھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے کونے میں رکھی کرسی اٹھا کر کھڑکی کے ساتھ رکھ دی۔

''لاہور والوں کے لیے سمندر میں بڑی کشش ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرا تعلق حویلیاں کے پاس ایک گاؤں سے ہے۔'' میں نے کہا اور اس نے کوئی جواب دیے بغیر مجھ پر ایک نظر ڈالی اور باہر کی جانب چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ملازم نے دستک دی۔ اس کے ساتھ خشک میوہ جات کی ٹرے تھی۔ اس نے میری کرسی کے ساتھ وہ ٹرے رکھی اور خاموشی سے چلا گیا۔

میں وہاں تب تک بیٹھی رہی جب تک اندھیرا پوری طرح نہ چھا گیا۔ وہاں سے اٹھ کر بستر پر آئی تو ذہن بالکل ہلکا ہو گیا تھا شاید اسی لیے آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں، آنکھ کھلی تو ایک خاتون مجھے جگا رہی تھیں۔ اس نے انگریزی میں کہا کہ صاحب نیچے ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہے ہیں۔

وہ شکل سے فلپائن کی لگ رہی تھی۔ میں نے گھڑی میں دیکھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ ڈرائنگ روم تک جانے میں مجھے دیر نہیں لگی تھی۔ احسان وہاں انتظار کر رہا تھا۔ میں نے چینج کیا تھا اور ہلکا میک اَپ کیا تھا۔ احسان نے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ میرے سوری کے جواب میں اس نے کہا۔ ''خوب صورت لوگوں کی زبان سے یہ الفاظ اچھے نہیں لگتے۔''

میں نے نارمل انداز میں سنا اور شکریہ ادا کیا۔

''میں نے ٹیبل بک کروالی تھی۔'' اس نے کہا اور میں صرف ٹھیک ہے، کہہ کر رہ گئی۔

وہ ریسٹورنٹ سمندر کے کنارے ہی تھا لیکن جو ٹیبل ہمارے لیے تھی، وہ ایک پلیٹ فارم پر تھی جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں نیچے موجیں پورے زور سے ٹکرا رہی تھیں۔

ہمارے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد کھانا سرو ہوا اور ساتھ ہی اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''حویلیاں میں کس طرف؟'' اس نے کہا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گاؤں کا پتا سمجھایا اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے وہ سب نہیں بتانا چاہیے۔ میں جس حیثیت سے وہاں تھی، وہ میرے علاقے کی نیک نامی کا باعث نہیں تھا۔

''بی اے لاہور سے کیا ہے؟'' اس نے اچانک انگریزی میں سوال کیا۔

''ملتان سے۔'' میں نے مختصر جواب دیا تھا۔ مجھے اس کے اپنے ماضی کے بارے میں سوالات سے اُلجھن ہو رہی تھی۔

''تو تمہارا پہلا اشتہار ہے۔'' اس نے اپنی انگریزی جاری رکھی تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ اتنا کم بولنا شاید ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نے کچھ دیر رک کر کہا۔

''وہ بھی شاید اس لیے کہ جس نے یہ ایڈ کرنا تھا وہ شادی کر کے چلی گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ کس نے کہا؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ریاض شیخ صاحب نے بتایا تھا۔'' میرا جواب تھا۔

''حقیقت یہ نہیں ہے۔'' احسان نے کچھ دیر رکنے کے بعد کہا۔ ''شادی اس نے کی ہے لیکن اشتہار سے نکلنے کے بعد۔'' احسان کا جواب میرے لیے حیران کن تھا۔

''میں سمجھ نہیں سکی ہوں۔'' میں نے وہی کہا جو میرے ذہن میں تھا لیکن احسان نے اس کا جواب دینے میں کچھ وقت لیا۔

''ریاض شیخ نے اپنی ایک اور اشتہاری کمپنی اپنے بہنوئی کے نام سے کھولی تھی اور جس سے اس ماڈل نے

شادی کی ہے اس کمپنی میں اس کا اکاؤنٹ آ گیا اور اس سیٹھ کے اصرار پر ریاض شیخ اسے ماڈل لینے پر اصرار کرتا رہا تھا۔" احسان نے کہا۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاض شیخ صرف فرنٹ مین ہے؟" میں نے کہا اور احسان کی آنکھوں میں میرے لیے تعریف ابھر آئی۔

"جب میرے علم میں یہ تمام باتیں آئیں تو میں نے اس سیٹھ سے پوچھا کہ وہ اس ماڈل کو کیوں پروموٹ کر رہا ہے اور وہ بھی اس طرح تو اس کا جواب تھا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ میں نے جب کہا کہ جب وہ ماڈل نہیں رہے گی تب بھی تو اس پر بھی اس نے ہاں کہا تھا اسی دوران مجھے تمہاری فوٹو شوٹ ملی اور میں نے اسے نکال کر تمہیں لینے کے لیے کہہ دیا۔" احسان کی کچھ بات سمجھ میں آئی اور کچھ نہیں لیکن میں نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ شادی اب کتنے دن چلتی ہے۔" احسان کچھ دیر بعد بولا تھا۔

اس ریسٹورنٹ میں کھانے سے زیادہ میں سمندر کی موجوں کے ٹکرانے اور پانی کے اچھلنے سے لطف اندوز ہوئی تھی پھر جب احسان نے چلنے کے لیے کہا تو میں کہتے کہتے رک گئی کہ کچھ دیر اور رک جائیں۔

گھر پہنچے تو گاڑی کی چابی ڈرائیور کو دینے کے ساتھ وہ میرے ساتھ ہی اوپر آ گیا۔ ہم دونوں اس جگہ آ کر رکے تو اس نے کہا۔ "کہاں جانا پسند کریں گی؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے کہا دائیں جانب آپ کا کمرا ہے اور بائیں جانب میرا۔" اس نے لہجہ اب بھی نرم رکھا تھا۔

"جہاں آپ کہیں۔" میں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لیے میں نے لفظ بھی وہی ادا کیے جو وہ سننا چاہتا تھا۔

میرا جواب سنتے ہی اس نے پہلی بار مجھے چھوا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ سو رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ آہستہ سے اٹھ کر اس کمرے میں آ جاؤں جہاں سے سمندر دکھائی دیتا تھا لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود میں بستر سے اتری ہی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور کہا صبح بخیر اور میں بھی مسکرا دی۔

"فریش ہو جاؤ پھر ناشتا کرتے ہیں پھر تمہیں دبئی دکھاتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں سر ہلا کر رہ گئی۔

جتنی دیر میں فریش ہوتی رہی۔ چیخ چیخ کرتی رہی، میرا ضمیر مجھے مستقل کچھ کہے دیتا رہا "ذیشان کے بارے میں تو کہہ سکتی ہو کہ تم سازش کا شکار ہو گئیں لیکن یہ سب کیا تھا؟" گزری رات پر ضمیر مجھے کچھ کہے دیتا رہا تھا۔

"میرے پاس اس کے علاوہ راستہ کیا ہے؟" میں نے ضمیر کو جواب دیا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب کا آخری سہارا تھا، وہ بھی نہیں رہا تھا۔" میں نے کہا لیکن ضمیر نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ "لیاقت کی آفر تھی تیرے پاس۔"

"دوبارہ سے مار کھانے کے لیے یا پھر کسی اور ذیشان کے آگے پیش ہونے کے لیے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

فلپائنی ملازمہ بلانے آئی تو میں تیار تھی۔ ناشتے کی میز پر ہم دو ہی تھے۔ ہم ناشتا کر رہے تھے کہ احسان نے اچانک سوال کیا۔

"ذیشان کو تم کس طرح جانتی ہو؟" اس نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ ذیشان کو جانتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ذیشان کے پورے خاندان کو جانتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس نے ذیشان کا خاندانی پس منظر بیان کرنا شروع کیا جسے میں کچھ کچھ جانتی تھی۔

"ویسے ذیشان خود اس لیے مظلوم ہے کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔" احسان نے کہا اور میرا نوالہ میرے ہونٹوں تک پہنچ سکا تھا۔

"ذیشان کے بڑے بھائی کا ان کے دشمنوں نے قتل کیا تو ذیشان کے باپ نے ذیشان کی شادی بیوہ بھابی سے کروا دی تاکہ زمین ہاتھ سے نہ نکلے۔" احسان کے الفاظ میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے، ساتھ ہی ذیشان کے الفاظ یاد آئے۔ "کبھی فرصت ملی تو تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"دو بچیوں کی ماں سے شادی کر کے ذیشان خوش نہیں ہے لیکن خاندانی مجبوری ہے۔"

"کیسی ہے اس کی بیوی؟" میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکی۔

"میں نے دیکھا نہیں لیکن ویسی ہی ہو گی جیسے اس طرف کی دیہاتی خواتین ہوتی ہیں۔ پھر ویسے بھی وہ ذیشان سے بارہ چودہ برس بڑی ہے۔" احسان نے کہا۔

"بہت تفصیل سے جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"بیٹے کے قتل کے بعد اس کے باپ نے میرے والد سے مدد مانگی تھی جو میں بھول گیا تھا لیکن پچھلے دنوں اس نے ایک سرکاری کام میں ریاض شیخ کے ذریعے مدد مانگی تھی۔ ایک سفارش کروانے کے لیے مگر میں پہلے ہی کسی کی سفارش کر چکا تھا۔"

"تو آپ نے اس کی سفارش نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"تم کہو تو میں کر دیتا ہوں۔ پہلی سفارش واپس لے لیتا ہوں۔" احسان نے کہا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو اپنی بات پر قائم رہنا چاہیے۔" احسان نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں اس سے یہ نہ کہہ سکی کہ مجھے یہاں تک پہنچانے میں ذیشان کا نوے فیصد ہاتھ ہے۔ لیاقت کا کام کر کے وہ مجھے چھوڑ دیتا تو میں یہاں اس حالت میں نہ ہوتی۔

"اس کی کیا گارنٹی تھی کہ ایک بار کامیابی کے بعد لیاقت دوسری بار وہی حرکت نہ کرتا۔" ذہن کے کسی گوشے نے ذیشان کے حق میں دلیل دی تھی۔

"تم چینج کرو گی یا۔۔۔؟" احسان نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے کہا تو اس نے کہا۔ "تم ٹھیک ہو لیکن مجھے چینج کرنا ہوگا۔"

"میں انتظار کرتی ہوں۔" میں نے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہم باہر نکلے تو ڈرائیور گاڑی لیے کھڑا تھا۔ احسان نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور پھر گھوم کر پچھلی نشست پر آ گیا۔ "شارجہ چلو۔" احسان نے ڈرائیور سے کہا تھا۔

"کچھ دیر لگے گی لیکن مجھے کچھ کاغذات پر دستخط کرنے ہیں کیونکہ وہ شخص آج ہی واپس لندن جا رہا ہے۔" اس نے کہا اور میں صرف او کے کہہ کر رہ گئی۔

احسان نے مجھے کار میں نہیں چھوڑا۔ جہاں ہم آئے تھے وہ ایک ہوٹل تھا جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ احسان نے خرید لیا ہے اور اس پر دستخط کرنے والا اس کے ساتھ ہوٹل کا پرانا مالک تھا جو ایک انگریز تھا۔ ہوٹل پر تقریباً ہمیں ایک گھنٹا خرچ ہوا وہاں سے واپسی پر ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں احتجاج کرتی یا کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی لیکن مجھے اس کے اس عمل پر حیرت ہوئی تھی۔

"نہ جانے کیوں میرا دل تمہیں چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہ رہا۔" اس نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے اس کے ہاتھ سے ہاتھ نہیں نکالا مگر سوال کر دیا۔

"میرے دو بھانجے ہیں جو اب میری ذمے داری ہیں انہوں نے بلوایا ہے تو مجھے جانا ہے۔" اس کا جواب تھا۔

"کب؟" میں نے سوال کیا۔

"کل صبح فلائٹ ہے۔" اس نے جواب میں کہا۔

میں کیا کہہ سکتی تھی اس لیے خاموش رہی۔ وہ راستے بھر میرے ہاتھ سے کھیلتا رہا اور میں خاموشی سے باہر سڑک پر دیکھتی رہی۔

دن کا باقی وقت ہم نے مختلف شاپنگ مال میں گزارا۔ وہ دل بھر کر میرے لیے شاپنگ کرتا رہا تھا۔ لنچ بھی ہم نے ہوٹل میں کیا لیکن شام سے پہلے وہ مجھے لے کر سمندر کے کنارے گیا۔۔۔۔۔ میرے ساتھ سمندر میں بھی کچھ دور تک گیا اور وہیں کے ایک ہوٹل پر ہم نے چائے پی اور پھر اس نے کہا۔ "جہاں کل ڈنر کیا تھا، وہاں چلیں۔" میں نے حامی بھر لی حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہوں میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔

ہم اسی ریسٹورنٹ میں آئے جہاں ایک روز پہلے بھی آئے تھے۔ احسان نے آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہارے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"جتنا کچھ آپ نے جان لیا ہے، اتنا کافی نہیں ہے؟" میں نے کہا لیکن خود مجھے اپنا لہجہ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

"رہا میرا ماضی تو میں اس پر بات کرنا نہیں چاہوں گی لیکن اگر آپ اصرار کریں گے تو۔۔۔" میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد ایم اے کی ٹرائی کیوں نہیں کی؟" اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔

"جس فیلڈ میں اب آ گئی ہوں، وہاں تعلیم سے زیادہ اہمیت دوسری چیزوں کی ہے۔" میں نے کہا نہ جانے کیوں میرا وہ لہجہ برقرار ہی رہا تھا۔

"میں بھی جو کچھ بننا چاہ رہا تھا، اس سے بہت دور ہوں۔ دو بھائیوں کے قتل اور بہن کی موت اس سے پہلے بہنوئی کے قتل نے ایک نئے راستے پر چلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دونوں بھانجوں کی ذمے داری نے بہت کچھ کرنے

سے روکا ہوا ہے۔'' وہ کہتا چلا گیا۔

ہم نے ایک روز مل سے کم وقت وہاں گزارا۔ احسان بھی کچھ جلدی میں تھا۔ ہم گھر آ گئے اور اوپر کی جانب بڑھے ہی تھے کہ احسان کا ہاتھ میری کمر پر آ گیا پھر ہم اسی طرح اس کے کمرے تک آ گئے۔ ایک روز مل کی طرح اس نے اجازت لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

صبح تک ہم جاگتے رہے۔ ابھی سورج کی کرنیں زمین تک پہنچی نہیں تھیں کہ احسان نے کہا۔ ''تم اگر یہاں رہنا چاہو تو یہاں رہ لو، ہوٹل شفٹ کرنا چاہو تو ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں، میری فلائٹ ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہوٹل مناسب رہے گا۔'' میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا کر رضامندی دے دی تھی۔

میں اور وہ تقریباً ساتھ ہی تیار ہوئے تھے۔ پہلی بار میں نے اسے سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا۔

''اسمارٹ نظر آ رہا ہوں؟'' میری آنکھوں میں اس نے ستائش دیکھ کر سوال کیا اور میں نے مسکرا کر داد دی۔

پروگرام میں صرف اتنی تبدیلی ہوئی تھی کہ ڈرائیور کے بجائے مجھے چھوڑنے احسان خود گیا تھا۔ احسان کی آمد کے ساتھ ہی صبح سویرے ہوٹل میں ایک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر کچھ ہدایات دیں اور رخصت ہو کر چلا گیا لیکن رخصت ہونے سے پہلے اس نے ایک قیمتی ہینڈ بیگ مجھے دیا تھا۔ ''کمرے میں جا کر چیک کرنا۔''

کمرا بہت عالیشان تھا اور یہاں سے سمندر بھی نظر آ رہا تھا لیکن آٹھویں منزل سے اس طرح نظر نہیں آ رہا تھا جس طرح احسان کے گھر سے دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے بعد بھی میں بہت دیر وہاں کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی۔ کچھ بھوک کا احساس ہوا تو میں نے ناشتے کے لیے آرڈر دیا۔

''کمرے میں ناشتا لیں گی یا نیچے ڈائننگ ہال میں۔'' فون پر اس نے کہا اور میں نے ہال میں جانے کو ترجیح دی۔

ہال میں مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ کچھ نظریں میری جانب اٹھیں اور پھر وہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر نکلی اور سیدھی کمرے میں آئی کیونکہ ناشتا کرتے ہوئے مجھے یاد آیا تھا کہ ہینڈ بیگ دیتے ہوئے احسان نے کہا تھا کہ کمرے میں جا کر چیک کرنا۔

میں نے کمرے میں آتے ہی بستر پر پڑے بیگ کو چیک کیا۔ اندر ڈالرز تھے جنہیں میں نے گنے بغیر ویسے ہی چھوڑ دیا اور وہ پرچی پڑھنے لگی جو ڈالرز کے ساتھ تھی۔

''ان تمام لمحات کے لیے شکریہ جو تم نے مجھے دیے۔'' پرچی پر انگریزی میں لکھا تھا۔

''تو یہ ڈالرز ان لمحات کی قیمت ہے۔'' ذہن میں سرگوشی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ذیشان کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ نوٹوں کی بارش ہوگی۔

سونے سے پہلے میں نے وہ ٹیگ بھی پڑھا تھا جس کے مطابق وہ ہینڈ بیگ مگرمچھ کی کھال سے بنا ہوا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹس جل رہی تھیں اور پہلا چہرہ جو نظر آیا تھا، اسے دیکھ کر میں نے سوچا بہتر تھا کہ میں سوئی ہی رہتی۔

''میں تو پریشان ہو گیا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ تم دن بھر سوتی رہی ہو۔'' ریاض شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

''بہت تڑپا ہوں میں تمہارے لیے۔'' اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا لیکن اس کا یونہی قریب آنا مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ ایک کراہیت سی ذہن میں ابھری تھی لیکن میں نے اسے دور نہیں کیا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کچھ دیر کی مہلت لینے کے لیے کہا اور اس نے فوراً ہی کھانے کا آرڈر دینا شروع کر دیا۔

ریاض شیخ کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ کلائنٹ کا کہنا ہے کہ اگلے ہفتے تک آن ایئر ہو جانا چاہیے۔ میں خاموش رہی۔ میں نے اس سے نہیں کہا کہ میں اس کی اصلیت جان چکی ہوں۔ کہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

کراہیت میں ایک چھوٹا سا وقفہ کھانے کے دوران آیا تھا لیکن اس کے بعد وہ دور اس وقت تک رہا تھا جب ریاض شیخ نڈھال ہو کر سو نہیں گیا تھا۔ سونے سے پہلے وہ مجھے بتا چکا تھا کہ ندیم چیمہ سمیت پورا یونٹ رات میں پہنچ جائے گا اور کوشش ہوگی کہ کل سے ہی شوٹنگ اسٹارٹ ہو جائے۔

وہ رات ہی کا کوئی پہر تھا جب ندیم کا فون آیا۔ ''وہ لوگ بھی پہنچ گئے ہیں اور اسی ہوٹل میں ہیں، صبح کس وقت آپ تیار ہو سکیں گی؟'' ندیم کا سوال تھا۔

''جب تم کہو۔'' میرا جواب تھا۔

''دس بجے......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا اور میں نے ہامی بھر لی۔

میں دیر سے سوئی تھی لیکن صبح جلد اٹھ گئی۔ فریش ہو کر

باتھ روم سے نکلی تو اس نے حیرت سے پوچھا، جلدی اٹھ گئی تھیں۔

میں نے اسے ندیم کے فون کی اطلاع دی تو اس نے فوراً ریسپشن سے ندیم کے روم نمبر کا معلوم کیا اور پھر اسے ڈائل کر کے باتیں کرنے لگا۔ میں تیار تھی تو میں نے اس سے کہا کہ میں ناشتے کے لیے جا رہی ہوں لیکن اس نے مجھے روکا۔

''میں بھی اپنے کمرے میں جا رہا ہوں اور تیار ہو کر نیچے ہی آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے احسان کا دیا ہوا ہینڈ بیگ لاکر میں رکھا اور تین سو ڈالر نکال کر اپنے بیگ میں رکھے اور نیچے آ گئی۔ یونٹ کے چند لوگ مجھ سے پہلے پہنچ گئے تھے پھر کچھ دیر میں ندیم بھی آ گیا۔

وہ میری ٹیبل پر ہی آیا تھا۔ چند رسمی باتیں کی تھیں اور ساتھ ساتھ ہدایتیں بھی دے رہا۔

''ہم یہاں سے اسٹوڈیو جائیں گے وہاں اِنڈور شوٹ کریں گے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''شام سے پہلے فارغ ہو گئے تو کچھ شاٹ سمندر کے ہی لے لیں گے اور نہیں تو کل صبح سمندر کے بعد ہورڈنگ وغیرہ شوٹ کر لیں گے۔''

میرا خیال تھا کہ سب کچھ آسان ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا پہلے دو گھنٹے تو میک اَپ میں ہی لگے پھر کپڑوں کی فٹنگ پر اسے اعتراضات تھے۔

ایک بجے کے بعد اس نے شوٹ کرنا شروع کیا لیکن سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود نئے زاویے کے وہی کچھ شوٹ کرتا تھا۔

چھ بجے کے قریب اس نے پیک اَپ کیا تو سب نے سکھ کا سانس لیا اور ان میں سب سے آگے میں تھی۔

''دس منٹ مزید پیک اَپ نہ کہتے تو میں بے ہوش ہو جاتی۔'' میں نے کہا لیکن ندیم کی گردن نفی میں ہل گئی تھی۔

''تمہاری انرجی دیکھ کر ہی میرا بھی دل چاہا تھا کہ پرفیکٹ شوٹنگ کروں ورنہ ماڈلز کے نخرے اتنے ہوتے ہیں کہ ہم بھی کام چلاؤ پر زور دیتے ہیں۔'' ندیم نے کہا۔

''پانچ اشتہاروں میں بھی تم نے یہ انرجی دکھائی تو تمہیں شہرت کی بلندیوں تک جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' اس نے کہا۔

''یہ پانچ اشتہاروں کی کیا شرط ہے؟'' میں نے سوال کیا اور وہ ہنس دیا۔

''پانچ اشتہاروں میں یہ شہرت بن جائے گی کہ تم وقت پر آتی ہو اور محنت سے کام کرتی ہو۔ اس کے بعد تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم فوراً ہی واپس نہیں آئے۔ راستے میں ندیم نے یونٹ کے سب لوگوں کو چائے پلوائی تھی۔ ہوٹل پہنچے تو اندھیرے کا قبضہ شروع ہو گیا تھا۔

ریاض شیخ نے میری ہوٹل آمد کے کچھ دیر بعد آنے کی بات کی تو میں نے طبیعت کی خرابی کی اطلاع دی تھی۔ وہ فون پر ہی شروع ہو گیا۔ ''یہ طبیعت بھی ابھی خراب ہونی تھی۔'' اس نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

''اب اس میں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا اور اس نے فون رکھ دیا۔

میرا دل چاہا تھا کہ اپنے اس کامیاب جھوٹ پر قہقہے لگاؤں اور میں نے لگائے بھی لیکن میرے قہقہے بے آواز تھے۔

ڈنر میں نے ڈائننگ ہال میں یونٹ کے باقی لوگوں کے ساتھ کیا تھا اور پھر کمرے میں آ کر سو گئی تھی۔ ایک رات پہلے کی کراہیت کو یاد کر کے میں بے چین ہوئی لیکن پھر آرام کی نیند سو گئی۔

صبح کچھ دیر سے آنکھ کھلی۔ میں جلدی سے تیار ہو کر پہنچی تو وہاں تقریباً تمام ہی افراد موجود تھے ندیم کے علاوہ۔ میں نے ندیم کا معلوم کیا تو بتایا گیا کہ وہ سویرے یہ کہہ کر نکل گیا تھا کہ اسٹوڈیو پہنچو وہ وہیں جوائن کر لے گا۔

ندیم کے آنے سے پہلے میک اَپ شروع ہو چکا تھا اور اس وقت کی شوٹنگ کے لیے ڈریس بھی تیار ہو رہا تھا۔ ندیم دس بجے کے بعد آیا تھا اور آتے ہی اس نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ میری طرف آیا جہاں میک اَپ ہو رہا تھا تو میں نے پوچھا۔ ''صبح صبح کہاں نکل گئے تھے؟'' اس نے میرا سوال سنا اور مسکرانے لگا۔

''تم نے اس موٹے ریاض شیخ کا موڈ آف کر دیا اور اس نے میرا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے جو کہا تھا، وہ میک اَپ کرنے والی لڑکیوں نے اگر سنا بھی تو سمجھی نہیں ہوں گی لیکن میرا چہرہ شرم سے لال ہو گیا تھا مگر بات ایسی تھی کہ میں جواب نہیں دے سکی۔

ندیم نے کہا تو تھا کہ اس کا موڈ آف ہے لیکن کام شروع ہوا تو وہ نارمل تھا۔ وہیں مجھے معلوم ہوا کہ ریاض شیخ کی واپسی ہو گئی ہے۔ ڈیڑھ بجے تک ہم اسٹوڈیو کا کام ختم کر کے سمندر کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ وہاں شام ڈھلے

تک مصروف رہے۔ ریاض شیخ کا فون واپسی پر آیا، وہ چاہتا تھا کہ کل صبح کام ختم کر کے شام تک واپس آجائیں۔ ندیم اس کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا لیکن آخر کار مان گیا۔

"کیا ابھی بہت کام باقی ہے؟" تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "دو گھنٹے سے بھی کم کا کام ہے لیکن یہ جو سب آئے ہیں ان کے پاس گھر والوں کی شاپنگ لسٹ ہے، کچھ خریداری تو کریں گے۔" اس کا جواب تھا۔

"میرا کام نہیں ہے تو میری واپسی کروا دو۔" میں نے کہا۔

میری واپسی کا ٹکٹ دو دن بعد کا تھا لیکن ندیم نے تعلقات استعمال کیے اور اگلے روز تین بجے کی فلائٹ کروا دی۔

رات میں نے سامان چیک کیا تو زیادہ تھا۔ احسان نے جو شاپنگ کروائی تھی، اس نے یہ غور کیے بغیر ہی کروائی تھی کہ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ ڈنر پر ندیم سے ذکر کیا تو وہ ہنس دیا۔ "جتنا سامان لے جا سکتی ہو، لے جانا باقی ابھی بیگ لے لیتے ہیں ان میں ڈال دینا ہم آتے ہوئے لے آئیں گے۔"

ڈنر کے فوراً بعد ہوٹل سے کچھ دور وہ دکان پر لے گیا اور دو بیگ خرید لیے اور ہم واپس آگئے۔ رات کا کچھ حصہ میں نے سامان کی پیکنگ میں گزارا اور پھر دیر تک اپنے بارے میں سوچتی رہی کہ میں کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ کیچڑ سے بھرے گناہ کے راستے پر چلتے ہوئے میں اُلجھ گئی تھی لیکن ابھی تو ابتدا تھی۔

ذیشان سے کئی دنوں سے بات نہیں ہوئی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے فون کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ دو دن آرام کی نیند کرنے کے بعد جی چاہ رہا تھا کہ راتیں اسی طرح گزریں۔

اگلے روز باقی کی شوٹنگ کر کے ندیم نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے ائرپورٹ چھوڑ دے۔ وقت سے پہلے آگئی تھی اس لیے آرام سے بورڈنگ کارڈ لیا اور لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ احسان کا دیا ہوا ہینڈ بیگ میں نے کاندھوں پر لٹکایا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ لوگ اسے دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ جہاز اُڑا تو میں بالکل نروس نہیں تھی اور نہ ہی کراچی ائرپورٹ پر اترتے ہوئے اور سامان لیتے ہوئے کوئی گھبراہٹ ہوئی۔ باہر نکلی تو سامنے ذیشان نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں بیگ لے لیے تھے۔

"مجھے فون تو کر دیتیں۔" اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا لیکن ذیشان کا چہرہ دیکھتے ہی میں نے جھوٹ گڑھ لیا تھا۔

"ندیم چیمہ نے کہا تھا کہ وہ فون کر دے گا آپ کو بھی اور ریاض شیخ کو بھی۔" میں نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا اور ذیشان نے یقین بھی کر لیا۔

کار ائرپورٹ سے باہر نکلی تو ذیشان نے کہا۔ "کیسا رہا ٹرپ؟"

"بہت اچھا بلکہ بہت ہی اچھا۔" میں نے کہا۔

"جاتے ہوئے تم نروس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ جلد عادی ہو جاؤ گی۔" اس نے کہا۔

"تم سے پہلے یہی بات لیاقت کہہ چکا ہے، کچھ الگ الفاظ میں۔" میں نے ہونٹوں پر آئے ہوئے فقرے کو روک لیا تھا۔

کار کچھ آگے بڑھی تو میں نے لیاقت کے بارے میں پوچھا۔ "آج دوپہر ہی وہ ملتان گیا ہے۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"اس کے پروموشن کے پیپر تیار تھے لیکن وہ ملتان سے آتے ہوئے کچھ کاغذات نہیں لایا تھا۔" ذیشان کا جواب تھا۔

کار کا رخ گھر کی جانب ہی تھا۔ ہم گھر پہنچے تو وہاں اس کی دوسری گاڑی بھی کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ہم کار سے اترے تو ڈرائیور بڑا سا کیک لے کر ہمارے پیچھے داخل ہوا۔ ذیشان نے اسے کمرے میں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔

"یہ کیا ہے ذیشان؟" میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگا۔

"تمہارا پہلا اشتہار مکمل ہوا ہے۔ پارٹی تو بنتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس جشن میں صرف ہم دو تھے۔ کیک کاٹنے کے بعد اور چائے پیتے ہوئے ذیشان نے کہا۔ "میں نے تمہارے ڈرائیونگ سیکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دوپہر سے تم ڈرائیونگ سیکھنا شروع کر دو گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس رات کھانے کے بعد ہم گھر آئے تھے۔ میرا کئی بار دل چاہا کہ میں اسے بتا دوں کہ اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہوں لیکن ہر بار کچھ سوچ کر خاموش رہی۔

چار دن اسی طرح گزر گئے۔ پانچویں روز ندیم چیمہ کا فون آیا کہ اشتہار فائنل ہو گیا ہے۔ چاہیں تو کل دفتر آ کر دیکھ لوں۔ میں جانا چاہتی تھی لیکن ریاض شیخ کی وجہ سے... کچھ

کشمکش کا شکار تھی پھر ندیم چیمہ نے بتایا کہ ریاض شیخ کی بیگم کی طبیعت خراب ہوگئی ہے اور کل رات انہیں اسپتال میں داخل کر لیا ہے جہاں حالت سدھرنے کے بجائے بگڑتی جارہی ہے اس لیے اگر تم آجاؤ تو بہتر رہے گا اور تو کوئی ہوگا نہیں۔

میں موٹر ٹریننگ اسکول سے سیدھے ریاض شیخ کے دفتر پہنچی تھی۔ ذیشان کہہ چکا تھا کہ وہ براہِ راست وہیں پہنچے گا۔ اسکرین پر خود کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ ''اتنی خوب صورت تو میں کبھی بھی نہیں تھی۔'' روشنی دوبارہ ہوئی تو میں نے تبصرہ کیا اور ندیم چیمہ سمیت سب نے اس پر تالیاں بجائی تھیں۔

وہاں سے واپسی پر ذیشان کی کار میں نے ہی ڈرائیو کی تھی۔ ہم ڈنر کے لیے ہوٹل پہنچے تو ذیشان نے بہت آہستگی سے سوال کیا۔

''تمہاری دبئی میں احسان کبھی سے ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا۔ ''احسان نے میرے ٹریننگ پر جانے پر میرے مخالف کی سفارش کی ہے۔''

''تو پھر......'' میں نے سوال کیا۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ احسان نے اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ میں نے اس رقم کا بھی ذکر نہیں کیا جو احسان نے دی تھی اور اب بھی اس کے بیگ میں رکھی تھی۔

''تمہارے پاس اس کا نمبر ہے۔'' ذیشان نے دوسرا سوال کیا اور میں نے انکار کر دیا۔

''وہ لندن جارہا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے مجھے ہوٹل ڈراپ کیا تھا۔ نہ اس نے نمبر دیا نہ میرا نمبر مانگا۔'' میں نے جھوٹ کہا اور ذیشان کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

جس روز ندیم چیمہ نے مجھے وہ اشتہار دکھایا تھا، اس کے تیسرے دن وہ اشتہار ٹی وی پر چلنا شروع ہوا۔ رات میں اشتہار چلا اور صبح کے اخباروں میں اشتہار کے ساتھ میری تصویریں چھپی تھیں۔ ندیم چیمہ نے پانچ لاکھ کا چیک دیتے ہوئے بینک اکاؤنٹ کا معلوم کیا تھا پھر اسی نے اپنے کسی بینک منیجر دوست سے کہہ کر اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا تھا۔ میں نے ذیشان کی دی ہوئی رقم کے ساتھ احسان کی رقم بھی جمع کروادی تھی۔ زیادہ پیسے نہیں رکھے تھے۔ رقم رکھ کر کرنا بھی کیا تھا، میرے اخراجات تو دوسرے لوگ پورے کررہے تھے۔

لیاقت سے تعلق واجبی سا رہ گیا تھا لیکن میرے اشتہار کی ریلیز کے ساتھ اس کے رویّے میں جارحانہ پن آرہا تھا پھر ایک دن وہ کھل گیا۔

''مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے؟'' اس نے کہا۔

''میرے پاس کہاں سے آئی رقم؟'' میں نے انکار کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ اشتہاروں میں تم فری کام کررہی ہو؟'' اس نے کہا لیکن اس کا لہجہ بہت جارحانہ تھا۔

''تم ترقی چاہتے تھے، وہ تمہیں مل چکی ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

''میں تمہارا شوہر ہوں اور میں موٹر سائیکل پر گھوم رہا ہوں اور تم گاڑیوں میں۔'' اس نے کہا اور میں اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''اسی شام میں نے ذیشان سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا تم فکر نہ کرو، میں سنبھال لوں گا۔'' اور اس نے سنبھال بھی لیا۔ دو روز بعد ہی وہ منہ بسورتا ہوا آیا تھا۔

''میرا کوئٹہ ٹرانسفر ہوگیا ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

''اپنے باس سے بات کرو۔'' میں نے کہا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

پہلے اشتہار کی ریلیز کے ساتھ ہی مجھ سے اشتہارات کے لیے ایجنسیوں نے رابطے کیے۔ میں نے ہر اشتہار قبول نہیں کیا اس میں میرا مشیر ندیم چیمہ تھا اور چھوٹے اشتہاروں میں کام کرنے کے بعد ندیم نے کراچی کی دو اشتہاری ایجنسیوں کے بارے میں بتایا کہ وہ مجھے اپنے اشتہاروں میں لینا چاہ رہے ہیں۔ ندیم کے ذریعے ہی میں نے انہیں اوکے کہا۔ ابھی وہ فائنل ہی ہوئے تھے کہ کوثر نے مجھ سے اپنے ڈرامے کے لیے بات کی لیکن وہ لاہور اور شمالی علاقوں میں شوٹ ہونے تھے۔ میں نے کوثر کو مجبوری بتائی تو اس نے کہا آپ ہامی بھرلیں، میں ایڈجسٹ کرلوں گا۔

میری مصروفیات اتنی ہوگئی تھیں کہ خود مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اتنی مصروف ہوسکتی ہوں۔ ایک اشتہار کراچی میں شوٹ کرنے کے بعد لاہور آئی کچھ شوٹنگ کی اور پھر کراچی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ کراچی میں جس ایجنسی کے لیے شوٹ کررہی تھی، اس کے مالک نے اپنا دوست کہہ کر ایک شخص سے ملوایا تھا جس نے تنہائی ملتے ہی آفر کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ کراچی میں بھی مجھے ایسی ہی آفرملیں جیسی میں نے لاہور جانے کی بات کی تو

انہوں نے لاہور آنے پر بھی رضامندی ظاہر کی اور جب تک لاہور میں رہی گھر نہ جا سکی بلکہ ہوٹل سے ہی کوثر کے ڈرامے کی شوٹنگ کرتی رہی۔ کوثر کے ڈرامے کے سیٹ پر بھی ذیشان سے ملاقات ہوئی تھی۔

''خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تم اتنی معروف ہو گئی ہو کہ فون کرنے کا وقت بھی نہیں رہا۔'' اس کا انداز طنزیہ تھا۔

ذیشان نے رکنے کی بات کی لیکن میں نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر اسے ٹال دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے کہا نہیں۔ جو مشورہ میں نے لیاقت کو دیا تھا کہ ''نئے حالات سے سمجھوتا کرلو۔'' میں نے ذیشان کو نہیں دیا لیکن وہ سمجھدار تھا اس نے خود بھی حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔

میں کراچی میں تھی کہ مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیٹی کا فون آیا کہ ''ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو میں سب کچھ چھوڑ کر ان کے جنازے میں جاتی لیکن میں اس سے صرف اتنا کہہ سکی کہ ''ابھی تو میں کراچی میں ہوں، ایک دوروز میں آؤں گی۔''

کراچی میں شوٹنگ ختم کرتے ہی میں نے اسلام آباد کا ٹکٹ لیا اور ساتھ ذیشان کو فون کیا کہ مجھے ہیڈ ماسٹر کے گھر جانا ہے، اسلام آباد ائرپورٹ سے پک کرلے۔ ساتھ ہی کوثر کو اپنے قریبی عزیز کے انتقال کی خبر دے کر دوروز کی چھٹی مانگی تھی۔

میں جہاز میں سوار ہوئی تو ایک خاتون پچھلی سیٹوں سے اٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔ ''تم رانی ہی ہو نا؟'' اس نے کہا۔ شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی لیکن میں پہچان نہیں سکی۔

''میں لیاقت کی بہن ہوں۔ ملتان میں تمہارے گھر آئی تھی۔'' اس نے کہا تھا اور مجھے یاد آ گیا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' میں نے اپنے برابر کی خالی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم فخر کرتے تھے کہ ہم سردار یعقوب کی اولاد ہیں لیکن تم نے تو ہمارے خاندان کا نام ڈبو دیا۔'' اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں غصہ تھا، شکر ہے کہ اس کی آواز بلند نہیں تھی۔ اسی وقت اس سیٹ کا جس پر وہ بیٹھی تھیں کا مسافر آ گیا۔ میں نے اس سے لیاقت کی بہن کی سیٹ پر جانے کی بات کی تو اس نے کہا ایک شرط پر۔

''آپ میرے ساتھ ایک سیلفی لیں گی۔'' میں تیار ہو گئی۔ ویسے بھی یہ اب معمول کی بات تھی جس محفل میں بھی جاتی وہاں سیلفیاں کھنچوانے والوں کی قطار لگ جاتی تھی۔

لیاقت کی بہن اس شخص کو اپنی سیٹ پر بٹھا کر آئیں تو میں نے آہستہ آواز میں انہیں اپنی پوری کہانی اور اس میں ان کے بھائی کے کردار کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ان کا غصہ تو پہلے چند جملوں میں ہی ختم ہو گیا تھا بلکہ تسلی دینے والے انداز میں انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''اس کے مجرمانہ ذہن کی وجہ سے ہم نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا بلکہ اس دن کے بعد تو ہم سب لاتعلق ہو گئے تھے جب ہمارے علم میں آیا تھا کہ نشے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے ایک باپ بیٹے کو کچل دیا تھا۔'' انہوں نے کہا اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''کہاں ہوا تھا یہ ایکسیڈنٹ؟'' میں نے سوال کیا لیکن ساتھ ہی دعا کرنے لگی کہ وہ کوئی اور مقام بتائیں لیکن اس بار بھی میری دعا رائگاں گئی تھی۔

''حویلیاں کے بعد کوئی مقام تھا۔'' انہوں نے کہا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔

میں اس بات پر رو رہی تھی کہ اپنے بھائی اور باپ کے قاتل کے ساتھ برسوں اس کی بیوی بن کر رہی تھی لیکن میرے آنسوؤں سے بے خبر وہ اپنی بات کہے جا رہی تھیں۔

''ایبٹ آباد سے وہ رات بھر نشہ کر کے چلا تھا اور راستے میں یہ واقعہ ہوا۔ بڑے بھائی جب اٹک میں تھے انہوں نے اپنے تعلقات کو استعمال کر کے اسے بچا تو لیا لیکن ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ اب ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کچھ عرصہ وہ ٹھیک رہا لیکن پھر ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے پھر سے شراب شروع کردی ہے پھر وہ واقعہ جس کی وجہ سے ہم ملتان آئے تھے۔''

میں نے آنسو پونچھ لیے تھے لیکن میری روح رو رہی تھی۔ اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کی کسک ایسی تھی کہ میں اس سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ میرے اندر بدلہ...... بدلے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن بدلہ لینے کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ذیشان ائرپورٹ پر موجود تھا۔ اس نے میرے دکھ کا اندازہ لگایا وہ اسے ہیڈ ماسٹر صاحب کی موت کا صدمہ سمجھ رہا تھا اس لیے سارے راستے تسلیاں دیتا رہا تھا۔ ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں میرے ساتھ عجیب سا برتاؤ ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ سوال تو نہیں کیا کہ کیوں آئی ہو لیکن ان کے چہروں سے واضح طور سے ظاہر تھا کہ انہیں میری آمد پسند نہیں آئی پھر اُن کی بیٹی نے وجہ بھی ظاہر کردی تھی۔

''ابا تمہارے اشتہار کو دیکھ کر روتے رہے تھے۔''
اس نے مجھ پر ایک نفرت انگیزی نظر ڈال کر کہا۔
میں وہاں زیادہ دیر رکی نہیں تھی۔ واپسی پر ایک بار میرا دل چاہا کہ وہاں کچھ دیر کے لیے گاڑی رکواؤں جہاں وہ حادثہ ہوا تھا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ''کیا کہوں گی کمال اور ابا سے کہ آپ کے قاتل کی بیوی آئی ہے۔''
ہم واپسی کے سفر میں تھے۔ کار ہری پور شہر کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ بدلہ...... بدلہ کی آوازیں تیز تر ہو رہی تھیں کہ ذیشان نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں نے احسان پکھی کا نمبر حاصل کر لیا ہے۔'' اس نے کہا اور میں بُری طرح چونک گئی۔
''مجھے اب تک اس کا نام کیوں یاد نہیں آیا؟'' میرے اندر بدلے کی آوازیں احسان پکھی کے نام کے ساتھ ہی خاموش ہو گئیں۔
''احسان سے کہوں گی تو وہ ضرور میری مدد کرے گا۔'' اس کے نام کے ساتھ ہی ایک نئی امید پیدا ہو گئی۔
''تم اگر احسان پکھی سے کہہ دو تو میرا کام ہو جائے گا۔'' ذیشان نے کہا۔
''لیکن وہ مجھے کہاں ملے گا؟'' میں نے ذیشان کی طرف دیکھ کر کہا۔
''میرے پاس اُس کا نمبر ہے۔'' ذیشان نے کہا اور میں ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ لیاقت اور ذیشان میں کتنا فرق ہے۔
میرے ہامی بھرتے ہی اس نے وہ نمبر ڈائل کر دیا جو اس کے پاس تھا پھر میرے نمبروں سے اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ وہ نمبر دیکھتے ہی میں نے جان لیا تھا کہ نمبر غلط ہے۔
''کس سے ملا یہ نمبر؟'' میں نے سوال کیا اور ذیشان کچھ دیر سوچتا رہا۔
''ریاض شیخ کی بیوی کے پُرسے کے لیے گیا تھا وہیں یہ نمبر اس سے لیا تھا۔'' ذیشان کا جواب تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کے چہرے پر موجود پریشانی کو پڑھنا مشکل بات نہیں تھی۔
پنڈی کی جانب آتے ہوئے اس نے کار اسلام آباد کی جانب موڑنی چاہی تو میں نے اسے روک دیا۔ ''سیدھے لاہور چلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر میں ایک نیا جھوٹ تراش چکی تھی۔

''جس ڈرامے میں کام کر رہی ہوں، اس کا ڈائریکٹر احسان کا دوست ہے اور احسان کے کہنے پر ہی پاکستان واپس آیا ہے۔'' میں نے کہا اور ذیشان نے وہی سوال کیا جس کی میں توقع کر رہی تھی لیکن اس کا جواب میں پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔
''جب میں دبئی میں تھی تو احسان نے اس سے بات کی تھی اور بات کرنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ جیسے وہ دونوں دوست ہوں۔'' میں نے ذیشان کے اس سوال کے جواب میں کہ ''تم کیسے جانتی ہو؟'' جواب دیا تھا۔
''تم تو کہتی تھیں کہ وہ بہت اکھڑ ہے، سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔'' ذیشان نے کہا۔
''تم اس بات کی فکر نہ کرو۔'' میں نے جواب دیا۔
''اس سے نمبر لینا میرا کام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
ذیشان کی اس سے ملاقات نہیں تھی ورنہ وہ میرا جھوٹ فوراً پکڑ لیتا۔ زرغون نامی وہ شخص عجیب ہی مزاج کا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنا ابتدا میں بہت ہی تلخ تجربہ تھا۔ پہلے ہی دن جب میں اس کی مرضی کے تاثرات نہیں دے سکی تھی تو اس نے ''کٹ'' کہنے کے ساتھ ہی عجیب سی بات کی تھی۔
''خاتون یہ ماڈلنگ نہیں ہے۔ یہاں خوب صورت ہونا ہی کافی نہیں ہے، ابھی سوچ لیں کہ آپ نہیں کر سکتیں تو علیحدہ ہو جائیں۔'' اس نے کہا۔
اس کے یوں سب کے سامنے بے عزت کرنے پر میرا دل چاہا تھا کہ میں رونا شروع کر دوں لیکن پھر میں نے خود پر کنٹرول کیا تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میرے آنسو بہانے پر ہمدردی کرے گا۔
ایسا نہیں تھا کہ پہلے دن تلخ فقرے استعمال کرنے والے زرغون نے اس کے بعد کچھ نہ کہا ہو لیکن اطمینان کا باعث بات یہ تھی کہ اس کا رویّہ سب کے ساتھ ایک جیسا تھا۔ وہ سینئر لوگوں کو بھی کچھ کہنے سے نہیں رکتا تھا لیکن یہ بات بھی تھی کہ اچھا شاٹ دینے پر وہ تعریف بھی کرتا تھا۔ وہ میری اس بات سے اگر خوش تھا کہ میں دیے ہوئے وقت پر پہنچتی ہوں تو اس پر ناراض بھی رہتا تھا کہ مجھے جانے کی جلدی رہتی ہے۔
موٹروے پر سفر کرتے ہوئے ہم راستے میں کچھ کھانے کے لیے رکے تو میں نے کوثر کو اپنی جلد آمد کی اطلاع دینے کے ساتھ دوبارہ سے وہ پروگرام ارینج کر لیے تھے

جہاں سے مجھے لاکھوں روپے ملنے تھے۔

دوبارہ سے کار میں سوار ہوئے تو ذیشان نے کہا۔

''میں تو چاہتا تھا کہ دو تین دن جب تک تم فارغ ہو، ہم اسلام آباد میں ہی رکتے۔'' اس کی بات سن کر میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ ''اب میں رانی نہیں ہوں جسے تم نے اس کے شوہر کے ساتھ مل کر حاصل کیا تھا، اب میں ایک خودمختار عورت ہوں جو اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔'' لیکن میں نے جو کہا، وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو میں کہنا چاہتی تھی۔

''چاہتی تو شاید میں بھی یہی تھی لیکن میں نے سمجھا کہ شاید یہ بات زیادہ ضروری ہے۔'' اس نے میری بات سنی اور اختلاف نہیں کیا۔

''یہ میری زندگی کا ایک اہم موڑ ہے اور شاید میرے ساتھ تمہاری زندگی کا بھی۔'' ذیشان نے کہنا شروع کیا۔

''ٹریننگ پر بھجوانا احسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' ذیشان.... رک رک کر بات کر رہا تھا جیسے اسے کہنے میں جھجک ہو رہی ہو۔

''ایک بار ٹریننگ ہوگئی تو پھر پروموشن کے لیے میں خود کوشش کرلوں گا۔'' اس نے کچھ سوچ کر کہا تھا۔

''اور اگر نہ ہو سکا تو پھر مجھ سے کہو گے؟'' میں نے سوچا لیکن کہا نہیں۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہارے اشتہار آرہے ہیں۔ ہورڈنگ لگ رہے ہیں لیکن تم یہ سب نہیں چاہتی ہو۔'' ذیشان اتنا کہہ کر رک گیا تھا۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں یہ سب نہیں چاہتی۔'' میں ایک بار پھر خاموش رہی تھی لیکن یہ کہتے کہتے رک گئی تھی کہ وہ اور وقت تھا جب میں یہ نہیں چاہتی تھی۔

''تم جو چاہتی ہو، میں وہ دینے کے لیے تیار ہوں۔'' ذیشان نے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا لیکن وہ خاموش رہا۔

''میں آج جو کچھ ہوں، وہ تمہاری خواہش کے مطابق ہے۔'' میں نے بالآخر اپنی زبان کھول دی تھی۔

''یہ بت جو آج اشتہاروں میں آرہا ہے جس کے ہورڈنگ بازاروں میں ہیں جو اب ڈراموں میں بھی آئے گا۔ اس بت کو توڑنے والا کوئی اور نہیں تم خود ہو ذیشان۔'' میں نے کہا لیکن ذیشان اس پر خاموش رہا۔

''میں تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی، یہ تو تم تھے جس نے بتایا تھا کہ شہرت کا اور دولت کا یہ راستہ ہے۔'' میں تلخ ہو چکی تھی، اس کا مجھے احساس ہوا تو خاموش ہوگئی۔

''اب وقت آگیا ہے کہ یہ چھوڑ کر وہیں پرانی زندگی کی طرف آجاؤ۔'' اس نے کہا۔

''لیاقت کے ساتھ۔'' میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، سوال کیا۔

''میرے ساتھ۔'' اس نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی تھی لیکن میں مسکرا کر چپ ہوگئی۔

''میں تمہیں وہ سب دوں گا جو کبھی تمہاری خواہش تھی۔'' اس نے مجھے میری بات یاد دلائی اور ساتھ ہی میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن میں اسی طرح بیٹھی رہی۔

میری خاموشی کی وجہ کچھ اور نہیں صرف یہ تھی کہ میں لیاقت اور ذیشان کا تقابل کر رہی تھی۔ ایک مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر چکا تھا اور دوسرا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ایک احسان کے بعد کتنے ہی احسان میری زندگی میں آنے تھے، اگر میں ذیشان کی بات مان لیتی۔ میں سوچ رہی تھی۔

''یہ بعد کی باتیں ہیں ذیشان! سب سے پہلے مجھے احسان کے نمبر حاصل کرنے ہیں پھر اس سے مل کر تمہارے کام کے لیے کہنا ہے۔'' میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا اور وہ خاموش رہا۔

میں نے اُس سے وہ سب کچھ کہنے سے گریز کیا تھا جو احسان بتا چکا تھا۔ اس کے بارے میں اس کے خاندان کے بارے میں۔ احسان سے میں ملنا چاہتی تھی لیکن اپنے بدلے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ملنا چاہتی تھی۔ باپ کی شفقت اور بھائی کو چھیننے والے خبیث شخص کو سزا دینے کے لیے ملنا چاہتی تھی اور اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

لاہور پہنچنے تک میں زیادہ تر خاموش رہی تھی۔ ذیشان بہت کچھ بولتا رہا تھا۔ میرے وہ خواب دہراتا رہا تھا جن کا کبھی میں اظہار کر چکی تھی لیکن میں اب وہ رانی نہیں رہی تھی میں اب شطرنج کی بساط.. کو پہچان رہی تھی جو مجھے سونے کے پنجرے میں قید کرنے کے لیے بچھائی گئی تھی۔

جب مجھے یہی کچھ کرنا ہے تو پنجرے میں بند ہو کر پنجرے کے مالک کی مرضی سے کیوں کروں، آزاد رہ کر اپنی مرضی سے کیوں نہ کروں۔ میں نے سوچا اور ایک فیصلے پر پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔

ابھی ہم لاہور سے کچھ دور تھے کہ زرغون کا فون آگیا۔ ''خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم جلد واپس آرہی ہو۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں وہاں رکی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ اس سے یہ کہنا فضول تھا کہ جو روپیہ ان کا میرے ساتھ تھا اس کے بعد میں وہاں رک نہیں سکتی تھی۔

"اگر تم میری طرف آجاؤ تو ہم اس پر بات کرلیں گے جو کل صبح شوٹ کرنا ہے، اس طرح صبح کا وقت بچ جائے گا۔" اس نے کہا۔

"میں گھر جانے کے بجائے سیدھی تمہاری طرف آجاتی ہوں لیکن زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی، میں طویل سفر سے تھک گئی ہوں۔" میں نے کہا اور وہ تیار ہوگیا۔

میں ہوٹل کے باہر اتر گئی۔ اپنا بیگ لے کر آئی اور لاؤنج میں بیٹھ کر احسان کو فون کیا۔ دوسری جانب فون اٹھانے میں دیر نہیں لگی۔ "ماما اس وقت نہیں ہیں۔" فون ریسیو کرنے والے نے کہا تھا۔

"اوکے۔۔۔" میں نے کہا۔ "وہ آئیں تو انہیں بتا دیجیے گا۔" اور جلدی سے فون رکھ دیا۔

جب تک زرغون کے ساتھ رہی، میں نے فون کرکے اسے اپنا روم نمبر دیا جس نے مجھے پک کیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ میں جب اس روم نمبر پر پہنچی جہاں کے لیے کہا گیا تھا، تب اس کا فون آیا۔

"تم نے فون کیا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔" میں نے کہا۔

"بولو۔۔۔" اس کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"تم کراچی کب آرہی ہو؟ تم ٹھیک تو ہو۔۔۔؟" اس نے کہا اور میں سوچ میں پڑ گئی۔

"دو دن بعد۔۔۔" میں نے کہا اور اس نے خاموشی اختیار کی۔

"تم کراچی آؤ۔۔۔" میں تمہیں ائرپورٹ سے پک کرلوں گا۔" اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

دو روز بعد میں کراچی پہنچی تو۔۔۔ انتظار کرتی رہی، وہ نہیں آیا۔ پھر ایک ڈرائیور میری جانب آیا۔ "کار پارکنگ میں ہے آپ رکیں میں کار لاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں چل رہی ہوں۔" ڈرائیور نے میرا بیگ تھاما اور چل دیا۔

پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر اس نے میرا بیگ کار میں رکھا اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور مختلف راستوں سے لے جا کر ڈیفنس کی ایک کوٹھی پر گاڑی روکی۔ جہاں احسان باہر نکل آیا تھا۔ میں آگے بڑھی اور احسان کے گلے لگ گئی۔ وہ اوپری منزل پر کمرے میں لایا۔ ساتھ ہی چائے کا آرڈر دیا۔

"ہاں بولو۔" اس نے کہا اور میں اس کا نرم لہجہ سنتے کے ساتھ ہی رونے لگی۔ وہ مجھے چپ کراتا رہا اور میں اپنی داستان سناتی رہی کہ کس طرح لیاقت نے میرے باپ اور بھائی کو مارا تھا۔ انہیں گاڑی سے کچلا تھا پھر مجھ سے شادی کی اور مجھے ذیشان کے پاس بھیجا تھا۔

"صرف لیاقت کو مارنا ہے یا ذیشان کو بھی؟" اس نے سوال کیا۔

"مجھے آپ کے پاس ذیشان نے ہی بھیجا ہے، وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی سفارش کریں۔" میں نے کہا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ کی مرضی۔" میں نے کہا اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے فون ملایا اور کسی سے اس زبان میں بات شروع کی جو میں نہیں جانتی تھی۔ اس نے لیاقت کے بارے میں کہا اور خود میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری جانب جو تھا، اس نے بتانا شروع کیا اور وہ صرف ہاں۔۔۔ اچھا۔۔۔ اور ٹھیک ہے کہتا رہا۔ "اسے لے کر وادکینٹ پہنچو۔" اس نے فون پر کہا۔ پھر فون رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"لیاقت دوسری شادی کرچکا ہے۔" اس نے کہا۔

"کون ہے اس کی دوسری بیوی۔" میں نے سوال کیا۔

"ایک اسٹیج کی فنکارہ ہے۔" احسان کا جواب تھا۔ اس کے بعد ہمارا کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔ اس نے کھانا لگانے کا حکم دیا تھا۔

ہم کھانا کھا رہے تھے تو اس نے کہا۔ "کہاں ہوا تھا آپ کے والد اور بھائی کا قتل؟" میں نے اسے بتایا کہ ایبٹ آباد سے ہری پور آتے ہوئے حویلیاں کے بعد ایک موڑ پر اترائی ہے وہیں لیاقت کی گاڑی اسٹاپ ہوئی تھی۔

وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو اسے نہ پاکر میں نے ملازم سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "صاحب تو سویرے نکل گئے تھے۔ آپ کے نام یہ پرچہ چھوڑ گئے تھے۔"

"میں دبئی جا رہا ہوں۔ لیاقت ہنی مون پر ملائیشیا گیا ہے۔"

''تم چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو۔'' اس نے لکھا تھا۔

''ڈرائیور سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔'' میں نے ناشتے کی ٹیبل پر کہا۔

پندرہ دن بعد میں لاہور میں تھی کہ احسان کا فون آیا۔ میں اُس وقت سیٹ پر تھی۔ زرغون ہدایات دے رہا تھا۔ ''وہ تمہارے گھر پہنچ گیا ہے۔''

''تم اس سے ملنا چاہو گی؟'' اس نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد مجھ سے شوٹنگ میں حصہ نہیں لیا گیا۔ میں نے زرغون سے اجازت لی اور گھر آ گئی۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون پہنچی۔ وہ انتہائی میک اَپ میں تھی۔

''لیاقت کہاں ہے؟'' اس نے کہا۔

میں نے اسے دیکھا اور کہا۔ ''جاؤ بی بی میرا سر نہ کھاؤ۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر واپسی کے لیے مڑی اور گیٹ پر رک کر کہا۔ ''میں تم سے اپنا شوہر لوں گی۔'' اس نے کہا اور وہاں سے چل دی۔

میں نے بیگ میں اپنا سامان رکھا اور وہاں سے نکل آئی۔ میں اس کے بعد شوٹنگ کے لیے گئی تھی۔ زرغون مجھے واپس آتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ندیم چیمہ کے لیے میں سونے کی کان تھی اس نے مجھے فون کیا اور مجھ سے دوسری ایڈورٹائز کی بات کی تھی۔ میں نے انکار کیا تو اس نے کوثر سے بات کروادی۔ اس نے ڈراموں کی پیشکش کی تو میں نے کہا، میں سوچوں گی۔

مجھے انتظار تھا احسان کے فون کا کہ وہ کب مجھے فون کرتا ہے۔ اس نے اس وقت فون کیا جب میں شوٹنگ سے تقریباً فارغ ہو گئی تھی۔ ''یہ لو بات کرو۔'' احسان نے مجھ سے کہا۔ میں نے اس سے بات کی، وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بندھا ہوا تھا۔ میرا چہرہ والس ایپ پر آیا تو وہ گڑگڑانے لگا۔ ''مجھے معاف کر دو رانی۔''

اس نے کہنا شروع کیا تھا لیکن میں نے اُسے معاف نہیں کیا، اس کے جرائم گنوائے اور احسان سے کہا، اسے فرنٹ سیٹ پر رکھ کر کار کو کھائی میں ڈال دو۔'' احسان نے ایسا ہی کیا۔

''میں تمہاری جانب آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں اس سے بات کرتے ہوئے اتنی مدہوش ہو چکی تھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو زرغون کھڑا تھا۔

''میں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میرے شوہر کی موت ہوئی تھی اور میں شوٹنگ میں مصروف تھی۔ اس کے بعد میں نے ذیشان کو احسان کا پیغام دیا تھا کہ اس نے فون کر دیا ہے، اس کا کام ہو جائے گا۔ میں آ رہا ہوں تمہاری طرف۔'' اس نے کہا۔

ذیشان کی آمد سے پہلے زرغون نے پیغام دیا۔ ''میں اس ڈرامے کو ختم کر کے واپس برطانیہ جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا پھر کچھ دیر۔۔۔ رک کر بولا۔ ''تم چلو گی، میرے ساتھ۔''

اس کی پیشکش عجیب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں کن مراحل سے گزرتی رہی ہوں۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''میں وہاں یہی کام کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بی بی سی کے لیے فلمیں بناتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میری ایک بچی بھی ہے وہاں جو میرے بغیر بہت اداس ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور اس کی ماں۔۔۔۔؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکرا دیا۔

''اس کی ماں اُسے چھوڑ گئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ نانی کے پاس ہے۔'' اس کا کہنا تھا۔

''میں سوچوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

احسان آیا تو اس نے بھی مجھے یہی پیشکش کی۔ میں اس کی احسان مند بھی تھی۔ اس نے خود لیاقت کو گولی مار کر گہری کھائی میں دھکا دیا تھا۔

زرغون اپنا کام ختم کر کے چلا گیا تھا۔ میں نے احسان سے کہا مجھے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں میرا جاننے والا کوئی نہ ہو۔

عدت کی مدت ختم کر کے احسان نے مجھ سے نکاح کر لیا۔ وہ مجھے لے کر کینیڈا آ گیا تھا۔ یہاں میں باہر کم ہی نکلتی ہوں۔ شاپنگ پر جاؤں تو حجاب لیتی ہوں۔ احسان کے دونوں بھانجے کاکول اکیڈمی میں ہیں۔ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو گیا ہے۔ دوسرے کی دو ماہ کی ٹریننگ رہتی ہے۔

ذیشان سے، ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر والوں سے زرغون سے، ندیم چیمہ سے، ریاض شیخ سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔ ایک بار میرے فون پر لیاقت کی بہن کا فون آیا، اس نے بھائی کے بارے میں سوال کیا۔

میں نے اسے بتا دیا۔ ''اب تو ہمارا ایک بیٹا بھی ہے اور دوسرے کی آمد ہے۔ چار برس میں دو بچے کافی ہیں۔''

❖ ❖ ❖

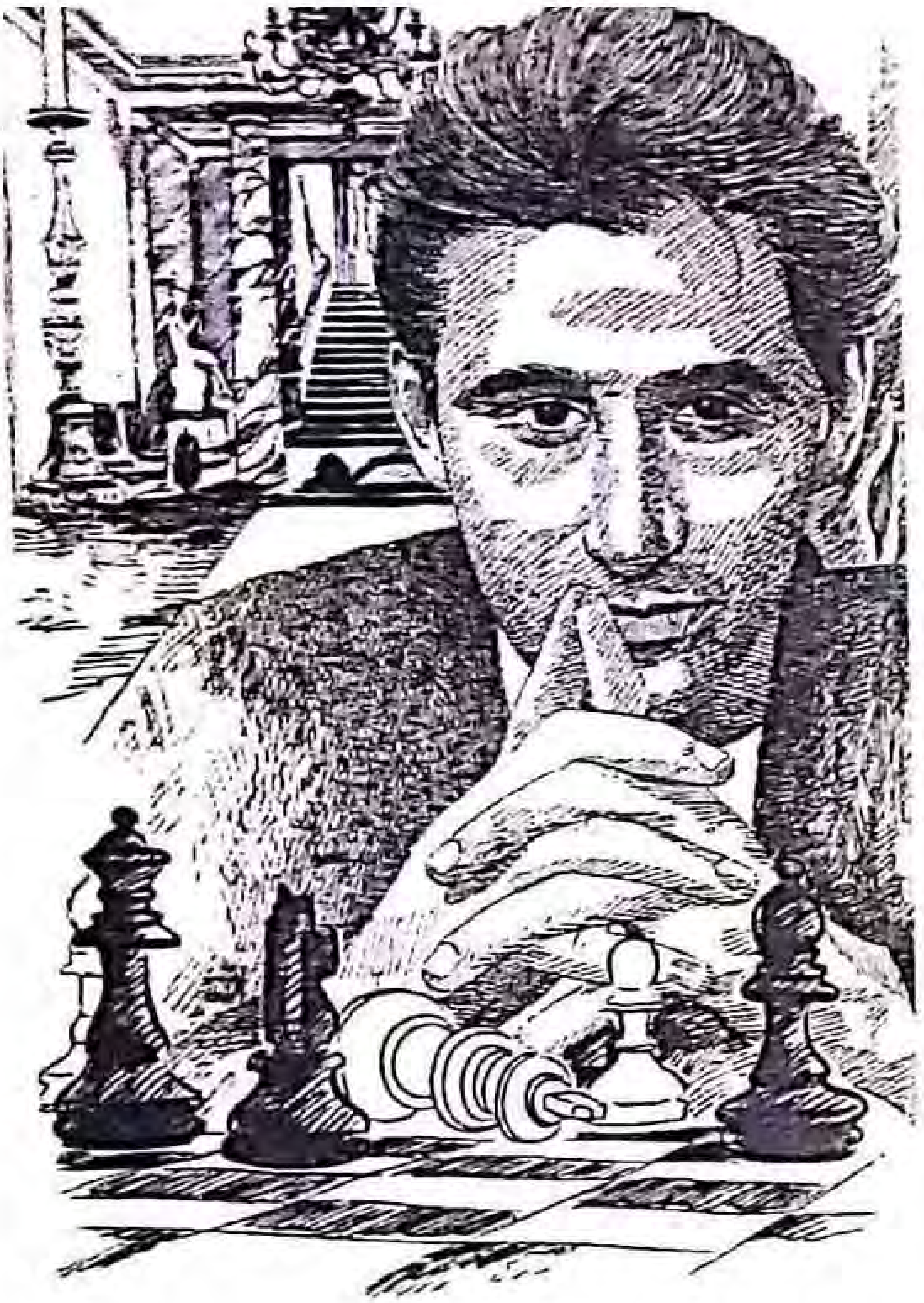

احترام

امجد رئیس

شطرنج کے کھیل میں ناقابلِ یقین پیچیدگیاں...راستے روکتی ہیں... کھلاڑی کے لیے وہ لمحات کسی کٹھن امتحان سے کم نہیں ہوتے...کھیل سے متعلق اس کی معلومات اور دماغی صلاحیتیں ہی اسے جیت کے قریب لاتی ہیں...

کھیل ہی کھیل میں ایک نئے اور منفرد پہلو سے ہونے والی آشنائی

انگلینڈ 2023ء۔

حسن خان سالار گرینڈ برائٹن ہوٹل کی وکٹوریہ ٹیریس میں بیٹھا تھا۔ جیبی شطرنج کی بساط میز پر رکھی تھی۔

اس نے بساط پر مُہرے رکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بساط کے سیاہ و سفید چونسٹھ خانوں کو تک رہا تھا۔ بازی کا آغاز ہوا۔ چشمِ تصور میں مہرے حرکت پذیر تھے۔ حسن خان سالار قومی چیمپئن اور آئی ایم (انٹرنیشنل ماسٹر) تھا۔ وہ خداداد صلاحیتوں کا مالک پیدائشی شاطر تھا۔ وہ ایشین چیمپئن، دبئی اوپن، بینکاک اوپن میں پاکستان کا نام روشن کرنے والا ایک ایسا گوہرِ نایاب تھا جس کی چمک نے حکومت اور میڈیا دونوں کو شطرنج کی جانب دیکھنے پر مجبور کردیا۔ 2022ء میں حسن سالار نے برٹش چیمپئن شپ جیتی تو ایک دنیا ورطۂ حیرت میں تھی۔ اس کی عمر ابھی محض پچیس برس تھی۔ حسن کے روپ میں پاکستان شطرنج کا پہلا گرینڈ ماسٹر (GM) طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ نام کی طرح چونسٹھ خانوں کا سالار تھا۔

حسن سالار نے نادیدہ حریف کی کوئین پر کوئین سے حملہ کیا۔ آس پاس اور آتے جاتے افراد دلچسپی اور تجسس کے ساتھ اسے خالی بساط کو گھورتا دیکھ رہے تھے۔ وہ دوسری مرتبہ برٹش چیمپئن شپ میں شریک ہو رہا تھا۔ اطراف سے بے نیاز وہ کھیل میں ڈوبا ہوا تھا۔ حسن قریبی میز پر موجود نوجوان سے بے خبر تھا جس کے ہمراہ ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ دونوں بلاشبہ حسن کی طرف متوجہ تھے۔

”کیا آپ میرے ساتھ ایک گیم کھیلنا پسند کریں گے؟“

حسن کے ارتکاز میں خلل پڑ گیا۔ ”نہیں۔“ اس نے نگاہ اٹھائی۔ ماسٹرز عام کھلاڑیوں سے رزم آرا ہونے سے پرہیز کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ بظاہر کمزور کھلاڑی سے شکست کھا جاتے ہیں۔ ایسی شکست ان کی ساکھ اور ذہنی کیفیت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ خصوصاً جب یہ سانحہ اس وقت پیش

آئے جب ماسٹر، برٹش چیمپئن شپ جیسے مضبوط ٹورنامنٹ کی تیاری میں مصروف ہو۔ حسن سالار کو معاً خیال آیا کہ اس کا انداز کس قدر غیر شائستہ تھا۔

"میرا مطلب، میں بہت مصروف ہوں۔" یہ فقرہ مضحکہ خیز تھا۔ بظاہر وہ خالی بیٹھا تھا۔ اس نے دوسری بار نظر اٹھائی تو چونک اٹھا اور سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم دونوں پاکستانی ہو؟" سوال اردو میں تھا۔

"جی ہاں۔" جواب بھی اردو میں آیا۔

"بیٹھ جایئے۔" اس نے اشارہ کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اجنبی ہم وطن شطرنج سے واقف ہیں لیکن صاف عیاں تھا کہ وہ دونوں حسن خان سالار کو نہیں پہچان سکے تھے؟

"شاید آپ کھیل رہے ہیں۔" لڑکے کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

حسن نے کوئین کا کوئین کے ساتھ تبادلہ کیا۔ کھیل اختتامی مراحل میں داخل ہو گیا۔

"تم دونوں یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہو؟" حسن نے باری باری دونوں پر نظر ڈالی۔

"ہم شیفیلڈ سے برائٹن آئے ہیں۔ شیفیلڈ میں ہم انکل کے ساتھ ہیں۔ انکل وہاں اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"اور تعلیم پاکستان میں۔" لڑکی نے اضافہ کیا۔

"برائٹن میں بھی کوئی انکل......"

"نہیں، نہیں، یہاں ہم شطرنج ٹورنامنٹ دیکھنے آئے ہیں۔" لڑکی نے قطع کلامی کی۔

حسن نے حیرت محسوس کی۔ "نیٹ پر یا ٹی وی پر کیوں نہیں؟"

"براہِ راست کا اپنا مزہ ہے۔ ماسٹرز سے ملاقات، آٹوگراف اور سیلفیاں......" اس مرتبہ بھی لڑکی نے جواب دیا۔

"اور آپ؟" لڑکے نے خالی بساط کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ بھی......؟"

"ہاں، میں بھی......اور براہِ راست۔" حسن نے گول مول جواب دیا۔ دفعتاً اسے ادراک ہوا کہ ان دونوں نے اسے کیوں نہیں پہچانا تھا۔ وہ تصوراتی کھیل میں اتنا مگن تھا کہ اپنے بدلے ہوئے حلیے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

"اصل مقابلہ ایلن وِنٹر، علی شیر اور ہمارے حسن خان سالار کے درمیان ہو گا۔" لڑکے نے رائے زنی کی۔ "ان تینوں کی موجودگی میں کسی اور کی دال گلنا مشکل ہے۔"

حسن خاموش رہا۔

"ازبک گرینڈ ماسٹر علی شیر شاندار کھلاڑی ہے۔" لڑکے نے مزید تبصرہ کیا۔ "بڑھتی عمر کے باوجود اس کا جارحانہ انداز برقرار ہے۔ پچھلی مرتبہ حسن سالار اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ حسن سالار نہ ہوتا تو میں اس مرتبہ علی شیر کی فتح کے لیے دعا کرتا۔ علی شیر کی جیت کے ساتھ اس کا اسٹائل بھی جیت جاتا۔"

"تمہیں ماڈرن اسٹائل پسند نہیں ہے؟" حسن نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"ماڈرن اسٹائل میں کتاب کا کردار زیادہ ہے۔ یہ ایک محتاط انداز ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "اس میں کھلاڑی حریف کی غلطی کا انتظار کرتا ہے۔"

"لیکن ماڈرن اسٹائل جیت رہا ہے۔" حسن نے نشاندہی کی۔

"دیکھیے......" لڑکا بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد گویا ہوا۔ "کیا خیال ہے اگر ایک گیم ہو جائے؟"

حسن کے اندازے کے مطابق لڑکے کی عمر بمشکل بیس برس ہو گی۔ مختصر گفتگو یہ سمجھنے کے لیے کافی تھی کہ وہ شطرنج کی اچھی معلومات رکھتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ کھلاڑی بھی اچھا ہو۔

"میں ایک فیل اٹھا کے کھیلوں گا۔" لڑکے نے پیشکش کی۔

حسن دھیرے سے مسکرایا۔ "میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اوہ سوری، میرا نام خالد منصوری ہے۔ میں نے گزشتہ سال انٹر یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتی تھی۔"

"تم ہو خالد منصوری......" حسن کو ایک خبر یاد آئی۔ وہ خبر انٹر یونیورسٹی کی نہیں بلکہ گلبرٹ جونیئر انٹرنیشنل ٹورنامنٹ (لندن) کی تھی۔ وہاں خالد منصوری نے بریلینسی پرائز حاصل کیا تھا۔

حسن نے پاؤچ میں سے پیادے اور مہرے نکال کے بساط پر رکھے۔ "فیل اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم برابر کی بنیاد پر کھیلیں گے۔ آٹھ پیادے، آٹھ مہرے تمہارے پاس اور اسی طرح میرے پاس۔"

"اب تمہیں سکون مل گیا؟" لڑکی نے خالد کو مخاطب کیا۔ "تم ہر جگہ کسی نہ کسی کو گھیر لیتے ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ تمہاری مڈبھیڑ بھی شطرنج کھیلنے والوں سے ہو جاتی ہے۔"

خالد نے کہا۔ "یہ میری چھوٹی بہن تارا ہے۔"

☆☆☆

خالد نے بادشاہ کے پیادے کو آگے بڑھا کے آغاز کیا۔

"ریاض احمد۔" حسن نے شناخت پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ

کیا اور بادشاہ کے سامنے والا پیادہ آگے بڑھایا۔ برٹش ٹورنامنٹ سر پر تھا اور حسن کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگرچہ وہ آگاہ تھا کہ شناخت کے ساتھ اسے اپنا اسٹائل بھی بدلنا ہوگا اور ایسی صورت میں خالد اس کو اپنی مرضی کے میدان جنگ میں لڑائے گا۔ ابتدائی چالوں کے بعد خالد نے میکس لینگ کے ذریعے جارحیت کا آغاز کیا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کم وقت میں فاتحانہ اختتام کا خواہشمند ہے۔ خواہ اس کے لیے ایک دو پیادوں کا نقصان ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے یا مہرہ قربان کرنا پڑے۔ تاہم حسن کے سامنے وہ ناکام رہا۔ کھیل طول پکڑ کے اختتامی مراحل کی طرف نکل گیا۔ خالد کو ایک پیادے کا خسارہ تھا۔ اگرچہ بساط پر پوزیشن کی تہ میں حملے کا امکان پوشیدہ تھا۔ وہ نروس دکھائی دیا۔ حسن بھی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ حسن اختتامی پوزیشن کو دور تک دیکھ رہا تھا۔

''جناب آپ بہت اچھا کھیلتے ہو۔'' خالد کے لہجے میں احترام تھا۔

حسن نے مسکرا کے سر کو جنبش دی۔ پوزیشن نازک تھی اور وہ باخبر تھا۔ شطرنج کا اختتامی کھیل جتنا سادہ دکھائی دیتا ہے اتنا ہوتا نہیں۔ اس میں ناقابلِ یقین پیچیدگیاں شاطر کی معلومات اور دماغ کا امتحان لیتی نظر آتی ہیں۔ بساط کا بظاہر سادہ نقشہ ایک چیستاں کے مانند تھا۔ جس میں خالد منصوری کے لیے فتح کا راز روپوش تھا۔ اگر خالد کی کتابی معلومات مکمل ہے تو وہ جیت کا راز تلاش کرلے گا۔ حسن مدِمقابل کی ہیجانی کیفیت سے آگاہ تھا۔

حسن کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی طرح خالد کی ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھائے۔ قبل اس کے کہ دیر ہوجائے۔ کوئی طریقہ استعمال کرنا تھا، مناسب یا غیر مناسب۔ ٹورنامنٹ میں حسن کے قریب ترین حریف اسے ناپسند کرتے تھے۔ اس نے کم عمری میں پاکستان کی جانب سے ریکارڈ توڑ کارکردگی پیش کی تھی۔ ابھی اس نے بہت شطرنج کھیلنی تھی۔ اگر وہ یہاں حادثاتی طور پر ہار گیا تو ٹورنامنٹ میں مذاق بن جاتا۔

خالد سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نظریں بساط پر تھیں۔

''تم نے مجھے متاثر کیا۔'' حسن نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں حسن خان سالار ہوں۔'' بظاہر یہ نوجوان کے لیے ماسٹر کی طرف سے ستائش کا ایک انداز تھا کہ ماسٹر نے اپنی حقیقت ظاہر کردی اور خالد نے بھی اسے خراجِ تحسین کے طور پر لیا۔ لیکن کھیل کی روح بدل گئی۔

وہ دونوں الجھن کا شکار نظر آئے۔ حسن نے تاریک چشمہ چہرے سے ہٹایا۔ وہ داڑھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ حسن کی ہلکوں سے شیبہ بڑھا رہا تھا۔ تاہم چشمہ ہٹانے پر خالد منصوری کی الجھن کسی حد تک کم ہوگئی۔

''ہم اسے اردو میں آشوبِ چشم کہتے ہیں۔'' حسن نے اپنی سرخ آنکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چشمے کی وضاحت کی۔

''میں امید کرتا ہوں کہ علی شیر کے بارے میں آپ نے میرے کمنٹس کا برا نہیں منایا ہوگا۔'' خالد نے کہا۔ ''مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا۔''

''نہیں، میں نے برا نہیں منایا۔'' حسن کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ ''علی شیر کا اپنا اسٹائل ہے اور میرا اپنا انداز ہے۔ تم چال چلو۔''

خالد نے بچوں کی طرح شرماتے ہوئے بساط کی طرف دیکھا۔ کھیل کا رنگ ڈھنگ بدلنے لگا۔ اب وہ حسن خان سالار کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ امید موہوم کے ساتھ کہ شاید وہ چیمپئن کو ہرادے اور صرف دو چالوں کے بعد خالد نے پیادے کو غلط حرکت دی۔ حسن کے لیے یہ کافی سے زیادہ تھا۔ اس نے آناً فاناً خالد کے خلاف بازی لپیٹ دی۔

''مجھے یقین ہے اس مرتبہ بھی آپ چیمپئن شپ جیت جاؤ گے۔'' خالد نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔

حسن کے ذہن میں خلش رہ گئی کہ اس نے گیم جیتنے کے لیے ''ٹرک'' استعمال کی تھی۔ اس کے لیے یہ ایک کھوکھلی فتح تھی۔

☆☆☆

''میں سمجھ نہیں سکا، اس نے اتنی دیر بعد اپنی پہچان کیوں کرائی۔'' خالد نے اپنی بہن سے کہا۔ ''اس لمحے تک میں ٹھیک کھیل رہا تھا اور دفعتاً میرا ذہن بند ہوگیا۔ او مائی گاڈ میں حسن سالار کو ہرانے کی کوشش کررہا تھا۔''

''تمہارا چیمپئن یہی چاہتا تھا۔ یہ اس کی چال تھی۔ وہ یقیناً گریٹ ہے لیکن تمہارے حق میں بساط پر اس نے کچھ دیکھ لیا تھا۔'' لڑکی نے کہا۔

''پیاری بہن وہ پھر بھی مجھے ہرادیتا۔''

''میں شطرنج زیادہ نہیں جانتی لیکن اس لمحے میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' خالد کی بہن نے منہ بنایا۔

☆☆☆

ازبک ماسٹر علی شیر کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن وہ ستر سال کا دکھائی دے رہا تھا۔ گزشتہ برس اسے دو صدمے برداشت کرنا پڑے تھے۔ پہلے حسن سالار نے اسے برٹش چیمپئن کے اعزاز

سے محروم کیا۔ چند مہینوں بعد اس کی بیوی کینسر کے خلاف ہار گئی۔ علی شیر کے دو عشق تھے، شطرنج اور بیگم۔ دوسرے صدمے نے اسے شطرنج سے دور کر دیا۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ وہ برٹش ٹورنامنٹ میں شریک ہو گا۔ علی شیر ٹورنامنٹ ہال میں موجود تھا۔ اس کے تمام بال سفید ہو گئے تھے۔ ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ تھا۔ حسن سالار عمر رسیدہ ماسٹر سے مل کر اندر سے افسردہ ہو گیا تھا۔ ایک سال میں علی شیر کتنا بدل گیا تھا۔ عمر کے باوجود وہ گزشتہ برس دوسری بار چیمپئن بنتے بنتے رہ گیا تھا۔ حسن سوچ رہا تھا کہ علی شیر اچانک کیوں نمودار ہوا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ کیا علی پچھلے سال کی طرح کھیل سکے گا؟

علی شیر کی عمر حسن سے بہت زیادہ تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کو ماسٹر کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ حسن اس کو پوری عزت واحترام دے رہا تھا۔ علی شیر اس کا مستحق تھا۔

''تمہارا کھیل ہر گزرتے دن کے ساتھ نکھرتا جا رہا ہے۔'' علی شیر نے حسن کے لیے سند جاری کی۔

''آپ سے دوبارہ یہاں ملنا ایک اعزاز ہے۔'' حسن نے ادب سے جواب دیا۔

''شاید یہ آخری ملاقات ہے۔'' بوڑھے ماسٹر کے پرشکن چہرے پر چند شکنوں کا اضافہ ہو گیا۔

''دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر گیا ماسٹر۔ میرے دوست احباب ماضی میں سوال کرتے تھے کہ میں شطرنج کھیلنے میں زندگی کیوں ضائع کرتا ہوں۔ میرا جواب ہوتا تھا، لوگ کتابیں لکھتے ہیں، اداکاری کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں، پیسوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، وغیرہ وغیرہ...... وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ میں جواب دے کر مطمئن ہو جاتا تھا۔'' علی شیر نے گہری سانس لی۔ ''ماسٹر اب میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ میں نے زندگی میں کیا کیا؟ میں مطمئن نہیں ہوں۔''

''آپ کا نام ہے جو ہمیشہ رہے گا۔'' حسن نے سنجیدگی سے کہا۔

''نام؟'' علی شیر ہنس پڑا۔ ''بہتر ہوتا اگر میں دس سال پہلے مر جاتا۔ ماسٹر ایک دن تم میری بات سمجھ جاؤ گے۔''

حسن سالار نے بوڑھے شیر کی بات کا مطلب اسی وقت سمجھ لیا۔ دس سال پہلے علی شیر کے سر پر جو تاج تھا اس میں متعدد چیمپئن شپ کے نگینے جگمگاتے تھے جو یکے بعد دیگرے گرتے گئے۔ گزشتہ برس برٹش چیمپئن کا واحد نگینہ حسن سالار نے چھین لیا تھا۔ یعنی علی شیر دس برس پہلے مرتا تو وہ ایک چیمپئن کی موت ہوتی۔ وہ برٹش چیمپئن شپ جیتنے آیا تھا۔ وہ چیمپئن کی موت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حسن سمجھ گیا یہ علی شیر کا آخری ٹورنامنٹ ہے۔ حسن سوچ رہا تھا کہ بوڑھا شیر زوال پذیر طاقت کے ساتھ کیونکر یہ ہدف حاصل کر پائے گا؟

حسن سالار اس کے لیے دل میں ہمدردانہ جذبات پنپانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ بساط پر علی شیر سے سامنا تقریباً یقینی تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ خود علی شیر کی جگہ ہوتا تو کیا علی کے احساسات بھی ایسے ہی ہوتے؟

☆☆☆

ٹورنامنٹ کے دوران خاصی سخت اور اعصاب شکن محاذ آرائی دیکھنے میں آئی۔ حسن اپنے مخصوص انداز کے ساتھ بہترین کھیل پیش کر رہا تھا۔ ایلن ونٹر بھی طوفانی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف علی شیر نے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ پھر سے جوان ہوا ہو۔ علی شیر نے تمام تجربہ اور بچی کچھی توانائی جھونک دی تھی۔ علی شیر نے ایلن ونٹر کی پیش قدمی کو روکا تو ہلچل مچ گئی۔ حسن دیکھ رہا تھا کہ علی شیر زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ حسن نے واحد شکست کا ذائقہ ایلن ونٹر کے سامنے چکھا تھا۔ چند گیم اس نے ڈرا کیے اور دیگر میں فاتح رہا تھا لیکن ایلن ونٹر، علی شیر سے شکست کھا کر سنبھل نہ سکا۔ وہ اپنے اگلے تین گیم ہار گیا۔ ٹورنامنٹ اختتام کی طرف گامزن تھا۔ چند راؤنڈ باقی تھے۔ خالد منصوری اور اس کی بہن روزانہ وہاں حاضری لگاتے رہے۔ دونوں بالخصوص حسن کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ حسن قصداً دونوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ حسن کے ذہن میں کہیں احساسِ جرم جاگزیں تھا کہ ہوٹل میں اس نے خالد کو ہرانے کے لیے نفسیاتی چال چلی تھی۔ نجانے اسے کیوں محسوس ہوتا کہ وہ دونوں وہاں اس کی غلطی پکڑنے آتے تھے کہ وہ غلطی کرے اور ہار جائے۔ تاہم حسن کا ارتکازِ توجہ مکمل تھا۔ اسے ادراک تھا کہ وہ برٹش چیمپئن شپ کھیل رہا ہے اور جیتنے کے لیے کھیل رہا ہے۔ ایلن ونٹر سے شکست کھانے کے باوجود حسن پوائنٹس ٹیبل پر اوپر تھا۔ حیرت انگیز طور پر علی شیر اور اس کے درمیان معمولی فرق رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ٹورنامنٹ اختتامی مراحل میں تھا۔ حسن سالار ایک دن ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا جب مقامی کلب کے سیکریٹری نے ملاقات کی۔

''ہمارے پاس دس کھلاڑی ہیں۔'' سیکریٹری نے کہا۔ ''یہ گروپ آپ سے کھیلنے کا خواہشمند ہے۔ اگر آپ رضامند ہوتے ہیں تو ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہو گا۔ جاری ٹورنامنٹ کے پیشِ نظر اس میچ کی کوئی تشہیر نہیں ہو گی۔''

سکریٹری درخواست کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

حسن نے فوراً جواب دینے سے احتراز کیا۔ شطرنج کی دنیا میں اس قسم کے نمائشی مقابلے انوکھی بات نہیں ہے۔ بیک وقت دس، بیس یا پچاس کھلاڑیوں سے مقابلہ...... لیکن اہم ٹورنامنٹ کے دوران یہ درست نہیں تھا۔

"گروپ کو آپ کا نام نہیں بتایا جائے گا۔" سکریٹری نے پُرامید نظروں سے حسن کو دیکھا۔

"ظاہر ہے یہ بلائنڈ فولڈ ہوگا۔" حسن نے کہا۔

"جی ہاں، آپ الگ کمرے میں بیٹھیں گے۔ جاری ٹورنامنٹ کے اختتام تک آپ کی شناخت میرے اور کلب کے پریذیڈنٹ تک محدود رہے گی۔ نیز گروپ بھی پابند ہوگا کہ وہ ٹورنامنٹ کے اختتام تک رازداری کا احترام کرے گا۔" سکریٹری نے یقین دہانی کرائی۔

حسن نے چند سوالات کے بعد کھیلنے کا عندیہ دیا۔

حسن کو بذریعہ کار اوبرائن چیس کلب لے جایا گیا۔ اسے الگ ایک چھوٹے آرام دہ کمرے میں بٹھا کر سکریٹری باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد کلب پریذیڈنٹ کے ہمراہ وہ واپس آیا۔ دونوں نے حسن کا شکریہ ادا کیا۔ تیزی سے تیاری مکمل ہوئی اور تیس منٹ میں میچ شروع ہوگیا۔ حسن کھلاڑیوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا نہ گروپ جانتا تھا کہ کون ماسٹر مدِمقابل ہے۔ سکریٹری نے بتایا کہ طاق نمبر کی پانچ بساطوں پر حسن سیاہ مہروں سے کھیلے گا۔ جفت نمبرز پر اس کے پاس سفید مہرے ہوں گے۔ سکریٹری نے مزید بتایا کہ طاق نمبرز پر پہلی چال بادشاہ کا پیادہ چوتھے خانے (e4) پر ہوگی۔

حسن نے سیاہ مہروں سے اپنی جوابی چال سکریٹری کو بتائی اور کہا کہ سفید مہروں سے اس کی پہلی چال کوئین کا پیادہ چوتھے خانے (d4) پر ہوگی۔ میچ کا آغاز ہوا۔ حسن کے دماغ میں فلم چل رہی تھی۔ قوتِ متخیلہ پوری طرح بیدار تھی۔ وہ تکنیک سے آگاہ تھا۔ اناڑیوں اور شوقین کھلاڑیوں نے بہت جلد کمزور چالوں سے اپنی شناخت کرا دی۔ حسن نے پہلے ان کو فارغ کیا۔ بقیہ پانچ میں سے تین نے قدرے مزاحمت پیش کی۔ تاہم عجلت اور جذبات کے ہاتھوں مار کھا گئے۔ بقیہ دو میں ایک اچھا کھیل رہا تھا لیکن حسن کو ادراک تھا کہ وہ بھی جلد یا بدیر ڈھیر ہو جائے گا۔ اصل مسئلہ بساط نمبر سات پر تھا جہاں حسن نے کم چالیں چلی تھیں۔ وہ شروع سے زیادہ توجہ نمبر سات پر دے رہا تھا۔ حسن کا شک یقین میں بدل رہا تھا۔ میکس لینگ، جارحیت اور حملوں کا انداز۔ نمبر سات پر کوئی اور نہیں خالد منصوری تھا۔ کچھ دیر بعد نواں کھلاڑی بھی شکست سے دوچار ہوا اور حسن نے تمام تر توجہ نمبر سات پر مرکوز دی۔ اس کا شک دور ہو گیا تھا۔ اس نے خالد کا اسٹائل پہچان لیا تھا۔ خالد پورے اعتماد کے ساتھ شاندار حملے کر رہا تھا۔ حسن دفاع پر مجبور ہو گیا۔ اس مرتبہ حسن کے پاس کوئی ایسی ترکیب نہیں تھی جس کے سہارے وہ خالد کا ذہن اور اعصاب منتشر کر سکتا۔ الٹا حسن اعصابی دباؤ کا شکار تھا۔ اگرچہ دس میں سے ایک شکست خاص معنی نہیں رکھتی تھی۔ حسن کی شناخت بھی خفیہ تھی لیکن خالد کے خلاف کھیلتے ہوئے شکست با معنی تھی۔ جیسے حسن نے خالد کو پہچان لیا تھا۔ حسن کو یقین تھا کہ خالد نے بھی اسے پہچان لیا ہے۔ کھیل چالیس چالوں سے اوپر چلا گیا تھا۔ حسن کے تصور میں ایک ہی بساط بچھی ہوئی تھی۔ نوجوان خالد کا چہرہ بھی حسن کے پردۂ تصور پر متحرک رہا تھا۔ خالد جانتا تھا کہ وہ حسن سالار کو شکست دینے جا رہا ہے۔

اور پھر کلب سکریٹری نے خالد کی چال حسن کو بتائی۔

"Pf6۔"

حسن چونک اٹھا۔ "یہ اس کی چال ہے؟"

"یس سر، Pf6۔" سکریٹری نے تصدیق کی۔

"کوئین سے رخ لے جاؤ۔" حسن نے اپنی چال بتاتے ہوئے سکون کی سانس لی۔ خالد نے غلطی کر دی تھی۔ بظاہر یہ غلطی نہیں تھی لیکن ماسٹر نے کھیل کا انجام دیکھ لیا تھا۔ کوئین قربان کرنے کے بعد دو رخ اور ایک گھوڑا دستیاب پوزیشن میں بازی لپیٹنے کے لیے کافی تھے۔

حسن نے سکریٹری سے کہا۔ "میری طرف سے چھ چالوں میں شہ مات کا اعلان کر دو۔"

خالد کو شکست دینے کے بعد حسن سکریٹری کے ہمراہ واپس ہوٹل کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"Pf6 پیادہ، ایف کے چھٹے خانے پر۔ Pf6...... Pf6......" حسن سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ خالد کی وہ چال تھی جس کے بعد چھ چالوں کے اندر بازی پلٹ گئی تھی۔ یہ غلطی نہیں تھی۔ خالد ماسٹر کی طرح کھیلا تھا۔ وہ یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہتھیار پھینکے تھے، جان بوجھ کر۔ اس نے مرضی سے کھیل ڈبویا تھا۔ ارادتاً شکست کا ہار گلے میں ڈالا تھا۔ اس نے حسن کو پہچان لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ٹورنامنٹ کے نازک مرحلے پر ایسی کوئی بھی بظاہر غیر اہم شکست حسن کا ردھم خراب کر دے گی۔ یہ اسپورٹس مین اسپرٹ کا حد درجہ لطیف اشارہ تھا۔ شائستہ اخلاقیات کا مظہر! خالد ایک اچھا کھلاڑی ہی نہیں اچھے کردار کا بھی مالک تھا۔ اسے ادراک تھا کہ اوبرائن کلب میں شکست اس کے لیے بے معنی تھی۔ وہ بھی حسن سالار کے ہاتھوں۔ لیکن

اگر چیمپئن شکست کھا جاتا تو برٹش ٹورنامنٹ کے لیے وہ شکست نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس رات حسن بمشکل سونے میں کامیاب ہوا۔ وہ خود سے سوال جواب کرتا رہا۔ شطرنج ایک کھیل ہے۔ عظیم کھیل۔ لیکن یہ زندگی نہیں ہے۔ سابق روسی عالمی چیمپئن اناطولی کارپوف کا کہنا تھا۔ ''شطرنج میری زندگی ہے۔'' امریکی ورلڈ چیمپئن بابی فشر نے کہا۔ ''شطرنج زندگی ہے۔''

شطرنج زندگی نہیں ہے۔ حسن نے خود سے کہا۔ حسن کے کھیل کا اپنا انداز تھا اور اس کی نفسیات بھی مختلف تھی۔ وہ بساط پر اور بساط سے ہٹ کر انسانی اقدار کو اہمیت دیتا تھا لیکن ظاہر ہے شطرنج وہ جیتنے کے لیے کھیلتے تھا۔ شطرنج میں نفسیات اور عمر کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ ہوٹل میں اس نے جس طرح خالد کو ہرایا تھا وہ خوش نہیں تھا۔ وہ جیت اس کی ضرورت تھی۔ لیکن کلب میں خالد نے قصداً بازی گرا کے حسن کو کھیل کی اخلاقیات کے ایک نئے پہلو سے روشناس کرایا تھا۔

معاً بوڑھے علی شیر کا چہرہ اس کے تصور میں در آیا۔ علی شیر اس وقت ماسٹر بنا تھا جب حسن سالار پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ حسن کے پسندیدہ ماسٹرز میں سے ایک تھا۔ ازبک ماسٹر زندگی کا آخری ٹورنامنٹ کھیل رہا تھا اور نہایت بہادری کے ساتھ۔ حسن جانتا تھا کہ علی شیر کیا چاہتا ہے۔ وہ حسن سے برٹش چیمپئن شپ کا نگینہ واپس لینا چاہتا تھا۔ وہ چیمپئن کی موت مرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اختتام کی طرف جاتے ہوئے بوڑھا شاطر شیر کی طرح لڑا تھا۔ آخری راؤنڈ میں صورت حال سنسنی خیز تھی۔ ایک نمبر بورڈ پر حسن اور علی شیر نبرد آزما تھے۔ علی شیر قریب ترین حریفوں سے نصف پوائنٹ آگے اور حسن سے نصف پوائنٹ پیچھے تھا۔ حسن ڈرا بھی کر جاتا تو نصف پوائنٹ کی سبقت سے میدان مار لیتا جبکہ علی شیر نے ہر قیمت پر حسن کے خلاف کامیابی حاصل کرنی تھی۔

علی شیر نے فائنل راؤنڈ جیت لیا۔ حسن وہ منظر بھول نہیں سکتا تھا جب رپورٹرز نے علی کے گرد گھیرا ڈالا۔ علی شیر رو رہا تھا۔ وہ شکست پر اتنا نہ روتا جتنا فتح پر رویا۔ اگرچہ فتح اس کے لیے اجنبی چیز نہیں تھی۔ یہ پہلی فتح نہیں تھی لیکن آخری تھی اور کس محبت و احترام سے علی شیر نے اپنے سے کہیں جونیئر ماسٹر حسن سالار کو ماسٹر کہہ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کے عظیم مستقبل کی پیش گوئی کی تھی۔ کس انداز میں حسن کو خدا حافظ کہا تھا۔ علی شیر واپس جا رہا تھا۔ اس کا آخری مقابلہ موت کے ساتھ تھا۔ شاید اگلے برس۔ اس نے ہارنا تھا اور وہ تیار تھا۔

☆☆☆

حسن ملے جلے جذبات و احساسات کے ساتھ سامان پیک کر رہا تھا۔ خوشی اور ناخوشی دونوں تھے۔ اطمینان و عدم اطمینان بھی ساتھ ساتھ...... وہ باخبر تھا کہ آخری راؤنڈ میں کیا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ماہرین علی شیر کے ساتھ آخری گیم کا تجزیہ کریں گے تو حسن کو مذاق کا نشانہ بنایا جائے گا۔

''کم ان۔'' اس نے دستک کے جواب میں بلند آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا، خالد اور اس کی بہن نے کمرے میں قدم رکھا۔

''سر، آپ آخری گیم کی وضاحت کریں گے۔'' خالد کے چہرے پر مایوسی اور تکلیف تھی۔ وہ احترام کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی کوشش کرتا نظر آ رہا تھا۔

''ہم توقع کر رہے تھے کہ آپ آخری گیم میں کھیل کے عروج پر ہوں گے۔ آپ کے لیے ڈرا بھی کافی تھا۔ علی شیر بری طرح تھک چکا تھا۔'' خالد نے شکوہ کیا۔

تارا نے بھائی کی تائید کی۔

''میں ہار گیا لیکن اچھا کھیلا تھا۔'' حسن نے کہا۔

''آپ نے گیم بطور تحفہ علی شیر کی جیب میں ڈالا تھا جو آپ اور علی شیر کے انداز سے بے بہرہ ہے، وہ دھوکا کھا سکتا ہے لیکن میں آپ دونوں کے کھیل کو سمجھتا ہوں، آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' خالد بدمزہ دکھائی دے رہا تھا۔

''ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ ہو سکتا ہے میں نے ضرورت محسوس کی ہو۔ کیا تم نے کبھی بہتر اور اعلیٰ خیال کے تحت قصداً گیم نہیں ہارا؟''

''نہیں، یہ کیا سوال ہوا؟'' خالد نے کہا۔

''تم اور برائن چیس کلب میں جس انداز میں میرے ساتھ کھیلے اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے کھیل اور اس کے ساتھ منسلک اخلاقیات کے منفرد پہلو سے روشناس کرایا تھا۔ کلب میں ہمارے درمیان جو کھیل کھیلا گیا تھا، تم ٹورنامنٹ کے فائنل راؤنڈ کو اس کی روشنی میں دیکھو۔ تم سمجھ جاؤ گے کہ میں علی شیر سے کیوں ہارا۔'' حسن مسکرا رہا تھا۔

''برائن کلب؟''

''ہاں، بورڈ نمبر سات!''

''میں نہیں سمجھا۔'' خالد کی حیرت برقرار تھی۔ ''میں زندگی میں کبھی وہاں نہیں گیا۔''

❖❖❖

عشقِ ناتمام

اسما قادری

رشتوں اور ناتوں کی جڑیں تبھی پائدار اور مضبوط رہتی ہیں... جب انہیں خوش اسلوبی سے نبھانے کا فن آجائے... کچھ لوگوں کی فطرت میں ہی محبت ... دوسروں کے احساس کرنے کا جذبہ شروع ہی سے موجود ہوتا ہے... اور بعض افراد میں بدنیتی... جفا گزیدگی اور اپنے مفادات کا حصول شاملِ فطرت رہتا ہے... چاہے اس کے لیے دوسروں کی زندگی ہی کیوں نا داؤ پر لگ جائے... ایک نوجوان کی لاابالی فطرت سے شروع ہونے والی کہانی... قتل کی واردات نے اسے سنگین تر بنا ڈالا...

سینے میں اُمنگوں بھرا دل رکھنے والا کوئی نوجوان مرضِ عشق میں مبتلا ہونے کی خواہش نہ رکھتا ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ میرے ذاتی خیال میں اس مرض میں مبتلا ہونے کے لیے پڑوسی کی لڑکی مطلب ہمسائی سب سے مثالی انتخاب ہوتی ہے۔ ایک تو محبوب تقریباً ہر وقت نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور انسان کو دیدارِ یار کے لیے گھڑی گھڑی اس کے محلے کے چکر نہیں کاٹنے پڑتے، چھت پر خفیہ ملاقاتوں کی سہولت موبائل فون کے پیکیجز ڈھونڈنے کے جھنجھٹ سے بچالیتی ہے، اپنے گھر میں دال، سبزی نہ بنی ہو تو پڑوس سے کسی معقول ڈش کی سپلائی مشکل کو آسان بنادیتی ہے اور تو اور لانڈری کے چکر لگانے اور اپنے کپڑے خود استری کرنے کی زحمت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمسائی سے عشق کے اتنے فوائد جاننے والا مجھ جیسا عقل مند انسان انگڑائیاں لیتی جوانی کی اُمنگوں کو سہارا دینے کے لیے فی الفور اپنی ہمسائی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا لیکن بُرا ہو سامنے والے شفقت کا کہ وہ مجھ سے زیادہ عقلمند نکلا اور جس عرصے میں، میں بی اے پاس بننے کے چکر میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا، وہ مکان کے بیرونی کمرے میں پرچون کی دکان کھول کر محلے بھر کی عورتوں کا مرکزِ نگاہ بن گیا۔ گلی میں دکان کی سہولت سے فائدہ اٹھا کر خواتین روزمرہ کا سودا سلف خود خریدنے اس کی دکان پر پہنچ جاتی تھیں اور وہ اپنے تئیں راجا اِندر بنا ہنس ہنس کر سب کو نمٹاتا رہتا۔ اس ہنسی ہنسی میں میری پڑوسن پروین عرف پنو کب پھنسی اور پاؤ بھر مونگ کی دال اور بریانی مصالحے کے ساشے خریدتے خریدتے دل کا سودا کیسے طے پا گیا مجھے خبر نہیں ہو سکی۔ اگرچہ میں جو قریب ترین پڑوسی ہونے کی حیثیت سے پنو پر سب سے زیادہ اپنا حق سمجھتا تھا، اس جانکاری پر دل ہی دل میں بہت تلملایا لیکن اب کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت والا معاملہ تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ کر پنو سے دستبرداری قبول کرلی۔

پنو سے مایوس ہو کر میں نے تلاش محبوب میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو مزید مایوس کن انکشاف ہوا کہ محبوبۂ دلنواز کے عہدے پر فائز کرنے کے لیے آس پڑوس میں پنو کے سوا کوئی مناسب لڑکی دستیاب ہی نہیں ہے۔ پنو کے سوا جو چند گنی چنی لڑکیاں پیا دیس سدھارنے سے رہ گئی تھیں، انہیں ''باجیوں'' کی فہرست میں شامل کیے بغیر چارہ نہیں تھا کہ ان کم بختوں کو یہ تک یاد تھا کہ جب میں چھوٹا تھا تو اکثر نیکر میں ''سوسو'' کرنے پر بیچ گلی میں اماں کے ہاتھوں مار کھاتا تھا اور میری ناک اس قدر بہتی تھی کہ اکثر بہتے بہتے کسی سیلابی ریلے کی طرح ہونٹوں کی رکاوٹ پار کر کے منہ کے اندر تک پہنچ جاتی تھی۔

بہرحال بات ہو رہی تھی محبوبہ کے عہدے پر فائز کرنے کے لیے کسی معقول لڑکی کی تو اس سلسلے میں بالآخر میری پڑوسن پروین عرف پنو ہی نے اعانت کی اور میری نظر میں پنچ جانے والی اپنی سہیلی نشاط عرف نشو تک مجھے یوں رسائی دی جیسے پاکستان، امریکا کی ایک گھوری کے بعد اسے نام نہاد دہشت گردوں تک رسائی دیتا ہے۔ امریکا کی طرف سے جیسے پاکستان کو معاشی تباہ حالی کی دھمکی دی جاتی ہے، میں نے بھی پنو کو اس کی اور شفقت کی محبت کا راز اس کے ابا کے سامنے طشت از بام کرنے کی دھمکی دی تھی۔ (ویسے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس محبت کا علم آگے پیچھے کی چار چار گلیوں تک ہر کسی کو ہوتا ہے اس سے لڑکی کے اماں ابا بھلا کیسے ناواقف رہ جاتے ہیں)

خیر...... جو بھی ہو، پنو کے طفیل مجھے ایک عدد معشوقہ دستیاب ہو گئی تھی۔ آج اسی محبوبۂ دلنواز سے ملاقات کی خاطر میں ایک سرکاری پارک میں موجود تھا۔ نشو تمام تر دلبرانہ ادائیں دکھاتے ہوئے اس وقت بڑی رغبت سے ان گول گپوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھی جو میں اس کی فرمائش پر پارک سے باہر کھڑے ریڑھی والے سے خرید کر لایا تھا۔ گول گپوں میں مرچوں کی زیادتی کے باعث اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ محبوبہ کی آنکھوں کے پانی (مطلب آنسوؤں) کو یار لوگوں نے بڑی بڑی شاعرانہ اصطلاحات میں قلم بند کیا ہے لیکن نشو کی آنکھوں سے بہتے آنسو مجھے کوئی رومینٹک شعر سوچنے سے اس لیے روکے ہوئے تھے کہ میری نظر اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ناک سے بہتے ہوئے پانی پر بھی پڑ چکی تھی جسے وہ ہر بار اپنی لپ اسٹک خراب ہونے سے قبل ہی بڑی مہارت سے آستین سے صاف کر لیتی تھی۔ محبوبہ کی بہتی ناک پر میں نے آج تک کسی شاعر کا کوئی خوب صورت استعارہ نہیں پڑھا اس لیے اس منظر سے بیزار اِدھر اُدھر آنکھیں گھما کر کسی معقول نظارے کی تلاش میں تھا۔ بالآخر میری نظروں نے زرد لباس پر سیاہ شال اوڑھے اس لڑکی کو ڈھونڈ نکالا جو ایک بینچ پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر اس سے تقریباً آٹھ دس سال بڑا ایک مرد براجمان تھا۔ لڑکی خوش شکل تھی لیکن مجھے اس کی شکل سے زیادہ اس کی آنکھوں میں موجود آنسوؤں نے متوجہ کیا۔ مرچوں کی زیادتی کے باعث سُوں سُوں کر کے آنسو بہانے

والی نشو کے آنسوؤں کے مقابلے میں اُس کے حزن و ملال میں ڈوبے چہرے پر آنسوؤں سے بھری یہ آنکھیں زیادہ قابلِ توجہ تھیں۔

''اے...... یہ تم میرے ساتھ آ کر پرائی لڑکیوں کو تاڑنے میں کیوں لگے ہوئے ہو؟'' نشو کی کڑک دار آواز نے مجھے اس لڑکی سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ وہ گول گپے مع اس کے کھٹے پانی کے ختم کر چکی تھی اسی لیے اسے میری حرکات وسکنات پر توجہ دینے کی فرصت مل گئی تھی۔

''کچھ نہیں...... بس میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ بے چاری رو کیوں رہی ہے؟'' میں نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''اپنے عاشقِ نامراد کو چھوڑ کر کسی اور کا گھر بسانے جارہی ہے تو اس کا اس الوداعی ملاقات میں رونا تو بنتا ہے نا؟'' نشو نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بڑے اطمینان سے تبصرہ کیا تو میں حیران رہ گیا۔

''تمہیں کیسے پتا؟ تم اس لڑکی کو جانتی ہو کیا؟'' سوال خود بخود میرے ہونٹوں سے پھسلا۔

''اس بات کو سمجھنے کے لیے جان پہچان کی نہیں، عقل کی ضرورت ہے۔ دیکھ نہیں رہے لڑکی مایوں کے زرد لباس میں ہے۔'' نشو نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

''ضروری تو نہیں کہ زرد لباس مایوں بیٹھی لڑکی ہی پہنے۔ عام دنوں میں یہ رنگ پہننا کوئی ممنوع تو نہیں ہے۔'' میں نے نشو سے بحث کی۔

''صرف کپڑوں کے رنگ کی بات نہیں ہے۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کی رنگت بھی زرد ہو رہی ہے اور ایسا ابٹن لگانے سے ہوتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے وہ ایلیمیا کا شکار ہو اور خون کی کمی سے رنگت زرد ہو رہی ہو۔'' پتا نہیں کیوں میں نشو کے دلائل سے قائل نہیں ہونا چاہ رہا تھا اس لیے خواہ مخواہ ایک دوسرا نکتہ اٹھایا۔

''بھاڑ میں جائے وہ لڑکی اور اُس کی رنگت۔ مجھے ملاقات کے لیے بلا کر تم ایک...... پرائی لڑکی پر غور و خوض کرنے میں الجھے ہوئے ہو۔'' بالکل اچانک ہی نشو کا مزاج بگڑ گیا اور اس نے دوسری بار مجھے یوں ''پرائی لڑکی'' کو دیکھنے کا طعنہ دیا جیسے خود میرے نکاح میں ہو۔

''بد اخلاقی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ذرا خیال نہیں ہے کہ یہ بندی جو خاص تمہارے لیے آئینے کے سامنے دو گھنٹے لگا کر آئی ہے، اسے ذرا توجہ سے دیکھ ہی لو۔'' اس نے منہ پھلایا۔

''آئینے کے سامنے دو گھنٹے لگانے کے بجائے واش بیسن پر دو منٹ لگا کر منہ دھو کر آجاتیں تو زیادہ اچھا تھا۔'' اس کے گولا گنڈا بنے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں اس خراب صورتِ حال میں بھی کلمۂ حق بولنے سے باز نہ رہ سکا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے گویا پنجے نکالتے ہوئے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب ہے تم تو دُھلے چہرے کے ساتھ بھی اتنی حسین لگتی ہو پھر اس ہار سنگار کے چکر میں وقت ضائع کرنے اور خود کو تھکانے کی کیا ضرورت تھی۔'' آخر کار مجھے حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور میں نے بڑی مہارت سے بات بنائی۔

''بس رہنے دو، مجھے معلوم ہے یہ سارے خرچے بچانے کے چکر ہیں۔ تم بڑے چالاک ہو۔ ابھی سے ایسی باتیں بنا کر مستقبل کے لیے بچت کر رہے ہو کہ شادی کے بعد میں تم سے اپنے ہار سنگار کے لیے کچھ لینے کی فرمائش ہی نہ کروں لیکن کان کھول کر سن لو سجنا سنورنا ہم خواتین کا پیدائشی حق ہے جسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'' اس نے یوں بولنا شروع کیا جیسے حقوقِ نسواں کے لیے منعقد کیے جانے والے کسی جلسے میں تقریر کر رہی ہو۔

''میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا یار! پیسہ کوئی تم سے بڑھ کر ہے۔ تم جو کہو گی میں تمہیں دلوا دیا کروں گا۔'' نقصِ امن سے بچنے کے لیے میں نے جھٹ اس سے وعدہ کر لیا اور

پَری

''ممی آپ تو کہتی ہیں کہ پریاں اڑتی ہیں؟''

''ہاں بیٹا! پریاں اڑتی ہیں۔''

''لیکن عاشی آنٹی تو نہیں اڑتیں۔''

''وہ پری نہیں ہیں۔''

''وہ پری ہیں...... جب بھی وہ اکیلے گھر میں آتی ہیں تو ڈیڈی کہتے ہیں میری پری آگئی!''

''اچھا...... اب وہ آئی تو خود بھی اُڑے گی اور ساتھ ہی تمہارے ڈیڈی بھی۔''

اسلام آباد سے ہما انصاری کی خفگی

بلا ارادہ ہی ایک نظر اُس لڑکی اور مرد پر ڈالی۔ اب وہ دونوں بینچ سے کھڑے ہو چکے تھے اور آپس میں کسی بات پر دھیمی آواز میں بحث کر رہے تھے۔

''ابھی دلواؤ تو جانوں۔ شادی کے بعد کے وعدے تو ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے سیاست دانوں کے الیکشن سے پہلے کے وعدے۔'' میری چالاکی بھانپ کر اس نے فوراً مجھے چیلنج کیا۔

''ایسی بے اعتباری کی باتیں تو مت کرو جانو! ایسی باتیں کر کے تم میرے سچے جذبوں کی توہین کر رہی ہو۔'' جیب ہلکی کرنے کے خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا چنانچہ اسے باتوں کے جال میں اُلجھانے کی کوشش کی اور مصنوعی ناراضی کے اظہار کے لیے اپنا رخ ذرا سا پھیر لیا۔ رخ پھیرنے پر میری نظر ایک نوجوان پر پڑی۔ وہ جینز کی پینٹ اور قدرے ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں ملبوس تھا پھر بھی میں نے اس کی شرٹ کے نیچے ابھار کو محسوس کر لیا۔ یوں لگتا تھا اس نے پینٹ میں کچھ اُڑس رکھا ہے۔ غالب امکان یہ تھا کہ وہ کوئی ہتھیار ہے۔ تمام شریف لوگوں کی طرح میں بھی مسلح لوگوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں سو فوراً ہی اس کی طرف سے توجہ ہٹالی لیکن نظر ہٹانے سے پہلے میں نوٹ کر چکا تھا کہ اس کی توجہ کا مرکز بھی وہی لڑکی اور اس کا ساتھی مرد تھے جس کی وجہ سے میرے اور نشو کا تازہ تازہ رشتۂ عشق خطرے سے دوچار تھا۔

''اپنی توہین کا بڑا خیال ہے اور یہ جو ہر دو منٹ بعد مجھے چھوڑ کر اِدھر اُدھر تاڑنا شروع کر دیتے ہو، وہ کچھ نہیں ہے۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے جو تم جیسے ناقدرے انسان سے واسطہ پڑ گیا۔'' میرے ناراضگی کے اظہار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے وہ دوہائیاں دینا شروع کر دیں جو ہمارے ہاں خواتین عموماً شادی کے بعد دیتی ہیں۔

''میں جا رہی ہوں۔ اگر مجھے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانے کا ارادہ ہو تو میرے پیچھے آنا ورنہ یہیں بیٹھ کر اس اجڑے پارک کی ٹوٹی بینچیں اور سوکھے پتوں کے نظارے کرتے رہنا۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور پارک کے بیرونی دروازے کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھی۔ میرا اپنی جیب ہلکی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے اس کے پیچھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ ضرور سوچا کہ اس اجاڑ پارک میں بیٹھے رہنے کے بجائے کسی دوست کے پاس جا کر گپیں لگا لیتا ہوں سو خود بھی نشو کے جاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پارک کے خارجی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک چوڑے تنے کے درخت کے پیچھے نسوانی وجود کی جھلک دیکھی۔ اس نے بہت خوب صورت کڑھائی والی میرون رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور ایسے رخ سے کھڑی تھی کہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یقینی طور پر وہ بھی کسی خفیہ ملاقات کے لیے آئی ہوئی تھی اور خود کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اس درخت کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔

مجھے دوسروں کی ذاتیات میں دخل دینا زیادہ پسند نہیں ہے اس لیے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی پارک کے گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ ایک چہکتی ہوئی آواز نے اپنی طرف توجہ مبذول کر لی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم میرے پیچھے ضرور آؤ گے اس لیے میں یہاں رک کر تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ کہیں مجھے نہ پا کر تم پریشان نہ ہو جاؤ۔'' وہ نشو تھی جو واقعی امریکی امداد کی طرح میرے گلے پڑ گئی تھی اور میرے لیے چاہ کر بھی اس سے جان چھڑانا مشکل تھا۔

''تمہیں میرے لیے خود کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے بھی پاکستان کی طرح مصنوعی اکڑ دکھانے کی کوشش کی۔

''ہائے اللہ کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم اور میں کوئی الگ تھوڑی ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر نام نہاد دوستی کا جھنڈا بلند کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا، اس سے قبل ہی فضا میں اوپر تلے دو فائروں کی آواز گونجی۔ میں نے بدحواس ہو کر آواز کی سمت دوڑنا چاہا لیکن نشو نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ بھاگو یہاں سے یہ نہ ہو کہ خود کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔'' اس نے عین وقت پر مجھے ہوش کے ناخن دلائے تو میں نے پارک کے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے نشو کے ساتھ دوڑ لگائی اور دونوں ہی روٹھنے منانے کا چکر بھول بھال کر اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

☆☆☆

اکیس سالہ سونیا گھر سے قریبی پارک میں پُراسرار طور پر قتل۔ مقتولہ کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا۔ والدین اور دیگر عزیز صدمے سے نڈھال۔۔۔۔۔ مقتولہ کی تین دن بعد شادی تھی۔

اس رات میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اس خبر کے ساتھ دکھائی جانے والی لڑکی کی تصویروں نے چونکا دیا۔ تصویروں کو دیکھ کر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے پارک میں ایک مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی کے قتل کی

خبر کے ساتھ ہی مجھے وہ جین اور ٹی شرٹ والا نوجوان بھی یاد آ گیا جس کی ٹی شرٹ کا ابھار دیکھ کر مجھے وہاں کسی اسلحے کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ پارک سے نکلتے وقت میں نے جن دو گولیوں کے دھماکے کے سنے تھے، وہ اسی نوجوان نے چلائی تھیں اور نشانہ سونیا تھی۔ پتا نہیں کون تھا وہ نوجوان اور کیوں ایک زندگی سے بھرپور لڑکی کو قتل کر ڈالا تھا۔ مجھے ہر عام انسان کی طرح ایک جوان لڑکی کے قتل پر افسوس ہو رہا تھا۔ ٹی وی پر نیوز اینکر اب دوسری خبریں سنا رہی تھی لیکن میرا ذہن اسی ایک خبر میں اٹک گیا تھا۔ اس اٹکے ہوئے ذہن کو موبائل کی گھنٹی نے متوجہ کیا، دوسری طرف نشاط عرف نشو تھی۔

''تم نے ٹی وی پر خبریں دیکھیں عابد! اسی پارک والی لڑکی کے بارے میں خبر آئی ہے۔'' میرے 'ہیلو' کہتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''ہاں دیکھ لی۔ پتا نہیں کس ظالم نے مار ڈالا بے چاری کو۔'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''دیکھنا، میں نے تم سے ٹھیک کہا تھا نا کہ وہ مایوں کی دلہن ہے۔ مجھے لگتا ہے اپنے عاشقِ نامراد کے ہاتھوں ہی ماری گئی ہے۔'' وہی جس سے ملنے کے لیے پارک آئی ہوئی تھی۔'' نشو اپنے اندازے کی درستگی پر پُرجوش ایک اور نیا اندازہ قائم کر چکی تھی۔

''میرا دل نہیں مانتا نشو کہ وہ پکی عمر کا مرد اس کا عاشق ہو سکتا ہے۔'' میں نے اس سے اختلاف کی جسارت کی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ تمہیں کیا معلوم آج کل لڑکیوں میں بڑی عمر کے مردوں سے رومانس کا رجحان بہت بڑھ چکا ہے۔ خالی جیب کے نوجوانوں کے مقابلے میں بڑی عمر کا ویل سیٹلڈ بندہ زیادہ ٹھیک رہتا ہے۔ کم از کم لڑکی کو اس کی پسند کی شاپنگ تو کروا دیتا ہے۔'' اس نے مجھے حالیہ رجحان سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ لگے ہاتھوں طعنہ دینے کا فریضہ بھی انجام دے ڈالا جسے نظر انداز کر کے میں نے اسے ٹی شرٹ والے ممکنہ مسلح نوجوان کے بارے میں بتایا۔

''کون تھا وہ لڑکی کا بھائی یا کوئی پرانا عاشق؟'' اس نے جھٹ مجھ سے سوال کیا۔

''مجھے کیا معلوم، میں نے کوئی جا کر اس کا انٹرویو لیا تھا۔'' میں اس کے بے تکے سوال پر جھنجلا گیا۔

''اس کے لیے انٹرویو لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اس کی شکل لڑکی سے ملتی جلتی تھی تو وہ اس کا بھائی ہوگا ورنہ سابقہ عاشق، قتل کا سبب ہوا...... مرد کی غیرت۔'' اس نے شرلاک ہومز کی طرح بیٹھے بیٹھے پورا کیس حل کر دیا۔

''تمہاری بے تکی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

اس وقت تو میں نے چڑ کر سلسلہ منقطع کر دیا لیکن بعد میں بار بار اس نوجوان کی شکل نظروں کے سامنے گھومتی رہی۔ کبھی لگتا مقتولہ سونیا سے اس کی شکل و صورت ملتی ہے اور کبھی وہ الگ لگنے لگتا۔ دھیان اس نوجوان سے بھٹکتا تو اس روز مقتولہ کے ساتھ موجود مرد کی طرف چلا جاتا۔ نشو نے اسے مقتولہ کا عاشقِ نامراد قرار دے کر پہلے ہی اس پر قتل کا الزام لگایا تھا۔ میرا ذہن اسے مقتولہ جیسی خوب صورت اور نوجوان لڑکی کا عاشق ماننے کے لیے تو تیار نہیں تھا لیکن قتل کا شبہ میں اس پر کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں اچھے خاصے معقول حلیے کے باوجود وہ شخص پہلی نظر میں ہی مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن کی خبروں میں بھی وقتاً فوقتاً سونیا قتل کیس کا ذکر کیا جاتا رہا۔ مایوں بیٹھی لڑکی کا گھر سے تنہا نکل کر قریبی پارک جانا اور قتل سب ہی کے لیے ایک حیرت انگیز بات تھی اس لیے میڈیا اس خبر کو خاصی کوریج دے رہا تھا اور پولیس کی طرف سے بھی تفتیش کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے مرحلے پر پارک کے گیٹ پر لگے سی سی ٹی وی کیمرے سے مدد لینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن شہر میں نصب بیشتر کیمروں کی طرح یہ کیمرا بھی ناکارہ پایا گیا تھا اور پولیس کو یہ جاننے میں قطعی کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ سونیا کس وقت اور کس کے ساتھ پارک آئی تھی یا اس کی پارک میں موجودگی کے دوران وہاں ایسا کون سا مشتبہ شخص وہاں آیا تھا جس پر اس کے قتل کا شک کیا جا سکے۔ سونیا کے اپنے گھر والے اس سلسلے میں کسی پر شک ظاہر کرنے سے قاصر تھے اور اب پولیس مقتولہ کے زیرِ استعمال موبائل فون کا ڈیٹا حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

''تم کیا کہتی ہو نشو! میں پولیس کو اس ٹی شرٹ والے کے بارے میں آگاہ کر دوں۔'' مجھے ایک ذمے دار شہری کہلوانے کا شوق چرایا تو نشو سے اس سلسلے میں مشورہ مانگا۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں تو شکر ادا کر رہی ہوں کہ وہاں کا کیمرا خراب تھا اس لیے ہم تفتیش میں شامل ہونے سے بچ گئے ورنہ عین گولیاں چلنے کے ٹائم ہمارا وہاں سے نکل بھاگنا ہمیں بھی پھنسوا سکتا تھا اور تم ہو کہ آ بیل مجھے مار کے مصداق خود چل کر پولیس کے پاس جانے لگے ہو۔'' نشو نے ایک ہی سانس میں مجھے جھاڑ کر رکھ دیا۔

''خود چل کر تھوڑی جاتا بس گمنام کال کر کے بتا

دیتا۔" میں نے منمنا کر اپنی صفائی پیش کی۔

"بس تم رہنے دو، پولیس کو اسے خود ڈھونڈنے دو۔ تمہاری آدھی ادھوری معلومات پولیس کو کیس حل کرنے میں تو کوئی مدد نہیں دیں گی لیکن تم خود کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔" وہ ابھی سے مجھے کسی بیوی کی طرح ڈانٹنے ڈپٹنے لگی تھی۔ میں نے بددلی سے فون بند کر دیا اور تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کے مشورے پر عمل کرنے لگا۔ اس مقصد کے لیے میرا ٹی وی دیکھنے کا دورانیہ جو کہ پہلے ہی کافی زیادہ تھا، مزید بڑھ گیا۔ تیسرے دن ہی اس کیس میں بے حد اہم پیش رفت ہوئی اور پولیس نے مقتولہ کے بہنوئی کو گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاری مقتولہ کے موبائل فون کا ڈیٹا حاصل کرنے کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی۔

تفصیلات کے مطابق قتل سے قبل سونیا کے موبائل پر آنے والی آخری کال اس کے بہنوئی کی تھی۔ موبائل فون کے ریکارڈ سے ظاہر تھا کہ وہ دونوں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے اور کئی بار ان کے موبائل کی لوکیشن ایک پائی گئی تھی۔ خبروں میں گرفتار شدہ شخص کی تصویر دیکھ کر میں زیادہ حیران نہ ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے قتل والے روز سونیا کے ساتھ پارک میں دیکھا تھا۔ سالی، بہنوئی کا آپس میں رابطے میں رہنا یا کسی مقام پر ساتھ موجود ہونا اتنے اچنبھے کی بات نہیں لیکن سالی کا بہنوئی کے ساتھ ہونا اور پھر قتل ہو جانا ضرور قابلِ توجہ تھا۔ بہرحال ملزم نے ابھی تک اعترافِ جرم نہیں کیا تھا۔

"میں پولیس کو اطلاع دے دیتا ہوں کہ قتل والے روز یہی شخص مقتولہ کے ساتھ پارک میں موجود تھا۔" میں ایک بار پھر پولیس کی مدد کے لیے پھڑکنے لگا۔

"پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے تو اس کی چھترول کر کے سچ بھی اگلوا لے گی۔ تمہیں خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑا کر تڑوانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس بار بھی نشو نے مجھے میرے ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا اور میں خبروں میں اس قتل کیس کا معما حل ہوتا دیکھتا رہا۔

ہر روز اس قتل کے حوالے سے نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے جس میں سے چند انکشافات نہایت شرمناک تھے۔ مقتولہ سونیا کے بہنوئی نے دورانِ حراست اعتراف کر لیا تھا کہ وہ سسرال میں کھلے بندوں آنے جانے کی اجازت کا فائدہ اٹھا کر عرصہ دراز سے اپنی نوجوان سالی کا جذباتی اور جنسی استحصال کر رہا تھا۔ محبت کے جھوٹے وعدوں اور دھمکیوں سے اس نے سونیا پر اچھا خاصا قبضہ جما رکھا تھا اور وہ یہ سب کچھ اتنی چالاکی سے کر رہا تھا کہ کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سونیا کا رشتہ طے کرتے وقت بھی اسے آگے آگے رکھا گیا تھا۔ چہرے پر نقاب چڑھائے وہ ایک طرف گھر کے بڑے داماد کے فرائض انجام دے رہا تھا تو دوسری طرف مسلسل سونیا کو ورغلانے اور شادی سے انکار کرنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن اس بار سونیا نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ ایک طرف تو طے پانے والا رشتہ بہت اچھا تھا اور دوسری طرف وہ گندگی کی اس دلدل سے نکلنا چاہتی تھی جس میں اس کے بہنوئی نے اسے پھنسا رکھا تھا۔ بہنوئی منیب کو اس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا اور اس نے اپنے موبائل میں موجود اس کی چند قابلِ اعتراض تصویریں اور ویڈیوز عام کر دینے کی دھمکی دے کر اسے اس روز پارک میں ملنے بلایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سونیا اس کے ساتھ گھر چھوڑ کر فرار ہو جائے لیکن سونیا اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان کافی بحث ہوتی رہی تھی اور منیب نے غصے میں اسے دھمکانے کے لیے اپنا پسٹل بھی نکال لیا تھا۔

اور بس یہیں تک منیب اعتراف کے لیے تیار تھا۔ وہ اس بات سے قطعی انکاری تھا کہ سونیا پر گولیاں اس نے چلائی تھیں اور وہ اس کی چلائی گئی گولیوں سے ہلاک ہوئی تھی۔ فرانزک کی رپورٹ بھی اس کے حق میں تھی۔ جائے وقوعہ سے ملنے والے گولیوں کے خول منیب کے پاس موجود پسٹل کی گولیوں سے مختلف تھے۔ دوسرا انکشاف یہ تھا کہ سونیا کو قریب کے بجائے دور سے گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ قریب سے گولیاں مارے جانے کی صورت میں اس کے زخموں پر بارود کی زیادہ مقدار موجود ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ زخم کے سائز اور زاویے وغیرہ کے حوالے سے بھی چند ٹیکنیکل باتیں تھیں جو منیب کے اس بیان کی تصدیق کرتی تھیں کہ اس نے سونیا پر گولیاں نہیں چلائیں اور وہ اس کا قاتل نہیں ہے۔

قاتل وہ نہیں تو اور کون تھا؟ میں جب بھی اس سوال کا جواب سوچتا، میرے ذہن میں اس نوجوان کی صورت آ جاتی جسے میں نے پارک میں دیکھا تھا۔ سونیا اور منیب کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے تھے اور مجھے اس کے پاس اسلحے کی موجودگی کا بھی شبہ ہوا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اس نوجوان کو قطعی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا سونیا سے کیا تعلق ہے۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک حل آیا اور میں نے اپنی خاموشی توڑ کر پولیس

کی مدد کا اصولی فیصلہ کیا۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے مجھے صرف ایک کام کرنا تھا۔ مجھے اپنی ڈرائنگ کی صلاحیت کا فائدہ اٹھا کر اس شخص کا خاکہ بنانا تھا۔ صرف یادداشت کی بنیاد پر یہ کام کرنا آسان نہیں تھا لیکن میں نے دن رات ایک کر دیے اور ایک ایسا خاکہ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو مکمل تو نہیں مگر کم سے کم ساٹھ فیصد اس شخص سے مشابہ تھا۔ اس تیار شدہ خاکے کو میں نے ڈاک کے ذریعے متعلقہ تھانے بھجوا دیا اور دعا کرنے لگا کہ وہ لوگ اسے نظر انداز کرنے کے بجائے سنجیدگی سے لیں۔ میری دعائیں قبول ہوئیں اور سونیا قتل کیس کے تفتیشی افسر نے میرے بھیجے ہوئے خاکے اور اس سے منسلک نوٹ کو اہمیت دیتے ہوئے صرف تین دن کے اندر اس شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ سونیا کا وہ منگیتر تھا جس سے قتل والے روز سے صرف تین دن بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔

گرفتاری کے بعد شروع میں تو اجمل نامی وہ لڑکا کچھ بھی ماننے سے انکار کرتا رہا لیکن پھر پولیس کی سختی نے اس سے بہت سے اقرار کروا لیے۔ اس نے بتایا کہ وقوعہ والے روز اس کے پاس ایک گمنام کال آئی تھی۔ کال کرنے والے کی آواز عجیب سی تھی اور وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ کسی مرد کی آواز ہے یا عورت کی۔ بہرحال وہ جو بھی تھا، اس نے اجمل کو بتایا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی کا کسی اور کے ساتھ افیئر چل رہا ہے اور وہ آج فلاں وقت پر اپنے عاشق سے ملنے گھر کے قریبی پارک میں جانے والی ہے۔ اجمل کو اس اطلاع پر بہت غصہ آیا تھا اور وہ تصدیق کے لیے بھرا ہوا پسٹل لے کر پارک جا پہنچا تھا۔ پارک میں اسے سونیا اور منیب کو دیکھ کر شدید جھٹکا لگا تھا اور غصے میں ایک لمحے کے لیے اس نے اسے قتل کرنے کا بھی سوچا تھا لیکن عین وقت پر اسے عقل آ گئی اور اس نے سوچا کہ سونیا کوئی اس کی منکوحہ تو نہیں ہے جو غیرت کا ایسا غیر معمولی مظاہرہ کر کے اپنی زندگی برباد کر لے۔ اس کے لیے آسان حل یہ تھا کہ وہ رشتہ توڑ دے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ پارک سے گھر جانے کے لیے نکلنے ہی لگا تھا کہ اس نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں اور سونیا کو زخمی ہو کر گرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس وقت منیب کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا اس لیے اس نے یہی گمان کیا تھا کہ منیب ہی سونیا کا قاتل ہے۔ اسے یقین تھا کہ منیب جلد یا بدیر سونیا کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو جائے گا اس لیے خود خاموشی اختیار کیے رہنے کا فیصلہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

پولیس نے اجمل کا یہ بیان مسترد کر کے عدالت سے اس کے خلاف ریمانڈ حاصل کر لیا تھا اور اس سے مزید تفتیش کر رہی تھی لیکن ایک بات اجمل کے حق میں تھی کہ اس کے پاس موجود پسٹل وہ نہیں تھا جس سے سونیا کو گولیاں ماری گئی تھیں۔ پولیس اجمل سے وہ پسٹل بازیاب کروانے کے سلسلے میں زور مار رہی تھی لیکن فی الحال ناکام تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ اس بندے کو تم نے پھنسوایا ہے۔" اجمل کی گرفتاری کے بعد نشو نے فون کر کے مجھ پر اپنا شک ظاہر کیا لیکن میں صاف انکاری ہو گیا۔ انکار کرنے میں اس لیے بھی آسانی تھی کہ تفتیشی افسر نے اپنی قابلیت ثابت کرنے کے لیے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ کسی اجنبی نے ایک عدد خاکے کے ذریعے اس کی مدد کی تھی۔ مجھے بھی اس بات کی پروا نہیں تھی۔ میں اس بات پر مطمئن تھا کہ قاتل پکڑا گیا ہے اور جلد پولیس اس سے اعتراف جرم بھی کروا لے گی۔

☆☆☆

سونیا قتل کیس سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں اس کیس سے اپنی دلچسپی ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس سلسلے میں میڈیا کا بھی کردار تھا کہ وقفے وقفے سے اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خبر نشر ہوتی ہی رہتی تھی۔ اب جو نئی خبر نشر ہوئی، اس نے مجھ سمیت بہت سوں کو چونکا دیا۔ یہ خبر آلۂ قتل کی بازیابی سے متعلق تھی۔ یہ عجیب و غریب بات سامنے آئی تھی کہ سونیا کے قتل سے صرف ایک دن پہلے منیب کے چھوٹے بھائی حسیب کا پسٹل چوری ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے پسٹل کی چوری کی خبر عین قتل والے روز قریبی تھانے میں درج کروا دی تھی لیکن پھر ایک دن بعد ہی اسے اپنا پسٹل گھر ہی سے مل گیا اور اس نے متعلقہ تھانے میں پسٹل کے مل جانے کی اطلاع دے دی۔ تھانے والوں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور حسیب بھی سونیا قتل کیس میں بھائی کو نامزد پا کر دانستہ خاموشی اختیار کر گیا لیکن بچوں میں سے کسی کے منہ سے یہ بات سونیا کے والد یعنی اپنے نانا کے سامنے نکل گئی کہ چاچو کا پسٹل ایک دن کے لیے چوری ہو گیا تھا۔ سونیا کے والد کو اپنی عزت خاک میں ملا دینے والے بڑے داماد سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی اس لیے انھوں نے فوراً تفتیشی افسر کو اس بات کی اطلاع دے دی۔ اس نے حسیب کا پسٹل کسٹڈی میں لے کر اس کی جانچ کروائی تو انکشاف ہوا کہ یہی پسٹل آلۂ قتل تھا۔ آلۂ قتل دریافت ہو جانے کے بعد ایک بار پھر منیب سب سے زیادہ مشکوک شخص قرار پایا اور پولیس کی تفتیش کا رخ اس کی طرف مڑ گیا۔

میں جو اجمل کو قاتل کی حیثیت سے گرفتار کروا کر مطمئن ہو چکا تھا، اس انکشاف کے بعد بری طرح الجھ گیا۔ اجمل کی رسائی منیب کے بھائی کے پسٹل تک ہوتی یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ کام تو صرف منیب ہی کر سکتا تھا کہ اپنے بھائی کا پسٹل چوری کرتا اور کام ہو جانے کے بعد اسے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیتا یعنی ایک بار پھر منیب ہی سب سے زیادہ مشکوک شخص تھا۔ ایک ایسا شخص جو اپنی سالی کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتا ہو قاتل بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ شخص یہ بات کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سونیا کے والدین کی حالت سب سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ ان کی ایک بیٹی مر چکی تھی اور دوسری بیٹی بھی اجڑ کر ان کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے بھیانک انکشافات کے بعد وہ بیٹی کو منیب کے گھر میں رہنے دیتے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک نیوز رپورٹ میں سونیا کے والدین کے ساتھ اس کے معصوم بھانجا بھانجی اور چادر میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی بڑی بہن کو دیکھا تو میرا دل کٹ کر رہ گیا اور پہلی بار میں نے خود کو مجبور پایا کہ ساری مصلحتوں اور خوف کو بھول کر خود تھانے جاؤں اور اس کیس کے تفتیشی افسر سے ملوں۔

☆☆☆

اُس روز خبروں کی شہ سرخی تھی۔

سونیا قتل کیس حل ـــــ بہن ہی بہن کی قاتلہ نکلی۔

یہ کہانی تھی ایک ایسی عورت کے غم و غصے اور نفرت کی جسے اس کے قریبی رشتے ہی دھوکا دے رہے تھے۔ شازیہ نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا تھا کہ کچھ عرصے سے اسے اپنے شوہر اور بہن کے تعلقات کے بارے میں شک محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ صرف اس وجہ سے صبر کے گھونٹ پی کر بیٹھی ہوئی تھی کہ سونیا شادی ہو کر اپنے گھر چلی جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر کسی طرح سونیا کو شادی سے روکنے پر تلا ہوا ہے تو ان دونوں کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ گئی اور وہ مسلسل ان کی کھوج میں رہنے لگی۔ اسی لیے جب منیب نے سونیا کو ملاقات کے لیے پارک بلوایا تو اس نے اپنی آواز کو مردانہ بناتے ہوئے اس کے منگیتر کو فون پہ اس کی اطلاع دے دی۔ اسے امید تھی کہ سونیا کا منگیتر جو ایک جذباتی نوجوان ہے، غصے میں انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا۔ دوسری صورت میں وہ از خود ان دونوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے اس نے اپنے دیور کا پسٹل چرایا تھا۔ جب اجمل توقع کے خلاف کوئی کارروائی کیے بغیر پارک سے جانے لگا تو پلان بی پر عمل کرتے ہوئے خود اس نے گولیاں چلادی تھیں۔ وہ منیب اور سونیا دونوں کو قتل کرنا چاہتی تھی لیکن صرف سونیا ہی نشانہ بن سکی اور منیب بچ گیا۔ وہ خود پارک کے مرکزی دروازے کے بجائے دائیں جانب کی ٹوٹی ہوئی گرل کی طرف سے کود کر فرار ہونے کے باعث کسی کی نظر میں نہ آسکی اور بعد میں اپنے دیور حسیب کا پسٹل واپس لے جا کر رکھ دیا۔ جوائنٹ فیملی میں رہنے کی وجہ سے اس کے لیے پسٹل کو چرانا اور واپس رکھنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ راز کبھی نہیں کھلے گا کہ اس نے منیب کا پسٹل استعمال کیا تھا۔ فلموں، ڈراموں سے سیکھی گئی عقل کے مطابق اس نے پسٹل استعمال کرتے وقت دستانوں کا استعمال کیا تھا اس لیے کسی وجہ سے پسٹل سامنے آنے پر بھی اسے اپنے فنگر پرنٹس پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ پکڑی گئی تھی کہ اس روز میں اپنی شو سے ملنے وہاں موجود تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے سونیا کی بڑی بہن شازیہ کو قاتلہ کی حیثیت سے کیسے پہچانا تو یقین جانیے میں نے ایک چھوٹے سے کلیو کی مدد سے یہ معما حل کیا۔ وہ نیوز رپورٹ جس میں سونیا کے والدین، شازیہ اور اس کے بچوں کو دکھایا گیا تھا۔ میری ساری الجھنیں دور کر گئی۔ اس ویڈیو میں شازیہ نے اپنا چہرہ ایک چادر سے چھپایا ہوا تھا اور مجھے فوراً اس روز پارک سے روانہ ہوتے وقت درخت کے پیچھے کھڑی عورت کی چادر یاد آ گئی تھی۔ خوب صورت کڑھائی والی وہ میرون چادر مجھ جیسے فطری آرٹسٹ کے دماغ سے نہیں نکل سکی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس روز درخت کے پیچھے چھپی کھڑی عورت جس کی میں نے شکل تک نہیں دیکھی تھی، کوئی اور نہیں سونیا کی بہن شازیہ تھی۔ میری رپورٹ پر شازیہ کی گرفتاری اور پھر تفتیش سے لے کر اقبالِ جرم تک کی ساری کارروائی پولیس نے بڑی سرگرمی سے انجام دی لیکن میرے ذہن میں یہ سوال رہ گیا کہ کیا اصل مجرم واقعی شازیہ ہے؟ یا ہمارا وہ تمام زندگی جو آہستہ آہستہ اپنے مرکز سے ہٹ کر اس نہج پر آچکا ہے کہ ہم اپنی اقدار اور رشتوں کا تقدس بھول کر بس ایسی حیوان نما مخلوق رہ گئے ہیں جس کے سامنے اپنے منفی جذبات کی تسکین کے سوا کوئی مقصدِ حیات ہی نہیں رہا۔ جنس، دولت اور انتقام جیسے چند گنے چنے جذبات کے درمیان اپنی زندگیاں بتاتے ہم ہر روز قربِ قیامت کی نشانیاں دیکھ رہے ہیں ـــــ شاید وہ دن دور نہیں جب ہم سچ مچ کی قیامت دیکھیں گے۔

❖❖❖

1

سوا سیر

حسام بٹ

زندگی کو سہل اور آسان تر بنانے والی نعمتیں
جن کو حاصل ہیں، وہ اس کا شکر ادا کرنے کے
بجائے... ان نعمتوں کو اپنی ایسی خواہشات
کی تکمیل کے لیے بروئے کار لاتے ہیں... جو
دوسروں کی زندگی کو برباد کرکے جہنم کدہ
بنا دیتی ہیں... کسی محنت اور تردّد کے بغیر
حاصل ہونے والی تعیشات کا کمال جو بالآخر
اس کے لیے وبال ثابت ہوا تھا...

ایک ہی تیر سے کئی شکار کرنے
والے شکاری کی انوکھی منصوبہ بندی

وہ لیپ ٹاپ کو اپنی گود میں رکھے، بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کی نگاہ لیپ ٹاپ کی اسکرین اور انگلیاں کی بورڈ پر معروفِ کار تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے دو نامناسب موویز ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ اب وہ ان دونوں ہیجان انگیز انگلش موویز کو یو ایس بی میں کاپی کر رہا تھا۔ ایسے مواقع اس کی زندگی میں بہت کم آتے تھے جب وہ گھر میں بالکل تنہا ہو۔ آج ایک ایسا ہی دن تھا اسی لیے اس نے اپنے تین ہم خیال دوستوں کو گھر پر مدعو کر لیا تھا تاکہ وہ چاروں کنگ سائز ایل ای ڈی پر وہ سنسنی خیز موویز دیکھ کر اپنے اخلاقی وجود کا سوا ستیاناس مار سکیں۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ اس کے دوستوں کی آمد میں ابھی کم و بیش دو گھنٹے باقی تھے۔ ان کو آج ڈنر بھی گھر پر ایک ساتھ ہی کرنا تھا۔ پیٹ پوجا کا سامان آن لائن آرڈر کرنے کا پروگرام تھا۔ اس نے دو ہاٹ موویز کو لائن اَپ کرنے کا بندوبست اپنے ذمّے لے رکھا تھا اور ان لمحات میں وہ اسی ذمّے داری کو نبھانے میں منہمک تھا۔

یکایک اس کے انہماک کا شیرازہ بکھر گیا۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔

''ان لوگوں نے تو آٹھ بجے آنے کو کہا تھا'' اس نے خود کلامی کی۔ ''یہ وہ تو نہیں ہو سکتے...... پھر کون ہے؟''

اس دوران میں ایک مرتبہ پھر اطلاعی گھنٹی کی مخصوص آواز سنائی دی۔ وہ بستر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے لیپ ٹاپ کو بیڈ پر ہی چھوڑا اور کمرے سے نکل کر بنگلے کے داخلی گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔ ایک بات کا اسے یقین تھا کہ وہ کامران، شرجیل یا توصیف میں سے کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر انہیں وقت سے پہلے آنا ہوتا تو وہ کال کر کے یا ٹیکسٹ کے ذریعے اسے اطلاع ضرور دیتے۔

اس نے مین گیٹ میں موجود چھوٹے دروازے کو کھولا تو اسے بنگلے کے باہر ایک مہ جبیں کھڑی دکھائی دی۔ وہ جدید تراش کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنے کندھے پر لمبے اسٹریپ والا ایک بیگ لٹکا رکھا تھا۔ مذکورہ لڑکی حسنِ بے مثال کی حامل تھی۔ اس نے اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور مزے کی بات یہ کہ وہ دلکش و دل نشیں لڑکی اس کے لیے قطعی اجنبی تھی!

اس نے خیرہ آنکھوں سے سرتاپا اس زہرہ جمال کا جائزہ لیا پھر پلکیں جھپکاتے ہوئے سوالیہ انداز میں صرف اتنا کہا۔ ''جی......؟''

اس ''جی'' کا سیدھا سادہ مطلب یہی تھا کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں، آپ نے گھنٹی کیوں بجائی ہے اور آپ کو کس سے ملنا ہے......؟ اس کے رُوبرو موجود چاند چہرہ حسینہ نے اپنی ستارہ آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈال کر بڑی شائستگی سے کہا۔

''یہ سر نوشاد کا گھر ہے؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''نوشاد علی میرے ڈیڈی ہیں مگر وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔''

وہ شولڈر بیگ کے اسٹریپ کو سیٹ بیلٹ کے مانند کھینچ کر ایڈجسٹ کرتے ہوئے اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''مگر انہوں نے تو مجھے آج شام چھ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ میرا نام انیتا ہے۔ میں ان کی ایک ایکس اسٹوڈنٹ ہوں اور آج کل پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہی ہوں۔ اسی سلسلے میں اُن سے مشورہ کرنے آئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق سر ٹائم اور وعدے کے سخت پابند ہیں پھر وہ مجھے ملاقات کے لیے چھ بجے کا وقت دے کر خود کہاں چلے گئے۔ کہیں یہ اپوائنٹ منٹ ان کے ذہن سے سلپ تو نہیں ہو گیا......!''

نوشاد علی کے گھر پر موجود نہ ہونے کی وجہ سے انیتا کے چہرے پر پریشانی ابھر آئی تھی اور اس تشویش نے اس کے حسن کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ نوشاد علی کے بیٹے کے دل میں پہلے ہی اتھل پتھل کا عمل جاری تھا۔ انیتا پر نگاہ پڑتے ہی اس کا پندرہ واں طبق بھی یکایک روشن ہو گیا۔ انیتا کے حوالے سے اس کے شیطانی دماغ نے ایک خاص انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے دوستوں کے آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اگر وہ ان کی آمد سے قبل انیتا کی کمپنی میں چند خوشگوار لمحات بتا لیتا تو اس میں خرابی والی کوئی بات نہیں تھی۔ انیتا جیسی طرح دار حسینہ کو گیٹ سے لوٹا دینے کے لیے اس کا دل آمادہ نہیں تھا۔

''میرا نام فیصل ہے!'' اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''آپ نے ڈیڈی کے مزاج، فطرت اور اصولوں کے حوالے سے جو کچھ کہا، وہ صد فیصد درست ہے۔ وہ میری بڑی بہن کے ساتھ تین گھنٹے پہلے شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ انہیں پانچ بجے تک واپس آ جانا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک لوٹے نہیں۔ ہو سکتا ہے ٹریفک جیم

میں کہیں پھنس گئے ہوں۔ میں انہیں ٹریس کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر ایکسرے کرنے والی نظر سے انیتا کا بھرپور جائزہ لیا۔ انیتا نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"لیکن کیا......؟"

"آپ کا یوں گیٹ پر کھڑے رہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا بلکہ یہ ایک طرح سے میری بداخلاقی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کو کوئی ایشو نہ ہو تو آپ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ڈیڈی کا انتظار کر سکتی ہیں۔"

"آپ سر کے بیٹے ہو فیصل......" انیتا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "سر میرے لیے بہت محترم ہیں اور میں اُن سے ملاقات کیے بغیر واپس نہیں جا سکتی۔ اگر آپ کہتے ہو کہ اندر بیٹھ جاؤں تو ٹھیک ہے...... اس میں ایشو والی کون سی بات ہے؟"

"ایشو کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس وقت گھر میں اور کوئی بھی موجود نہیں ہے۔" فیصل نے انیتا کی نظر میں خود کو معتبر بنانے کی غرض سے کہا۔ "باجی، ڈیڈی کے ساتھ گئی ہیں اور......"

"میڈم چار سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔" انیتا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ چار افراد کی فیملی ہوا کرتے تھے۔ آپ، آپ کی بڑی بہن زرمین، آپ کی ممی اور سر نوشاد لیکن میڈم یعنی آپ کی امی کا چار سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھیں۔"

فیصل نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ "آپ تو ہماری فیملی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔"

"فیصل! آپ نے شاید میری بات پر دھیان نہیں دیا۔" انیتا اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے ڈیڈی کی ایک ایکس اسٹوڈنٹ رہ چکی ہوں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں اولیول کر رہی تھی اور سر کے پاس کیم (کیمسٹری) کی ٹیوشن پڑھنے آیا کرتی تھی۔ اُن دنوں آپ لوگ کسی اور نسبتاً چھوٹے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ تم اس وقت کافی چھوٹے تھے۔ تمہاری سس (سسٹر) زرمین بھی مجھ سے دو سال چھوٹی ہے۔ وہ اس وقت اکیس کی ہے اور میں تیئس کی۔ ایم آئی رائٹ؟"

"ایبسولیوٹلی رائٹ انیتا!" وہ خاصے جوشیلے انداز میں بولا۔ "آپ تو ہماری فیملی فرینڈ نکل آئی ہیں مگر میں نے آپ کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور......"

"اور کیا؟" فیصل نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو انیتا خاصی بے تکلفی سے بولی۔ "آپ اچانک چپ کیوں ہو گئے۔ کوئی پرابلم ہے کیا......؟"

"کوئی پرابلم نہیں......" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ اندر ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔ باقی باتیں وہیں بیٹھ کر کریں گے۔"

انیتا نے ایک معنی خیز مسکراہٹ اُس کی جانب اُچھالی پھر بنگلے کے گیٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے مقابل قیمتی دبیز صوفوں پر براجمان تھے۔ اگر فیصل، انیتا کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتا دیتا کہ نوشاد علی اور زرمین آج دوپہر میں اسلام آباد چلے گئے ہیں اور نوشاد علی کی واپسی کل شام میں ہو گی تو...... انیتا کسی بھی قیمت پر اس کے گھر میں داخل نہ ہوتی۔ وہ نوشاد علی سے کوئی سنجیدہ مشورہ کرنے آئی تھی، فیصل سے گپ شپ کرنے نہیں...... مگر دوسری جانب معاملہ اس کے برعکس تھا۔

انیتا پہلی ہی نگاہ میں فیصل کو بھا گئی تھی۔ یہ اُس کے دل کا تقاضا تھا کہ وہ اس پری وش کی سنگت میں تھوڑا وقت بسر کرے۔ اس خواہش کے پردے میں اس کی کسی لوفرانہ سوچ کا عمل دخل نہیں تھا۔ بس یہ ایک لطیف جذبہ تھا اور وہ اس جذبے کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔

"آپ" اور "جناب" کے تکلفات کو وہ بنگلے کے گیٹ کے باہر ہی چھوڑ آئے تھے۔ وہ دونوں نئی جدید نسل سے تعلق رکھتے تھے جو روایات اور تکلفات کو فرسودہ اور فضول خیال کرتے تھے۔ گفتگو کا آغاز انیتا نے کیا۔ وہ دوستانہ انداز میں مستفسر ہوئی۔

"فیصل! تم نے میرے "اور کیا؟" کا جواب نہیں دیا......؟"

"ارے یار! اور، اگر، مگر...... وغیرہ کو بعد میں دیکھیں گے۔" فیصل نے سرسری انداز میں کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

"موسم ٹھنڈا ہے لہٰذا گرم زیادہ مناسب رہے گا۔" وہ اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔

"اپنی چوائس بتاؤ......" فیصل نے صوفے سے اٹھتے

ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "چائے یا کافی؟"

"تم بناؤ گے......؟" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"ظاہر ہے...... اس وقت اس بنگلے میں دو ہی افراد موجود ہیں۔" فیصل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ایک مہمان اور دوسرا میزبان اور...... یہ کام تو میزبان ہی کو کرنا ہوگا۔ میں اچھا اسٹوڈنٹ نہ سہی مگر مجھے کھانے پینے کا بہت شوق ہے اور تم تو جانتی ہو، کھانے کے شوقین افراد اچھے کک بھی ہوتے ہیں!"

"ٹھیک کہہ رہے ہو فیصل!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "دسمبر کا مہینا قریب الختم ہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں کافی زیادہ مناسب رہے گی۔"

"اوکے...... تم اِدھر ہی بیٹھو۔ میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔" فیصل نے معتدل انداز میں کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

"ایک منٹ فیصل......" وہ عام سے لہجے میں بولی۔ "جب تک تم کافی بنا کر لاتے، میں تمہارا واش روم استعمال کرلوں...... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟"

بات کے اختتام پر انیتا نے ایسی نگاہِ دل رُبائی سے فیصل کی طرف دیکھا کہ وہ دل و جاں سے اس پر نثار ہو گیا۔ جذبات سے مغلوب اور مسرت سے معمور آواز میں اس نے جواب دیا۔

"ویسے تو یہ ڈرائنگ روم بھی اٹیچڈ باتھ ہے لیکن تم نے میرا واش روم استعمال کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو آؤ، میں تمہیں اپنا کمرا دکھا دوں......!"

فیصل اپنے دوستوں کے گروپ میں سب سے زیادہ کامیاب فلرٹ سمجھا جاتا تھا۔ توصیف، کامران اور شرجیل اسے اپنا گرو مانتے تھے۔ وہ بڑی ہوشیاری اور نپے تلے انداز میں اپنی "چال" بڑھایا کرتا تھا اور اسے کبھی ناکامیابی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا، انیتا کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔

"کیوں نہیں......" وہ اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر ڈالتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تم میرے سر کے بیٹے ہو، تمہاری خواہش کا احترام بھی مجھ پر لازم ہے۔"

فیصل کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اگرچہ اسے اپنے "ٹیلنٹ" پر بڑا ناز تھا لیکن انیتا کے ذیل میں اس کا دماغ ففٹی ففٹی کے امکانات کی صدا دے رہا تھا اور یہاں تو سینٹ پرسینٹ رزلٹ نکل آیا تھا۔ اس نے آج تک اپنی فیملی کی جاننے والی کسی لڑکی پر ٹرائی نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے رولز آف فلرٹیشن کے خلاف تھا۔ وہ ہمیشہ محفوظ کھیل کھیلنے کا عادی تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے جا رہا تھا جو اس کی فیملی کے ہر فرد کو اچھی طرح جانتی تھی لیکن یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی نیت صاف اور ارادہ نیک ہے۔ وہ محض انیتا کے ساتھ تھوڑی دیر کی خوش گپیوں کا تمنائی تھا اور بس......!

وہ انیتا کو اپنے روم میں پہنچانے کے بعد کچن کی طرف جانے کے لیے مڑا تو وہ تاکیدی لہجے میں بولی۔ "کافی تیار کرنے کے دوران میں سر کو بھی ٹرائی کرتے رہنا، ان سے آج میری ملاقات بہت ضروری ہے۔ میں ان سے ملے بغیر یہاں سے جاؤں گی نہیں...... یو گاٹ مائی پوائنٹ؟"

"یپ...... گاٹ اِٹ!" فیصل نے جواب دیا۔

کچن میں، کافی بناتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ یہ انیتا تو خاصی ایڈوانس لڑکی ہے، اس کی توقع سے کہیں زیادہ بولڈ اینڈ بیوٹی فل۔ وہ اپنے پہناوے اور لائف اسٹائل سے الٹرا ماڈرن لگتی ہے۔ اس کا ایکسینٹ بھی پیور امریکن ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، اس نے اسٹیٹس (امریکا) میں کافی وقت گزارا ہو۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے ڈیڈی کے بارے میں اس سے غلط بیانی کی ہے تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی......

"مسٹر فیصل! جب تک جھوٹ کو نبھا سکتے ہو، کوشش جاری رکھو۔ جب تمہاری دروغ گوئی پکڑی گئی جس کے امکانات بہت زیادہ ہیں...... تو یہ کہہ کر سوری کر لینا...... انیتا! تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ اس "اور کیا؟" کا بھی یہی جواب ہے کہ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ بس، تم سے گپ شپ کرنے کے لیے، میں نے جھوٹ بول دیا۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ ڈیڈی، زرمین کے ساتھ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں تو تم گیٹ پر ہی سے واپس لوٹ جاتیں اور میرے دل کو یہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا...... وغیرہ وغیرہ!"

کافی تیاری کے آخری مراحل میں تھی کہ بنگلے کے اندرونی حصے سے انیتا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے طرح چلاتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔

"فیصل...... فیصل...... او فیصل......!"

وہ آناً فاناً میں کچن سے نکلا اور اپنے بیڈ روم کی جانب دوڑ لگا دی۔ انیتا کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز نے اسے بوکھلا دیا تھا اور اس بوکھلاہٹ میں حد درجہ اضطراب پایا جاتا

تھا۔ وہ آنِ واحد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو اس کی آنکھوں نے ایک عجیب اور مضحکہ خیز منظر دیکھا۔

انیتا کا لباس سامنے سے پوری طرح بھیگا ہوا تھا اور اس کے بعض عقبی حصے بھی گیلے نظر آ رہے تھے۔ فیصل نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''کیا ہوا انیتا...... یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے...... لگتا ہے، کسی نے تم پر پانی سے بھری ہوئی بالٹی انڈیل دی ہے......؟''

''ن...... نہیں......'' وہ اپنے لباس کے اوپر سے پانی کو جھٹکتے ہوئے معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔

''پھر کیا تم...... پھسل کر واش روم میں گر گئی تھیں؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوا فیصل......'' وہ منمنائی۔

''پھر کیسا ہوا ہے......'' وہ اصراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کچھ منہ سے بولو تو......؟''

''وہ...... کموڈ والے شاور نے گڑبڑ کر دی ہے......'' وہ بہ دستور اپنے لباس پر، ہاتھوں کو استری کے مانند پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے استعمال کرنے کے لیے جیسے ہی اس کا بٹن پریس کیا، اچانک اس کے ہینڈل کے نزدیک سے پانی کا ایک فوارہ سا نکل کر سیدھا میرے اوپر آیا اور...... اس پانی نے مجھے پوری طرح بھگو کر رکھ دیا...... کچھ نہ پوچھو کہ میں نے کس طرح خود کو سنبھالا ہے۔ تم میری حالت دیکھ رہے ہو نا......؟''

فیصل مسلسل اسی کو تک رہا تھا لیکن جب انیتا نے زور دے کر آخری جملہ ادا کیا تو اس نے اپنی تمام تر توجہ دیکھنے کی طاقت پر مرکوز کر دی اور آنکھیں پھاڑ کر اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ انیتا لباس پر سے پانی کو جھٹکنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو کسی استری کی طرح جس طور حرکت دے رہی تھی اس عمل نے گیلے کپڑوں کو اس کے بدن کے ساتھ چپکا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ نیم عریاں نظر آنے لگی تھی۔ اس ہوش ربا نظارے نے فیصل کی سوچ کو تہ و بالا کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے جذبات پر اختیار کھو بیٹھتا، ایک فوری ارادے کے تحت وہ واش روم کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''کموڈ والا شاور تو بالکل ٹھیک تھا...... میں جا کر دیکھتا ہوں، آخر اچانک اسے ہو کیا گیا ہے......!''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اسے اپنے عقب میں انیتا کی آواز سنائی دی۔

وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔

پوری دنیا

شوہر نے سُرور میں کہا۔ ''ڈارلنگ! تمہیں اندازہ نہیں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔''

''میں آپ سے اس سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔'' بیوی نے اٹھلا کر جواب دیا۔ ''میں تو آپ کی خاطر پوری دنیا سے لڑ سکتی ہوں۔''

''دنیا کو چھوڑو!'' شوہر بولا۔ ''تم تو ہر وقت مجھ ہی سے لڑتی رہتی ہو۔''

''تو آپ ہی تو میری پوری دنیا ہیں۔''

کراچی سے عائشہ رشید کی معصومیت

''کیا مطلب؟''

''میں نے اسے ٹھیک کر دیا ہے۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولی۔

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''وہ کیسے؟''

''جب دفعتاً پانی کا فوارہ میرے اوپر آیا تو میں خوف زدہ ہو گئی تھی اور اسی ڈراؤنی سچویشن میں بے ساختہ میں نے تمہیں پکارا لیکن پھر فوراً ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔ تب میں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ شاور والا ربر کا پائپ ڈھیلا تھا۔ پانی کے پریشر کی وجہ سے ربر والا پائپ شاور کے ہینڈل سے الگ ہو گیا تھا۔ خیر...... اب میں نے اس پائپ کو فکس کر دیا ہے......''

فیصل اس کے بھیگے اور بدن پر چپکے ہوئے لباس سے نگاہ چُرا کر معتدل انداز میں گویا ہوا۔ ''تمہیں فوراً لباس تبدیل کر لینا چاہیے ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔ آؤ میرے ساتھ......''

وہ کسی فرماں بردار بچے کے مانند اس کے پیچھے چل پڑی۔ فیصل نے کہا۔ ''زرمین کی ہائٹ بہت کم ہے۔ اس کے کپڑے تمہیں آئیں گے نہیں البتہ ممی کی فگرز تم سے میچ کرتی ہیں۔ میں تمہیں ممی کا کوئی سوٹ نکال کر دیتا ہوں۔ تم جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔ میں تمہارے بھیگے ہوئے کپڑوں کو پریس کر کے سکھا دیتا ہوں۔''

''تمہاری بیوی تو بہت خوش رہے گی؟'' وہ فیصل کے عقب میں پیش قدمی کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔

"کافی بنانا تمہیں آتا ہے، کپڑے استری کر لیتے ہو۔ یقیناً دیگر کھانے بنانے کا ہنر بھی جانتے ہو گے۔ تم تو بنے بنائے ہاؤس ہسبینڈ ثابت ہو گے...... ایسے شوہر تو نصیب والی بیویوں کے حصے میں آتے ہیں۔"

"تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو؟" فیصل نے اس کی طرف دیکھے بغیر شاکی لہجے میں دریافت کیا۔

"ہرگز نہیں!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں ایک دم سنجیدہ ہوں۔"

وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے مسز نوشاد علی مرحومہ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس بیڈروم میں قدم رکھتے ہی انیتا کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا کیونکہ مذکورہ بیڈروم کسی سالگرہ کی تقریب کی طرز پر سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار پر "ہیپی برتھ ڈے" کے الفاظ کے نیچے "پچاس" کے عدد کا کنگ سائز پوسٹر چسپاں کیا گیا تھا۔ اس پچاس کے فگر کے ساتھ ہی چھوٹی انگلش کا "ٹی ایچ" بھی لکھا ہوا تھا یعنی یہ کسی کے ففٹیتھ برتھ ڈے (پچاس ویں سالگرہ) کے جشن کے ذیل میں تھا اور اس 50th کے اوپر اُس "کسی" کا نام بھی درج تھا اور وہ نام تھا "عطیہ نوشاد علی"...... بیڈروم کی دیواروں، چھت اور کھڑکی دروازے پر سجاوٹ کے مختلف سامان کے علاوہ رنگ بہ رنگ غبارے بھی لہرا رہے تھے۔ یہ سجاوٹ قابلِ دید تھی۔

"لگتا ہے......" انیتا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "اس کمرے میں میڈم کا برتھ ڈے منایا گیا ہے......؟"

"تمہیں بالکل ٹھیک لگتا ہے۔" فیصل نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔ "آج ستائیس دسمبر ہے۔ تین روز قبل یعنی چوبیس دسمبر کو ہم نے یہاں پر ممی کا برتھ ڈے سیلبریٹ کیا تھا۔"

"مگر تمہاری ممی تو چار سال پہلے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں؟" انیتا نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "گزر جانے والوں کی تو برسی منائی جاتی ہے، سالگرہ نہیں......"

"ڈیڈی کو ممی سے بہت زیادہ محبت تھی بلکہ اب بھی ہے۔" وہ اپنی ماں مسز نوشاد علی مرحومہ کا ایک لباس وارڈ روب سے نکال کر انیتا کی جانب بڑھاتے ہوئے بوجھل آواز میں بولا۔ "وہ ہر سال اس بیڈروم میں ان کا برتھ ڈے سیلبریٹ کرتے ہیں جس میں صرف میں، زرمین اور ڈیڈی شریک ہوتے ہیں البتہ ممی کی برسی ہر سال روایتی انداز میں کی جاتی ہے...... اوہ مائی گاڈ!"

فیصل نے آخری جملہ ایسی بے ساختگی سے ادا کیا تھا کہ انیتا نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا ہو گیا فیصل...... تم یکایک اتنے نروس کیوں ہو گئے ہو؟"

"میں کافی کو جلتے ہوئے چولہے پر چھوڑ کر تمہاری طرف لپکا تھا۔" وہ اپنی ممی کے لباس کو انیتا کے ہاتھ میں تھما کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے، اس کا کام تمام ہو گیا۔ تم جلدی سے لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ میں کچن میں جا رہا ہوں۔"

"اوکے۔" انیتا نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک بار پھر آمنے سامنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ سینٹر ٹیبل پر کافی کے دو مگ رکھے ہوئے تھے جن سے مخصوص مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔ انیتا نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"فیصل! میری آمد نے تمہیں خاصا ڈسٹرب کر دیا ہے۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

"اٹس اوکے!" وہ معمول کے انداز میں بولا۔ "ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ جو ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ بتاؤ، تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟"

"آں ں ں......" وہ ایک لفظ کو معنی خیز انداز میں کھینچتے ہوئے بولی۔ "نہیں...... سردی تو اس کافی سے خود ہی بھاگ جائے گی جو تمہیں دوبارہ بنانا پڑی ہے البتہ...... میں اس وقت تھوڑی بھوک محسوس کر رہی ہوں۔ اگر گھر میں کچھ کوکیز وغیرہ رکھے......"

"چاکلیٹ والے کوکیز یا سالٹیش؟" وہ انیتا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "دونوں قسم کے کوکیز موجود ہیں۔"

"میرے خیال میں کافی کے تلخی آمیز فلیور کے ساتھ چاکلیٹ والے کوکیز زیادہ مزہ دیں گے۔"

"اوکے...... میں لے کر آتا ہوں۔" فیصل ڈرائنگ روم سے اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گیا اور چند منٹ کے بعد ایک پلیٹ میں چاکلیٹ کوکیز لے کر واپس آ گیا۔

وہ دونوں کافی کی چسکیوں اور کوکیز کے بائٹس سے لطف اندوز ہونے کے دوران میں باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال بھی کرنے لگے۔ انیتا نے پوچھا۔

"تم کیا پڑھ رہے ہو فیصل؟"

"میں اے لیول کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"تمہاری بہن زرمین نے تو میڈیکل لیا تھا اور اس

وقت وہ ڈاکٹر بننے کے آخری مراحل میں ہے۔'' انیتا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے کیا لیا ہے؟''

''کامرس!'' فیصل نے جواب دیا۔

''یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے یا سر کا......؟''

''ڈیڈی کی تو یہی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں مگر میں نے ان کی بات نہیں مانی اور اولیول میں سائنس کے بجائے کامرس کو چن لیا۔ خدا خدا کر کے میں نے اولیول کو نمٹایا اور اب اے لیول میں ہوں۔''

فیصل نے اُسے اپنے تعلیمی مراحل سے آگاہ کیا۔

''اور تمہارے کیا ارادے ہیں آگے؟''

انیتا نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا مگر میڈیکل کالج میں میرٹ پر ایڈمیشن نہیں ملا تو میں BSC کی طرف چلی گئی۔ پھر M.SC کیا اور اب Ph.D کی تیاری کر رہی ہوں۔ اسی سلسلے میں، میں سر سے ملنے آئی ہوں کیونکہ میرا سبجیکٹ کیمسٹری ہے اور نوشاد سر اس سبجیکٹ کے چیمپئن ہیں اور ہاں......'' اچانک اسے کچھ یاد آ گیا اور اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

اپنے پہلے جھوٹ کو چھپانے کے لیے اس نے دروغ گوئی کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں، جب میں کچن میں دوسری مرتبہ کافی بنا رہا تھا تو ڈیڈی سے میری بات ہو گئی تھی۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے، میں تمہیں انتظار کرنے کو کہوں۔''

''ویری گڈ......!'' انیتا نے ستائشی الفاظ میں کہا۔ ''فیصل! تمہارے ڈیڈی ایک عظیم انسان ہیں اور تم......!''

''ڈیڈی مجھے نالائق کہتے ہیں۔'' وہ ندامت سے بولا۔

''جبکہ تم اس سے کہیں بڑھ کر ہو۔''

انیتا کا لہجہ معنی خیزی سے لبریز تھا۔ وہ اس کی تعلیمی قابلیت کو حدفِ تنقید بنا رہی تھی۔ جواباً اس نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھ لیا۔

''تم نے اولیول میں کون سا تیر مارا تھا؟''

''میرے چار A اسٹار اور پانچ A گریڈ تھے۔''

انیتا نے بتایا۔

''واؤ......'' وہ تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم تو کافی پڑھاکو لڑکی رہی ہو!''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''پڑھائی میں تو بس میں نارمل ہی تھی۔ ہاں، یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آوارہ ذہن کی نہیں تھی......''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' فیصل نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے تمہارے ساتھ کون سا آوارہ پن کیا ہے۔ آخر تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟''

''یہی کہ تم درجۂ اول کے بے شرم اور بے حیا انسان ہو......'' وہ اپنے ہونٹوں پر قاتلانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''وجہ بتاؤ تم نے مجھ میں ایسا کیا دیکھ لیا؟'' فیصل نے تلملاتے ہوئے پوچھا۔

انیتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے ادھر بیڈ روم میں تمہارے کرتوت دیکھے ہیں۔''

''کک......کیا......'' وہ اس طرح اُچھلا جیسے اس نے بے دھیانی میں ہائی وولٹیج الیکٹرک وائر کو چھو لیا ہو۔ ''تت......تم میرے کون سے...... کرتوت کی...... بات کر رہی ہو......؟''

''میرا اشارہ تمہارے لیپ ٹاپ کی جانب ہے۔'' وہ شرارت بھرے انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''جس کے ڈاؤن لوڈز میں دو نیو بائل موویز رکھی ہوئی ہیں......''

''وہ لیپ ٹاپ میرا نہیں ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''اور نہ ہی نیو بائل موویز سے میرا کوئی لینا دینا ہے...... یہ سب کچھ میرے ایک دوست کا ہے......''

''اگر وہ لیپ ٹاپ تمہارا ہے بھی تو اس میں گھبرانے یا شرمانے والی کوئی بات نہیں۔'' وہ ایک دم پٹری بدلتے ہوئے خاصے کھلے ڈلے انداز میں بولی۔ ''اس عمر میں سب یہ کرتے ہیں۔''

فیصل بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔ انیتا کے رویے میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ چند لمحے پہلے انیتا ایک خرانٹ اسکول ٹیچر کے مانند اسے ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی اور اب وہ کسی بے تکلف ہم قماش دوست کا کردار ادا کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک جماہی لیتے ہوئے شک زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''انیتا! کیا تم سیریس ہو؟''

''ہاں نا...... میں بھلا تم سے مذاق کیوں کروں گی؟''

وہ لگاوٹ سے بولی۔ ''ہم ایک ہی ایج گروپ سے ہیں اس لیے ایک دوسرے کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی وکسن موویز ٹرائی کی ہیں؟''

''نن........نہیں.......!'' فیصل نے اتنی شدت سے نفی میں گردن ہلائی کہ اس کے ''انکار'' کے گریبان سے ''اقرار'' جھلکنے لگا۔

بات کے اختتام پر وہ اپنی پیشانی کو مسلنے لگا۔ اس کے چہرے سے کسلمندی اور تھکاوٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ انیتا نے نیو بائل اور وکسن کے ٹاپک کو ایک طرف رکھ کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''فیصل! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ تم دو تین بار جماہیاں لے چکے ہو اور اب سر کو دبا رہے ہو.......!''

''اچانک مجھے بہت زیادہ نیند آنے لگی ہے۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''اور سر بھی بہت بھاری محسوس ہو رہا ہے.......میری آنکھیں بند.......ہو رہی ہیں۔''

''او بھائی! ذرا سنبھل کے.......'' انیتا نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''یہاں صوفے پر ہی نہیں سو جانا۔ ابھی تو تم نے میرے کپڑوں پر استری بھی کرنا ہے۔ میں تمہاری ممی کا لباس پہنے بیٹھی ہوں اور تمہارے ڈیڈی بھی آنے ہی والے ہیں۔ وہ مجھے اپنی مرحومہ بیوی کے لباس میں دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے.......؟''

انیتا کی اتنا ہی باتیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ فیصل کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگائے گہری نیند میں جا چکا تھا۔

انیتا اپنی جگہ سے اٹھی اور پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے فیصل کے انتہائی قریب پہنچ گئی پھر وہ انتہائی فیصل کے اوپر جھک کر کسی ماہر انویسٹی گیشن آفیسر کے مانند اسے ''چیک'' کرنے لگی۔ چند سیکنڈ کی چیکنگ کے بعد وہ مطمئن انداز میں پلٹی اور دوبارہ اپنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے بیگ کے اندر سے اسمارٹ فون برآمد کیا اور اسے آپریٹ کرتے ہوئے کسی سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ پہلی ہی گھنٹی پر دوسری جانب اس کی کال ریسیو کر لی گئی اور کسی مرد نے بھاری بھرکم آواز میں استفسار کیا۔

''صوفیہ! کیا رپورٹ ہے؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کام ہو گیا ہے۔''

''سب ٹھیک ہے نا.......؟''

''ایک دم پرفیکٹ!'' وہ فیصل پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''ویری گڈ!'' دوسری طرف فون پر موجود شخص نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں ایک منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''گاٹ اِٹ!'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

اس مختصر سی سیلولر گفتگو کے بعد اس نے اپنے اسمارٹ فون کو دوبارہ بیگ کے اندر رکھا اور پوری تندہی کے ساتھ کام سے لگ گئی۔

☆☆☆

فیصل کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بڑی واہیات صورتِ حال میں پایا۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے سامنے والے صوفے پر اسے اپنا لباس رکھا دکھائی دیا۔ یہ وہی صوفہ تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے انیتا اس کے رُوبرو بیٹھی کافی کے ساتھ چاکلیٹ کوکیز سے لطف اندوز ہو رہی تھی مگر اب وہ صوفہ انیتا کے وجود سے خالی تھا۔

فیصل کے دماغ میں مختلف سوچوں کا چیختا چنگھاڑتا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ دماغ کے ہر گوشے سے جواب طلب خیالات بجلی کے کوندوں کے مانند لپک رہے تھے۔ وہ اپنا لباس پہنتے ہوئے اضطراری انداز میں سوچنے لگا۔

''میں کافی کے سپ لیتے لیتے اچانک سو کیسے گیا؟ انیتا نظر نہیں آ رہی۔ وہ کہاں چلی گئی؟ مجھے بے لباس کس نے کیا اور کیوں؟ کیا ان تمام حیرت انگیز اور ذلت آمیز ناقابلِ یقین واقعات میں انیتا کا کوئی ہاتھ ہے.......؟''

دماغ میں ابھرنے والے اس آخری سوال نے فیصل کو اندر باہر سے بے چین کر دیا۔ ان سوچوں سے نبرد آزمائی کے دوران میں وہ لباس پہن چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں انیتا کو کہیں بھی نہ پا کر وہ حلق کے بل چلایا۔

''انیتا.......!''

اُس کی پکار پر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر بنگلے کے مختلف حصوں میں انیتا کو تلاش کرنے لگا کیونکہ وہی ایک ایسی ہستی تھی جو بتا سکتی تھی کہ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟

ڈرائنگ روم سے باہر قدم نکالنا قیامت ہو گیا۔ گھر کا ہر اندرونی حصہ ابتری اور افراتفری کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ نوشاد علی، مسز نوشاد علی مرحومہ اور زرمین کے بیڈ رومز کی حالت افسوسناک اور بربادکن تھی۔ ان تینوں کمروں میں موجود وارڈروبز، لاکرز اور دیگر چوبی فرنیچر کا حشر نشر کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ تمام مضبوط اور بظاہرہ نقل کو توڑ کر ان تانوں کے

پیچھے حفاظت سے رکھا ہوا قیمتی سامان بڑی صفائی سے اُڑا لیا گیا تھا اور اس سامان میں بنیادی طور پر نقد رقم اور جیولری کا شمار ہوتا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، اس ڈکیتی میں کم از کم دس لاکھ کیش اور کم و بیش چالیس لاکھ مالیت کے طلائی زیورات لوٹ لیے گئے تھے اور فیصل کو اس امر میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ منظم واردات انیتا کی سرکردگی میں کی گئی تھی اسی لیے وہ بنگلے میں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اپنے بیڈ روم کی خبر گیری کے لیے جب آگے بڑھا تو وہاں کی حالت بھی خاصی تشویش ناک تھی۔ کسی وزنی آہنی شے سے کاری وار کر کے اس کے لیپ ٹاپ کا کچومر نکال دیا گیا تھا۔ مرحوم لیپ ٹاپ کی باقیات کمرے کے فرش پر اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی کپڑوں والی الماری اور مختلف درازوں کو بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ تمام لاکرز اور کنڈیاں ٹوٹی پڑی تھیں تاہم اسے مالی طور پر کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا کیونکہ اس کے بیڈ روم میں کوئی جیولری تھی اور نہ ہی کیش۔ تمام تالوں اور کنڈیوں کے حشر کو دیکھ کر یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ اس بنگلے کو تباہی اور بربادی کا نمونہ بنانے والے اپنے ساتھ پلاس، کٹر اور وزنی ہتھوڑے لے کر آئے تھے۔

اچانک فیصل کی نظر بیڈ روم میں پڑی دو کرسیوں پر گئی تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس نے انیتا کے بھیگے ہوئے لباس کو ان کرسیوں پر پھیلا دیا تھا تاکہ ان کا گیلا پن ختم ہو جائے۔ اس کے بعد وہ ان کپڑوں کو پریس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب وہ کپڑے غائب تھے۔ شاید جاتے ہوئے انیتا نے اپنا لباس پہن لیا تھا۔

''وہ گیلے کپڑے کیسے پہن سکتی ہے؟'' فیصل نے خود سے سوال کیا۔ ''اور اگر ایسا ہے بھی تو پھر ممی کا لباس کہاں گیا ....؟''

وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور خود پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی سماعت تک انیتا کے جو آخری الفاظ پہنچے، وہ کچھ اس طرح تھے...... او بھائی! ذرا سنبھل کے......''

اس کے بعد فیصل کو کچھ یاد نہیں رہا تھا کیونکہ وہ گہری نیند میں چلا گیا تھا۔ غور و فکر کرنے پر یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ انیتا نے اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی میں کچھ ملا دیا تھا اور یقیناً اس نے یہ زود اثر خواب آور دوا اس وقت کافی میں ملائی تھی جب وہ چاکلیٹ کوکیز لینے کچن کی طرف گیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ چال باز عورت ایک خاص منصوبے کے تحت وہاں پہنچی تھی اور یقیناً وہ اکیلی نہیں تھی۔ جب انیتا نے اسے بے ہوش کر دیا تو ...... اس کے ساتھی بھی بنگلے میں آ گئے تھے اور ان سب نے مل کر ایک منظم ڈکیتی کی تھی۔

وہ اپنے بیڈ روم سے نکلا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ انیتا کو شک کے دائرے میں رکھ کر جب اس نے سوچنا شروع کیا تو حقیقتِ حال اس پر واضح ہو گئی۔ اس کا ڈیڈی کی ایکس اسٹوڈنٹ بن کر بنگلے پر پہنچنا، خالی بنگلے میں بیٹھ کر نوشاد علی کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہو جانا، فیصل کے

ساتھ اس کا بے تکلف ہو جانا، واش روم میں اپنے لباس کو بھگونا، گیلے لباس میں سے اپنے ہوش رُبا بدن کا نظارہ کروانا، فیصل کو اس کی فطرت اور مزاج کے مطابق لُبھا کر ہینڈل کرنا الغرض...... اس کی ایک ایک حرکت کسی اسکرین پلے کے حساب سے دکھائی دیتی تھی اور وہ اسکرپٹ تھا، ایک کامیاب ڈکیتی!

''کمپنی کا ہوم ورک بڑا جان دار تھا......'' فیصل نے تلخی بھرے انداز میں خود کلامی کی۔ ''مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ڈیڈی سے ملنے نہیں بلکہ ہماری حجامت بنانے یہاں آئی تھی...... لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ وہ لوگ جاتے ہوئے مجھے بے لباس کیوں کر گئے......؟''

ان لمحات میں فیصل کی ذہنی حالت خاصی مخدوش ہو رہی تھی۔ وہ ذلت، ہزیمت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ خود پر ٹوٹنے والی اس بپتا کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائنگ روم کی محدود فضا میں سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ مخصوص ٹون اس کے اسمارٹ فون کی تھی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنی جیب پر گیا مگر گھنٹی کی آواز سائڈ والے صوفے پر سے ابھر رہی تھی۔

اس نے لپک کر سیل فون اٹھالیا۔ فون کے اسکرین پر ایک اَن ناؤن (اجنبی) نمبر نظر آیا۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔

''ہیلو......!''

''فیصل! کیسے ہو؟'' دوسری جانب ایک مانوس آواز نے پوچھا۔

''انیتا......'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم نے میرے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا۔''

''میں نے وہی کیا جس سلوک کے تم مستحق تھے۔'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''اور میرا نام انیتا نہیں ہے۔''

''تم انیتا ہو، سنگیتا ہو یا سمیتا...... اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، وہ دہاڑ سے مشابہ آواز سے بولا۔ ''تم جب بھی میرے ہتھے چڑھیں، میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

''بڑے شوق سے فیصل......'' وہ غصہ دلانے والے انداز میں بولی۔ ''بشرطیکہ میں کبھی تمہارے ہاتھ لگ پاؤں......!''

''بکو مت......!'' وہ پھنکارا۔ ''یہ بتاؤ، تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟؟''

''میں نے وہی بتانے کے لیے تو تمہیں کال کی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تمہاری بکواس رکنے کا نام لے تو میں کچھ کہوں۔''

''بھونکو......'' وہ زہر خند انداز میں بولا۔ ''میں سن رہا ہوں۔''

''میں ایک ایسی فلاحی تنظیم کا حصہ ہوں جو بڑی خاموشی کے ساتھ اصلاح معاشرہ کے کاموں میں لگی رہتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کسی عظیم انسان کا یہ قول یقیناً سن رکھا ہوگا کہ...... ''اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کرے اور آپ بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود اسے معاف کر دیں تو آپ کی عظمت کارخانۂ قدرت میں رجسٹر ہو جاتی ہے۔ آپ کا شمار مالک کے پسندیدہ افراد میں ہونے لگتا ہے......''

''ہاں......'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایسی لائن کہیں پڑھی تھی لیکن اس کا میرے معاملات سے کیا تعلق؟ کیا تم مجھے معاف کرنے کا درس دے رہی ہو؟ تم چاہتی ہو، تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، میں اسے بھول کر خود کو عظمت کے مینار پر ٹانگ لوں......؟''

''فیصل! تم ایک ایسے گدھے ہو جو سنتا کم اور ''ڈھینچوں، ڈھینچوں'' زیادہ کرتا ہے۔'' اس نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تم تحمل کے ساتھ میری بات سن لو تو تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ بادلِ ناخواستہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''اب تم ہی بولو، میں سن رہا ہوں۔''

''ہماری تنظیم کا اصول بھی اس سے کچھ ملتا جلتا ہے۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس لائن کے تحت کام کرتے ہیں کہ...... ''اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کرے اور آپ اس سے بدلہ لینے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں نا، آپ کا انتقام لینے کے لیے......!''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' فیصل بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''میری بات پر توجہ مرکوز رکھو۔ میں سمجھا رہی ہوں نا۔'' وہ کرخت لہجے میں بولی۔ ''ہم کسی بھی مجبور اور لاچار متاثرہ شخص سے رابطہ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی سے کوئی فیس وصول کرتے ہیں۔ ہم اس معاشرے کے اندر سے، اپنے لیے خود ہی کیس تلاش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس معاملے کی حقیقت کی تصدیق کی جاتی ہے۔ ظالم اور مظلوم کا

تعین کیا جاتا ہے۔ پھر ظالم کو عبرت ناک سبق سکھانے کے لیے ہم ایک ماہ تک ہوم ورک کرتے ہیں۔ اس شخص یعنی اپنے ٹارگٹ کے معمولات، اس کے فیملی ممبرز کی مصروفیات، آپس کی رشتے داریاں، ان تمام لوگوں کے کانٹیکٹ نمبرز اور گھر کے ایڈریس، الغرض...... جب ہمارے پاس ٹارگٹ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے کا سارا تصدیق شدہ ڈیٹا جمع ہو جاتا ہے تو ہم کوئی مناسب موقع دیکھ کر آپریشن کرتے ہیں۔ ہم نے چونکہ بڑی جامع تیاری کی ہوتی ہے اس لیے ہمیں کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ اس مشن کے دوران میں جو کچھ بھی ہمارے ہتھے چڑھتا ہے، اسے ہم مالِ غنیمت جان کر اپنے معاوضے کے طور پر رکھ لیتے ہیں۔ ویری سمپل!''

''ویری سمپل کی بچی......!'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم لوگوں نے مجھے ٹارگٹ کیوں بنایا...... میں نے کسی کے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی؟''

''اگر تمہاری یادداشت کام کر رہی ہے تو نادیہ کو یاد کرو......'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

فیصل کے دماغ میں ایٹمی دھماکا ہوا تاہم وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''کک...... کون نادیہ...... میں کسی نادیہ کو نہیں جانتا......''

''لگتا ہے، تمہاری یادداشت کو ایکٹی ویٹ کرنے کے لیے مجھے کوئی چمتکار دکھانا پڑے گا۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں اس غیرت مند نادیہ کی بات کر رہی ہوں، ایک سال پہلے ایک بھیڑیا جس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ نادیہ کو اپنی ہوس کی خوراک بنانا چاہتا تھا مگر نادیہ نے اس کا ہر حربہ، ہر چال ناکام بنا دی بلکہ ایک موقع پر تو اس نے جرأت کر کے بھیڑیے کی بدتمیزی کے جواب میں اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ بھی رسید کر دیا تھا۔ بھیڑیے نے نادیہ کی اس غیرت مندی کا انتقام لینے کے لیے فوٹو شاپ کے ایک بے ضمیر ماہر سے مدد لی اور بھاری معاوضے کے لالچ میں اس ضمیر فروش کمپیوٹر ایکسپرٹ نے اڈوب فوٹو شاپ کا استعمال کر کے نادیہ کے شرمناک ویڈیو کلپس اور تصاویر بنا کر مذکورہ بھیڑیے کے حوالے کر دیں۔ پھر اُس بھیڑیے نے مجبور اور غیرت مند نادیہ کے بے حیائی پر مبنی اس ایڈٹ شدہ میٹریل کو سوشل میڈیا پر اَپ لوڈ کر کے اس معصوم کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''وہ بھیڑیے تم ہو فیصل! تمہارے کالے کرتوتوں کی وجہ سے اس معصوم اور باحیا نادیہ نے خود کو ختم کر لیا تھا۔ اگر اب بھی تمہیں وہ نادیہ یاد نہیں آ رہی تو جاؤ جہنم میں......!''

اس شٹپٹائے ہوئے جملے کے ساتھ ہی دوسری جانب سے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا گیا۔ فیصل کی حالت غیر ہونے لگی۔ اُس سوکالڈ انیتا نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ اگر حقیقت پسندی اور دیانت داری سے سوچا جائے تو نادیہ کی موت کا ذمے دار وہی تھا۔ ان نازک لمحات میں فیصل کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا لیکن گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ پشیمانی، ندامت اور جھنجلاہٹ کے بھنور میں گھرا ہوا تھا کہ اس کے سیل فون پر ٹیکسٹ میسج ریسیو ہوا۔ اس نے جلدی سے مذکورہ میسج کو کھول کر پڑھا۔ وہ اسی نام نہاد انیتا کا میسج تھا۔

''ٹھیک تیس سیکنڈ کے بعد میں تمہیں ایک ویڈیو کلپ بھیج رہی ہوں۔'' اس نے لکھا تھا۔ ''اور یہ تیس سیکنڈ شروع ہوں گے تمہارے اس میسج کو پڑھنے کے بعد۔ میں نے جس ویڈیو کلپ کا ذکر کیا، وہ تمہاری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھو گے تو تمہاری طبیعت گارڈن گارڈن ہو جائے گی۔''

تیس سیکنڈ کا قلیل وقت پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اپنا نام انیتا بتانے والی اس ظالم حسینہ نے جو ویڈیو کلپ فیصل کو بھیجا، اسے دیکھ کر فیصل کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی اور بڑی وضاحت کے ساتھ اس پر یہ راز افشا ہو گیا کہ جب وہ نیند سے بیدار ہوا تھا تو اس کے بدن پر لباس کیوں نہیں تھا......!

''یہ میرا آخری میسج ہے۔'' اسی اجنبی نمبر سے ٹیکسٹ موصول ہوا۔ ''تمہارا یہ شرمناک ویڈیو کلپ ہماری تنظیم کے آرکائیو میں محفوظ رہے گا۔ آج کے بعد اگر تم نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت کی تو اس ویڈیو کلپ کو آن لائن ڈال دیا جائے گا۔ پھر تم ایک ایک شخص کو بتاتے رہنا کہ اس کلپ میں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ فوٹو شاپ کی کارستانی ہے...... اس ویڈیو کلپ کو اَپ لوڈ کرنے والا کام ہم اب بھی کر سکتے ہیں لیکن ہم اصلاحِ معاشرہ چاہتے ہیں، تباہی معاشرہ نہیں......!''

فیصل کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس دنیا کا نظام چلانے والے قادرِ مطلق نے ہر سیر کے لیے ایک سوا سیر بھی پیدا کر رکھا ہے!

❖ ❖ ❖

چھٹی قسط

الاؤ

کاشف زبیر

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چندسنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اپنے قلم سے اسے اختتام تک پہنچا سکیں... اس دلچسپ اور پُرتجسس کہانی کو اسی انداز میں انجام تک لے جانا ایک امتحان تھا... آخرکار آپ کے جانے پہچانے اور مقبول و معروف مصنف کو یہ کام سونپا گیا جو کاشف زبیر کی لکھی ہوئی اقساط کے بعد قارئین کے لیے اپنے ہنر کے جوہر دکھائیں گے... **الاؤ** ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور ایسی داستان ہے جو قارئین کو اول تا آخر اپنی گرفت میں رکھے گی...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنادیتے ہیں

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ تاج نے میری گردن میں جو انجکشن اتارا تھا، وہ بے ہوش کرنے والا نہیں تھا۔ وہ تاج تھا کم سے کم آواز سے تو مجھے یہی لگا تھا۔ دوا کے داخل ہوتے ہی میرے دماغ اور حواس خمسہ کے درمیان رابطہ منتشر ہو گیا۔ انسان آنکھوں اور کانوں سے سب سے زیادہ معلومات حاصل کرتا ہے یعنی اپنے آس پاس سے رابطے میں رہتا ہے۔ اگر یہ رابطہ کسی وجہ سے منقطع ہو جائے تو آدمی اپنے اردگرد سے غافل ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میرا دماغ کام کر رہا تھا مگر میں کچھ سن نہیں پا رہا تھا اور جو آوازیں آ رہی تھیں، وہ بگڑی ہوئی صورت میں تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے پھٹے رنگوں اور بہت تیزی سے لہراتی اور گھومتی تصویروں کی ایک فلم چل رہی تھی۔ میرا اپنے جسم پر اختیار بھی ختم ہو گیا تھا مگر میں کھڑا ہوا تھا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔

میرا دماغ فعال تھا اور میں بالکل درست انداز میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے مجھے معلوم تھا کہ انجکشن نے میرے جسم اور دماغ کا رابطہ منقطع کر دیا ہے یا اس رابطے میں خلل ڈالا تھا جس کی وجہ سے میں نہ تو درست طریقے سے دیکھ اور سن پا رہا تھا اور نہ ہی مجھے اپنے جسم پر اختیار تھا۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ میں کیوں چل رہا ہوں۔ اگر دماغ سے رابطہ نہیں رہا تھا تو جسم کو بے حرکت ہو جانا چاہیے تھا مگر میں نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا تھا بلکہ اب چل بھی رہا تھا، اس میں میرے ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔ میں نے خود کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جسم ریفلکسز پر کام کر رہا تھا۔ پہلے شور کم تھا مگر کچھ دیر بعد شور بہت زیادہ ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اب میں کہیں ٹریفک میں ہوں۔ یہ اسی کا شور تھا۔ میرے آس پاس کچھ لوگ بھی تھے کیونکہ بگڑی شکلیں کبھی کبھی انسانوں کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ حیرت انگیز دوا تھی اور میں نے ڈاکٹر ہونے کے باوجود آج تک اس قسم کی دوا کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ مگر میں نے تو اور بھی بہت کچھ نہیں سنا اور جانا تھا اور اب جان اور سن رہا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کیفیت سے مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا کہ انسان اپنی ہی ذات کے گنبد میں قید ہو جائے اور اس کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو جائے۔ میرا جسم ہل رہا تھا جس سے پتا چل رہا تھا کہ میں کسی گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں دشمن کے ہاتھ لگا تھا۔ ایک بار پہلے رفیق کی بروقت آمد نے مجھے بچا لیا تھا لیکن اس بار دشمن مجھے گرفتار کر کے لے جا رہا تھا اور میں کسی کو اطلاع بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ میں اپنی کیفیت سے بہت ڈر گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری جدوجہد کا خاتمہ ہو گیا ہے اور یہ لوگ جلد مجھے بھی عادل کی طرح مار دیں گے۔ میں کچھ پچھتایا بھی کہ اس چکر میں کیوں پڑا۔ ٹھیک ہے عادل میرا ایک بھائی تھا اور مجھے بہت پیارا تھا مگر میں عام آدمی ہوں، ان بدمعاشوں سے نہیں لڑ سکتا۔ مجھے ان سے دور رہنا چاہیے تھا اور اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

اسی قسم کی مایوس کن سوچوں نے میرے فارغ ہو جانے والے دماغ پر یلغار کی ہوئی تھی۔ جسمانی کام چھوڑ دینے سے اس کا سوچنے والا حصہ کچھ زیادہ ہی فعال ہو گیا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ نہ سوچوں مگر فی الحال یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ جیسے شرارتی بچوں کو گھر میں بند کر دو تو وہ آپ کے قابو میں نہیں رہتے ہیں اور ماں کو رو پیٹ کر انہیں باہر جانے کی اجازت دینی پڑتی ہے مگر میں تو باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک دوا کا اثر ختم نہیں ہو جاتا یا اس دوا کا توڑ نہ دیا جاتا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی، کم سے کم مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دیر گزر گئی ہے۔ میرا جسم پھر حرکت میں آیا مگر میں ناواقف تھا کہ میں کہاں ہوں۔ تاج اینڈ کمپنی مجھے اپنے کسی ٹھکانے پر لے آئے تھے یا پھر مجھے گوہر شاہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ جسم کچھ دیر متحرک رہا اور پھر رک گیا۔ اچانک ہی آوازیں واضح ہونے لگیں اور آنکھوں کے سامنے بنتے بگڑنے والے نقش اور رنگ سمٹنے لگے۔ دوا کا اثر ختم ہو رہا تھا مگر جسمانی حسیات واپس آتے ہی مجھے بازو میں تکلیف کا احساس ہوا۔ اس بار انجکشن مجھے بازو میں دیا گیا تھا اور یہ نس کا نہیں تھا اس لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔ شاید یہ دوا نس میں نہیں دی جاتی تھی اور اس کا ایکشن بہت تیز تھا اس لیے اسے گوشت میں لگایا گیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ نروس سسٹم میں شامل ہو رہی تھی۔

جب میری آنکھوں نے منظر واضح کیا تو میں نے خود کو ایک وسیع و عریض نشست گاہ میں پایا۔ یہاں شاہانہ انداز کا فرنیچر تھا اور سامنے ایک تخت طاؤس نما صوفے پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت کے ساتھ کسی قدر بھاری جسم اور بھاری پپوٹوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ زندگی کو بے اعتدالی سے گزار رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سامنے کرسٹل

کی تپائی پر کرسٹل کی بوتل میں اُمّ الخبائث موجود تھی اور اس کی چھوٹی مقدار اس کے ہاتھ میں موجود پیمانے میں بھی تھی۔ میں نے اپنے جسم کو دیکھا اور ہاتھ اٹھانا چاہا تو وہ آرام سے اٹھ گیا۔ میرا جسم میرے قابو میں آ گیا تھا۔ اب منظر بالکل واضح تھا اور وہاں سناٹا تھا اس لیے میں کانوں کے فنکشن کے بارے میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ٹھیک کام کر رہے تھے یا نہیں۔ ادھیڑ عمر آدمی نے ہاتھ اوپر کیا اور بولا۔ ''ڈاکٹر سیف بیٹھ جاؤ...... تم اب بالکل ٹھیک ہو۔''

میرے عین عقب میں کرسی موجود تھی اور اس کے پیچھے تاج کھڑا تھا۔ شاید یہ انجکشن بھی اسی نے لگایا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تم یقیناً گوہر شاہ ہو؟''

''تمیز سے بات کر۔'' عقب سے تاج غرایا۔ ''شاہ جی بول۔''

میں صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گوہر شاہ نے مجھے اپنے سامنے بٹھایا اور بات کرنا چاہ رہا تھا جبکہ اسے تو مجھے اپنے جلادوں کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے چند دن میں اسے بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑے تھے۔

''گوہر شاہ پہلے تو یہ طے کر لو کہ بات تم کو کرنی ہے یا اس نے؟'' میں نے سوچنے کے بعد کہا۔

''تو بکواس......'' تاج نے کہنا چاہا مگر گوہر شاہ نے اسے جھاڑ دیا۔

''شٹ اَپ۔ میں بات کر رہا ہوں۔''

وہ فوراً دم دبا کر کھڑا ہو گیا۔ میں مسکرایا۔ ''اب تم باس لگ رہے ہو۔''

گوہر شاہ کے تاثرات ایک لمحے کو بدلے تھے، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم جانتے ہو پچھلے چند دنوں میں تمہاری وجہ سے مجھے کتنے نقصانات اٹھانا پڑے ہیں۔''

''نقصان مجھے ہوا ہے۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔ ''انسان تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، وہ بھی جن کے تم اعضا نکالتے ہو اور وہ بھی جو تمہارے لیے زندہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ کوئی بھی مر جائے تمہارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مالی نقصان بھی تم پورا کر لو گے مگر میرا بھائی مرا ہے اور اس کے قاتل تم ہو۔''

وہ گلاس ہاتھ میں گھماتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا، وہ اداکاری کر رہا ہے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''مجھے تمہارے بھائی کا افسوس ہے۔''

''مجھے افسوس نہیں چاہیے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے قصاص چاہیے۔''

میری بات پر تاج نے پہلو بدلا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کی زبان پر گوہر شاہ نے تالا لگا دیا تھا۔ گوہر شاہ نے پھر کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں نے کہا نا مجھے افسوس ہے اور اس لڑکے سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عادل کے ساتھ جو ہوا وہ تمہارے حکم پر ہوا۔''

گوہر شاہ کے چہرے کا رنگ پھر بدلا تھا مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر اور پہچاننے کے بعد میرے اندر وہی یخ سی کیفیت آ گئی تھی اور میں بے خوف اور اندیشوں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا کہ میں پوری طرح اس کے قبضے میں تھا اور اس کے ایک اشارے پر مجھے شوٹ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے جلاد مجھے بھی اعضا نکال کر مار سکتے تھے یا اپنے نقصان کا بدلہ لینے کے لیے وہ مجھے تڑپا تڑپا کر مارتا۔ میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ حسبِ معمول وہ کسی قدر تاخیر سے بولا۔ ''میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔''

''کیسی تلافی؟''

''دیکھو جن لوگوں نے یہ کام کیا تھا، وہ سب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ عظیم نے مارے جانے والے دو آدمیوں کے ہمراہ عادل کو اٹھایا تھا اور ان ڈاکٹروں نے اس کے اعضا نکالے تھے جو راوی والے اسپتال میں مارے گئے۔ اس طرح اس کے براہِ راست قاتل اب دنیا میں نہیں ہیں۔''

''لیکن یہ سب ہوا تو تمہارے حکم پر تھا؟''

''میں اسی کی تلافی کی بات کر رہا ہوں۔ میں خون بہا دینے کو تیار ہوں۔ جتنا تم چاہو اور جس کرنسی میں چاہو، یہاں پاکستان میں یا باہر ملک۔''

''میرا بھائی بہت قیمتی تھا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ساری دنیا کی دولت......''

''کتابی باتیں مت کرو۔'' اس نے میری بات کاٹ کر ناگواری سے کہا۔ ''ساری دنیا کی دولت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ اس کے بہت معمولی سے حصے کے لیے پتا نہیں کیا کچھ کر جاتے ہیں، تم اس رقم کی بات کرو جو تمہارے خیال میں مناسب ہو اور میں ادا کر سکوں۔''

میں نے ساری دنیا کی دولت کی بات سچ میں کی تھی۔ میں عادل کا قتل ساری کائنات کے بدلے بھی معاف نہیں کر

سکتا تھا مگر یہ بات اسے کہنا بیکار تھا، وہ اس قسم کا آدمی ہی نہیں تھا جو اس بات کو سمجھتا۔ میں نے سوچا کہ اس سے اُلجھنے کے بجائے میں جانئے کی کوشش کروں کہ عادل کے اعضا کہاں گئے تھے اور میرے لیے باہر سے حکم کیوں آیا تھا کہ مجھے ختم کر دیا جائے۔ مگر میں یہ بات براہِ راست گوہر شاہ سے نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے میں نے دوسری طرح سے پوچھا۔ ''عادل کے اعضا کہاں گئے؟''

''ملک سے باہر۔'' اس نے جواب دیا۔

''جن لوگوں کو اس کے اعضا لگے ہوں گے، ان کی ٹشو میچنگ کی گئی ہوگی۔''

''بالکل، اس کے بغیر اعضا لینا بیکار ہوتا ہے۔''

''تب مسٹر شاہ تم وضاحت کرو گے اسے یا ان متوقع گاہکوں کو کیسے پتا چلا کہ ان کے ٹشوز سے میچ کرنے والا ایک نوجوان لاہور میں ہے؟'' میرا لہجہ کاٹ دار ہو گیا۔

مگر وہ بالکل پُرسکون رہا۔ ''میں نہیں جانتا، مجھے بس باہر سے آرڈر آیا اور میں نے اس کی تعمیل کر دی۔''

میرے اندر کی یخ نے میرے جذبات کو بھی سر بہ مہر کر دیا جیسے کسی آتش فشاں کی چوٹی پر جمی برف سے اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اس کے اندر کھولتا لاوا موجود ہے اس لیے میں بہت سکون سے بات کر رہا تھا ورنہ شاید میں تاج کی پروا کیے بغیر اس پر حملہ کر دیتا۔ اس کے باوجود گوہر شاہ کے اس جملے سے میرے اندر اشتعال کی لہر اٹھی تھی۔ وہ کتنے آرام سے عادل کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ اس نے آرڈر ملنے پر اسے اٹھایا اور اس کے اعضا نکال کر باہر بھیج دیے۔ گویا وہ کوئی فیکٹری چلا رہا تھا اسے باہر سے مال کا آرڈر ملا، اس نے تیار کیا اور بھیج دیا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا کہ اسے باہر سے کسی نے آرڈر کیا تھا۔ باہر بھلا کسی کو عادل کے بارے میں کیا پتا کہ اس کے ٹشوز میچ کر رہے ہیں۔ اس سے وہی سوال میرے ذہن میں آیا کہ عادل کی ٹشوز میچنگ کیسے کی گئی؟ یہ بہت اہم سوال تھا اگر مجھے اس کا جواب مل جاتا تو شاید معما ہی حل ہو جاتا۔

اس گفتگو کے دوران میں میرے اندر غصہ سر اٹھانے لگا لیکن میں نے خود پر قابو رکھا، میں چاہتا تھا کہ وہ خود اپنے رویّے کی وضاحت کرے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تب تم میرے اعضا کا بھی کوئی گاہک تلاش کر لو اور مجھے مار کر اعضا فروخت کر دو، تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔''

اس نے پہلو بدلا۔ ''ڈاکٹر سیف، میں بہت مجبوری میں زور زبردستی والا کام کرتا ہوں ورنہ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو پندرہ بیس ہزار کے عوض بہ خوشی اپنا گردہ فروخت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ آنکھ اور جگر فروخت کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔''

وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ نواب ٹاؤن کے پاس والی کوٹھی میں اس کے آدمیوں نے انکشاف کیا تھا کہ صرف ایک سال میں انہوں نے سو کے قریب افراد کو راوی والے اسپتال بھیجا تھا جہاں ان کے اعضا نکال لیے جاتے تھے اور ان کی لاشیں ضائع کر دی جاتی تھیں۔ یہ درست ہے کہ اعضا فروشی بھی ہوتی تھی لیکن گوہر شاہ کا ریکٹ بہت منظم اور بہت زیادہ کمانے والا تھا انہیں کسی کو ایک پیسہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ ریکٹ بیرونِ ملک جہاں جہاں اعضا کے طلب گار ہوتے تھے، انہیں منہ مانگے داموں ان کے مطلب کے اعضا فراہم کرتا تھا۔ جب طلب گار بہت زیادہ ہوں تو میچنگ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ وہ جن لوگوں کو اٹھاتے ہیں، ان کے ٹشوز کسی نہ کسی سے میچ کر جاتے ہیں۔ مگر عادل کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا تھا، اس کی ٹشو میچنگ پہلے سے ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''عادل کے معاملے میں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''باہر سے آرڈر آیا تھا۔''

''آرڈر کہاں سے آیا؟''

''یہ میں تمہیں یا کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر سیف، میں نے تمہیں بلایا ہے۔ میں تم سے مفاہمت چاہتا ہوں۔ تمہارے نقصان کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔''

''اس احسان کی وجہ؟'' میں نے خفیف سے طنز کے ساتھ پوچھا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کے پسِ پشت کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''اگر میں مان بھی لوں تب بھی میں اپنے بھائی کا خون فروخت نہیں کر سکتا۔''

گوہر شاہ میرے صاف انکار پر کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر سفاکی نمودار ہوئی۔ ''تم میری رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔''

''بالکل بھی نہیں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جواب میں مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہوگا۔''

''میرے تین آدمی غائب ہیں۔'' بالآخر اس نے وہی کہا جو میرے ذہن میں تھا، اس کی نرمی کے پیچھے یہی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔

''اگر تمہارے تین آدمی غائب ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

گوہر شاہ نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''سیف میں کھل کر بات کرتا ہوں، تمہاری زندگی کا انحصار ان تین افراد کی واپسی پر ہے۔''

''کیا تین یا تین سو افراد تمہارے لیے اتنے اہم ہو سکتے ہیں کہ تم ان کی خاطر مجھے چھوڑ دو۔''

''شاہ جی یہ اس طرح نہیں مانے گا۔'' تاج جو بہت دیر سے پہلو بدل رہا تھا، اس نے تڑپ کر کہا۔ ''اسے ایک گھنٹے کے لیے میرے حوالے کر دیں۔ یہ خود بتائے گا کہ وہ تینوں کہاں ہیں؟''

''پہلے مجھے پوچھ لینے دو۔'' گوہر شاہ نے یوں کہا جیسے مجھے خبردار کر رہا ہو کہ شرافت سے بتا دوں کہ وہ تین بندے کہاں ہیں ورنہ تاج مجھ سے دوسرے طریقے سے پوچھے گا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم پوچھو، یہ پوچھے یا کوئی اور پوچھے، میرا جواب ایک ہی ہے کہ مجھے تمہارے تین آدمیوں کا قطعی علم نہیں ہے...... ہاں ایک پارٹی نے پیچھا کیا تھا، مجھے اور میرے ساتھ ایک لڑکی کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں دو آدمی جان سے گئے۔ کیا غائب ہونے والے اسی پارٹی کا حصہ تھے؟'' میں نے کسی قدر انجان بن کر کہا۔

تاج پھر تڑپا۔ ''شاہ جی یہ کتے کی دُم ہے۔''

''تم بھونکنے والے کتے ہو۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''میں کاٹتا بھی ہوں۔'' اس نے غرا کر کہا۔

گوہر شاہ جس طرح تاج کی بات ماننے سے ہچکچا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ صرف ان تین آدمیوں کا معاملہ نہیں تھا جو یقینی طور پر طارق کی تحویل میں تھے۔ گوہر شاہ نے میری طرف دیکھا۔ ''میرا ایک آدمی تمہاری نگرانی کر رہا تھا اور وہ ثمن آباد تک تمہارے پیچھے گیا، اس کے بعد غائب ہو گیا۔ اس کی تلاش میں دو آدمی اور گئے تھے اور وہ بھی غائب ہو گئے۔ دوسری پارٹی سیاہ جیپ میں تھی جس نے تمہارا پیچھا کیا تھا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے شانے اچکائے۔

''تم کہاں گئے تھے؟''

''ایک واقف کار کے گھر، لیکن میں اُس کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔''

''ہم تیرے بارے میں سب جانتے ہیں۔'' تاج نے دخل دیا۔ ''وہاں تیرا کوئی واقف کار نہیں ہے۔''

''اچھا تو میں کیا اس موسم میں وہاں ٹہلنے گیا تھا۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

''تم طارق سے ملنے گئے تھے؟'' گوہر شاہ نے پوچھا تو میں انجان بن گیا۔

''کون طارق؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو، میں کس طارق کی بات کر رہا ہوں۔ وہی جس کے ساتھ تم نے ڈیفنس والی کوٹھی پر حملہ کیا تھا۔''

''میرے ساتھ صرف سرفراز تھا۔''

''تمہارے ساتھ طارق تھا۔'' گوہر شاہ پورے یقین سے بولا۔ ''میں اور میرے آدمی اسے اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ وہ عرصے سے ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''میرا خیال ہے تمہارے آدمیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''میں کسی طارق کو نہیں جانتا ہوں۔''

''تم ثمن آباد سے کس عورت کے ساتھ بائیک پر نکلے تھے؟''

''وہ میری پرانی واقف کار ہے، میں اسی کے گھر گیا تھا۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ یہ اچھی بات تھی کہ رومی سے واقف نہیں تھے مگر یہ تشویش ناک بات تھی کہ وہ طارق سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اتنے خطرناک لوگوں کے خلاف کام کر رہا تھا اور یوں اس عام سے گھر میں رہتا جہاں گھسنا بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ احمق آدمی نہیں تھا اگرچہ لگتا ضرور تھا۔ گوہر شاہ جو سوالات پر آمادہ تھا، اس نے اگلا سوال کیا۔

''اس عورت نے میرے دو آدمی مار دیے۔ کیا کوئی عام عورت اس طرح مسلح افراد سے لڑ سکتی ہے؟''

''میں نے کب کہا کہ وہ عام عورت ہے اور دوسری بات یہ کہ ایک آدمی اس نے مارا اور ایک میرے ہاتھوں مارا گیا اگرچہ میں نے جان کر اسے نشانہ نہیں بنایا تھا مگر اس کی قضا آ گئی کہ میری اندھا دھند چلائی گولی اسے جا لگی۔ ویسے ایک لمحہ پہلے اس نے مجھے تقریباً قتل کر دیا تھا۔ اس کی چلائی گولی میری ناک کو چھوتے ہوئے گئی تھی۔''

"لگتا ہے تم یوں نہیں مانو گے۔" گوہر شاہ نے اچانک تیور بدل کر کہا اور تاج کی طرف دیکھا۔ "اسے لے جا کر بند کر دو جب تک یہ ان تینوں کے بارے میں نہ بتائے اِسے کھانا پانی مت دینا۔"

مجھے حیرت اور تاج کو مایوسی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ گوہر شاہ مجھے تاج کے حوالے کر دے گا کہ وہ مجھ پر مشقِ ستم کر سکے۔ مگر اس نے فی الحال صرف بند کر کے کھانا پانی بند کرنے کو کہا تھا۔ تاج نے مجھے اشارہ کیا جو میں نے نظر انداز کر کے گوہر شاہ سے کہا۔ "ایک بات بتاؤ مجھے کون سی دوا دی گئی تھی؟"

"اِسے لے جاؤ۔" گوہر شاہ نے میرا سوال اَن سنی کر کے تاج کو حکم دیا اور خود تپائی پر رکھی بوتل سے اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ تاج نے مجھے کالر سے پکڑ کر دھکیلا اور میں آگے بڑھا۔ تاج خطرناک قسم کی شاٹ گن لیے میرے عین پیچھے تھا۔ اپنی آرائش اور قیمتی فرنیچر سے یہ جگہ کسی عالی شان کوٹھی کا حصہ لگ رہی تھی۔ کمرے سے نکل کر ہم باہر کھلی جگہ پر آئے تو میں نے دیکھا کہ نشست گاہ ایک چھوٹی عمارت کا حصہ تھی۔ اس دو منزلہ عمارت کے سامنے اور بائیں طرف باغ تھا اس باغ کے بائیں طرف اصل کوٹھی تھی اور میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ اقبال ٹاؤن والی کوٹھی تھی جہاں میں صائمہ کے بیان کی تصدیق کے لیے آیا تھا۔ میں نے گیٹ سے باہر دیکھا اور اسی کوٹھی سے وہ ملازم نکل کر گیا تھا جو آگے جا کر طارق کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ باہر سے یہ عام سی کوٹھی دکھائی دیتی تھی مگر اندر سے اس کے حفاظتی انتظامات خاصے سخت دکھائی دیے۔ پورا احاطہ دیواروں پر لگی تیز روشنی والی لائٹوں سے جگمگا رہا تھا۔ نہ صرف گیٹ پر دو مسلح گارڈز تھے بلکہ پورچ اور چھوٹی عمارت کی چھت پر بھی ایک مسلح آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

"آگے چلو۔" تاج نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا اور میں گرتے گرتے بچا۔

"چل تو رہا ہوں کیا اب دوڑنا شروع کر دوں۔" میں نے کہا۔ ہم بائیں باغ میں آئے۔ وہ مجھے عقبی حصے میں واقع ایک چھوٹی سی ایک منزلہ عمارت تک لایا۔ یہ کوٹھی خاصے بڑے رقبے پر تھی۔ شاید پانچ یا چھ کنال پر تھی۔ مرکزی عمارت نہایت شاندار طرزِ تعمیر کی حامل تھی۔ نشست گاہ والی عمارت بھی اسی طرح شاندار تھی مگر یہ چھوٹی عمارت عام سی تھی۔ ہم اندر آئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اصل میں قید خانہ تھا۔ ایک پتلی سی گیلری میں قطار سے تین کوٹھریاں تھیں جن پر فولادی دروازے لگے ہوئے تھے۔ اس کے آخری حصے میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید وہاں کوئی تہ خانہ تھا۔ میں اس طرف دیکھ رہا تھا کہ تاج نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"شکر کر تجھے شاہ جی نے میرے حوالے نہیں کیا ورنہ تو اس طرف جاتا۔ خیر پھر سہی۔"

عمارت میں ایک ادھیڑ عمر مگر پہلوان نظر آنے والا ست الوجود سا شخص تھا۔ جب ہم اندر آئے تو وہ ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ تاج کے اشارے پر اس نے اٹھ کر ایک کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ تاج نے مجھے اندر دھکا دیا۔ "عیش کر جب تک مقدر میں ہے۔"

یہ کوٹھری اندر سے خالی تھی۔ فرش کھردرا اور دیواروں پر رنگ و روغن کی زحمت نہیں کی گئی تھی میں نے غور کیا تو بعض جگہ دیواروں پر سرخی مائل نشانات نظر آئے جیسے یہاں کسی کا خون لگا ہو۔ چھت پر پیلا بلب روشن تھا مگر اس کے باوجود تاریکی اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ یہاں حبس تھا کیونکہ ہوا کی آمد و رفت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان رخنوں سے جو ہوا آ رہی تھی، وہ بس اتنی تھی کہ آدمی دم گھٹ کر نہ مرے۔ ورنہ دروازہ بند ہوتے ہی گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ بارش کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا اس کے باوجود یہاں گرمی تھی اور اگر بارش نہ ہوتی تو اس وقت یہ کوٹھری جہنم بنی ہوتی۔

میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ فرش اور دیوار دونوں کھردرے تھے اور جسم میں چبھ رہے تھے۔ آدمی زیادہ دیر ایک زاویے سے بیٹھ نہیں پاتا تھا اور میں بھی ہر چند منٹ بعد پہلو بدلنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ دس منٹ میں میرے جسم پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ گوہر شاہ کی بھوکے پیاسے رکھنے کی دھمکی کی فی الحال اہمیت نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ اگر اسی طرح پسینہ آتا رہا تو چوبیس گھنٹے سے بھی پہلے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو جاؤں گا۔ ورنہ میں دو دن بھی پانی کے بغیر رہ سکتا تھا۔ عام حالات میں مجھے نہیں یاد کہ میں نے آج تک کبھی چند گھنٹے بھی پانی کے بغیر گزارے ہوں۔ رات سوتے میں سات سے آٹھ گھنٹے کا سب سے طویل وقفہ آتا تھا جب میں پانی کے بغیر رہ لیتا تھا۔ جاگتے میں لازمی ہر چند گھنٹے بعد پانی پینا لازمی تھا اس لیے میں ذاتی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ عام یا خاص حالت میں، میں کتنی دیر پانی کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ البتہ رمضان میں بارہ چودہ گھنٹے پانی کے بغیر رہا

ہوں۔

گوہر شاہ کا رویّہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے تین آدمیوں کی اتنی پروا تھی کہ وہ اس کے بدلے مجھے رہا کرنے کو تیار تھا جبکہ میری خاطر اس نے نہ جانے کتنے آدمی ضائع کرا دیے تھے۔ کوئی ایسا چکر ضرور تھا جس کی وجہ سے وہ میرے بجائے ان تین آدمیوں کے لیے فکرمند تھا۔ دوسری بات جو اہم تھی، اس نے مجھے براہِ راست جسمانی اذیت کا نشانہ بنانے سے گریز کیا۔ بھوکا پیاسا رکھنا الگ بات ہے لیکن وہ مجھے تاج کے حوالے کرتا تو وہ یقیناً مجھے اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ آخر وہ جسمانی طور پر میرا اتنا خیال کیوں رکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ممکنہ جواب تو یہ تھا کہ بالآخر وہ میرے بھی اعضا نکالنے کی فکر میں تھا۔ انتقام بھی پورا ہو جاتا اور ممکن ہے اس کا وہ نقصان پورا ہو جاتا جو اسے میری وجہ سے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اگر گوہر شاہ کے رویّے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی تو وہ مجھے ایک حد سے زیادہ بھوکا پیاسا بھی نہیں رکھ سکتا کیونکہ اس سے بھی مجھے جسمانی نقصان ہو سکتا تھا۔ خاص طور سے ڈی ہائیڈریشن سے گردے فیل ہونے کا چانس بہت بڑھ جاتا ہے۔

گوہر شاہ یقیناً دل گردے والا آدمی تھا تبھی اس نے اپنی ذاتی رہائش میں اس طرح کا قید خانہ بنایا ہوا تھا۔ اسے پولیس یا قانون کا خوف نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے ان کا تعاون خرید لیا تھا۔ جب میں گوہر شاہ کے سامنے تھا تب مجھے خوف نہیں تھا اور میں کسی قدر بے پروا ہو رہا تھا مگر یہاں تنہائی میں میرے اندر کی جی والی کیفیت ختم ہو گئی تھی اور اب میں خوف زدہ بھی تھا اور پریشان بھی۔ گوہر شاہ میرے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے آزاد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام چاہ رہا تھا اور اپنے ان آدمیوں کی واپسی چاہتا تھا جو طارق کے پاس تھے۔ ممکن ہے ان آدمیوں کی کچھ اہمیت ہو لیکن وہ بہرحال اتنی زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔

تاج نے جب مجھے انجکشن دیا تو اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو تقریباً پہلے کی طرح پایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان لوگوں نے میرا پستول، پرس، رقم والا بیگ اور موبائل نکال لیا تھا۔ پرس میں صرف رقم تھی اور پستول بھی ان ہی لوگوں کا تھا جو میں نے اسلحے والے صندوق سے حاصل کیا تھا۔ مجھے فکر موبائل میں محفوظ نمبروں کی تھی جو یقیناً ان لوگوں کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ ان میں طارق، رومی اور حمیرا کے نمبرز شامل تھے۔ بائیک کے کاغذات بائیک کی پاکٹ میں تھے اور اس کی چابی میرے پاس تھی شاید وہ بھی ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ مگر اس کی اہمیت نہیں تھی۔ اصل اہمیت تو میری تھی جو اُن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ مجھے سرفراز کا افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مجبوراً سہی لیکن ہمارا ساتھ دیا تھا اور اسی وجہ سے اسے اس عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ شاید ڈیفنس والی کوٹھی سے واپسی کے فوراً بعد ان لوگوں کے ہاتھ آیا اور مارا گیا تھا۔

اس کے بعد وہ سکون سے انتظار کرتے رہے کہ کب کوئی اور آتا ہے اور وہ اسے بھی قابو کرتے ہیں۔ وہ دو دن سے انتظار کر رہے تھے اور بدقسمتی سے میں اُن کے ہاتھ آ گیا۔ سرفراز مطمئن تھا کہ وہ اس تک نہیں آ سکتے تھے کیونکہ وہ اس کی اصل شخصیت اور ٹھکانے سے لاعلم تھے اسی وجہ سے وہ اپنے گھر میں رہا۔ مگر وہ اس تک پہنچ گئے۔ اگر سرفراز واپسی کے فوراً بعد ان کے ہاتھ لگا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ گوہر شاہ کے آدمی اسے پہلے سے تلاش کر رہے تھے اور وہ شاید گھر میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاں تک اس تک رسائی کا معاملہ تھا تو یہ بہت مشکل کام نہیں تھا۔ نواب ٹاؤن سے ملحقہ سوسائٹی میں بہت کم گھر تھے اور یہ لوگ جس قسم کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے، یقیناً اپنے آس پاس کی پوری خبر رکھتے ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ گلی کے کونے والی نامکمل کوٹھی میں خانہ بدوش خاندان مقیم تھا اور سرفراز کے ایک لڑکی سے تعلقات تھے۔ وہ اس لڑکی کو اپنے گھر لاتا رہا تھا۔ سرفراز کے سامنے آنے کے بعد ان لوگوں نے خانہ بدوش خاندان کو پکڑا ہوگا اور انہوں نے فوراً سرفراز کے بارے میں بتا دیا ہوگا، اس کے بعد وہ آرام سے اس کے گھر تک پہنچ گئے۔

سرفراز نے بے پروائی کا ثبوت دیا تھا یا شاید وہ خطرہ محسوس بھی کر رہا تھا تو بیس لاکھ کے چکر میں رکا رہا۔ وہ اپنی جان سے گیا اور بیس لاکھ اس کے قاتلوں کو بونس میں مل گئے۔ مجھے تاج اینڈ کمپنی کی دیدہ دلیری پر حیرت تھی جو آبادی کے عین درمیان ایک آدمی کو قتل کر کے سکون سے بیٹھے ہوئے تھے اور دو دن تک میرا انتظار کرتے رہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ تاج کو گولی لگی تھی اور دو دن میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک کیسے ہو گیا؟ گولی کا زخم کتنا ہی غیر سنگین کیوں نہ ہو، اتنی جلدی نہیں بھرتا ہے اور نہ ہی آدمی فٹ ہو کر یوں بھاگ دوڑ میں لگ جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تاج کو گولی شاید چھو کر نکل گئی تھی اور زخم معمولی سا تھا جیسے حمیرا کو آیا

تھا اور وہ اب ٹھیک تھی۔ سرفراز کا نشانہ چوک گیا تھا مگر تاج نے اس سے بہت خوفناک انتقام لیا تھا۔ میرے ذہن اس کی سینہ کھلی لاش آئی تو میں جھرجھری لے کر رہ گیا اور مجھے احساس ہوا کہ میں درندوں سے زیادہ سفاک لوگوں کی قید میں ہوں۔ اگر ان کی مجبوری آڑے نہ آرہی ہوتی تو میرا حال سرفراز سے بھی بُرا ہوتا۔

مجھے ہوش آیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے اور ایک بجے کے قریب مجھے اس کوٹھری میں پھینکا گیا تھا۔ میری کلائی سے گھڑی بھی غائب تھی اس لیے میں وقت کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے میں نے شرٹ اتار دی تھی اس کے باوجود پسینہ بہہ رہا تھا۔ شرٹ کو تکیہ بنا کر میں نیچے لیٹ گیا۔ فرش شروع میں بہت چبھ رہا تھا مگر کچھ دیر بعد میں اس کا عادی ہو گیا اور مزے کی بات ہے کہ سو بھی گیا۔ پھر میری آنکھ صبح کے قریب کھلی باہر روشنی ہو گئی تھی تب بھی مجھے پتا نہیں تھا مگر پرندوں کی چہکار نے بتایا کہ صبح ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا مگر رات کی نسبت یہ پسینہ کم تھا۔ سوتے میں جسمانی کارکردگی خود بہ خود سست ہو جاتی ہے۔ مگر جاگنے کے کچھ دیر بعد مجھے پھر پسینہ آنے لگا۔ اگر سورج نکل آیا تھا تو ایک گھنٹے سے بھی پہلے یہ جگہ جہنم بن جاتی۔ رفتہ رفتہ بڑھتی تپش بتا رہی تھی کہ اس میں اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ نامحسوس مٹی نے میرا جسم، لباس اور بال گرد آلود کر دیے تھے اور پسینہ آنے سے جم سی گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد تپش واضح طور پر بڑھ چکی تھی۔ پسینہ جو پہلے رک سا گیا تھا اب دوبارہ بہنے لگا اور اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے لگا کہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے میرے جسم کا بیشتر پانی نکل جائے گا۔ انسانی جسم میں ستر فیصد پانی ہوتا ہے اور اس میں سے صرف دس فیصد بھی کم ہو جائے تو انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے اور انسان مر بھی سکتا ہے۔ کیونکہ صرف ہر خلیہ بلکہ ٹشوز اور تمام اہم اعضا پانی کے بغیر بیکار ہو جاتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانی جسم کی ستانوے فیصد چربی گھل جائے تب بھی انسان ٹھیک ٹھاک اور صحت مند رہتا ہے لیکن کل پانی میں صرف دس فیصد کمی اسے موت کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ پانچ فیصد کمی کے بعد انسان ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ پانچ فیصد کمی واقع ہو چکی تھی کیونکہ شدت کی پیاس کے ساتھ اب میں آنکھوں اور جسم میں تکلیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ کیفیت اور بڑھتی تو میرا دماغی توازن برقرار نہیں رہ پاتا۔ مجھے ناموجود چیزیں دکھائی دیتیں اور ایسی آوازیں سنائی دیتیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مجھے پانی کے سراب آنے لگتے۔

صحراؤں میں بھٹکنے والے جب پیاس کی شدت سے پاگل ہو جاتے ہیں تو ان کو پانی کے چشمے اور تالاب دکھائی دیتے ہیں اور وہ دیوانہ وار ان کی طرف بھاگتے ہیں۔ وہ جتنا بھاگتے ہیں یہ سراب اتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے جب ان میں بھاگنے کی ہمت نہیں رہتی تب وہ گر جاتے ہیں اور دم توڑ دیتے ہیں۔ مگر یہاں بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی صحرا تھا جس میں مجھے تالاب اور چشمے دکھائی دیتے مگر سراب تو کہیں بھی اور کسی طرح سے بھی آسکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ کہیں پانی ٹپک رہا ہے۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی، آواز اتنی واضح تھی کہ میں بے اختیار اٹھ گیا اور تلاش کرنے لگا کہ پانی کہاں ٹپک رہا ہے۔ یہ سراب اتنا مکمل تھا کہ میں نے پانی کی مہک بھی محسوس کی مگر پانی کہیں نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں پاگلوں کی طرح تلاش کرنے لگا۔ پھر میں دروازے پر ہاتھ اور ٹھوکریں مارنے لگا۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے چلّا کر کہا۔ ''مجھے پانی چاہیے۔''

کوئی جواب نہیں ملا مگر پانی گرنے کی ٹپ ٹپ اور اس کی مہک بدستور میرے حواسوں تک آتی رہی۔ اس آواز اور مہک نے مجھے سچ مچ پاگل کر دیا۔ میں نے دروازے پر یلغار کی جیسے ابھی اسے اکھاڑ پھینکوں گا مگر اسے ہلا بھی نہیں سکا اور اس ذرا سی جدوجہد نے میرے جسم سے رہا سہا کارآمد پانی بھی پسینے کی صورت میں خارج کر دیا۔ میں نیچے گر پڑا اور ہانپنے لگا۔ میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں گوہر شاہ اینڈ کمپنی کے لیے وہ گالیاں نکل رہی تھیں جو مجھے سخت ناپسند تھیں اور عام حالات میں میں کسی صورت انہیں اپنی زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ عام حالات میں میں گوہر شاہ سے التجا بھی نہیں کر سکتا تھا اگر مانگتا تو شاید موت مانگ لیتا مگر اس وقت میں اس سے پانی کی التجا بھی کر رہا تھا۔ گالیوں اور التجاؤں کا سلسلہ بیک وقت جاری تھا۔ تھک کر میں خاموش ہو جاتا مگر جب منہ میں خشک چمڑے جیسی زبان چبھتی اور پانی کی طلب بے اختیار کرتی تو میں پھر گالیوں اور التجاؤں پر اتر آتا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کتنی دیر جاری رہا اور پھر مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ بے ہوشی کی حالت میں مجھے کب اس قید خانے سے نکالا گیا، مجھے پتا نہیں چلا۔

جب گوہر شاہ کا آدمی ہمارے ہاتھ لگا اور طارق نے اسے اپنے گھر کے تہ خانے میں ڈالا کہ جب بھوک پیاس سے اس کے کس بل نکل جائیں تو پھر اس سے بات کی جائے۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ میں دشمن کے ہاتھ لگ جاؤں گا اور وہ یہی حربہ مجھ پر آزمائے گا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے اس کا خیال آیا۔ اچانک میرے ہونٹوں پر نمی آئی تو میں جیسے تڑپ کر ہوش میں آیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اٹھنا تو ایک طرف رہا میں ٹھیک سے تڑپ بھی نہیں سکا کیونکہ میں ایک اسٹریچر نما بیڈ سے بندھا ہوا۔ میرے پیروں، رانوں، پیٹ، سینے اور سر کو چمڑے کی مضبوط بیلٹس سے یوں جکڑا گیا تھا کہ میں از خود جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے عین اوپر ایک بڑی ڈرپ کی تھیلی لٹک رہی تھی اور اسٹاپر کے بعد اس کی نلکی کاٹ دی گئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر گرنے والا پانی کا قطرہ اسی سے ٹپکا تھا۔ نلکی میرے منہ سے بہ مشکل چند انچ کے فاصلے پر تھی۔ مگر میں اس تک ہونٹ لے جا نہیں سکتا تھا۔ ایک قطرہ گرا تھا اور اب دوسرا قطرہ بن رہا تھا اور میری جان لبوں پر آئی ہوئی تھی۔ میں اس قطرے کے لیے تڑپ رہا تھا اور پہلے سے منہ ممکن حد تک کھول لیا تھا تاکہ اس کے کہیں اور گرنے کا موہوم سا امکان بھی باقی نہ رہے۔

پہلے قطرے کے بعد یہ قطرہ شاید بیس یا پندرہ سیکنڈ بعد گرا تھا مگر مجھے لگا جیسے نہ جانے کتنی مدت بعد یہ قطرہ گرا اور میرے منہ میں گیا۔ میرے منہ میں جاتے ہی وہ یوں غائب ہو گیا جیسے صحرا کی ریت میں پانی کی ایک بوند غائب ہو جائے۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں اس قطرے کی نمی بھی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اگلا قطرہ بننا شروع ہوا تھا مگر اسٹاپر اتنا کم کھلا تھا کہ پانی بہت مشکل سے نکل رہا تھا۔ میں حلق پھاڑ کر چلایا۔ ''کوئی ہے...... اسٹاپر کھولو...... مجھے پانی دو۔''

لیکن میرے منہ سے جو آواز نکلی وہ اتنی مدھم تھی کہ بہ مشکل میرے کانوں نے سنی۔ اسے زیادہ سے زیادہ سرگوشی قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کا فوری ردِعمل ہوا اور میرے سامنے تاج کا منحوس چہرہ نمودار ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ''پانی مل تو رہا ہے، یہ کیا ہے؟'' اس نے ڈرپ کی تھیلی ہلائی تو نلکی بھی ہلنے لگی اور مجھے خطرہ ہوا کہ اس کا اگلا قطرہ میرے منہ سے باہر نہ گرے۔ تاج کی شکل واضح تھی لیکن کلر آؤٹ تھے۔

''پلیز اسے تیز کرو۔'' میں نے التجا کی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اسی رفتار پر رہے گی جب تک کہ......

جب تک کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے جملہ مکمل کیا۔ ''جب تک شاہ جی کے تین بندے نہیں مل جاتے۔''

''میں نہیں جانتا۔''

اگلا قطرہ میرے منہ میں گرا اور حسبِ سابق غائب ہو گیا۔ تاج نے اسٹاپر کو ہاتھ لگایا۔ ''اگر میں اسے ذرا سا سرکا دوں تو پھر قطرہ آدھے منٹ کے بعد گرے گا یعنی تم کو ہر منٹ میں دو قطرے پانی کے ملتے رہیں گے۔''

میں لرز گیا۔ ''نہیں خدا کے لیے۔''

''اور اگر اسے پورا بند کر دیا تو تم پانی سامنے ہوتے ہوئے بھی پیاس سے مر جاؤ گے۔ یہ بہت اذیت ناک موت ہو گی۔ تم نے شاید زندگی میں پہلی بار پیاس کا تجربہ کیا ہے لیکن یہ صرف آغاز ہے، اصل اذیت آگے آئے گی اور تم اسے جھیلو گے۔''

سچ تو یہ ہے کہ میں نے اب تک جو اذیت سہی تھی وہی بہت تھی اور یہ منحوس شخص مجھے مزید اذیتوں کی خبر دے رہا تھا۔ اگر میں زبان نہ کھولتا تو وہ اسٹاپر بند کر دیتا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو میں سچ کہہ رہا ہوں...... میں واقعی ان تینوں کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔''

جواب میں اس نے اسٹاپر بند کر دیا اور میں تڑپ کر رہ گیا میں نے پھر سرگوشی میں چلا کر کہا۔ ''اِسے کھولو۔''

''یہ اب نہیں کھلے گا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

میں آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے ایک بار پھر ان گالیوں کا آموختہ دہرایا جو مجھے اب ازبر ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے کبھی کسی کو اتنے تواتر سے گالیاں نہیں دی تھیں اس لیے جب کوٹھری میں دیں تو ذرا جھجک ہوئی تھی مگر اب یہ مجھے سبق کی طرح یاد ہو گئی تھیں اور میں نہایت رواں ہو رہا تھا۔ مگر تاج پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ گالیاں دینا اور کھانا اس کے لیے معمول کی بات تھی۔ جب اس پر اثر نہیں ہوا تو میں نے کہا۔ ''تیرا ناجائز باپ کہاں ہے۔ گوہر شاہ کو بُلا۔''

''میں یہیں ہوں۔'' گوہر شاہ کی آواز آئی۔

اس کی آواز سن کر میری ٹون پھر بدل گئی اور میں گالیوں سے التجا پر اتر آیا۔ ''دیکھو شاہ جی تم بھلے مجھے قتل کر دو لیکن مجھے پانی دے دو۔ اس کتے سے کہو اسٹاپر کھول دے۔''

''تاج اسٹاپر کھول دے۔'' خلافِ توقع گوہر شاہ نے اسے حکم دیا اور اس نے بلا چون و چرا تعمیل کی۔ مگر اس نے اسٹاپر پہلے جتنا کھولا تھا اور نلکی کی نوک پر پانی کا قطرہ بننا

شروع ہوا تھا۔ میں گوہر شاہ اور تاج کو بھول گیا اور میری نظر اس قطرے پر مرکوز تھی۔ چند سیکنڈ بعد قطرہ گرا اور اس نے زبان پر پانی کا ذائقہ دیا۔ اس ایک قطرے نے میرے اندر آگ آنے والے صحرا کو جیسے کسی قدر کم خشک کر دیا تھا۔ گوہر شاہ کے بہ ظاہر شریفانہ رویے کی وجہ سے میں نے پھر التجا کی۔

"پلیز اس کی رفتار تیز کرو۔"

"ڈاکٹر صاحب اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟" تاج نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو، ہم کیا چاہتے ہیں؟"

اس بار قطرے جلدی گر رہے تھے یعنی ہر چھ سات سیکنڈ کے بعد ایک قطرہ گر رہا تھا اور اتنی دیر میں کئی قطرے میرے منہ میں جا چکے تھے۔ خشکی کم ہوئی تو میری آواز ذرا کھل گئی تھی۔ "گوہر شاہ اگر میں جانتا تو......"

"تاج اسٹاپر بند کر دے۔" گوہر شاہ نے کہا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔

"میری بات سنو۔" میں نے کہنا چاہا لیکن تاج نے اسٹاپر بند کر دیا اور پانی کا قطرہ نلکی کی نوک پر لرزتا رہ گیا۔ "میری بات سنو۔"

مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ گوہر شاہ خاموش رہا اور تاج کے منہ پر طنزیہ مسکراہٹ تھی اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اسے یہ کھیل بہت پسند آیا تھا اور وہ اسے جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس میں اسے جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا تھا۔ مجھے پانی چاہیے تھا۔ چاہے وہ میری زندگی کا آخری پانی کیوں نہ ہو۔ میں نے شکست تسلیم کر لی۔ "ٹھیک ہے میں جو جانتا ہوں بتاتا ہوں لیکن پہلے مجھے کچھ پانی دو تاکہ میرا گلا تر ہو جائے۔"

"اسٹاپر کھول دو۔"

"شاہ جی یہ پانی پی کر مکر گیا تو؟" تاج نے دبی زبان میں پوچھا۔

"تب اسے ایک دن کے لیے اور کوٹھری میں ڈال دینا۔" گوہر شاہ نے سزا تجویز کی تو تاج نے بادل ناخواستہ اسٹاپر کھولا۔ اب بھی پانی قطروں کی صورت میں گر رہا تھا۔ ہر سیکنڈ میں ایک قطرہ گر رہا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں یہ رفتار خاصی تیز تھی مگر مجھے اس سے زیادہ پانی درکار تھا۔

"اس رفتار سے تو میں شاید ایک گھنٹے بعد بولنے کے قابل ہوں گا۔"

"تیز کر۔" گوہر شاہ نے حکم دیا تو تاج کا چہرہ بگڑ گیا تھا اس نے زیر لب کچھ کہا اور اسٹاپر مزید کھولا۔ پانی کسی قدر سست انداز میں تار بنا کر گرنے لگا اور پہلی بار میری جان میں جان آئی تھی۔ ایک منٹ یہ سلسلہ چلا اور اس دوران میں میں نے شاید آدھا یا پون گلاس پانی پیا تھا۔ گوہر شاہ نے روکنے کا حکم دیا تو تاج نے نہایت پھرتی سے اسٹاپر بند کر دیا۔

"تمہیں اب پانی اسی صورت میں ملے گا جب تم زبان کھولو گے۔" گوہر شاہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

"میں ایک آدمی کے بارے میں جانتا ہوں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ اب میری نظر ٹھیک ہو گئی تھی اور منہ کی خشکی بھی خاصی حد تک دور ہو گئی تھی۔ "جو میرے پیچھے آیا تھا اور ہم نے غنی آباد کے پارک میں اسے گھیر لیا تھا۔"

"ہم کون؟"

"طارق۔" میں نے اعتراف کیا۔

"ابھی تک تو تم کسی طارق سے ناواقف تھے۔"

"اس وقت میں نے جھوٹ کہا تھا لیکن اب سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم نے اسے طارق کے گھر میں قید کیا اور پھر میں وہاں سے نکلا۔ راستے میں تمہارے آدمیوں نے حملہ کیا۔ اس سے بچنے کے بعد جب ہم نے طارق سے رابطہ کیا تو اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

"ہم کون؟"

"میرے ساتھ جو عورت تھی لیکن میں تمہیں اُس کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔"

"اگرچہ اس نے میرا ایک آدمی مارا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" گوہر شاہ نے کہا۔ "مجھے میرے آدمیوں کے بارے میں بتاؤ۔"

"جب ہم واپس طارق کے گھر پہنچے تو وہاں نہ طارق تھا اور نہ ہی تمہارا آدمی جو قید تھا۔ گھر الٹا پڑا تھا اور ایک کمرے میں خون بھی پڑا تھا۔"

"جسے تم نے پکڑا تھا اس کے پاس ایک سگنل چپ تھی اور میرے غائب ہونے والے باقی دو آدمی اسی کے سگنل پر وہاں گئے تھے مگر پھر ان کا بھی پتا نہیں چلا۔"

"میں اُن کے بارے میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا اور مجھے کہتے ہوئے خیال آیا کہ میرا موبائل ان کے پاس تھا اور اس سے طارق کے نمبر پر کال کی گئی تھی۔ تو میرا جھوٹ پکڑا جائے گا کہ میں طارق اور اس کے گم شدہ آدمیوں کے بارے میں نہیں جانتا۔ مگر گوہر شاہ کی طرف سے ایسا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ اس کے بجائے اس نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے میرے آدمی طارق کے قبضے میں ہیں؟"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ طارق اصل میں تمہارے قبضے میں ہو، آخر اس کے گھر پر گڑبڑ ہوئی ہے اور وہ غائب ہے۔"

"تم میرے قبضے میں ہو اور مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں لیکن جو میں جانتا تھا، وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم کیا کرو گے میرے ساتھ؟"

"ابھی تم آرام کرو تم سے پھر بات ہوگی۔"

"میری بات سنو۔" میں نے کہنا چاہا لیکن دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ گوہر شاہ جا چکا تھا۔ تاج نے کہا۔

"عیش کر جب تک مقدر میں ہے۔" اس نے اسٹاپر ہلکا سا کھولا اور چلا گیا۔ قطرہ قطرہ پانی ٹپکنے لگا اور زندگی بن کر میرے جسم میں اترنے لگا۔ رفتار اب بھی وہی تھی یعنی ایک قطرہ ایک سیکنڈ میں۔ یہ ڈیڑھ لیٹر والی ڈرپ تھی اور اس میں سچ مچ گلوکوز والا پانی تھا یہ نہ صرف میری پیاس بجھا رہا تھا بلکہ مجھے توانائی بھی دے رہا تھا۔ مگر اس رفتار سے تھیلی کو خالی ہونے میں کئی گھنٹے لگ جاتے اور ایسا لگ رہا تھا کہ تھیلی خالی ہی ہو جائے گی۔ وہ دونوں مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی دیواریں سفید تھیں۔ سر میں گھما نہیں سکتا تھا اور آنکھیں گھمانے سے مجھے پتا چل رہا تھا کہ یہاں نارمل فرنیچر نہیں تھا۔ ایک طرف ایک شیشے کی الماری تھی جیسا کہ اسپتال اور کلینکس میں دوائیں رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ الماری بھی اس لیے نظر آگئی کہ وہ اونچی تھی اس سے نیچے کمرے میں کیا تھا، میں لاعلم تھا میرا منہ دیوار کی طرف تھا جس سے یہ اسٹریچر لگا کھڑا تھا اور کمرے کا دروازہ سر کے پیچھے کہیں تھا۔

اس طرح بے بسی کی کیفیت میں بندھے ہوئے اچانک مجھے عادل کا خیال آیا۔ جب اسے زبردستی اغوا کر کے لے جایا ہوگا اور راوی والے مذبح خانے لے جانے سے پہلے اسے قید میں رکھا گیا ہوگا تب اس پر کیا گزری ہو گی۔ اس نے کیسی بے بسی محسوس کی ہوگی، پتا نہیں اسے آپریٹ کرنے سے پہلے بے ہوش کیا گیا ہوگا یا نہیں۔ اس نے اپنے جسم کی چیر پھاڑ اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اس کی اذیت محسوس کی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے میرے اندر جیسے کچھ پگھلنے لگا اور شاید اس کا اثر میری آنکھوں پر بھی آیا تھا۔

پانی کی کمی دور ہوئی تو آنسو بھی نکل پڑے تھے۔ بہت دیر آنسو بہانے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔ ڈرپ نصف ہوئی تھی اور پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اگرچہ اب میری پیاس مٹ گئی تھی اور جسمانی طور پر بھی میں خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا مگر میں نے قطرے لینا جاری رکھا۔ دشمن کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس وقت پھر مجھ پر پانی بند کر دیتا اور یہ ڈرپ صرف پانی نہیں بلکہ کھانا بھی تھی۔ میں اس سے توانائی حاصل کر رہا تھا۔

گوہر شاہ نے ایک بار پھر میری توقع کے خلاف مجھے کچھ نہیں کہا اور پانی بھی دے دیا۔ میرا شبہ قوی ہونے لگا کہ وہ میرے اعضا کے چکر میں تھا تبھی مجھے جسمانی نقصان پہنچانے سے گریز کر رہا تھا۔ مزید ایک چوتھائی ڈرپ کے بعد میرے لیے باقی ڈرپ پینا ممکن نہیں رہا تھا سستی کے باوجود میرا پیٹ بھر گیا تھا اور اب مجھے حاجت محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر میں یہاں بندھا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں پانی نہ پیتا تو وہ قطرہ قطرہ میرے منہ پر ہی ٹپکتا رہتا اور اگر میں منہ بند کرتا تو ہونٹوں اور ناک پر گرتا میں نے تجربہ کر کے دیکھا تو پتا چلا کہ منہ بند کرنے کی صورت میں قطرے ناک میں جا رہے تھے۔ دوسری صورت میں مجھے ہونٹ یوں پھیلانے پڑتے تھے کہ قطرے ان پر گر کر دائیں بائیں ڈھلک جائیں اور ناک میں نہ جائیں مگر یہ بھی آسان نہیں تھا اگر میں بچہ ہوتا تو بہ آسانی دیر تک اس طرح چڑانے والے انداز میں ہونٹ پھیلا سکتا تھا۔

مگر میں بچہ نہیں تھا اس لیے میرے سخت ہوجانے والے ہونٹ ذرا سی دیر میں تھک گئے اور میں منہ سیدھا کرنے پر مجبور ہوگیا نتیجے میں پانی پھر ناک میں جانے لگا اور مجھے تھک ہار کر منہ کھولنا پڑا تھا۔ پانی قطرہ قطرہ گر رہا تھا جسے میں منہ میں بھی جمع نہیں کر سکتا تھا وہ خود بہ خود حلق سے نیچے جا رہا تھا۔ اب میرا پیٹ پھولنا شروع ہوگیا تھا کیونکہ گردوں کے عمل سے پانی میرے مثانے میں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ مزید کچھ دیر بعد میرے لیے ضبط کرنا دشوار ہوگیا تو میں نے چلّا کر کہا۔ "کوئی ہے...... مجھے واش روم جانا ہے۔"

کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے دوسری طرح سے پکارا اور یہاں موجود افراد کے خاندانی رشتوں کو آپس میں خلط ملط کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ میرا پیٹ پھٹنے والا ہے اور میں اب یہیں فارغ ہو جاؤں گا۔ اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر مجھے کسی بزرگ کی ایک بادشاہ کو نصیحت یاد آئی

جو پانی پینے جارہا تھا اور بزرگ نے بادشاہ سے اس پانی کی قیمت دریافت کی تو اس نے اپنی آدھی سلطنت اس کے عوض دینے کو کہا اور پھر بزرگ نے پوچھا کہ یہی پانی جسم میں رک جائے اور خارج نہ ہو تو بادشاہ اس صورت میں اپنی باقی سلطنت دینے کو تیار ہو گیا۔ تب بزرگ نے اس سے کہا کہ اپنی سلطنت پر غرور نہ کریں کہ اس کی قیمت پانی کا ایک پیالہ اور اس کے مساوی مقدار میں پیشاب ہے۔ میں ایک کیفیت سے گزر چکا تھا جب ایک گلاس پانی کے بدلے میں مرنے کو تیار ہو گیا تھا کہ میرے پاس ایک یہی متاع ہے۔ اب دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا تھا اور میں اس کے بدلے کچھ بھی دینے کو تیار تھا۔ اگرچہ مجھے مجبوری نہیں تھی میں آرام سے یہیں فارغ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ میری طبع کو گوارا نہیں تھا کہ میں شیر خوار بچوں کی طرح اپنے کپڑے گندے کر لوں۔ اس لیے بے تاب تھا کہ کوئی آئے اور مجھے اس قید سے نجات دلا کر واش روم کا راستہ دکھائے۔

ڈرپ ختم ہونے کے قریب تھی اور میں بھی پھٹنے کے قریب تھا۔ میں پکار کے تیسرے راؤنڈ کا آغاز کرنے والا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں نے سکون کا سانس لیا کہ میری فریاد سن لی گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تاج یا گوہر شاہ کا کوئی اور گرگا آیا ہو گا مگر جب آنے والا میری نظروں کے فوکس میں آیا تو دنگ رہ گیا۔ وہ صائمہ تھی۔ وہی صائمہ جس نے مجھے اس کوٹھی اور ڈیفنس والی کوٹھی کا پتا بتایا تھا اور پھر غائب ہو گئی تھی۔ وہ گوہر شاہ سے بچتی پھر رہی تھی اور اب گوہر شاہ کی کوٹھی میں تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ڈاکٹر تو؟"

"تم یہاں کیسے کیا ان لوگوں کے ہاتھ آ گئیں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "اسی دن پکڑی گئی تھی۔" پھر اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "پہلے کی کوئی بات مت کرنا۔ گوہر شاہ کو پتا نہیں ہے کہ میں نے تجھے ڈیفنس والی کوٹھی دکھائی تھی۔"

"میں نے نہیں بتایا ہے لیکن وہ بچہ نہیں ہے، اسے معلوم ہے کہ ہم تمہیں اس کے قبضے سے نکال کر لے گئے تھے اور تم ہی نے اس کے ٹھکانوں کی نشان دہی کی ہو گی۔"

وہ سہم گئی۔ "اس نے کچھ کہا نہیں ہے پر وہ بے بہت ظالم، بندے کو وہاں مارتا ہے جہاں اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔"

"ہو سکتا ہے اس کا شک تمہاری طرف نہ گیا ہو ویسے میرے ساتھ وہاں جانے والا بندہ اس جگہ سے واقف تھا اگر گوہر شاہ نے پوچھا تو میں اس کا نام لے دوں گا۔"

"تیرا شکریہ ڈاکٹر۔"

"ایسے نہیں، مجھے کھولو۔" میں نے کسمسا کر کہا۔ "مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں کھول سکتی، میں تو تیری آواز سن کر یہاں آ گئی۔"

"تب گوہر شاہ یا تاج سے پوچھو۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "میرا پیٹ پھٹنے والا ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور باہر چلی گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں گوہر شاہ کی کوٹھی میں تھا۔ صائمہ کی موجودگی سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا کیونکہ وہ گوہر شاہ سے روپوش رہنے کے لیے شاید لاہور ہی چھوڑ جائے۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ اسی دن پکڑی گئی اور خوش قسمتی کہ گوہر شاہ نے پھر اسے اپنے جلادوں کے حوالے نہیں کیا حالانکہ وہ اس کے چار آدمیوں کی قاتلہ تھی۔ بے شک اس نے انہیں صرف نامرد کیا تھا مگر گوہر شاہ نے اسی وجہ سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ ناکارہ ہو گئے تھے اور اس کے لیے بوجھ بن جاتے۔ گوہر شاہ جیسے لوگ بوجھ نہیں پالتے ہیں۔ صائمہ چند منٹ بعد واپس آئی اور میرے جسم سے بندھی بیلٹس کھولنے لگی۔ اس کے ساتھ کوئی اور نہیں آیا تھا، اس نے مجھے کھولتے ہوئے خبردار کیا۔

"الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔"

"کیسی حرکت؟"

"یہی بھاگنے والی...... یہاں سے کوئی نہیں بھاگ سکتا ہے۔ باہر گوہر شاہ کے کتے بھی ہیں جو کسی اجنبی کو دیکھ کر چیر پھاڑ دیتے ہیں۔"

میرا فرار کا بالکل ارادہ تھا اس لیے میں نے کسی قسم کی یقین دہانی سے گریز کیا البتہ جب میں اس کے ساتھ باہر آیا تو سامنے ہی تاج کو موجود پایا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کی شاٹ گن اس کی رانوں پر رکھی تھی۔ وہ مجھے خبردار کرنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ میں کوئی حرکت نہ کروں جو میرے حق میں اچھی نہ ہو۔ یہ چھوٹی سی راہداری تھی اور اس کے کونے میں ہی واش روم تھا جو شاید ملازمین کے لیے مخصوص تھا میں اندر چلا گیا۔ صائمہ باہر رک گئی۔ ایک منٹ بعد میں نہایت مطمئن اور کسی قدر پرمسرت باہر آیا تھا۔ ہاتھ اور منہ دھوتے ہوئے میں نے باتھ روم کا جائزہ لیا تو اسے مکمل طور پر بند پایا صرف ایک کونے میں چھ انچ کا ایگزاسٹ فین لگا تھا جو یہاں کی کثیف ہوا کو باہر نکال رہا

تھا۔

فرار کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور صائمہ مجھے اطلاع دے چکی تھی کہ باہر دو پیروں کے ساتھ چار پیروں والے بھی تھے۔ اس لیے میں بادلِ ناخواستہ باہر آیا۔ صائمہ وہیں موجود تھی۔ اب تک مجھے اپنی پڑی تھی اور میں اس کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ تک سک سے تیار تھی۔ سلک جیسے کسی کپڑے کی انتہائی چست قمیص جو خاص طور سے کمر سے تنگ تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے چڑھائی کیسے ہوگی۔ اسی قسم کے کپڑے کا چست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس لباس میں دوپٹے کا کوئی کام نہیں تھا۔ مجموعی طور پر یہ لباس بہت سنسنی خیز اور نمایاں کرنے والا تھا۔ گوری رنگت کے ساتھ وہ خوش شکل بھی تھی لیکن اس کا اصل اثاثہ اس کا جسم تھا اور مجھے پہلی بار اس کا علم ہوا۔ اس سے پہلے وہ خاصی دیر میرے ساتھ رہی تھی مگر وہ عام سے لباس میں تھی اور میں نے غور بھی نہیں کیا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے یوں غور کرتے پا کر وہ خوش ہوئی اور بولی۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''ٹھیک لگ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

اس تعریف پر وہ ذرا مرجھائی اور پھر بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ مجھے ایک اور کمرے میں لائی۔ یہ اسی راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ راہداری کے دونوں سرے بند تھے اور یہاں سے باہر جانے کا راستہ پتا نہیں کس طرف سے تھا۔ دونوں طرف تین تین دروازے تھے یعنی کل چھ کمرے تھے۔ ایک طرف بند تھی اور دوسری طرف واش روم تھا۔ لازمی بات تھی کہ ان ہی دروازوں میں سے کوئی باہر جانے کے لیے تھا اور میرے خیال میں وہ دروازہ تھا جس کے آگے تاج گن سمیت براجمان تھا۔ یہ کمرا بھی اسی سائز کا تھا۔ یہاں بیڈروم سیٹ تھا۔ کنگ سائز ڈبل بیڈ، اس کے عین سامنے اسی ڈیزائن کی ڈریسنگ ٹیبل اور دروازے کے ساتھ تین پٹ کی الماری تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور بیڈ کے بعد کھڑکی تھی۔ اس پر قالین سے ہم رنگ پردے تھے۔ صائمہ نے اے سی آن کیا اور میری طرف دیکھ کر توبہ شکن قسم کی انگڑائی لی اور معنی خیز انداز میں بولی۔ ''کیا خیال ہے ڈاکٹر؟''

''خیال تو اچھا ہے۔'' میں بیڈ کے کنارے نیم دراز ہو گیا۔

''تب میں لائٹ بند کر دوں۔'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ہاں اور دروازہ بھی بند کرتی جانا۔ دروازہ کھلا ہو تو مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آتی ہے۔''

ایک لمحے کو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''میں جاؤں؟''

''ہاں تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے اکیلے سونے کی عادت ہے۔''

''تو جی کچھ دیر بعد سو جانا۔'' اس نے پیش قدمی کی اور میرے پاس آ گئی۔ اس نے جھک کر میرے جوتے اتارنا چاہے مگر میں نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم جاؤ۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اچانک ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تیرا کیا خیال ہے میں اپنی خوشی سے یہ سب کر رہی ہوں۔''

''پھر؟''

''مجھے شاہ جی نے حکم دیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''میں کیسے پوچھ سکتی ہوں؟'' وہ بولی۔ ''یہاں سب شاہ جی کے غلام ہیں۔''

''میں نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ پوچھے تو تم کہنا میں نے انکار کر دیا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے کہا کہ میں پوری کوشش کروں، ساتھ ہی دھمکی دی کہ میں ناکام رہی تو میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''تم اس سے کہہ سکتی ہو کہ میں نے سختی سے منع کر دیا تھا، میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے عورت کو کبھی کھلونا نہیں سمجھا اور تعلق میں ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''وہ بہت ظالم ہے۔ اگر میں تجھے دکھاؤں کہ میرا پورا جسم بھرا ہوا ہے اس کے ظلم کے نشانات سے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے لوگ کسی بے بس عورت کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا کرو تم کچھ دیر یہاں رہو اور پھر جا کر اسے کہہ دو کہ تم نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔''

میری بات پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''اگر اس نے جھوٹ پکڑ لیا؟''

''وہ کیسے پکڑ سکتا ہے؟''
''تو ڈاکٹر ہے کیا تو نہیں جانتا کہ کیسے پکڑ سکتا ہے؟''
میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ واقعی پکڑ سکتا تھا۔ مگر صائمہ کی خاطر میں اپنے مقام سے تو نہیں گر سکتا تھا اس کے بعد میں کسی سے کیا خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ رہتا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

وہ کھڑی ہو گئی اور کچھ دیر سر جھکائے کھڑے رہنے کے بعد اس نے باہر کا رخ کیا۔ اس نے عقب میں دروازہ بند کیا تو میں لیٹ گیا۔ ڈی ہائیڈریشن، پھر مستقل بندھے رہنے سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ یہ قدرت کی طرف سے کسی انعام سے کم نہیں تھا کہ گوہر شاہ کی قید میں مجھے اتنا آرام دہ اور پُرتعیش کمرا ملا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس نے صائمہ کو اس حکم کے ساتھ کیوں بھیجا تھا؟ یہ یقیناً اس کی مہربانی نہیں تھی پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے صائمہ کو ایسا حکم دیا؟ میں سوچ میں پڑ گیا کیا اس طرح وہ میری جسمانی کارکردگی جانچنا چاہ رہا تھا۔ جب مجھے خیال آیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں تو میں نے بے ساختہ لاحول پڑھی۔ کمرے میں کئی لائٹس روشن تھیں اور تیز روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر لائٹ بند کرنا چاہی تو پتا چلا کہ سوئچ بورڈ کے بٹن کام نہیں کر رہے تھے۔ تب لائٹس کیسے آن ہوئی تھیں؟

جب ہم آئے تو یہ لائٹس آن ہی تھیں۔ میں نے کئی بار سوئچ اوپر نیچے کیے مگر لائٹس پر کوئی اثر نہیں پڑا اور تب مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے سرسری سے انداز میں کمرے کا جائزہ لیا اور کسی قدر تلاش کے بعد مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر لگے ایک دیوار گیر شوپیس میں شیشے کی چمک محسوس ہوئی۔ حالانکہ یہ پلاسٹک جیسی کسی چیز سے بنا ہوا کیوپڈ کا مجسمہ تھا جو تیر چلا رہا تھا۔ اس کے دونوں کھنچے ہوئے بازوؤں کے درمیان ایک سیاہ سوراخ تھا اور وہ چمک اسی سوراخ سے محسوس ہوئی تھی۔ شاید یہ کیمرے کا لینس تھا۔ اگر صائمہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو میری مووی بن جاتی۔ مگر سوال یہ تھا کہ گوہر شاہ مووی بنا کر کیا کر لیتا۔ مجھے بلیک میل کرنا بیکار تھا۔ اگر وہ مجھے خاموش رہنے اور خون بہا قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا تب بھی اس میں رسک تھا۔ میں ابھی مان جاتا اور آزاد ہونے کے بعد مکر جاتا تو وہ کیا کر لیتا؟ عین ممکن تھا اس فلم کی تشہیر بھی مجھے نہ روک پاتی۔
میں واپس آکر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد سو بھی گیا تھا۔ پیاس مٹ گئی تھی اور بھوک بہت معمولی سی تھی اس لیے نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں تاریکی تھی اور ایک نائٹ بلب روشن تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اٹھ کر اس شوپیس کو چیک کیا۔ لینس کا گول شیشہ صاف محسوس ہوا تھا۔ شوپیس کو دیوار سے اکھاڑنا مناسب نہیں تھا اس سے وہ جان جاتے کہ میں کیمرے کی موجودگی سے آگاہ ہو گیا ہوں۔ یہاں گھڑی نہیں تھی اور میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وقت کیا ہوا ہے۔ کھڑکی کے باہر تاریکی تھی۔ اگر میں سارا دن بے ہوش رہا تھا تو اس وقت رات ہو گئی تھی اور اب شاید رات بھی ختم ہونے والی تھی۔ میں نے الماری چیک کرنا چاہی مگر اس کے پٹ بند تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں خالی تھیں۔ بیڈ کے دونوں طرف موجود سائیڈ درازیں بھی خالی تھیں البتہ ان پر ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ ہلکے پلاسٹک اور بہت ہی معمولی سے الومنیم پائپ سے بنا یہ ٹیبل لیمپ ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے چند انچ کے پائے تھے اگر میں انہیں توڑ بھی لیتا تو ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں مایوسی کے عالم میں واپس آکر لیٹ گیا۔
فی الحال رہائی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی باہر تاج موجود تھا اور مسلح تھا۔ وہ خالی ہاتھ سے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میری توجہ اس کی شاٹ گن کی طرف گئی۔ اگر میں کسی طرح اس کی شاٹ گن حاصل کر لیتا تو اس ہتھیار کی مدد سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا۔ مگر میں کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہو جسے میں کام میں لا سکوں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ چیک کیا وہ لاک نکلا۔ کسی وقت اسے باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا ہینڈل اس قسم کا تھا کہ اسے اندر سے لاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر میں کسی طریقے سے تاج کو اندر آنے پر مجبور کر دیتا تو بھی اس سے ہتھیار حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا ہو کر آتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سرے سے نہ آتا اور صائمہ یا کسی اور کو... بھیج دیتا یا پھر کسی کو نہ بھیجتا اور میری پکار پر کوئی توجہ نہ دیتا۔

یہ سارے خیالات میرے ذہن میں تھے۔ جب خاصی دیر غور و خوض کے بعد بھی کوئی طریقہ سمجھ نہیں آیا تو میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔ یعنی ذہن کو آزاد کر دیا اور یونہی لیٹے لیٹے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔

اچانک ہی کمرے کی روشنیاں آن ہو گئیں۔ اس کے نصف گھنٹے بعد صائمہ نے اندر جھانکا۔ "اٹھ گئے ہو؟"

"ہاں وقت کیا ہوا ہے؟"

"ناشتے کا وقت ہو گیا ہے۔" اس نے مبہم انداز میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ واش روم جانا ہے تو؟"

"کیوں نہیں۔" میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ تاج اسی جگہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاٹ گن حسب معمول اس کی گود میں تھی۔ میں صائمہ کے ساتھ واش روم تک آیا اور اندر جانے سے پہلے سرسری انداز میں کہا۔ "تم اندر کیسے آئیں؟"

"دروازہ کھول کر۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"چابی سے؟"

"نہیں بس لٹو گھمایا تو کھل گیا۔"

اب میں سمجھا کہ بہ وقت ضرورت دروازے کے لٹو کو صرف باہر سے گھمانے پر دروازہ کھلتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا میکنزم کیا ہے لیکن یقیناً کوئی طریقہ ہوگا۔ کوئی خفیہ لاک جسے بروئے کار لانے سے اندر کا ہینڈل بیکار ہو جاتا ہوگا۔ صائمہ جانتی نہیں تھی یا مجھے بتانا نہیں چاہ رہی تھی اس لیے انجان بن رہی تھی۔ میں واش روم سے آیا تو وہ غائب تھی۔ میں نے تاج سے چھیڑ خانی کا فیصلہ کیا۔ جاتے جاتے اس کے پاس رکا۔ "تم بہت وفادار ہو۔ کسی اچھی نسل کے ہو۔"

اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا اور اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "جلد تجھے پتا چل جائے کہ کس نسل سے ہوں۔"

"ہوسکتا ہے کہ صرف میرا گمان ہو بعض اوقات آدمی کو خود پتا نہیں ہوتا کہ اس کا باپ کون ہے۔" میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم جیسے لوگ اپنے اَن داتا کو خوب پہچانتے ہیں۔"

"بکواس کرلو۔" وہ پھر غرایا۔ "میں نے کہا نا ایک ہی بار حساب کروں گا۔ تجھ سے بھی اور اُس سے بھی۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ "کس سے؟"

"اس کُتیا سے۔" اس کا اشارہ واضح تھا۔ میں پلٹ کر اس کی طرف آیا تو اس نے چوکنا ہو کر شاٹ گن سامنے کرلی۔ "واپس جا۔"

مگر میں اَن سنی کر کے اس کے بالکل سامنے آیا اور سرد لہجے میں کہا۔ "اب تم نے حمیرا کے بارے میں بکواس کی تو......"

"تو کیا کر لے گا؟" وہ مسکرانے لگا۔ "میں صرف بکواس نہیں اور بھی بہت کچھ کروں گا۔"

اُس کا خیال تھا کہ میں شاٹ گن پر ہاتھ ڈالوں گا مگر خلاف توقع میں نے عین سامنے سے اس کی ناک پر مُکا رسید کیا۔ وار زوردار تھا اور وہ کراہ کر پیچھے گیا۔ شاٹ گن کی نال میرے سینے کی طرف تھی اور اس کے ٹریگر دبانے کی دیر تھی کہ آں جہانی ہو جاتا۔ مگر اس نے ٹریگر نہیں دبایا۔ پیچھے ہٹ کر اس نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا جس سے خون ٹپک رہا تھا اور مشتعل ہو کر شاٹ گن اوپر کی تھی۔ وہ مجھے دستہ مارنے والا تھا، میں نے دستے کی پروا کیے بغیر اس کے دائیں گھٹنے پر ٹھوکر ماری اور جو دستہ میرے سر پر لگنا چاہیے تھا وہ میرے شانے پر لگا۔ درد کی لہر نے ایک لمحے کو میرا شانہ مفلوج کر دیا مگر میری ضرب زیادہ کارگر تھی، وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور کرسی سے ٹکرایا اور نیچے ڈھیر ہو گیا۔ شاٹ گن چھوٹ کر اس کے پاس گری تھی۔ میں اس کی طرف لپکا تھا کہ سامنے سے درمیانی دروازہ کھلا اور گوہر شاہ پستول بدست نمودار ہوا۔

"بس۔" اس نے کسی ڈائریکٹر کی طرح کہا جو سین شوٹ ہو جانے پر کٹ کہتا ہے۔ میں رک گیا اور تاج تکلیف کے باوجود پھرتی سے کھڑا ہو گیا اس نے شاٹ گن اٹھالی۔ گوہر شاہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"اس نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔" تاج نے اپنی زخمی ناک پیش کی۔

"یہ ایک ڈاکٹر ہے اور تم بچپن سے بدمعاشی کے ماہر ہو پھر یہ کیسے کامیاب ہوا؟"

"اس نے دھوکے سے حملہ کیا۔" تاج بوکھلا گیا۔ وہ خوف زدہ تھا۔

"افسوس کہ تم ایک عام آدمی کے دھوکے میں آجاتے ہو۔" گوہر شاہ کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ "اگر یہ تمہاری ٹکر کا کوئی بدمعاش ہوتا تو اس وقت یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔"

تاج سر جھکا کر اور دوسرے لفظوں میں دم دبا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر گوہر شاہ نے اسے دفع ہو جانے کا اشارہ کیا اور وہ اسی دروازے سے نکل گیا۔ میں نے سر ہلایا۔

"تم اسے بدمعاش قرار دے رہے ہو حالانکہ تم خود کیا ہو۔ فرق صرف چھوٹے بڑے کا ہے۔"

"سیف اپنی زبان قابو میں رکھو۔" اس نے سکون سے کہا۔ "انسان اپنی زبان کی وجہ سے مشکل میں پڑتا ہے۔ اگر میں نہ آتا تو اس وقت یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔"

"تمہاری بڑی مہربانی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لیکن میں اس مہربانی کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

گوہر شاہ مجھ سے ذرا فاصلے پر تھا اور اس نے پستول ڈھیلے انداز میں پکڑ رکھا تھا مگر اس کا رخ میری طرف ہی تھا اور

وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ تاج سے کہہ رہا تھا کہ میں ایک عام آدمی ہوں۔ اس نے سر ہلایا۔ "میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اور جلد تم اس کی وجہ جان جاؤ گے۔"

"وجہ جاننے کے لیے بہت زیادہ عقل مندی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسے اعضا فروش سے آدمی اور کیا توقع کر سکتا ہے۔ شاید تم میرے لیے کسی گاہک کی تلاش میں ہو۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "جو میرے بھائی کے ساتھ کیا تھا، وہی میرے ساتھ کرو گے۔"

گوہر شاہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا مگر اس نے فوری خود پر قابو پا لیا اور پھر پہلے کی طرح سپاٹ سا چہرہ بنا کر بولا۔ "تم سوچنے سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔ لیکن کچھ پابندیاں ہوں گی۔ اب تم نے پھر ایسی کوئی حرکت کی تو اس آرام دہ کمرے کی جگہ اسی کوٹھری میں ڈال دیے جاؤ گے۔"

"اوکے، میں ڈر گیا۔" میں نے ہاتھ اوپر کر کے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "بندہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ اب کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔"

گوہر شاہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور پھر پلٹ کر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا تھا کہ دروازہ کھولوں مگر وہ دوسری طرف سے بند کیا جا چکا تھا۔ میں نے دوسرے دروازے چیک کیے مگر وہ سب بند تھے۔ حتیٰ کہ اس کمرے کا دروازہ بھی بند تھا جس میں مجھے ہوش آیا تھا۔ میں پلٹ کر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف آیا اور اس کے لٹو کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر اس میں کوئی ایسا کھٹکا یا لاک نہیں تھا جسے دبانے سے یہ اندر سے ناکارہ ہو جاتا۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا تو مجھے اس کے نچلے حصے میں خفیف سا ابھار محسوس ہوا۔ میں نے اسے دبانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں ہلا پھر میں نے اسے دائیں بائیں سرکانا چاہا تو وہ سرک گیا۔ اس کے بعد میں نے اندر سے لٹو گھمایا تو دروازہ کھل رہا تھا۔ اس ابھار کو واپس اپنی جگہ کرنے سے لٹو اندر کی طرف سے بیکار ہو گیا تھا۔ گویا یہ میکنزم تھا۔ میں نے سوچا اور اسے اسی پوزیشن میں رہنے دیا کہ لٹو اندر سے بیکار رہے اور میں اندر آ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہی میں قیدی ہو گیا تھا۔ اب میں اسی وقت باہر جا سکتا تھا جب کوئی باہر سے دروازہ کھولتا۔

میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کیونکہ میں یہ راز چھپانا چاہتا تھا کہ میں میکنزم سے واقف ہو گیا ہوں۔ کمرے کی لائٹس خود کار انداز میں کھلتی بند ہوتی تھیں۔ میں نے ایسے ہی سرہانے رکھے ٹیبل لیمپ کو آن کیا اور وہ آن ہو گیا۔ یعنی اس کا ساکٹ کام کر رہا تھا۔ میں نے تار چیک کی تو وہ قالین کے نیچے جا رہی تھی اور پھر دروازے کے پاس قالین سے نکل کر کوئی فٹ بھر اوپر دیوار میں لگی ڈسک تک جا رہی تھی۔ اس میں کوئی سوئچ یا ساکٹ نہیں تھا بلکہ تار یہاں فکس تھی۔ گویا اس میں ہمہ وقت کرنٹ رہتا ہوگا۔ اسے چیک کرتے ہوئے اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے دروازے کے لٹو کا معائنہ کیا۔ یہ لوہے کا اور پالش کیا ہوا تھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ایک خیال میرے ذہن میں پرورش پانے لگا۔ میرے ذہن نے مسئلے کا ایک حل پیش کیا تھا۔

ابھی روشنی تھی۔ اگر میں کچھ کرتا تو وہ کیمرے کی زد میں آ جاتا۔ مجھے شبہ تھا کہ کیمرا شاید رات میں بھی کام کرتا ہوگا۔ میں مڈل ایسٹ کے جس اسپتال میں کام کرتا تھا۔ وہاں اسی قسم کے کیمرے لگے ہوئے تھے جو گھپ اندھیرے میں بھی اپنا کام کرتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی ترکیب سے کیمرے کو ناکارہ کر دوں۔ بیڈ کے ساتھ کی دراز میں گول بال نما لٹو لگا ہوا تھا، یہ ایک پیچ سے منسلک تھا اور میں نے اسے گھمایا تو یہ آسانی سے کھل گیا۔ لٹو کسی وزنی دھات کا تھا اور سوائے پیچ والے سوراخ کے کسی بال کی طرح گول تھا اس کا سائز گولف بال کے برابر تھا۔ میں اسے یوں اچھال اچھال کر کیچ کرنے لگا جیسے وقت گزاری کر رہا ہوں اور یہ کھیل اس وقت تک جاری رکھا جب تک صائمہ ناشتے سمیت نہیں آ گئی۔

ناشتا خاصا بھاری اور دیسی اسٹائل کا تھا۔ یعنی دیسی گھی میں بنے پراٹھے، دیسی انڈے تلے اور ابلے ہوئے، بہت مقوی قسم کا دودھ جس میں خشک میوے پیس کر ڈالے گئے تھے، مکھن اور لسی تھی۔ میں نے صائمہ سے کہا۔ "میں یہ سب نہیں کھاتا ہوں، کیا مجھے توس مل سکتے ہیں؟"

"ڈاکٹروں والی باتیں نہ کر، یہ سب کھا کر مرد میں جان آتی ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اور وہ دوسروں کی جان لینے پر تل جاتا ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے اور ہماری زندگی کا مقصد بس یہی رہ گیا ہے کہ اپنی جان بنائیں اور دوسروں کی جان عذاب میں ڈالیں۔"

"ڈاکٹر صبر شکر کر کے کھا لے۔" اس نے دبے لہجے میں کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ گوہر شاہ تجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے وہ تو جس سے ناراض ہو جائے، اس پر زندگی بھاری کر دیتا ہے۔"

"وہ طاقتور ضرور ہے لیکن مختارِ کُل نہیں ہے۔ اس سے اوپر بھی ایک ذات ہے جس کے آگے وہ اتنا ہی بے بس ہے

جتنے کہ ہم ہیں۔ یہ اس کی نہیں اوپر والے کی مہربانی ہے۔" میں نے کہا اور بادلِ ناخواستہ ناشتے کا آغاز کیا۔

"یہ تو ہے اس کی کوئی مجبوری ہے کہ تمہیں اتنے آرام سے رکھا ہوا ہے۔"

"تمہاری اب کیا حیثیت ہے؟"

"وہی جو پہلے تھی۔" اس نے کھل کر کہا۔ "کل رات بھی گوہر شاہ کے ساتھ تھی۔"

"اسے خیال نہیں آیا کہ اس نے پہلے تمہیں اپنے کتوں کے حوالے کر دیا تھا۔"

"وہ خیال کرنے والا آدمی نہیں ہے۔" صائمہ بے دلی سے بولی۔ "مجھے لگتا ہے کچھ دن بعد میرا پھر یہی انجام ہوگا۔ پتا نہیں ابھی بھی کیوں بخش دیا۔"

"صائمہ تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ تمہاری جان شدید خطرے میں ہے اور اچانک کوئی لمحہ موت کے فرشتے کی صورت میں تمہارے سامنے آئے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "گوہر شاہ کے ظاہری رویے پر مت جاؤ۔ مجھے بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے، مجھے یقین ہے اس کے ذہن میں میرے لیے کوئی عبرتناک انجام ہے اور اسی وجہ سے میری یہ خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ شاید مجھے قربانی کا بکرا بنایا جائے اور میرے اعضا بھی فروخت کر دیے جائیں۔"

"اگر ایسا ہے تب بھی میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ بے دلی سے بولی۔ "میں نے کہا نا یہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہوتا نہیں ہے، تلاش کیا جاتا ہے یا بنایا جاتا ہے۔" میں نے اکسانے والے انداز میں کہا۔ "دیکھو مرنا تو ہے تب آدمی کوشش کر کے کیوں نہ مرے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"جو عقل ہے اسے استعمال کرو۔ اگر کسی کی مدد حاصل کر سکتی ہو تو وہ کرو۔"

"مدد۔" اس نے سوچ کر کہا۔ "ایک آدمی ہے گارڈ ہے کبھی گیٹ پر ہوتا ہے اور کبھی اندر ڈیوٹی لگتی ہے۔"

"تم میں دلچسپی لیتا ہے؟"

اُس کا چہرہ سرخ ہوا مگر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "حالانکہ جانتا ہے کہ پکڑا گیا تو بہت بُرا ہوگا مگر باز نہیں آتا۔"

عورت کے لیے تو غلام بادشاہوں سے لڑ جاتے تھے۔ گوہر شاہ کی تو حیثیت ہی نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ "آدمی کیسا ہے؟"

"جی دار ہے۔ غلام قادر نام ہے۔ پر گوہر شاہ کا وفادار بھی ہے۔ ایک بار اس نے جان پر کھیل کر اسے بچایا تھا خود دو گولیاں کھائیں مگر گوہر شاہ پر آنچ نہیں آنے دی۔ تب سے وہ اس پر بہت اعتبار کرتا ہے۔"

"کیا خیال ہے اگر تم اس کی طرف بڑھو اور اسے استعمال کرو تو کیا وہ ہماری مدد کرے گا؟"

صائمہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "ڈاکٹر تو کس خیال میں ہے تو کوٹھی کی سب سے محفوظ جگہ قید ہے، یہاں سے کوئی نہیں نکل سکتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "او کے میں نہیں نکل سکتا لیکن تم تو نکل سکتی ہو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ مجھے لگا کہ اس میں ہمت نہیں تھی اور وہ کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ڈر رہی تھی جبکہ مجھے یقین تھا کہ گوہر شاہ اسے کسی صورت معاف نہیں کرے گا۔ ابھی وہ کسی وجہ سے رکا ہوا تھا اور جیسے ہی یہ وجہ ختم ہوگی صائمہ کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ گفتگو کے دوران میں اچھا خاصا ناشتا کر گیا تھا۔ ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے میں نے لسی کا گلاس اٹھا لیا۔ یہ بہتر رہتا۔ وہ چائے نہیں لائی تھی جب برتن اٹھا کر لے جانے لگی تو چائے کا پوچھا میں نے کہا۔ "ایک گھنٹے بعد لے آنا۔"

اس کے جاتے ہی میں اٹھا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ لٹو گھمانے کی کوشش کی مگر وہ گھوم کر رہ گیا اور دروازہ نہیں کھلا جبکہ صائمہ نے میرے سامنے اسے گھما کر دروازہ کھولا تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے کھٹکا سرکا کر اسے لاک کر دیا تھا۔ یہ صائمہ کا کام تھا، تاج یا کوئی دوسرا اتنی تیزی سے یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صرف اوپر سے میری ہمدرد بن رہی تھی ورنہ وہ گوہر شاہ کے احکامات پر پوری طرح عمل کر رہی تھی۔ میں گہری سانس لے کر واپس اپنی جگہ آ گیا۔ دراز کے لٹو سے کھیل کر ٹائم پاس کرنے لگا۔ وہ ایک گھنٹے بعد چائے لے آئی تھی۔ چائے کا مگ میرے سامنے رکھ کر جانے لگی تو میں نے روکا۔ "اتنی جلدی کیا ہے، کچھ دیر بیٹھو بات کرو۔"

اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کل تو بھگا دیا تھا۔"

"وہ دوسری بات ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ مگر یہاں اکیلے میں میرا دل گھبرا رہا ہے اس لیے تمہیں روک لیا اگر کوئی مسئلہ ہے تو کوئی بات نہیں، تم چلی جاؤ۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ بستر کے کونے پر بیٹھ گئی۔ آج اس نے موسم کی مناسبت سے لان کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

یہ خاصا طریقے سلیقے والا اور سج دھج کے تھا اس لیے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے چائے کا سپ لیا اور سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"گوہر شاہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں رہتا ہے؟"

"نہیں اس کا خاندان گاؤں کی حویلی میں ہوتا ہے۔"

"یہ گاؤں کہاں ہے؟"

"ادھر پاکستان سے نیچے کہیں ہے۔" صائمہ بولی۔ "مجھے نام نہیں معلوم اور نہ میں نے کبھی گوہر شاہ کے گھر والوں کو دیکھا ہے۔ سنا ہے اس نے دو شادیاں کی ہیں اور وہ دونوں حویلی میں رہتی ہیں۔"

"ممکن ہے اِدھر لاہور میں بھی شادی کر رکھی ہو؟"

صائمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے یہاں کوئی شادی نہیں کی اور اسے ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"یعنی عقل مند آدمی ہے ورنہ گاؤں دیہات کے جاگیرداروں کا حساب ہے کہ ایک بیوی شہر میں رکھتے ہیں اور ان کے مرنے کے بعد شہر اور گاؤں والوں میں وراثت کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔"

"یہاں میں ہوں اور دوسری تیسری بہت آجاتی ہیں۔ اسی کوٹھی میں آتی ہیں۔ ایک تو بہت مشہور فلمی اداکارہ ہے۔ اب بیکار ہے تو اسی طرح گزارا کر رہی ہے۔ کچھ اسٹیج والیاں بھی آتی ہیں مجرات بھر کے لیے۔"

"گوہر شاہ پچاس کے قریب ہوگا اگر رواج کے مطابق اس کی شادی کم عمری میں ہوگئی ہوگی تو اب اس کے بچے بھی بچوں والے ہوں گے۔"

"سنا ہے چار یا پانچ بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ اکثر میرے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے مگر وہ یا بیٹے اس کوٹھی میں کبھی نہیں آئے۔"

"حیرت ہے جبکہ گوہر شاہ یقیناً بیشتر وقت یہیں ہوتا ہوگا تب اپنے گھر والوں کو کب وقت دیتا ہے؟"

"مہینے میں دو بار دو دن کے لیے حویلی جاتا ہے۔" صائمہ نے کہا۔ "اس کے علاوہ سارا وقت یہیں گزرتا ہے۔ گاؤں کی زمین پر اس کے بھائی قابض ہیں۔ اس نے زمین ان کے حوالے کر دی ہے۔"

"اسے زمین کی کمائی کی ضرورت ہی نہیں ہے اس دھندے سے اتنا کما لیا ہوگا کہ پورے گاؤں کی زمین خرید سکتا ہے۔"

صائمہ نے سر ہلایا۔ "کتنی بار اس نے میرے سامنے اپنی بڑی سی تجوری کھولی، وہ اوپر تک نوٹوں سے اور سونے کی چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ نوٹوں میں باہر کے نوٹ بھی ہیں۔ ڈالرز، پاؤنڈ اور وہ یوریا کیا کہتے ہیں اسے......"

"یورو۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہی اور بہت سارے ہیں۔"

یہ سب بلیک اور ڈرٹی منی تھی جو انسانوں کے اعضا فروخت کر کے کمائی گئی تھی۔ ہمارے ہاں بلیک منی عام طور سے تجوریوں اور بیرونِ ملک خفیہ بینک اکاؤنٹس میں رکھنے کا رواج ہے۔ مجھے یقین ہے گوہر شاہ کی جتنی دولت یہاں تھی اس سے کہیں زیادہ بیرونِ ملک ہوگی۔ اس کا بیرون ملک تک پھیلا ہوا ریکٹ اس کا واضح ثبوت تھا۔

صائمہ نے انکشاف کیا کہ وہ خرچ کرنے میں بہت کھلے ہاتھ کا آدمی تھا۔ اپنے علاقے میں انتظامیہ اور پولیس والوں کو بے دریغ نوازتا تھا۔ اپنے کارندوں اور کام کرنے والوں کو بھی نہال کر دیتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سب اس کے مرید تھے اس کے گن گاتے تھے۔ یہ آزمودہ نسخہ ہے جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا۔ اس لیے گوہر شاہ جو کماتا تھا، اس کا ایک حصہ یوں خرچ بھی کرتا تھا۔

"گوہر شاہ کے کئی بیٹے ہیں اور یقیناً جوان بھی ہوں گے تو کیا اس نے انہیں اپنے دھندے میں شامل نہیں کیا ہے؟"

"اگر وہ ہیں تب بھی مجھے علم نہیں ہے۔" صائمہ بولی۔ "کیونکہ میں نے انہیں کبھی یہاں نہیں دیکھا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ گوہر شاہ کا دھندا لاہور تک محدود نہیں تھا بلکہ اصل کام تو لاہور سے باہر ہوتا تھا۔ اکثر انسان جن کے اعضا نکالے جاتے تھے، وہ جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے لائے جاتے تھے۔ ان میں بڑی تعداد میں یقیناً افغانی بھی ہوں گے جو آسان شکار تھے کیونکہ ان کی موجودگی غیر قانونی ہوتی ہے اور گم ہونے کے بعد انہیں کوئی مشکل سے ہی تلاش کرتا ہے۔ اس وسیع نیٹ ورک کو چلانے، مال تلاش کرنے اور اس کی بہ حفاظت ترسیل کے لیے یقیناً گوہر شاہ نے اعتماد کے آدمی رکھے ہوں گے۔ اس کے خاص آدمی لازمی اس کے قریبی لوگ ہوں گے اور انسان کے سب سے نزدیک فرد جس پر وہ اعتماد کر سکے، اس کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ گوہر شاہ بیشتر وقت لاہور میں ہوتا تھا اور یہاں سے باہر ہونے والے کاموں کو دوسرے لوگ دیکھتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گوہر شاہ کے بیٹے اور دوسرے رشتے دار یہاں آتے ہوں لیکن صائمہ کو پتا نہیں چلتا ہو۔ یہ بات میں نے اس سے کہی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہاں سب ملازم میرے ہاتھ میں تھے۔ میرا مطلب کام کرنے والوں سے ہے۔ وہ مجھے ایک ایک بات کی رپورٹ دیتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے ضرور پتا چل جاتا۔''

''ممکن ہے وہ دوسری عمارت میں آتے ہوں؟''

صائمہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''ڈاکٹر تو زیادہ ہی سوچ رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو گوہر شاہ کو کس کا ڈر ہے کہ وہ چھپائے گا۔''

میں خفیف ہو گیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ گوہر شاہ نے اپنی اولاد کو اس دھندے سے بالکل الگ رکھا ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ انہیں یہاں نہیں بلاتا ہے۔''

''میری سمجھ بھی یہی آتا ہے۔'' صائمہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو باہر غلام موجود ہے اسے کہہ دینا۔''

میں چونکا۔ ''اس کی ڈیوٹی یہاں لگ گئی ہے؟''

''ہاں تو نے تاج کی ناک جو توڑ دی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے پاس ہے۔''

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ تاج کی ناک ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا خون زیادہ ہی کھولنے لگتا تھا۔ میں نے صائمہ سے کہا۔ ''رک جاؤ میں غلام کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آجاؤ مگر باہر مت آنا۔''

میں صائمہ کے ساتھ دروازے تک آیا اور میں نے اندر سے قادر کو دیکھا۔ وہ جوان عمر آدمی تھا۔ جسمانی طور پر مضبوط مگر عام سی صورت کا، کسی قدر صاف رنگ تھا اور چہرے پر چیچک کے ہلکے داغ تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ تھا اور کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تاج کے تجربے کے پیش نظر گوہر شاہ نے اسے اسلحہ نہیں دیا تھا۔ اگر تاج کی شاٹ گن میرے ہاتھ لگ جاتی تو بازی پلٹ سکتی تھی۔ کم سے کم میں آسانی سے دوبارہ قابو میں نہ آتا۔ صائمہ نے مجھے چند سیکنڈ دیے تھے اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ساتھ ہی کھٹکا کھسکا کر اسے لاک کر دیا۔ میں وہیں کھڑا رہا اور باہر کان لگائے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے مگر ان کی آواز اتنی مدھم تھی کہ مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سرد آہ بھر کر میں واپس آبیٹھا۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ دن میں روشنیاں آن ہی رہیں گی۔ صائمہ دو بار اور آئی۔ ایک بار لنچ لے کر جو میں نے کھانے سے انکار کر دیا اور پھر سات بجے کے بعد ڈنر لے کر آئی تھی۔ وقت کا پتا بھی اسی سے چلا جب اس نے بیزاری سے کہا۔

''ابھی سات بجے ہیں اور مجھے کھانا دے کر بھیج دیا۔''

''کیا اس لیے کہ میں نے دوپہر میں نہیں کھایا۔''

''پتا نہیں ڈاکٹر صاحب۔'' وہ مزید بیزاری سے بولی۔ ''کھانا کھاؤ۔''

میں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور پھر اس سے کہا۔ ''ایک گھنٹے بعد مجھے واش روم جانا ہوگا۔''

''قادر سے کہہ دینا وہ لے جائے گا۔'' اس نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔ میں اس کے رویے پر غور کر رہا تھا، وہ صرف بیزار نہیں بلکہ کچھ ڈری ہوئی بھی تھی۔ شاید گوہر شاہ کو علم ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے اس کے بارے میں بات کرتی رہی ہے اور یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا اگر وہ یہاں کیمرا لگا سکتا تھا تو مائک لگانا تو اس سے بھی آسان کام تھا۔ وہ ہماری گفتگو سن سکتا تھا اور یقین ممکن تھا کہ سن بھی لی ہو۔ میں فکر مند ہو گیا۔ صائمہ نے بہت کھل کر بات کی تھی اور خاص طور سے ڈیفنس والی کوٹھی کا بھی ذکر آیا تھا اور یہ بات گوہر شاہ کے علم میں آچکی تھی تو اس کی خیر نہیں تھی۔ مگر شاید اس کی پہلے ہی خیر نہیں تھی کیونکہ گوہر شاہ کسی کو معاف کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ صائمہ سے وہ پہلے ہی جان چھڑانے کے چکر میں تھا اسی لیے اسے کام نکلوا کر اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ صائمہ کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے پیٹنے کے انداز میں دروازہ بجایا۔

''کیا ہے؟'' کچھ دیر بعد باہر سے آواز آئی۔

''مجھے واش روم جانا ہے——'' میں نے چلا کر کہا۔ ''جلدی——''

غلام قادر نے دروازہ کھولا اور پیچھے ہو گیا۔ ''چلو آؤ۔''

تب میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں کرنٹ مارنے والا آلہ تھا۔ اگر اس آلے کا اگلا سرا کسی کے جسم سے لگا دیا جائے تو اسے شدید قسم کا برقی جھٹکا لگتا جس سے اس کے اعصاب مفلوج ہو جاتے۔ اس قسم کے آلے میں نے سیکیورٹی والوں اور پولیس کے پاس دیکھے تھے۔ میں نے اپنا پیٹ پکڑ رکھا تھا اور جھکا جھکا واش روم کی طرف گیا۔ خاصی دیر وہاں لگا کر میں اسی طرح کراہتا ہوا اور جھکا جھکا واپس آیا۔ کمرے میں جانے سے پہلے میں نے قادر سے کہا۔ ''شاید مجھے پھر جانا پڑے، میرا پیٹ گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

''دروازہ بجا دینا میں لے جاؤں گا۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ اس کی جگہ تاج ہوتا تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا یا... کم سے کم پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیتا۔ میرے اندر

جاتے ہی اس نے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور لائٹ بند ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد لائٹس آف ہو گئیں اور نائٹ بلب آن ہو گیا۔ میں جلدی سے بیڈ سے اٹھا اور ٹیبل لیمپ لے کر دروازے کے پاس آیا۔ میں نے قالین کے نیچے سے تار نکالا اور پھر جہاں یہ تار لیمپ کے اندر جا رہے تھے وہاں سے انہیں کھینچ لیا۔ چرچراہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نائٹ بلب اور اے سی بند ہو گیا کیونکہ لیمپ کے دونوں تار ٹوٹنے کے دوران آپس میں ملے اور شارٹ سرکٹ کی وجہ سے سرکٹ بریکر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے ٹٹول کر دونوں تار الگ کیے اور انتظار کرنے لگا کہ کب بریکر اٹھایا جاتا ہے اور لائٹ آتی ہے۔ لائٹ چند منٹ بعد آئی۔ میں نے دونوں تار الگ الگ پکڑ رکھے تھے۔ انہیں احتیاط سے لے کر دروازے کی طرف بڑھا اور باری باری دونوں تاروں سے دروازے کے ہینڈل کو چھو کر دیکھا۔ جس سے چرچراہٹ ہوئی، وہ فیز تھا اور دوسرا نیوٹرل تھا۔ میں نے نیوٹرل والا تار چھوڑ دیا اور فیز والا پکڑے رکھا۔ پھر میں نے دروازے پر دستک دی۔ قادر نے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"واش روم جانا ہے۔" میں نے آواز میں کرب شامل کرتے ہوئے کہا۔ میری نظر دروازے کے لٹو پر تھی جیسے ہی وہ گھوما اور دروازہ ذرا سا کھلا میں نے ننگا تار لٹو پر لگاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا پٹ تھام لیا ورنہ وہ جھٹکے سے بند بھی ہو سکتا تھا۔ باہر سے ایک بھنچی ہوئی چیخ سنائی دی اور دروازے کو جھٹکا لگا اگر میں نے اسے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ بند ہو جاتا اور پھر میں اسے اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ اسے بند ہونے سے روکنے کے لیے مجھے اپنے ناخن کنارے پر گڑانے پڑے تھے۔ پہلے جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے پر دروازہ اندر آیا اور میں قادر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا کیونکہ وہ بھی آگے آیا تھا، اس نے لٹو اور کرنٹ نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ وہ جھٹکے لے رہا تھا اور اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے پٹ تھام لیا اور چند لمحے بعد تار الگ کر دیا۔ کیونکہ اب خطرہ تھا کہ وہ مجھ سے ٹکرائے گا اور کرنٹ مجھے بھی گرفت میں لے لے گا۔

کرنٹ ختم ہوتے ہی وہ ایک جھٹکے سے پیچھے جا گرا اور اسی جگہ پڑے پڑے لرزنے لگا۔ میں نے تار احتیاط سے نیچے رکھی اور اس کی طرف بڑھا۔ کرنٹ مشکل سے آدھے منٹ جاری رہا تھا مگر اس نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور منہ سے جھاگ سا نکل رہا تھا۔ میں نے فکرمند ہو کر اس کی نبض دیکھی تو وہ بھی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میں نے اُسے سیدھا لٹایا اور اس کی تلاشی لی۔ مجھے امید تھی کہ اس کے پاس سے کوئی ہتھیار بھی نکل آئے گا مگر اس کے پاس صرف وہی کرنٹ مارنے والا آلہ تھا۔ البتہ کام کی چیز ایک موبائل تھا جو اس کی جیب سے نکلا۔ میں نے جلدی سے طارق کا نمبر ملایا کیونکہ اس کا نمبر مجھے یاد ہو گیا تھا۔ مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ دوسری بار بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی تو میں نے اسے دل ہی دل میں سناتے ہوئے اسے ایس ایم ایس کیا۔

"تم یقیناً خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہو اور میں گوہر شاہ کی قید میں ہوں۔ اسی اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں جہاں پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ جلدی کرو اس سے پہلے کہ میرے اعضا بھی بک جائیں۔"

میں نے ایس ایم ایس کر کے اسے سینٹ آئٹم سے اڑا دیا اور پھر ڈائل نمبر سے طارق کا نمبر بھی ڈیلیٹ کر دیا۔ دوسری کال میں نے حمیرا کو کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"حمیرا میں ہوں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"سیف آپ۔" اس نے چیخ ماری۔ "کہاں ہیں آپ؟"

"گوہر شاہ کی قید میں۔" میں نے کہا۔ "اس جگہ کا پتا نوٹ کر لو اور فوری شاداب کو کال کرو یا امجد صاحب سے بولو کہ ان کا جو جاننے والا پولیس افسر ہے، اس سے کونٹیکٹ کریں اور کسی صورت یہ بات لیک نہ کریں ورنہ میں یہاں سے غائب کر دیا جاؤں گا۔"

"میں سمجھ گئی آپ پتا بتائیں۔" حمیرا نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور کوئی سوال کرنے کے بجائے پتا نوٹ کرنے لگی۔ میں اسے پتا بتا رہا تھا کہ مجھے لگا کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ کسی کی آواز آئی تھی۔

"کوئی آ رہا ہے اللہ حافظ۔" میں نے کال کاٹ کر حمیرا کا نمبر بھی ڈیلیٹ کیا اور پھرتی سے موبائل اور کرنٹ مارنے والا آلہ قادر کے لباس میں رکھ کر کمرے کی طرف لپکا۔ اندر گھس کر میں نے دروازہ بند نہیں کیا صرف باریک سی درز رکھی تھی۔ اسی لمحے سامنے والی طرف سے درمیانی دروازہ کھلا اور اس سے زخمی تاج اور ایک مسلح شخص باہر آئے۔ میں نے بے آواز طریقے سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد پھرتی سے لیمپ کا تار قالین کے نیچے ڈال کر میں نے لیمپ اپنی جگہ رکھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور تاج نے اندر جھانکا۔ اس نے کہا۔

"یہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔"

''تب اسے کیا ہوا؟'' دوسرا بولا۔ میں سوتا بنا رہا تھا۔ تاج اندر آیا اور کچھ دیر کھڑا رہا پھر واپس چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر وہ لائٹس آن کر کے کمرے کا معائنہ کرتا تو شاید اسے لیمپ کا گم شدہ تار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر خطرہ تو اب بھی تھا۔ جیسے ہی قادر کی حالت ٹھیک ہوتی، وہ بھانڈا پھوڑ دیتا کہ اس کے ساتھ اصل میں کیا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے چیک کیا تو اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور میں امید کر سکتا تھا کہ اس کی حالت شاید مزید دو تین گھنٹے ایسی ہی رہے تو امید تھی کہ باہر سے مدد آجائے اور میں اس قید خانے سے نجات حاصل کر لوں گا۔ طارق سو رہا تھا اور شاید صبح ہی میرا ایس ایم ایس دیکھتا البتہ تیسرا فوری حرکت میں آتی۔ شاداب اور امجد صاحب کوشش کرتے تو پولیس بالآخر یہاں کا رخ کر ہی لیتی اور میں آزاد ہو جاتا۔ میں اپنی حد تک کوشش کر چکا تھا اور اب تن بہ تقدیر تھا۔

ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ کہیں میں نے موقع گنوا تو نہیں دیا ہے۔ مجھے واپس کمرے میں آنے کے بجائے کوشش کرنی چاہیے تھی کہ تاج اور اس کے ساتھی پر قابو پالیتا اور پھر باہر نکلتا۔ مگر یہ خیال احمقانہ تھا۔ میں لڑنے کا ماہر نہیں ہوں اور نہ ہی اسلحے کے استعمال کا ماہر ہوں اس لیے میرے لیے تربیت یافتہ افراد کا مقابلہ کر کے باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں نے غور کیا تو بہت موہوم سا چانس تھا۔ باہر کم سے کم چھ سات مسلح افراد تھے اور ان کے علاوہ بھی مسلح افراد کی موجودگی کا پورا امکان تھا۔ ان کی سربراہی کے لیے گوہر شاہ موجود تھا۔ پھر کتے بھی تھے جو بہ قول صائمہ کے ہر اجنبی پر جھپٹ پڑتے تھے اور یہ صرف بھونکنے والے نہیں بلکہ پھاڑ کھانے والے کتے تھے۔ اس صورت میں یہی قدم بہتر تھا جو میں نے اٹھایا تھا۔ اب مجھے انتظار کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اٹھ کر باہر کی سن گن لی اور پھر احتیاط سے لیمپ کی تار اس طرح لا کر لیمپ کے نیچے دبائی کہ بہ ظاہر وہ اس سے منسلک ہی لگ رہی تھی۔ میں نے احتیاط رکھی کہ تاریں آپس میں نہ ملنے پائیں ورنہ پھر سرکٹ بریکر ہوتا اور وہ لوگ چونک بھی سکتے تھے۔ اب بہ ظاہر سب ٹھیک تھا جب تک غلام قادر بھانڈا نہ پھوڑتا یا پھر کوئی آکر لیمپ اٹھا کر نہ دیکھتا۔

یہ کام نمٹا کر میں لیٹا تھا کہ دروازہ کھلا اور ساتھ ہی کمرا روشن ہو گیا۔ میں دوسری طرف کروٹ لیے لیٹا تھا اور اب ساکت لیٹا رہتا تو یہ اوور ایکٹنگ ہو جاتی اس لیے میں غنودہ انداز میں اٹھا اور اندر آنے والے تاج اور گوہر شاہ کو دیکھا۔ وہ متجسس نظروں سے کمرے کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو میرا دل ڈوب گیا کہ قادر کو ہوش آگیا تھا اور اس نے بتا دیا تھا کہ اسے کرنٹ کیسے لگا۔ میں نے گوہر شاہ سے پوچھا۔ ''اس طرح آمد کی وجہ؟''

''تو نے قادرے کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' تاج غرایا۔

''گوہر شاہ اسے پٹا ڈال کر رکھو، مالک کی موجودگی میں کتا بھونکے تو اچھا نہیں لگتا ہے۔'' میں نے کہا تو تاج غرا کر آگے آیا۔ اس کی ناک پر بینڈ ایج تھی اور آنکھوں میں میرے لیے خون اترا ہوا تھا اگر گوہر شاہ نہ ہوتا تو وہ شاید مجھے شوٹ کر دیتا۔ گوہر شاہ نے ہاتھ اٹھایا تو وہ رک گیا۔

''ڈاکٹر سیف۔'' گوہر شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''باہر تمہاری نگرانی کرنے والا گارڈ دروازے کے سامنے بے ہوش پایا گیا ہے۔''

''مجھے باہر سے کچھ آوازیں آئی تو تھیں۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔ ''جیسے کوئی تکلیف میں ہو لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کوئی گارڈ بے ہوش ہوا ہے۔''

''ڈاکٹر کے مطابق اُسے شدید کرنٹ لگا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''اس کے پاس کرنٹ مارنے والا آلہ ہے کہیں اس نے وہی تو خود کو نہیں لگا لیا۔''

''خود کو کیسے لگا سکتا ہے؟'' تاج نے مداخلت کی۔

''کیا کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''اناڑیوں کے ہاتھ میں ہتھیار دو تو وہ بعض اوقات خودکشی کر لیتے ہیں۔ ویسے اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ اسے کس نے کرنٹ لگایا ہے۔''

''وہ بے ہوش ہے۔'' گوہر شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن جلد اسے ہوش آجائے گا اور وہ حقیقت بتا دے گا۔''

''تمہارے انداز سے لگ رہا ہے کہ تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں یہاں بند حالت میں کمرے سے باہر کسی آدمی کے خلاف کیا کر سکتا ہوں اور دوسرے مجھے اس سے کیا فائدہ ہوا میں تو یہاں سوتا رہ گیا اگر میں نے کچھ کیا ہوتا تو فرار کی کوشش تو کرتا۔''

''تجھے موقع نہیں ملا۔'' تاج نے کہا۔ ''میں جو آگیا تھا۔''

''مجھے تو موقع ملا تھا تمہارے ہوتے ہوئے اور تمہاری قسمت کہ گوہر شاہ آگیا۔'' میں نے اسے یاد دلایا تو اس کا چہرہ بگڑ گیا اور گوہر شاہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''بہت شوق ہے بولنے کا، اب دفع ہو جا یہاں سے۔''

بے عزتی کے ساتھ تاج وہاں سے چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد گوہر شاہ نے مجھ سے کہا۔ ''سیف اگر ثابت ہو

گیا کہ باہر جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا ہاتھ تھا تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"میں پہلے ہی کون سا آسانی میں ہوں۔ یہ پُرآسائش کمرا اور تمہارا رویہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا ہے۔ میں ذہنی طور پر بدترین انجام کے لیے تیار ہوں۔"

گوہر شاہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ان لوگوں کا خیال لیمپ کی طرف نہیں گیا کیونکہ اس کمرے میں یہ بجلی کی واحد چیز تھی جسے میں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا تھا۔ مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ قادر کسی وقت ہوش میں آسکتا تھا اور میرا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اس واقعے کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اگر شاداب یا امجد صاحب کوشش کرتے تو ایک گھنٹے میں یہاں پولیس آسکتی تھی۔ گویا آدھا گھنٹا مزید باقی تھا جو ہونا تھا اسی دوران میں ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر قادر جلد ہوش میں آ گیا اور وہ لوگ ہوشیار ہو گئے خاص طور سے اس صورت میں کہ ان کا ذہن موبائل کے استعمال کی طرف نہ چلا جائے تو مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کیا جا سکتا تھا یا پھر سرے سے میرا قصہ ختم کیا جا سکتا تھا۔ گوہر شاہ کے جانے کے چند منٹ بعد روشنیاں گل ہو گئیں اور نائٹ بلب جل اٹھا تھا۔ گویا انہیں میری طرف سے ایسا خدشہ نہیں تھا کہ روشنیاں کر کے میری نگرانی کرتے۔

بھانڈا پھوٹنے کی صورت میں مجھے اپنا دفاع خود کرنا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ سوائے بجلی کی تار کے۔ لیکن پھر مجھے ایک خیال آیا میں نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ چیک کیا۔ دیکھنے میں یہ خاصا مضبوط لگ رہا تھا۔ مگر اسے توڑا جا سکتا تھا۔ ایک مسئلہ آواز کا بھی ہوتا۔ اگر میں شیشہ توڑتا تو لازمی باہر تک آواز جاتی تو گوہر شاہ کے گُرگے فوراً تفتیش حال کے لیے آ جاتے۔ اس لیے فی الحال مجھے صبر سے کام لینا تھا اور یہ کام اس وقت کرنا تھا جب صورتِ حال خراب ہو جائے۔ مگر وہ اچانک آ جاتے تو پھر میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ میں اپنے دفاع کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

ایک تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ میں الماری کھسکا کر دروازے کے آگے کر دیتا۔ یہ بہت بھاری الماری تھی اور دروازے کے آگے آ جاتی تو وہ اتنی آسانی سے نہیں کھل سکتا تھا۔ میں نے دروازے کی مخالف سمت الماری کے کونے اور دیوار کے درمیان خلا میں گھس کر الماری کو دھکیلنے کی کوشش کی۔ بہت زور لگانے پر الماری ذرا سی سرکی تھی کیونکہ یہ قالین پر تھی اور قالین پر اسے دھکیلنا اور مسئلہ تھا۔ میں زور لگاتا رہا اور الماری ملی میٹر کے حساب سے سرکتی رہی۔ خاصی دیر بعد جا کر وہ کوئی فٹ بھر سرکی تھی اور اب دروازے سے بس ذرا فاصلے پر تھی۔ الماری سرکنے سے قالین کھسک گیا تھا اور اس پر درمیان سے لائن آ گئی تھی۔ مگر وہ اس پوزیشن میں آ گئی تھی کہ میں پیروں سے زور لگاتا تو وہ آسانی سے دروازے کے سامنے آ جاتی۔

اس محنت نے مجھے اے سی میں بھی پسینے پسینے کر دیا تھا۔ میں نے اپنا سانس درست کیا اور لیٹ گیا۔ ایک گھنٹا گزر گیا تھا اور ابھی تک باہر سے کوئی ہلچل سنائی نہیں دی تھی مگر میں نے خود کو تیار کر لیا۔ لیمپ کے نیچے سے تار نکال کر میں دروازے کے پاس آ گیا۔ میرے کان باہر کی آواز پر مرکوز تھے۔ وقت جیسے سست روی سے گزر رہا تھا۔ میں نے دروازے سے ٹیک لگائی تھی۔ مجھے حمیرا کا خیال آیا کہ وہ کیا کر رہی ہوگی؟ اس نے یقیناً امجد صاحب کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا اور شاداب کا بھی دماغ کھایا ہوگا۔ وہ اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا ہوگا اور شاید میرے لیے عملی مدد آنے والی تھی۔ مگر مدد نہیں آئی اور دشمن آ گئے۔ مجھے تاج کے چلانے کی آواز آئی۔

"یہی...... ہے میں پہلے ہی کہہ رہا تھا اس کی تو......"

درمیان میں وہ گالیاں فٹ کر رہا تھا اور ظاہر ہے اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں نے عجلت میں لیمپ کے دونوں تار ملائے اور لائٹ چلی گئی۔ اب باہر لائٹ پر رونا پیٹنا مچ گیا اور میں تیزی سے الماری کے سرے تک آیا اور اپنا جسم الماری اور دیوار کے درمیان لگا کر دونوں پیروں سے الماری کو آگے دھکیلا۔ توقع کے برعکس یہ خاصا مشکل کام ثابت ہوا تھا۔ الماری بہ مشکل سرک رہی تھی۔ میں نے سانس روکی اور پوری قوت پیروں میں منتقل کر کے الماری کو دھکیلا تو وہ بالآخر دروازے کے سامنے ہو گئی اور اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ کھولا تو وہ الماری سے لگ کر رک گیا۔ باہر سے کوئی چلایا۔ "اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے۔"

میں نے اور زور لگایا تو الماری آگے سرکی اور اب وہ کوئی فٹ بھر دروازے کے آگے آ گئی تھی اسے ہٹائے بغیر دروازہ کھولنا ممکن نہیں رہا تھا۔ یہ کام کر کے میں آگے آیا۔ لٹو اب گھوم نہیں رہا تھا۔ باہر سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ کسی نے کہا۔ "گولی سے لاک توڑ دے۔"

"لاک نہیں، آگے کچھ ہے جس کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل رہا۔" تاج بولا۔ ابھی تک لائٹ نہیں آئی تھی اور اچانک ہی لائٹ آئی تو کمرا روشن ہو گیا۔ میں نے ڈریسنگ کے اوپر لگا

کیوپڈ کا مجسمہ کھینچ کر نیچے پھینکا تو اس کے ساتھ لگا تار بھی کھنچا چلا آیا تھا، اسے توڑ دیا پھر ڈریسنگ کی ایک دراز نکال کر اسے شیشے پر مارا اور وہ ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ میں نے تکیے کا غلاف اتار کر اسے ایک لمبے اور دھار والے ٹکڑے پر لپیٹ کر اسے خنجر کی شکل دے..... دی۔ اب میں بالکل ہی نہتا نہیں تھا۔ بجلی بحال ہوتے ہی باہر سے ایک بار پھر دروازے پر زور آزمائی ہونے لگی۔ میں دروازے تک آیا اور نیچے بیٹھ کر بجلی کا تار لٹو سے لگا دیا۔ باہر سے کسی نے آواز نکالی۔

''ہاہا..... ماں جی۔''

''اس وقت ماں کو یاد کر رہا ہے۔'' کوئی دوسرا ہنسا۔

''اس میں کرنٹ آرہا ہے۔'' ماں کو یاد کرنے والے نے فریاد کی۔

''پیچھے ہٹ جاؤ اس..... نے کرنٹ لگایا ہوا ہے۔'' تاج نے ایک بار پھر مجھے للکارا۔ مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ لٹو شاید تاج پکڑے گا۔ ہنسنے والے نے پوچھا۔

''اب دروازہ کیسے کھلے گا؟''

''دانت مت نکال۔'' تاج مشتعل ہو گیا۔ ''باہر تیری ماں کے یار آئے ہیں اس سے پہلے وہ یہاں آئیں اسے نکالنا ہے۔''

تاج کی بات نے میری امیدوں کا نخل سرسبز کر دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری کال رنگ لائی تھی اور یہاں پولیس آگئی تھی۔ یقیناً شاداب اور امجد صاحب نے بہت اوپر سے جیک لگایا ہوگا ورنہ عام پولیس والے تو یہاں پھٹک بھی نہیں سکتے تھے اور مقامی تھانے والے تو اس کے وظیفہ خوار تھے۔

کمرے میں پانی کی ایک ڈیڑھ لیٹر والی بوتل تھی اور اس میں تقریباً لیٹر پانی تھا۔ میں نے وہ دروازے کے پاس لا کر اسے یوں بہایا کہ وہ دروازے سے باہر جانے لگا۔ بوتل خالی ہونے پر میں نے بجلی کا تار گیلی جگہ سے لگا دیا اور اس بار باہر سے کئی افراد کے چلانے کی آواز آئی تھی۔ وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگے تھے۔ تاج دھاڑ رہا تھا۔ ''اندھے ہو..... پانی نظر نہیں آرہا تھا۔''

''ہم تو بس دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' ایک کرنٹ گزیدہ نے فریاد کی۔ ''پانی کی طرف دھیان کہاں سے دیتے۔''

''اب دروازے کے پاس بھی نہیں جا سکتے ہیں۔'' دوسرا بولا۔

''یہاں کی لائٹ بند کرواؤ۔'' تاج چلایا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا اور ہر ایک کو نواز رہا تھا۔ ایک منٹ میں روشنیاں بند ہو گئیں۔ ظاہر ہے بجلی کا تار بھی ناکارہ ہو گیا۔ اب باہر سے دروازے پر زور آزمائی شروع ہوئی اور میں نے اندر سے جوابی زور لگانا شروع کر دیا۔ باہر زور لگانے والے دو تھے اور میں اکیلا تھا مگر میرے ساتھ الماری کا وزن اور قالین کی رگڑ بھی شامل تھی اس لیے الماری سرک نہیں رہی تھی۔ مگر اسے زیادہ دیر روکا بھی نہیں جا سکتا تھا اگر زور آزمانے والے زیادہ ہو جاتے یا طاقتور آدمی آجاتے تو وہ کوشش کر کے الماری کو سرکا ہی دیتے اور اندر گھس آتے پھر ایسا ہی ہوا۔ تاج نے مزید آدمی بلوا لیے۔ اب زور لگانے والے زیادہ تھے اور الماری نے دھیمی رفتار سے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ میرے لیے ممکن ہوتا تو میں اسے دروازے کے سامنے گرا دیتا مگر اس کے لیے لازمی تھا کہ میں اسے گرانے کے لیے دور لے جاتا اور یہ ممکن نہیں تھا۔

میں نے اپنا سارا زور لگا دیا، اس کے باوجود الماری کو سرکنے سے نہیں روک سکا۔ باہر والے صرف زور نہیں لگا رہے تھے بلکہ رہ رہ کر دھکے بھی دے رہے تھے اور ان کے اجتماعی دھکوں سے ہی الماری سرک رہی تھی۔ عقب سے تاج کی گالیاں ان کے لیے چابک کا کام کر رہی تھیں۔ گالیاں کھا کر وہ اپنا غصہ زور کی صورت میں نکال رہے تھے۔ رفتہ رفتہ الماری کئی انچ پیچھے آگئی اور وہ جتنا پیچھے آرہی تھی باہر والوں کے لیے اسے دھکیلنے کا کام اتنا ہی آسان ہوتا جا رہا تھا۔ میرے لیے دباؤ برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا اب وہ الماری گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر وہ گرتی تو مجھ پر گرتی اور اس کا وزن میری ہڈی پسلی برابر کر دیتا اس لیے میں اب کنارے پر تھا کہ الماری گرے تو میں اس کے نیچے نہ آؤں۔ باہر والوں نے محسوس کر لیا کہ اب دروازہ کھلنے کے قریب ہے اس لیے ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہو گیا تھا۔

دروازہ اتنا تو کھل گیا تھا کہ ایک آدمی پھنس پھنسا کر اندر آجائے مگر وہ الماری کے پیچھے تھا اس لیے وہ الماری ہٹانے کے چکر میں تھے۔ بالآخر انہوں نے ایک آخری دھکا دیا اور الماری گرنے لگی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اور جب محسوس ہوا کہ میں نہیں روک سکتا تو میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور جھپٹ کر بستر پر رکھا خود ساختہ خنجر اٹھا لیا۔ الماری گرتے ہی تاج سمیت تین افراد اندر گھس آئے تھے۔ سب سے آگے آنے والے نے مجھے قابو کرنا چاہا مگر میں نے شیشے کا خنجر چلایا اور وہ ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ دھار نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ یہاں کی لائٹ بند تھی مگر راہداری میں دیوار پر لگی ایمرجنسی لائٹ آن تھی اور اس کی روشنی اندر آرہی تھی۔ تاج

نے مجھے للکارا۔
''ہتھیار پھینک دو۔''
''ضرور۔'' میں نے آگے بڑھ کر پھر ہاتھ چلایا مگر اس بار وہ ہوشیار تھے، بچ گئے اور پھر تاج نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو مجھے اس میں پستول نما چیز نظر آئی۔ وہ مجھے شوٹ کرنے جا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں جھکا لیکن پستول سے نکلنے والی چیز میرے سینے پر آ لگی اور چپک گئی۔ مجھے کرنٹ کا شدید جھٹکا لگا اور میں لرزتے ہوئے نیچے گر گیا۔ یہ کرنٹ والا پستول تھا اس کا پھینکا جانے والا حصہ آدمی سے چپک جاتا تھا اور جب تک پستول کا ٹریگر دبا رہتا آدمی کو کرنٹ لگتا رہتا تھا۔ تاج نے ٹریگر دبایا ہوا تھا اور اس کا بس چلتا تو شاید اس وقت تک دبا کر رکھتا جب تک پستول کی بیٹری خالی نہ ہو جاتی مگر ان لوگوں کے پاس وقت نہیں تھا اس نے بادلِ ناخواستہ کرنٹ روک کر تار کھینچا اور اپنے آدمیوں سے کہا۔
''اِسے اٹھا کر لے چلو...... جلدی۔''
''میرا ہاتھ زخمی ہے۔'' مضروب نے فریاد کی۔
''معمولی سا کٹ ہے تو مر نہیں جائے گا۔'' تاج نے اسے پھٹکارا تو مجبوراً اس نے دوسرے کے ساتھ مل کر مجھے اٹھایا۔ کرنٹ نے میرا جسم سن کر دیا تھا اور میں اب حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا مگر میرے حواس بحال تھے، میں سن اور دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اٹھا کر باہر لائے۔ میرے ہاتھوں زخمی ہونے والا مجھے دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا مگر میں اس کی بک بک پر توجہ دینے کے بجائے اس پر فکر مند تھا کہ مجھے کہاں منتقل کیا جا رہا تھا اور میری تلاش میں آنے والے اب تک کہاں تھے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کسی غریب لاوارث شخص کا مکان نہیں تھا جہاں پولیس دندناتی ہوئی ہر جگہ پہنچ جاتی۔ اسے تو اندر آنے کے لیے بھی گوہر شاہ کی اجازت درکار ہو گی۔ وارنٹ کا بندوبست تو مشکل تھا مگر پولیس اور اعلیٰ حکام کوشش کرتے تو گوہر شاہ کو مجھے ان کے حوالے کرنا ہی پڑتا۔ اب میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ اس سے پہلے مجھے غائب کیا جائے، پولیس آ جائے۔

مجھے اسی دروازے سے لے جایا گیا جو آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دوسری طرف کمرا نہیں بلکہ ہال تھا۔ یہاں روشنی تھی کیونکہ یہاں کا سرکٹ بریکر الگ تھا۔ ابھی وہ ہال وے کے وسط میں تھے کہ سامنے سے دروازہ کھلا اور مسلح پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ پولیس نے ان لوگوں کو للکارا۔ ''خبردار سب ہتھیار پھینک دیں۔''
ہتھیار کے بجائے مجھے اٹھانے والے بدبختوں نے مجھے ہی پھینک دیا اور میں دھڑام سے قالین پر گرا۔ تاج کے پاس کرنٹ مارنے والا آلہ تھا، اس نے وہ نیچے ڈال دیا اور سکون سے بولا۔ ''یہ چور ہے کوٹھی میں گھسا تھا۔ ہم نے پکڑ لیا اور اب آپ کے پاس لا رہے تھے۔''
اندر آنے والے پولیس والوں کی قیادت ایک انسپکٹر کر رہا تھا۔ اس نے پستول اور باقی افراد نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک ڈی ایس پی اور گوہر شاہ تھے۔ گوہر شاہ کہہ رہا تھا۔ ''میں کسی ڈاکٹر سیف کو نہیں جانتا، ابھی کچھ دیر پہلے یہ آدمی کوٹھی میں گھسا اور میرے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اسے قابو کرنے کے لیے انہوں نے ٹیزر گن استعمال کی تھی۔ یہ ٹھیک ہے مرے گا نہیں۔''
ڈی ایس پی میرے پاس آیا۔ وہ ادھیڑ عمر اور صورت سے خرانٹ نظر آنے والا پولیس مین تھا۔ وہ اس عہدے تک بڑے دھکے اور رگڑے کھا کر پہنچا تھا اور اب عہدے کو جس طرح کیش کرا رہا، تھا اس کا پتا اس کی توند کے گنبد سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔ اس نے جھک کر مجھے دیکھا اور ناگواری سے بولا۔
''شاہ جی یہی ڈاکٹر سیف ہے، آپ کہہ رہے ہیں یہ چور ہے۔''
''بالکل چور ہے۔ میں تو اس کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤں گا۔''
''شاہ جی ذرا اِدھر آ کر میری بات سنیں۔'' ڈی ایس پی بولا اور گوہر شاہ کو ذرا دور لے گیا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ میرے حوالے سے مک مکا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جس طرح سے گوہر شاہ سے بات کر رہا تھا، صاف ظاہر تھا کہ ان میں پرانی شناسائی تھی اور یہ شناسائی یقیناً گوہر شاہ کے دھندوں سے متعلق تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا، گوہر شاہ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ آخر میں اس نے بادلِ ناخواستہ سر ہلایا اور اپنے آدمیوں کو کچھ اشارہ کیا۔ تاج سمیت باقی دو فوراً غائب ہو گئے تھے۔ ڈی ایس پی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں ڈالو۔''
دو پولیس والے میری طرف آئے۔ اب میں کسی قدر حرکت کر سکتا تھا اور گردن گھما رہا تھا۔ انہوں نے مجھے پیروں اور اوپر سے پکڑا اور کسی قالین کی طرح اٹھا کر لے جانے لگے۔ کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم باہر آئے اور انہوں نے مجھے ایک پولیس ہیلکس کے عقبی حصے میں ڈالا۔ اس کے ساتھ ایک خستہ حال پک اپ موبائل بھی تھی اور اس میں بھی کوئی نصف درجن مسلح پولیس والے موجود تھے۔ میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اگر شاداب یا کوئی جانا پہچانا آدمی آتا

تو مجھے اطمینان ہوتا مگر شاداب اس قابل نہیں تھا اور امجد صاحب براہ راست اس معاملے میں ملوث نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر یہ پولیس پارٹی واپس جا کر رپورٹ کرتی کہ میں نہیں ملا تو ان کا کیا بگاڑ لیا جاتا۔ کچھ دیر بعد ڈی ایس پی آیا اور ہیلکس میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر عقبی دروازہ کھلا جہاں میں پڑا ہوا تھا اندر روشنی ہوئی تو مجھے گوہر شاہ کی صورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ بگڑ کر کسی گندے جانور سے مشابہ ہو گیا تھا۔ اس نے دھیمی مگر غراتی آواز میں کہا۔

"یہ مت سمجھنا کہ بچ گئے ہو، جلد ہماری پھر ملاقات ہو گی۔"

"ضرور۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "لیکن ہو سکتا ہے حالات مختلف ہوں۔"

"تمہارے لیے حالات اس سے بدتر ہوں گے اور وہ تمہاری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔"

"اس کا علم صرف اللہ کو ہے کہ کب کس کے آخری لمحات کہاں ہوں گے۔"

وہ کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا اور پھر اس نے پوری قوت سے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ڈی ایس پی نے ڈرائیور سے کہا۔ "چلو۔"

اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور موبائل پیچھے آئی تھی۔ چند لمحے بعد دونوں گاڑیاں گوہر شاہ کی وسیع و عریض کوٹھی سے نکل رہی تھیں۔ شاک کا اثر کم ہو رہا تھا اور میں نے خود کو سنبھال کر سیدھا کیا۔ میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا مگر وہ لاتعلقی سے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ میں نے ڈی ایس پی سے پوچھا۔ "تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"اوپر سے حکم آیا جی کہ آپ اس کوٹھی میں ہیں آپ کو لایا جائے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ہم تو حکم کے بندے ہیں، حکم کی تعمیل کر دی۔"

"مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"آپ دیکھ لو گے جی۔" اس نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"تمہاری اور گوہر شاہ کی باتوں سے ایسا لگا جیسے تم ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

"اچھی طرح جی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "شاہ جی کو ہم سے زیادہ کون جانے گا۔"

میں نے باہر دیکھا تو گاڑی کا رخ ماڈل ٹاؤن کی طرف تھا۔ موبائل کی بیل بجی۔ ڈی ایس پی نے جیب سے جدید ترین آئی فون نکالا اور کال ریسیو کی۔ "یس سر...... جی میں لے آیا ہوں، میرے ساتھ ہیں...... ایک منٹ۔" اس نے کہہ کر فون میری طرف بڑھا دیا۔ "ایس ایس پی صاحب ہیں۔"

میں نے موبائل لیا۔ "ہیلو۔"

"سیف کیسے ہو تم؟" شاداب کی آواز آئی۔ "ان لوگوں نے مسئلہ تو نہیں کیا؟"

"نہیں یار آرام سے رکھا مجھے اور کسی قدر مشکل سے تمہارے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ باقی میں ملاقات پر بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے یہ تمہیں امجد صاحب کے پاس لے جا رہے ہیں۔"

"تم کب گھر شفٹ ہو گے؟"

"کل ڈاکٹر دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔" اس نے کہا۔ "اب میں ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے تب میں گھر آؤں گا۔"

"میں نے اسپیشل یونٹ کے دو آدمی امجد صاحب کی کوٹھی پر بھیج دیے ہیں۔ وہ گارڈ کریں گے اور تم کو کہیں جانا ہو تو اُن کے ساتھ جاؤ گے۔"

شاداب سے بات کر کے میں نے موبائل واپس ڈی ایس پی کو دیا اس وقت میرا رُواں رُواں اپنے مالک کا شکریہ ادا کر رہا تھا جس نے مجھ جیسے بے نوا انسان کو ایسے دوست اور مددگار عنایت کیے جنہوں نے مجھے گوہر شاہ کے چنگل سے نکال لیا ورنہ اس کے پاس مجھے اپنی زندگی کے چانس بہت کم نظر آ رہے تھے۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا کیونکہ گوہر شاہ نے دھمکی دے کر کھلی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ امجد صاحب کی کوٹھی پہنچنے تک میری حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی اور گاڑی پورچ میں رکی تو میں خود نیچے اتر آیا۔ اندر سے حمیرا بھاگتی ہوئی نمودار ہوئی اور اس نے دوسروں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر میرا بازو پکڑ لیا تھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟ ان لوگوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی۔"

"نہیں۔" میں پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "مگر دشمن کی قید بذاتِ خود تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔"

امجد صاحب بھی باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر خیر خیریت دریافت کی اور پھر ڈی ایس پی کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ میں نے اسی لمحے محسوس کر لیا کہ ان کے انداز میں کچھ رکھائی اور سرد مہری تھی۔ حمیرا کی ساری توجہ مجھ پر تھی اس لیے وہ محسوس نہ کر سکی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "آیئے اندر چلیں، آپ نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

"میں نے ڈٹ کر ڈنر کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت ایک کپ چائے کا موڈ ہے اور ہاں اگر کوئی پین کلر ہے تو وہ دے دو۔"

"پین کلر؟" اس نے تشویش سے کہا۔ "آپ کو چوٹ آئی ہے؟"

"نہیں کم بختوں نے بے بس کرنے کے لیے شاک دیا تھا اس کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔ وہ مجھے کچن میں لے آئی اور میں وہیں چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر ٹک گیا۔

"میں نے منت مانگی کہ آپ واپس آئے تو میں نفل پڑھوں گی۔" اس نے چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ سوچ نہیں سکتے کہ آپ کے غائب ہونے کے بعد میری کیا حالت ہوئی۔ یہ آپ کو کیسے لے گئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں کیسے ان کے چنگل میں پھنسا۔ سرفراز کی موت کا سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ "آج ہی اخبار میں گجومتہ سے ملنے والی لاش کا ذکر ہے مگر میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ سرفراز کی ہوگی۔"

"اس کی موت بھی بہت بھیانک تھی۔ وہ واپسی کے فوراً بعد اُن کے ہتھے چڑھ گیا اور مارا گیا۔ اس کا سینہ چاک کر دیا تھا۔"

"اللہ اس کی مغفرت کرے۔ وہ کیسا ہی آدمی سہی لیکن اس نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی امانت بھی واپس نہ کر سکا وہ بھی ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئی۔"

"لعنت بھیجیں اس پیسے پر، اصل چیز تو اس کی جان تھی، مجھے اس کا افسوس ہے۔"

"مگر اس نے اسی پیسے کے چکر میں جان دی۔ اسے پہلے ہی بھاگ جانا چاہیے تھا مگر وہ رقم کے لالچ میں رکا رہا اور مارا گیا۔"

"پھر آپ کے ساتھ کیا ہوا؟" اس نے چائے کا مہکتا کپ میرے سامنے رکھا۔

"اگرچہ اچھا نہیں ہوا مگر کچھ ایسا برا بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا اور اسے اپنے اوپر گزرنے والی بپتا سنائی۔ جب میں نے گوہر شاہ کی سازش اور صائمہ کی پیشکش کا ڈھکے چھپے الفاظ میں ذکر کیا تو وہ طیش میں آگئی اور خالص زنانہ انداز میں کہا۔

"تھپڑ مارتے اُس کمینی کے منہ پر۔"

"میں نے مہذب انداز میں یہی کام کیا تھا۔" میں نے کسی قدر مبالغہ آرائی کے ساتھ کہا پھر اپنی جدوجہد کا ذکر کیا جو میں نے بچنے کے لیے کی تھی۔ حمیرا کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے میں کوئی اساطیری داستانوں کا ہیرو ہوں اور کوئی کارنامہ انجام دے کر واپس آیا ہوں حالانکہ میں بہ مشکل جان سلامت لے کر آیا تھا اور وہ بھی شاداب اور امجد صاحب کی وجہ سے۔ "یہ بتاؤ کہ ریسکیو مشن کس نے روانہ کیا؟"

"شاداب بھائی نے۔" وہ بولی۔ "اگر پاپا کے واقف کار ڈی آئی جی کے چکر میں رہتے تو اس نے وارنٹ حاصل کرنے میں صبح کر دینی تھیں۔ پاپا اس سے رابطے میں تھے اور جب میں نے محسوس کیا کہ وہ دیر کر رہا ہے تو میں نے شاداب بھائی سے رابطہ کیا اور ان سے التجا کی۔ انہوں نے کوئی جیک لگایا اور پولیس پارٹی بروقت پہنچی۔"

"بالکل بروقت۔" میں نے کہا۔ "ایک دو منٹ کی تاخیر ہوتی تو گوہر شاہ کے بندے مجھے غائب کر چکے ہوتے، انہوں نے شاک لگا کر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ آنے والا ڈی ایس پی جو باہر امجد صاحب سے بات کر رہا ہے، یہ گوہر شاہ کا واقف کار ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ سیدھا اندر گھسا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ گوہر شاہ مجھے کہاں رکھ سکتا ہے۔"

"مجھے پاپا کی سمجھ نہیں آرہی ہے۔" حمیرا نے اچانک دھیمے لہجے میں کہا۔ "ان کا رویہ بدلا ہوا ہے۔"

"میں نے آتے ہی محسوس کر لیا تھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن میرے خیال میں یہ فطری ردِعمل ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" اس بار وہ تیز لہجے میں بولی۔ "مجھے پاپا سے یہ امید نہیں ہے، آپ صرف میرے محسن ہی نہیں ہیں بلکہ آپ کی فیملی سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں۔"

"حمیرا اسے نارمل بات مت سمجھو۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "گوہر شاہ کسی زہریلے سانپ سے زیادہ خطرناک اور بھیڑیے سے زیادہ سفاک شخص ہے۔ ایسے شخص سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔"

"تب آپ اس سے دور کیوں نہیں رہتے؟"

"تم جانتی ہو میری مجبوری ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ جب میں اس کی قید میں تھا تو اس نے خود اقرار کیا کہ اس نے ہی عادل کو اغوا کرایا اور اس کے حکم پر عادل کے اعضا نکال کر بیرونِ ملک بھیجے گئے۔ میں اپنے بھائی کے قاتل کو کیسے معاف کر دوں؟"

"آپ مجبور ہیں تو میں بھی مجبور ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔"

"پلیز حمیرا بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"یہ نہیں سمجھے گی۔" امجد صاحب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "میں بہت سمجھا چکا ہوں۔"

وہ اپنے گلابی نازک لب کاٹنے لگی۔ "پاپا آپ......"

"حمیرا خدا کے لیے، ماجد کے بعد میں کوئی اور نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔ "اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔"

"امجد صاحب کچھ نہیں ہوگا۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "آپ اسے کچھ عرصے کے لیے کہیں اور بھیج دیں، اس دوران میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

"کیسا فیصلہ؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "اور میں کہیں نہیں جارہی۔"

"حمیرا۔" امجد صاحب نے تیز لہجے میں کہا تو وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

"امجد صاحب میں معذرت خواہ ہوں۔"

"نہیں بیٹے ایسا مت کہو۔" وہ بولے۔ "میں خود بہت شرمندہ ہوں۔ کل سے اسے سمجھا رہا ہوں اور اس دوران میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔"

"آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ آپ نے اور حمیرا نے میری جتنی مدد کر دی، وہی میرے لیے بہت ہے اور اب میں آپ لوگوں کو مزید اس خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ سے دور بھی ہو جاؤں تب بھی گوہر شاہ اس چیز کو نہیں سمجھے گا اور وہ بدستور آپ کے اور خاص طور سے حمیرا کے پیچھے پڑا رہے گا۔ اس کا سب سے بہترین حل یہی ہے کہ اسے کچھ عرصے کے لیے باہر بھیج دیں بلکہ ہائر اسٹڈیز کے لیے بھیج دیں تو اسے ایک ٹاسک بھی مل جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں نے بھی یہی سوچا ہے.... فی الحال تو میں اسے اس کی خالہ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب تک اس کا کہیں داخلہ نہیں ہو جاتا، یہ وہیں رہے گی۔ تمہارے لیے بھی میرے ذہن میں یہی ہے کہ اب تم باہر چلے جاؤ۔"

"شاید میں ایسا ہی کروں۔" میں نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا کیونکہ میرا باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"تم آرام کرو تھکے ہوئے اور پھر بے آرام بھی رہے ہو۔"

"جی ٹھیک کہا آپ نے۔" میں نے سر ہلایا۔

میرے لیے گیسٹ روم کا وہی کمرا کھلوا دیا گیا تھا جہاں میں پہلے بھی رکا تھا۔ میں نے نیم گرم پانی سے غسل کیا تو جسمانی تھکاوٹ اور تکلیف میں خاصی کمی آئی تھی۔ حمیرا چائے کے ساتھ پین کلر دینا بھول گئی تھی۔ مگر اب ضرورت نہیں تھی۔ میں ابھی سونا نہیں چاہتا تھا اس لیے بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں اٹھا اور جوتے پہن کر نیچے کا رخ کیا مگر جب باہر جانے والے دروازے کے پاس پہنچا تو نشست گاہ کی تاریکی سے ایک سایہ الگ ہوا اور میری طرف آیا، میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "تم جاگ رہی ہو؟"

"ہاں کیونکہ مجھے معلوم تھا آپ چپکے سے فرار ہو جائیں گے۔" وہ بولی اور روشنی میں آئی تو میں نے دیکھا وہ مکمل لباس میں مع جوتوں کے تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا بڑا سا ہینڈ بیگ تھا۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں تو جارہا ہوں مگر تمہاری یہ تیاری کس خوشی میں ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ......"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر ناگواری سے کہا۔ "مجھے تم جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی سے اس رویے کی توقع نہیں ہے۔"

"آپ میرا رویہ دیکھ رہے ہیں، اپنے رویے پر غور کیا ہے؟" وہ جذباتی ہو گئی۔ "آپ کا رویہ بھی آپ کی شخصیت کے مطابق نہیں ہے۔"

"میرا بھائی مارا گیا ہے اور میرا رویہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں، میرے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میں مرد ہوں سب دیکھ سکتا ہوں اور جھیل سکتا ہوں۔ تمہارا ایک گھر ہے، باپ ہے اور دوسرے رشتے دار بھی ہیں۔ تم ایک لڑکی ہو نازک سی اور اس سے زیادہ نازک تمہاری عزت ہے۔ تمہارے باپ کی جان تم میں ہے، تمہیں کوئی مجبوری نہیں ہے کہ میرے پیچھے یوں آؤ۔"

"مجبوری ہے۔"

"وہ صرف ایک وقتی احساس ہے۔" میں نے دل پر جبر کر کے اس کی محبت کی نفی کی۔ "کچھ دن مجھ سے دور رہو گی اپنی مصروفیات ہوگی تو سب بھول جاؤ گی۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "آپ سچ مچ ایسا سمجھ رہے ہیں؟ آپ کے خیال میں میں ٹائم پاس کر رہی ہوں۔ آپ کا اور میرا ایک رشتہ ہے۔"

"شاید۔" میں نے جان بوجھ کر بے پروائی سے کہا۔ "آج کل تو جوانوں کو ایسی کیفیت لاحق ہو جاتی ہے چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کچھ عرصے بعد انہیں افاقہ بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے نزلہ زکام وقت کے ساتھ خود ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"سیف چپ کر جائیں۔" وہ چلا اٹھی۔ "آپ میری اور میرے جذبے کی توہین کر رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔" میں نے لہجہ مزید روکھا کر لیا۔ "مہربانی کر کے میرا پیچھا چھوڑ دو،

مجھے اپنے دشمنوں سے نمٹنا ہے، میں دوسرے تیسرے چکروں میں نہیں پڑسکتا۔"

"آپ......آپ......" اس نے کہنا چاہا اور پھر یک دم روتے ہوئے سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔ حمیرا کے جانے کے بعد میں نے مڑنا چاہا تھا کہ لاؤنج کی تاریکی سے ایک سایہ اور الگ ہوا اور میں رک گیا۔ اس بار امجد صاحب تھے۔

"تم نے اسے بالکل صحیح ڈوز دیا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولے۔ "لڑکیاں ایسے ہی جذباتی ہوتی ہیں اور پھر وقت کے ساتھ سنبھل جاتی ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب وہ مجھ سے اور میرے معاملات سے دور رہے اس لیے میں خاموشی سے یہاں سے جا رہا تھا مگر اب تو سب کو پتا چل گیا ہے۔"

"جب تم آرام کرنے جا رہے تھے تب ہی میں سمجھ گیا تھا۔" وہ بولے۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

ہم باہر پورچ میں آئے۔ وہاں ایک گہرے سبز رنگ کی وین کھڑی تھی۔ یہ بالکل نئی وین تھی اور اس کی مضبوط باڈی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔ امجد صاحب نے کہا۔ "یہ میں نے تمہارے لیے لی ہے۔ تمہیں ایک اچھی گاڑی کی ضرورت ہے۔"

"لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بالکل ہے۔" وہ زور دے کر بولے۔ "تم بہت طاقتور دشمنوں سے لڑ رہے ہو اور بائیک کا استعمال بہت غیر محفوظ ہے۔ یہ طاقتور اور مضبوط وین ہے، اس کا پک اَپ اچھا ہے اور اس کے پیچھے خاصی گنجائش ہے۔ میں چاہتا ہوں جب تک تم یہاں ہو، اسے اپنے استعمال میں رکھو۔ اب تم انکار نہیں کرو گے۔"

میں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ "میں آپ دونوں سے جتنا دور رہنا چاہتا ہوں، آپ لوگ اتنے ہی قریب آتے ہیں۔ دشمنوں کو پتا چل جائے گا کہ میں آپ کی گاڑی استعمال کر رہا ہوں۔"

"تم فکر مت کرو، گاڑی تمہارے نام پر ہے اور یہ میں نے کئی دن پہلے منگوائی تھی۔ اتفاق کی بات ہے تمہارے غائب ہونے کے بعد آئی اور ہاں ہوسٹل سے تمہارا خاص سامان شاداب نے منگوا لیا ہے۔ کمرا تمہارے پاس ہے اور تمہارے کپڑے اور ضرورت کا سامان وہیں ہے لیکن اب تمہارے اہم کاغذات اور چیزیں شاداب کے پاس ہوں گی۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" میں نے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ آپ اور شاداب نے میری غیر موجودگی میں کچھ فیصلے کیے ہیں؟"

"بالکل کیونکہ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو اور ہم تمہیں کسی بھی حال میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ حمیرا باہر جائے گی اور جب تک تم ان مسائل سے نمٹ نہیں لیتے میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔"

امجد صاحب کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا وہ صرف حمیرا کو دکھانے کے لیے مجھ سے ایسا رویہ رکھ رہے تھے ورنہ اندر سے وہ اب بھی میرے ساتھ تھے۔ ان کا بہ ظاہر مجھ سے دور ہونا درست تھا۔ انہوں نے مجھے وین کی چابی دی اور آہستہ سے بولے۔ "اس کے ڈیش بورڈ میں کچھ چیزیں ہیں، وہ دیکھ لینا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟"

میرا اشارہ پولیس گارڈز کی طرف تھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ "اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ شاداب نے ایک طرح سے تمہارے چارج میں دیا ہے ان لوگوں کو۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور چابی لگائی۔ ہلکی سی جھرجھری کے ساتھ وین کا طاقتور ڈیزل انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے امجد صاحب سے ہاتھ ملایا اور وین آگے بڑھائی۔ گیٹ کے پاس روک کر میں نے پولیس گارڈز کو آواز دے کر بلایا اور انہیں وین میں بیٹھنے کو کہا۔ ان میں سے ایک پیچھے آ گیا اور ایک میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "سر کہاں جانا ہے؟"

"باہر۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ میں نے وین باہر نکالی اور مین روڈ کے بجائے مخالف سمت میں موڑ لی۔ صبح کے چار بج رہے تھے اور گلیوں میں مکمل سناٹا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی ہمارے پیچھے آتا تو اس کے چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہم گلی سے نکلے ایک گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ہمارے پیچھے آنے لگی۔ میں نے وین کی رفتار تیز کی اور اسے ایک گلی میں موڑتے ہوئے کہا۔ "دیکھو اگر گاڑی پیچھے آئے تو اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔"

"فائر کرنا ہے سر۔" میرے ساتھ بیٹھے گارڈ نے پوچھا۔

"بالکل مگر ٹائر ناکارہ کرنا ہے۔ تم میں سے کس کا نشانہ

اچھا ہے؟''

''دونوں کا سر۔'' اس نے کہا اور پیچھے چلا گیا۔ ''ہم دونوں ٹرائی کرتے ہیں جس کا نشانہ لگ جائے۔''

''خیال رکھ کر فائر کرنا۔'' میں نے خبردار کیا۔ ''اندھا دھند مت کرنا۔ کسی اور بندے یا گاڑی میں بیٹھے کسی آدمی کو گولی نہ لگے۔''

''آپ بے فکر رہیں سر۔'' اس نے جواب دیا۔ گاڑی پیچھے آرہی تھی۔ میں نے چند گلیوں میں اسے اور گھمایا اور پھر ایک بڑی سڑک پر لے آیا۔ گاڑی تقریباً سو فٹ کے فاصلے سے پیچھا کر رہی تھی۔ گوہر شاہ نے اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ ان دونوں نے آپس میں کچھ طے کیا۔ اندر کی روشنی بند تھی انہوں نے اچانک دونوں عقبی دروازے کھولے اور ایک ساتھ پچھلی کار کے ٹائروں کا نشانہ لے کر فائرنگ کرنے لگے۔ فائرنگ کے شور کے ساتھ ہی عقبی کار لہرانے لگی۔ وہ گولیوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر دو رائفلوں کی مسلسل فائرنگ سے بچنا آسان کام نہیں تھا۔ بالآخر کوئی گولی کام کر گئی اور گاڑی کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا تھا۔ وہ لہرائی اور پھر رکنے لگی۔

''شاندار۔'' میں نے داد دی اور وین کی رفتار بڑھا دی۔ ٹائر برسٹ ہونے کے بعد ان کے پیچھے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن سے نکل کر میں نے فیروز پور روڈ کا رخ کیا اور پھر وہاں سے ڈیفنس کی طرف مڑ گیا۔ اس کی ویران سڑکوں اور گلیوں میں وین چلاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے تسلی ہوگئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے تو میں نے رنگ روڈ انٹرچینج کے پاس وین روکی اور ان دونوں سے کہا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔''

''کہاں جناب؟'' فرنٹ سیٹ والے نے پوچھا۔

''واپس، اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

فرنٹ سیٹ والے نے کہا۔ ''جناب ہمیں شاداب صاحب نے لگایا ہے، اُن کے حکم کے بغیر ہم واپس نہیں جا سکتے۔''

اب مجھے شاداب سے رابطہ کرنا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے پاس موبائل تو ہے نہیں۔ پھر مجھے امجد صاحب کی بات یاد آئی اور میں نے وین کا خانہ کھول کر دیکھا۔ اس میں سامنے ہی ایک عدد موبائل رکھا تھا۔ میں نے اسے آن کیا تو اس کی فون بک میں ان کا، حمیرا کا اور شاداب کا نمبر شامل تھا۔ میں نے شاداب کو کال کی اور اس نے کچھ بیلز کے بعد کال وصول کی اور غنودہ لہجے میں بولا۔ ''اس وقت کیا ایمرجنسی آگئی؟''

''یار یہ تمہارے بندے تمہارے حکم کے بغیر میرا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''وہ ٹھیک کر رہے ہیں، انہیں میں نے حکم دیا ہے۔''

''میں فی الحال شہر سے باہر جا رہا ہوں، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کسی قدر غلط بیانی سے کام لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ابھی سوچا نہیں ہے لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد تمہیں بتاؤں گا۔''

''تمہارا سامان اور رقم میرے پاس ہے۔''

اس دوران میں، میں خانے میں رکھا ہوا ایک شاندار لیدر پرس برآمد کر چکا تھا۔ اس میں پانچ ہزار، ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی صورت میں خاصی رقم تھی۔ ''رقم ہے میرے پاس۔''

''ہاں بھائی مزے کرو۔'' وہ ہنسا۔

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس میں اچھا نہ لگنے والی کون سی بات ہے۔ وہ اپنا سمجھ کر تمہارے لیے سب کر رہے ہیں، کوئی بدلہ نہیں اتار رہے۔''

''میں سمجھتا ہوں اسی لیے چپ ہوں، بہر حال تم ان سے کہو کہ اب یہ جاسکتے ہیں۔''

رفیق کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ ''ٹھیک ہے، میری بات کراؤ۔''

میں نے موبائل فرنٹ سیٹ والے کے حوالے کیا اور وہ شاداب سے بات کرنے لگا۔ میں نے خانے کی مزید تلاشی لی تو اس میں سے ایک پسٹل اور اس کے دو عدد اضافی میگزین نکلے تھے۔ چھوٹی نال اور کسی قدر بڑے دستے والا یہ ہتھیار نشانے اور ہلاکت خیزی میں بہترین ہے۔ اس کے علاوہ خانے میں میرے آئی ڈی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس کی کلر فوٹو کاپیز بھی تھیں اگر کہیں ضرورت پڑتی تو میں دکھا سکتا تھا۔ میں نے شاداب سے سچ کہا تھا مجھے امجد صاحب کی یہ سب مہربانیاں خود پر بوجھ لگ رہی تھیں۔ مگر فی الحال میں مجبور تھا کیونکہ بائیک جاچکی تھی اور میرے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے بات کر کے موبائل میری طرف بڑھایا تو شاداب نے کہا۔ ''میں نے اسے کہہ دیا ہے۔''

''تھینک یو، ایک کام اور ہے۔''

''اب تھینک یو کہا تو کام نہیں ہوگا۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''سوری یار......''

''نو سوری......'' وہ مزید خفا ہوگیا۔

میں ہنسا۔ ''میری بائیک سرفراز کے گھر کے پاس مین روڈ پر تھی۔ وہی جو مارا گیا ہے، کیا تم پتا کرا سکتے ہو کہ بائیک کہاں ہے؟''

''صبح معلوم کرلوں گا۔'' اس نے کہا۔

''اگر مل جائے تو چیک کرا کے اپنے پاس منگوا لینا، یہ گوہر شاہ بہت حرامی چیز ہے کوئی بگ نہ لگا دے۔''

''میں کروالوں گا۔''

''اب آرام کرو۔'' میں نے کال کاٹ دی۔

''سر ہمیں کسی ایسی جگہ اتار دیں جہاں سے ہم کوئی کنوینس لے سکیں۔'' انہوں نے درخواست کی تو میں نے سر ہلایا اور انہیں رنگ روڈ پر ہی ایک جگہ اتار دیا جہاں صبح کے اس پہر بھی رکشے ٹیکسیاں موجود تھیں۔ میں نے دونوں کو ہزار ہزار دیے اور وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ہوسٹل کا رخ کیا۔ وین اسی گلی میں ایک جگہ کھڑی کر دی اور خود پیدل ہوسٹل آیا۔ صبح کے پانچ بجے تھے اور مین گیٹ بند تھا۔ میں نے بیل دی تو کرم آنکھیں ملتا ہوا آیا۔ میں نے شفیق کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ''اس کے بھائی کا طبیعت خراب تھا وہ اُدھر گیا ہے۔''

دوسری چیزوں کے ساتھ میری چابیاں بھی گئی تھیں اور اب میں اپنے ہی کمرے میں نہیں جا سکتا تھا جب تک شفیق نہ آجاتا۔ شاداب نے میرا سامان منگوایا تھا تو اس نے کسی طریقے سے تو کمرا کھولا ہوگا اس کے پاس اضافی چابیاں تھیں۔ شاداب نے صرف رقم اور میری ڈاکومنٹس منگوائی تھیں۔ میں لاؤنج میں آگیا اور ایک صوفے پر دراز ہوگیا۔ کرم نیچے کاؤنٹر والی جگہ سو رہا تھا وہ پھر سونے چلا گیا اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ چابیاں شفیق کے پاس ہی ہو سکتی تھیں۔ میں تھکا ہوا تھا اس لیے کب آنکھ لگی مجھے پتا نہیں چلا۔ کسی نے ہلایا تو میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور میرا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب کی طرف گیا۔ مگر شفیق کو دیکھ کر رک گیا اور مجھے یاد آیا کہ پسٹل تو وین میں ہی ہے۔ میں نے واپس خانے میں رکھ دیا تھا۔ میرے تاثرات نے شاید شفیق کو ڈرا دیا، اس نے جلدی سے کہا۔ ''آرام سے ڈاکٹر صاحب یہ میں ہوں۔ خدانخواستہ کوئی بُرا خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے؟''

''نہیں۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''ذرا ٹینس ہوں اس لیے ایسا ردِعمل دیا۔''

''کیا ہوا جی خیر تو ہے، کل پولیس والے آئے تھے۔ آپ کا کمرا کھلوایا اور کچھ سامان لے گئے تھے۔ میں نے جی منع کیا تھا مگر جناب یہ سنتے کہاں ہیں۔ بہرحال جب وہ جا رہے تھے تو میں نے ان کے نام اور تھانے کا پوچھ لیا تھا۔''

''فکر مت کریں وہ میرے ایک ایس ایس پی دوست کے آدمی تھے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''میرے ساتھ ٹریجڈی ہوئی اور کل ڈکیتی میں میرا سامان چھن گیا۔ میں خود بھی چکر میں پڑا تھا اور اسی وجہ سے میں نے پولیس کی مدد سے سامان اٹھوالیا تاکہ ڈاکوؤں کی جانب سے کوئی گڑبڑ ہو تو آپ تک بات نہ آئے۔ وہ چابیاں بھی لے گئے تھے۔''

شفیق نے مزید سکون کا سانس لیا۔ ''یہ تو آپ نے پھر بہت اچھا کیا جو مجھ غریب کا خیال رکھا۔ ویسے پولیس والے بھی بہت شرافت سے آئے تھے اور کوئی بدتمیزی یا ہنگامہ نہیں کیا۔''

''اگر وہ آپ سے ذرا بھی بدتمیزی کرتے تو پیٹی اتر جاتی۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی ہوگی، وہ عنایت کر دیں۔''

''کیوں نہیں جی، میں نے باہر والا تالا بھی دوسرا لگا دیا تھا۔ احتیاط کے طور پر۔'' اس نے کہا اور کاؤنٹر کی دراز سے مجھے کمرے کی اضافی چابیاں دیں۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں اوپر آیا اور سب سے پہلے شاور لے کر کپڑے بدلے۔ میرے یہ کپڑے بھی میلے ہو رہے تھے۔ جب تک تازہ دم ہوا نیچے ناشتا بننا شروع ہوگیا تھا، میں نے ناشتا کیا اور شفیق کو ڈونٹ ڈسٹرب کا کہہ کر اوپر آگیا۔ سونے سے پہلے حمیرا اور طارق کو میسج کر دیا کہ میں خیریت سے ہوں۔ اس کے بعد میں لمبی تان کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں تاریکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شام ہو چکی ہے میں نے وقت دیکھا تو حیران رہ گیا۔ شام کے پونے سات بج رہے تھے، میں کوئی دس گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ناشتا ہضم ہو چکا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے پہلے موبائل دیکھا اس میں مس کالز اور میسجز دونوں تھے۔ پہلا میسج طارق کا تھا اور اس نے لکھا تھا۔ ''تم یقیناً سو رہے ہو گے اس لیے جب اٹھنا تو مجھے کال کرنا۔''

دوسرا میسج شاداب کا تھا۔ ''تم کال ریسیو نہیں کر رہے ہو، کہاں ہو اور واپسی کب تک ہوگی۔''

''فی الحال میں ہوسٹل میں ہوں۔'' میں نے جوابی میسج کیا۔ ''تم سے رابطہ کرتا ہوں ابھی ڈنر کے لیے نکل رہا ہوں۔''

شاداب کو میسج کر کے میں واش روم آیا اور منہ ہاتھ

دھو رہا تھا کہ اس کی کال آ گئی۔ وہ مضطرب تھا۔ ’’سیف یہ اچھا نہیں کیا، یہاں میں نے پولیس کے آدمی بھیجے تھے اور تم جانتے ہو ہمارے ہاں کالی بھیڑیں کتنی زیادہ ہیں۔ کسی نے گوہر شاہ تک یہ اطلاع پہنچا دی ہوگی۔ وہ خود بھی اپنے کونٹیکٹ استعمال کر رہا ہوگا۔‘‘

’’میرا خیال ہے یہ جگہ محفوظ ہے، میں صبح سے یہاں ہوں۔ اگر گوہر شاہ اس جگہ کے بارے میں جان چکا ہوتا تو اب تک پہنچ گیا ہوتا۔‘‘

’’نہیں تم فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔ بہتر ہوتا کہ بچ بچ شہر سے باہر چلے جاتے۔ ملنے والی اطلاعات تشویشناک ہیں۔‘‘

’’کیسی اطلاعات ہیں؟‘‘

’’گوہر شاہ لاہور کے جرائم پیشہ گروہوں سے رابطہ کر رہا ہے۔ وہ اُن کی مدد سے تمہاری تلاش کرا سکتا ہے اس لیے بہتر ہوگا تم کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلے جاؤ بلکہ ملک سے ہی چلے جاؤ اگر تم کہو تو تمہارا پاسپورٹ ویزے کے لیے بھیج دوں۔ وزٹ ویزا دو دن میں مل جائے گا۔‘‘

’’نہیں، میں وہاں واپس نہیں جانا چاہتا کیونکہ جان کے دشمن تو وہاں بھی موجود ہیں۔‘‘

’’یار وہاں جانے کو کون کہہ رہا ہے۔ تم تھائی لینڈ یا سری لنکا چلے جاؤ، چین بھی جا سکتے ہو۔‘‘

میں ہنسا۔ ’’پچھلے چند دن جیسے گزرے ہیں، میں سوچ رہا ہوں افغانستان چلا جاؤں، وہاں میرے لیے زیادہ امن و سکون ہوگا۔‘‘

’’سیف مذاق میں مت ٹالو، میں سنجیدہ ہوں۔‘‘

’’تم فکر مت کرو، یہاں میرے کچھ اور ٹھکانے ہیں جن کے بارے میں کوئی اور نہیں جانتا ہے، میں وہاں چلا جاتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے مگر یہاں سے تو نکلو۔‘‘

’’بس میں نکل ہی رہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور کال کاٹ کر اپنا کام مکمل کیا اور پھر کپڑے پہن کر میں نے دو جوڑے چھوٹے بیگ میں رکھے اور کمرا لاک کر کے نیچے آیا۔ شفیق کچن والی طرف مصروف تھا وہاں کچھ مسئلہ ہوا تھا اور وہ کرم اینڈ برادرز پر گرج برس رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ میں نے پہلے گلی کا جائزہ لیا۔ لوگ آ جا رہے تھے اور یہ سب عام سے لوگ تھے، مجھے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا جو خاص طور سے میری نگرانی کر رہا ہو۔ وین تک آتے ہوئے میں چوکنا رہا اور پھر اسے کچھ دیر گلیوں میں گھماتا رہا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں نے وین کا رخ کینال روڈ کی طرف کر دیا۔ کینال روڈ پر آنے کے بعد میں نے طارق کو کال کی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

’’سیف کہاں ہو؟‘‘

’’کینال روڈ پر ہوں، ماڈل ٹاؤن کے پاس۔‘‘

’’گڈ، یہاں سے واپسی کرو اور گلشن راوی کی طرف آؤ۔‘‘

’’وہاں آ کر کیا کرنا ہے؟‘‘

’’تم آؤ، میں تمہیں گائیڈ کروں گا، میں ایک جگہ ہوں لیکن یہاں کا پتا نہیں بتا سکتا، سمجھا سکتا ہوں راوی کنارے ایک ہٹ ہے۔‘‘

میں نے آنے والے پہلے کٹ سے وین نہر کے دوسری طرف گھما دی۔ ’’وہاں کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’ان تینوں کے ساتھ ہوں۔‘‘ اس نے بھنا کر کہا۔ ’’کیا تم باقی سوالات یہاں آ کر نہیں کر سکتے۔‘‘

’’اوکے آ کر کرتا ہوں۔‘‘ میں نے کال کاٹ دی۔

گلشن راوی لاہور شہر کی حدود میں آتا ہے لیکن اس کے ساتھ بہنے والا راوی شہر سے باہر ہے۔ یہاں لوگوں نے تفریحی ہٹ بنا رکھے ہیں اور جب بارشوں میں راوی میں کسی قدر پانی آتا ہے تو لوگ یہاں پکنک منانے آتے ہیں۔ گزشتہ روز کی بارش کے بعد راوی میں یقیناً پانی ہوگا۔ کیونکہ بارش نہ صرف پورے لاہور میں بلکہ اس سے اوپر کے علاقوں میں بھی ہوئی تھی۔ بند روڈ کے پاس پہنچ کر میں نے پھر طارق کو کال کی۔

’’بند روڈ تک آ گیا ہوں اب کہاں آنا ہے؟‘‘

’’اسی روڈ پر راوی کی طرف آؤ۔‘‘ طارق نے کہا۔ ’’آگے موٹروے انٹرچینج ہے اس سے ذرا پہلے ایک نیم پختہ سڑک دریا کی طرف جا رہی ہے، اس کے آغاز میں نیلے رنگ کا فش فارم کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ آبادی کے بعد کوئی کلومیٹر بھر بعد سرمئی رنگ کا سرخ کھپریل نما چھت والا ہٹ آئے گا، اس کے آگے میری مہران کھڑی ہے۔‘‘

’’میں سمجھ گیا بس چند منٹ میں آ رہا ہوں۔‘‘

مجھے وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ لگے تھے۔ میں نے وین مہران کے ساتھ کھڑی کی۔ یہ جگہ دریا کے پاٹ سے سو گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی مگر اس کی بلندی خاصی تھی اس لیے بہت شدید سیلاب کی صورت میں ہی پانی ہٹ تک آتا ہوگا.... ہٹ تقریباً چار مرلے پر تھا۔ سامنے لوہے کا

چھوٹا دروازہ تھا اور ہٹ میں آمد و رفت کا واحد ذریعہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ کھڑکیاں تھیں۔ ہٹ آبادی سے ہٹ کر تھا۔ گلشن راوی کی باقاعدہ آبادی کے بعد لوگوں نے اس سے ملی ہوئی کچی بستی بھی بسا لی تھی مگر اس کچی بستی میں اکثر مکانات پختہ اور شہری انداز کے تھے۔ باقی جگہوں پر کھیت تھے۔ کہیں کہیں فش فارم بھی بنے تھے۔ یہاں آبادی کو دریا سے بچانے کے لیے باقاعدہ بند بنایا گیا تھا۔ یہ بند نیم دائرے میں گھومتا ہوا گلشن راوی تک چلا گیا اور اس کی وجہ سے یہ بند روڈ کہلاتی تھی۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے طارق نے پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس ہیئت کذائی میں تھا کہ اس نے صرف ایک بڑی سی نیکر پہن رکھی تھی اور باقی جسم کی ستر پوشی اس کے ریچھ نما بالوں سے ہو رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے مجھے شبہ ہوا کہ اس نے کوئی نشہ کیا ہوا ہے اور میں اندر آیا تو ہلکی سی بُو بھی محسوس ہوئی۔ میں نے ناک پر زور دیا۔ "یہ چرس کی بُو ہے؟"

"میری جوانا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "یہ جسمانی کارکردگی بڑھاتا ہے۔"

"ہر نشہ انسان کو صرف موت کی طرف بڑھاتا ہے۔" میں نے قدرت کا فلسفہ بیان کیا اور ہٹ کا معائنہ کیا۔ یہ بڑا سا لاؤنج تھا جس میں ایک طرف اوپن کچن بھی تھا۔ عقب میں دو کمرے تھے۔ لاؤنج میں ہی دائیں طرف کونے میں کامن باتھ روم تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے میز پر کولڈ ڈرنک کے کئی خالی ٹن رکھے تھے۔ ایش ٹرے میں سگریٹوں کے ٹوٹے اتنے زیادہ تھے کہ اب باہر گر رہے تھے اور راکھ تو پوری میز پر تھی۔ باقی لاؤنج کی حالت بھی تقریباً ایسی ہی تھی۔ اس کا لیپ ٹاپ میز پر تھا اور اس سے یو ایس بی وائرلیس ڈیوائس لگی ہوئی تھی۔ "وہ تینوں کہاں ہیں؟"

"اندر۔" اس نے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ "لیکن میں ان سے ساری معلومات نچوڑ چکا ہوں۔ انہوں نے خاصے سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟"

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میرے ساتھ اور اس سے پہلے سرفراز کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے سرفراز کی موت کا سن کر سرسری سے انداز میں کہا۔ "اس کے لیے مجھے ایسی ہی توقع تھی۔"

"کیوں؟"

"وہ بے پروا اور چھوٹے دماغ کا آدمی تھا اور لالچ میں مارا گیا۔ اسے پہلی فرصت میں بھاگ جانا چاہیے تھا۔"

"جیسے تم بھاگ لیے۔" میں نے طنز کیا۔ "تم آرام سے اس غیر محفوظ گھر میں رہ رہے ہو اور تمہارے دشمن تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا صورت سے نظر آتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے فریج سے کولڈ ڈرنک کے دو ٹن نکالے اور ایک مجھے تھما دیا۔

"ہاں بعض اوقات آدمی اس سے زیادہ احمق ہوتا ہے جتنا کہ وہ نظر آتا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

"میں نے کون سی حماقت کی ہے؟"

"طارق میں ایک دن گوہر شاہ کی قید میں رہا ہوں اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ بہت سفاک اور طاقتور شخص ہے۔"

"یہ مجھے بہت پہلے سے معلوم ہے۔"

"تمہیں اس سے بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

"میں اتنا محتاط ضرور رہتا ہوں کہ مرتے وقت پچھتانا نہ پڑے۔" اس نے کہا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔

"او کے، اب بتاؤ کہ تم نے کیا معلوم کیا ہے؟"

"میں نے دو اہم باتیں معلوم کی ہیں۔" اس نے ٹن کھولا اور ایک ہی سانس میں اسے آدھا کر دیا۔

"کون سی دو باتیں؟"

"پہلی بات یہ کہ جس دن عادل کا مرڈر ہوا اسی دن لاہور ائرپورٹ پر ایک پرائیویٹ جیٹ نے آمد و رفت کی۔ لیکن امیگریشن اور کسٹم میں اس کا کوئی اندراج نہیں ہے۔ جیٹ مڈل ایسٹ کے ایک ملک سے آیا تھا اور صرف چند گھنٹے کے لیے یہاں رکا تھا۔"

طارق نے ملک کا نام بتایا تو میں چونک گیا میں وہیں تو کام کرتا تھا۔ میری وہاں سے روانگی سے ایک دن پہلے یہ جیٹ آیا اور گیا تھا۔ تو کیا عادل کے اعضا اسی جیٹ طیارے میں گئے تھے اور اسی ملک گئے تھے۔ طارق نے سر ہلایا۔

"اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔ روحی کوشش کر رہی ہے کہ کہیں سے کلیو مل جائے مگر مسئلہ یہ ہے یہاں کے لوگ ملے ہوئے ہیں اور وہ اس بارے میں زبان کیوں کھولنے لگے؟"

''کیا یہ اُن لوگوں نے بتایا ہے؟''
اس نے سر ہلایا۔ ''ان میں سے ایک راوی والے اسپتال سے گاڑی میں اس آدمی سمیت ائرپورٹ گیا تھا جو اعضا لینے آیا تھا مگر اس نے اسے ائرپورٹ کے باہر تک چھوڑا تھا، اسے نہیں معلوم کہ وہ اندر کہاں گیا اور پھر وہاں سے آگے کہاں گیا مگر جیٹ کی پرواز کی ٹائمنگ میچ کر رہی ہے۔''
''طیارے کی پرواز کا وقت کیسے معلوم ہوا؟''
''ائر ٹریفک کنٹرول کے ریکارڈ سے جو کسی بھی پرواز کو اترنے یا فضا میں جانے کی اجازت دیتا ہے۔''
''کیا اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے؟''
''براہِ راست نہیں، یہ ایک ضمنی ثبوت ہو سکتا ہے جہاں تک طیارے کی آمد و رفت کی بات ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ طیارے نے کسی ضرورت کے تحت لینڈ کیا اور کیونکہ نہ کوئی اترا اور نہ کوئی اس میں بیٹھا اور نہ ہی کوئی سامان آیا گیا اس لیے امیگریشن یا کسٹم میں اس کا کوئی اندراج بھی نہیں ہے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''دوسری اہم بات کیا ہے؟''
''جنوبی پنجاب میں حاصل پور کے پاس کہیں ان لوگوں کا مرکز ہے جہاں یہ ان لوگوں کو رکھتے ہیں جن کے اعضا نکالنے ہوں۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ وہاں براہِ راست آپریٹ بھی ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو اسمگل بھی کیا جاتا ہے۔''
''کہاں؟''
اس نے شانے اچکائے۔ ''ظاہر ہے بیرونِ ملک۔ معلوم یہ ہوا کہ ان لوگوں کو پہلے کراچی بھیجا جاتا ہے اور وہاں سے وہ مختلف راستوں سے باہر جاتے ہیں۔''
''انسانی اسمگلنگ کا تو سنا ہے لیکن اعضا کے لیے انسانوں کی اسمگلنگ کا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔''
''جو لوگ اس طرح اسمگل ہو کر جاتے ہیں، ان کا ہر طرح سے استحصال ہوتا ہے۔ عورتوں کو جنسی غلام کے طور پر بیچا جاتا ہے اور مرد بیگاری کیمپوں میں کام کرتے ہیں۔ بچے غلام کی حیثیت سے دولت مندوں کو فروخت کیے جاتے ہیں۔ بچوں سے خطرناک جگہوں پر کام لیا جاتا ہے۔ اونٹوں کی ریس کا تو تم نے سنا ہوگا، اس کے علاوہ بھی بچوں کو بہت سی جگہوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔''
''تم نے جو معلوم کیا ہے، اسے ہم کس طرح استعمال کر سکتے ہیں؟''
''پولیس سے کہنا بیکار ہے، وہ ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کرے گی۔'' طارق نے جواب دیا اور لیپ ٹاپ میری طرف گھما دیا۔ ''میں نے گوگل میپ پر اس عمارت کو تلاش کر لیا ہے جہاں اسمگل کیے جانے والے لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ یہ حاصل پور کے شمال مشرق میں ہے۔''
میں نے اسکرین پر دیکھا۔ یہ چھوٹی سی آبادی تھی مگر طارق نے جس عمارت کی نشان دہی کی تھی، وہ خاصی بڑی اور کسی قلعے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف موٹی اور اونچی دیوار والی فصیل تھی۔ اندر کئی عمارتیں تھیں اور آس پاس سرسبز ماحول تھا۔ کیونکہ یہ جگہ پنجاب کی دریائی وادیوں میں آتی تھی، اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ میں نے طارق سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''اس عمارت کو یہ لوگ کراکوٹ کہتے ہیں۔ اس کا مالک جبار ماہی نامی شخص ہے۔''
''اس کا گوہر شاہ سے کیا تعلق ہے؟''
''بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں ہے مگر ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں وہی گوہر شاہ کا آدمی ہے مگر ساتھ ہی خود مختار بھی ہے۔''
''تب تم اسے بزنس پارٹنر کہہ لو۔ وہ صرف تنخواہ پر کام نہیں کرتا ہوگا بلکہ نفع میں شامل ہوگا۔''
''عین ممکن ہے۔'' طارق نے سر ہلایا۔ ''عنقریب سو افراد کی ایک کھیپ کراچی کی طرف جانے والی ہے۔''
میں حیران رہ گیا۔ ''سو افراد، یہ تعداد بہت زیادہ نہیں ہے کیا؟''
''بالکل ہے مگر بیرونِ ملک سب سے زیادہ اسمگل ہو کر جانے والے اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں غربت اور جہالت بہت زیادہ ہے۔ اسمگلر اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے کیس بھی ہوتے ہیں کہ وہ ایک بندے سے لاکھوں لیتے ہیں اور اسے کسی خلیجی ملک کے ساحل پر پھینک کر فرار ہو جاتے ہیں۔ یا اُسے وہاں کے دولت مندوں کو بیچ دیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کھیپ میں بھی ایسے لوگ ہوں۔''
''سوال یہ ہے کہ اعضا فروشی کے لیے ٹشو میچنگ کیسے ہوتی ہوگی؟''
''یار یہاں سب ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ جو نام نہاد ہیلتھ این جی اوز کام کر رہی ہیں وہ اور کیا کرتی ہیں۔ صرف اعضا نکالنے کا چکر نہیں ہے۔ بات اب انسانوں پر تجربات اور

ان کے خون اور جسم کے دوسرے حصوں سے ویکسین اور اینٹی باڈیز بنانے تک جا پہنچی ہے۔ یہ لوگ ایسی غیر قانونی تجربہ گاہوں کو فروخت کیے جاتے ہیں جہاں یہ تجربات ساری دنیا سے چھپ کر کیے جاتے ہیں۔''

''اس کے پیچھے لازمی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہوں گی۔''

''اس کے پیچھے نہیں ہیں، وہی یہ سب کرا رہی ہیں کیونکہ ہیلتھ انڈسٹری کا شمار اب دنیا میں سب سے زیادہ بزنس کرنے والی انڈسٹریز میں ہوتا ہے۔''

میں نے ان لوگوں کے بارے میں سوچا جنہیں نہ جانے کون سے سبز باغ دکھا کر باہر بھیجا جا رہا تھا اور وہ بے خبر تھے کہ ملک کی سرحدوں کے پاس موت کا فرشتہ ان کا منتظر ہے۔ جس طرح عادل میرے لیے تھا تو وہ بھی کسی کے پیارے ہوں گے۔ ''یار ہم ان لوگوں کے لیے کچھ کر نہیں سکتے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''سوچا تو میں نے بھی ہے لیکن یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''پھر کیا کریں؟''

''ان تینوں کو تو پولیس کے حوالے کرنا ہے۔ روحی اور شاداب نے ایف آئی آر کروا دی ہے۔ ان کی گرفتاری ظاہر کی جائے گی اور ان پر میرے گھر پر حملے اور اغوا کے الزام میں پرچہ کٹے گا۔''

''الزام لگانا اور بات ہے اور ثابت کرنا اور بات ہے۔''

''ثابت نہیں کرنا ہے ان کے بیانات کی روشنی میں گوہر شاہ اور اس کا چٹھا کھٹا سامنے لانا ہے۔ میری ایک بندے سے بات ہوگئی ہے۔ وہ بھی آرگن پائریسی پر کام کر رہا ہے۔''

''یہ ضروری ہے اس کا نام پریس اور میڈیا میں سامنے آئے گا تو انتظامیہ اور پولیس پر بھی دباؤ بڑھے گا۔''

''اب ان لوگوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے ڈنر نہ کر لیا جائے۔''

''ڈنر کہاں پر؟''

''یہاں سے کچھ دور ایک ڈھابا ہوٹل ہے، وہاں بڑی لاجواب کڑاہی ملتی ہے۔''

مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ ''ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟''

''پڑے ہیں یہاں سے نہیں نکل سکتے، واپس آکر انہیں بنڈل بنا کر کہیں ڈال کر پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔''

ہم طارق کی مہران کار میں روانہ ہوئے اس سے پہلے اس نے وین کا معائنہ کیا اور اسے ہونے والے سسر کا گفٹ قرار دیا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''میں نے صرف عارضی لی ہے جیسے ہی اپنا کوئی بندوبست کیا، اسے واپس کر دوں گا۔''

''چھوڑ کا کے اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا حق ہے اس پر...... قیمتی چیز ہے اور کام کی بھی ہے۔''

کڑاہی کے بارے میں اس کا دعویٰ درست ثابت ہوا۔ میں نے بہت عرصے بعد اتنے اچھے ذائقے والی کڑاہی کھائی تھی۔ ڈھابے کے باہر گاڑیوں کی قطار تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اتنی اچھی کڑاہی بنانے والا اس جگہ بیٹھا ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ عرصے بعد مزنگ یا کسی اور اچھی جگہ منتقل ہو جاتا۔ واپسی پر جب ہم بندروڈ پر مڑے تو عقب سے آنے والی ایک لگژری جیپ نے ہمیں چونکایا اور میں نے طارق سے کہا۔ ''لگتا ہے یہ ہمارے پیچھے آرہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' اس نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ ''تیار رہو۔''

میرا پستول اب میرے پاس تھا اور طارق بھی مسلح تھا۔ اس نے جان کر کار رہٹ کے اگلے پہلو کی آڑ میں روکی اور ہم دونوں پھرتی سے نیچے اتر آئے اور گاڑی کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ جیپ اسی طرف آرہی تھی اور پھر ہٹ کے پاس سے ہوتی ہوئی آگے بند کے پاس جا کر رکی اور اس سے چار پانچ نوجوان لڑکے برآمد ہوئے جنہوں نے ہاتھ میں بوتلیں اٹھا رکھی تھیں اور وہ ان بوتلوں کا خاصا مال اپنے پیٹ میں منتقل کر کے مسرور اور بہکے ہوئے تھے۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے بند کی طرف چلے گئے۔ میں نے اور طارق نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے پستول واپس بیلٹ میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم بلاوجہ ہی چوکنا ہو گئے تھے۔''

''یہ اچھی بات ہے ہم جیسے لوگوں کو پتا کھڑکنے کی آواز پر بھی ہوشیار ہو جانا چاہیے۔'' طارق نے کہا اور ہم ہٹ کے دروازے تک آئے۔ اس نے تالے میں چابی لگائی تو وہ گھومی نہیں۔ اس نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے پھر پستول نکال لیا اور میں اس کے پیچھے اندر آیا۔ لاؤنج میں آتے ہی ہم رک گئے۔ قیدیوں والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

پیاس

مظہر سلیم ہاشمی

انکشافات پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دیتے ہیں... ایسے ہی دوستوں کی پُرسکوت زندگی میں اچانک ہی ایک انکشاف نے تبدیلی کا بگل بجا دیا... وہ اسے اپنی خوش بختی سمجھ رہے تھے... مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ بظاہر نظر آنے والی خوش بختی کے پس منظر میں بدبختی انتظار کررہی ہوتی ہے... حصولِ زندگی کا معاملہ ہو تو ناجائز بھی جائز کی سند پالیتا ہے... صحرائوں میں بھٹک کر ریت کی گرماہٹ اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو جانے والے دوستوں کی سنسنی خیز رُوداد...

بھوک و پیاس کی وحشت

اور شدت کا آسیب جس نے

انہیں جکڑ لیا تھا......

''ہم مر جائیں گے رستم...... میں کہہ رہا ہوں، ہم مر جائیں گے۔'' ناصر نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''ایسے مت کہو......''

''میں نہیں مرنا چاہتا...... اللہ پاک کی قسم میں اس طرح نہیں مرنا چاہتا۔''

''تم نہیں مرو گے...... بس اس طرح کی باتیں مت کرو۔''

''مجھے پیاس سے نہیں مرنا رستم......'' ناصر ایک بار پھر سسکا۔ ''میں نہیں مرنا چاہتا۔''

''اس سے بُری موت بھی آسکتی ہے......'' رستم نے کہا۔

''پیاسا مرنے کے سوا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جس میں ایسے سسک سسک کے مرا جائے۔'' ناصر کی حالت پتلی تھی۔

''اب اس بارے میں بات کرنا بند کر دو......؟'' رستم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا......'' ناصر نے مایوسی سے کہا لیکن چند لمحے کی خاموشی کے بعد ہی پھر سے بول اٹھا۔ ''یہ بتاؤ کہ ہمارے پاس کتنا پانی باقی رہ گیا ہے؟''

''چند گھونٹ ہی...... اس کے بعد سب خلاص......''

''مجھے میرا حصہ دے دو......'' ناصر نے اپنا گلا مسلتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے حلق میں آگ لگی ہو۔''

رستم نے آگے بڑھنا بند کر دیا۔ وہ بغور ناصر کو دیکھنے لگا۔ شاید اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ باقی ماندہ پانی ضائع کیا جائے یا نہیں۔ اس نے اپنے کندھے پر لٹکی پانی کی دو بوتلوں سے وہ والی اتاری، جس میں تھوڑا سا پانی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ڈھکن کھول کر دو بڑے گھونٹ لیے...... وہ بھی پیاسا تھا اس لیے ایک آخری بار حلق کو اچھی طرح تر کر لینا مناسب سمجھا پھر اس نے بوتل ناصر کی جانب بڑھا دی۔

ناصر نے ایک جھپٹا مار کر اس سے بوتل وصول کی۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل سرخ ریت پر بیٹھ گیا...... اس کی گردن کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ پانی حلق میں تیزی سے اتارتے ہوئے وہ باقاعدہ آواز نکال رہا تھا۔ پانی کی آخری بوند تک اس نے بوتل کو منہ سے لگائے رکھا اور اندر موجود پانی کو چاٹنے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ اس کے بعد وہ بوتل کو سینے سے لگائے ریت پر جھولنے لگا۔ وہ آخری بوندوں کا سواد لیتے ہوئے جھومنے لگا تھا۔

رستم تھوڑی دیر تک اس کی دیوانگی پر مشتمل حرکتیں دیکھتا رہا لیکن پھر اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ...... یہاں ہم نے ساری زندگی نہیں گزارنی ہے۔''

''اب کیا فائدہ؟'' ناصر مایوسی سے بولا۔ ''اب تو ہمارے پاس مزید پانی بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں پیاس سے ہی مر جائیں گے۔''

''میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ اس بارے میں بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے......'' رستم درشت لہجے میں بولا۔

ناصر نے یہ بات سن کر اسے ایسے دیکھا جیسے کوئی معصوم زخمی جانور اپنے شکاری کو آخری بار دیکھتا ہے۔

''رستم...... تمہیں لگتا ہے کہ وہ نکل گیا ہوگا؟''

''کون...... وجدان؟''

''ہاں...... وجدان۔''

''اب اُس...... کے بارے میں تم کیوں سوچ رہے ہو؟'' رستم نے ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔

''اس نے جیپ کے لیے سارا پیٹرول نہیں اٹھایا تھا۔''

''نہیں بھی اٹھایا تھا تو واپسی کے لیے اسے کافی ہو گیا ہوگا۔''

''کیوں رستم کیوں؟ آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟'' ناصر کی آواز میں دنیا بھر کا درد سٹ آیا تھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے اس نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟'' رستم نے الٹا سوال کر دیا۔

''وہ سونے کی ڈلیاں جو ہمیں ملی تھیں...... انہیں بیچ کر امیر ہوا جاسکتا ہے۔'' ناصر نے رک رک کر کہا۔ ''اگر اس ٹوٹی پھوٹی حویلی کی اچھی طرح سے تلاشی لی جائے تو اور بھی ملیں گی...... اتنا سارا کچھ ملے گا کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی بیٹھ کر کھائیں گی...... پھر آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''اسے لالچ کا بخار چڑھ گیا اور کیا......'' رستم تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ اسے ہی مل جائے۔''

''لیکن وہ ہمارا دوست تھا...... ہمارا بھائی تھا۔'' ناصر ابھی تک اس دھوکے کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کر پایا تھا۔

''اچھا فضول باتیں چھوڑو......'' رستم نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بارے میں تب سوچیں گے جب ہم اس چولستان سے نکلیں گے۔''

''ہا...... ہا...... ہا۔'' ناصر ہذیانی انداز میں قہقہے لگانے لگا۔ ''اچھا لطیفہ تھا رستم...... اللہ کی قسم بڑا مزے کا لطیفہ تھا۔ ہا ہا......''

''تمہیں مسئلہ کیا ہے؟'' رستم چڑ گیا۔

''جب ہم یہاں سے نکلیں گے...... تم نے ہی تو کہا

جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔ ہاہاہا۔ اتنی مضحکہ خیز بات کر دی اور اب میں اس پر ہنسوں بھی نا۔" ناصر بے تحاشا قہقہے لگانے کے درمیان بولا۔

رستم کو اس کی بات سمجھ آئی تو وہ غصے سے تڑپ کر ہی رہ گیا۔

"چٹاخ......" اس نے آگے بڑھ کر ناصر کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ناصر کے قہقہوں کو یکلخت ہی جیسے کسی نے لگام ڈال دی۔ وہ زبان سے تو خاموش ہو گیا لیکن اس کی انگلیاں پوری شدت سے پانی کی بوتل پر متحرک تھیں جسے اس نے جانے کب سے گلے لگایا ہوا تھا۔

"تم میرے گلے میں اٹکے وہ چھچھوندر بن گئے ہو جسے نہ اگلا جا سکتا ہے نہ نگلا۔" رستم سخت اشتعال میں تھا۔ "تین دن ہو گئے ہیں اور تم یہی بکواس کرتے جا رہے ہو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا کہ میں تمہیں لات مار کر اکیلا کیوں نہیں نکل جاتا......"

"نہیں......نہیں......نہیں۔" ناصر میں جیسے یہ بات سن کر جان آ گئی۔ "ایسا مت کرنا رستم۔ پلیز...... ایسا مت کرنا۔"

"کھڑے ہو جاؤ پھر......" رستم نے ناصر کو کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

ناصر اپنے قدموں پر کھڑا تو ہو گیا تھا لیکن ابھی بھی وہ جھوم رہا تھا۔ اس سے ایک جگہ پر ٹھہرنا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ رستم نے اس کا ایک بازو تھاما اور آگے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وجدان، رستم اور ناصر عم زاد تھے اور بہاولپور شہر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وجدان اور رستم ہم عمر تھے اور یونیورسٹی کے آخری سال میں تھے جبکہ ناصر ان سے تین سال چھوٹا تھا لیکن پڑھائی میں اچھا ہونے کی وجہ سے کم عمری میں ہی ایف ایس سی کر کے یونیورسٹی میں ڈی فارمیسی میں داخلہ لے چکا تھا۔ وجدان کے والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا اور اس کی والدہ اسے اس کے چچا کے حوالے کر کے اپنے والدین کے پاس چلی گئی تھیں۔ وجدان کے چچاؤں نے اسے اپنے بھائی کی اولاد کے بجائے اپنی اولاد سمجھ کر پالا تھا اور کبھی کوئی فرق روا نہیں رکھا تھا۔

ایک ہی گھر میں یہ تینوں رہتے بھی بھائیوں کی طرح تھے اور باہر لوگوں کو جب تک یہ مکمل تعارف نہیں کرواتے تھے تب تک انہیں معلوم نہیں پڑتا تھا کہ یہ سگے بھائی نہیں ہیں۔ کوئی چھ ماہ قبل ایک بس حادثے میں ناصر اور رستم کے والدین اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ تب تینوں نے مل جل کر ہی ایک دوسرے کا غم بانٹا تھا۔

"یہ کس زمین کے کاغذات ہیں؟" ایک دن رستم نے اپنے والد کی دستاویزات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک پلندا نکال کر دونوں کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو ہمارے پردادا کی زمین ہے چولستان میں......" وجدان کاغذات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ ان کے دادا جب بہاولپور شفٹ ہوئے تھے تو اپنے پیچھے چولستان کی کئی ایکڑ زمین چھوڑ آئے تھے۔ بارشوں کے فقدان اور قحط سالی نے وہاں سے کئی لوگوں کو اپنی زمین چھوڑ دینے پر مجبور کیا تھا۔ اپنا بچا کھچا اثاثہ لے کر جب وہ بہاولپور میں منتقل ہوئے تو...... کبھی پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ اگرچہ اب ان علاقوں میں نہری پانی پہنچ چکا تھا لیکن اولاد پڑھ لکھ کر پھر سے کھیتی باڑی کو بطور پیشہ اپنانے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ ویسے بھی رستم کے والد کے نزدیک یہ زمین کوڑیوں کے مول بکتی اس لیے انہوں نے زیادہ سر درد لینے کے بجائے اسے ایک جانب ڈال کر بھول جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

قانونی اور وراثتی طور پر یہ زمین اب رستم، وجدان اور ناصر کی تھی۔ تینوں کا یونیورسٹی سمسٹر ختم ہو چکا تھا اس لیے ایڈونچر کرنے کی غرض سے انہیں اپنی زمینوں کا دورہ کرنے کا شوق چرایا تھا۔

انہوں نے اپنی تیاری مکمل کی۔ خشک خوراک اور پانی کی ایسی بوتلوں کا ذخیرہ کیا جو تھرموس کے مانند ٹھنڈے کو ٹھنڈا رکھتی تھیں۔ خیمہ اور دیگر ضرورت کا سامان بھی انہوں نے ہمراہ کر لیا تھا۔ تین چار دن وہ بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی والدین کی اچانک حادثاتی موت کے بعد سے وہ گھر کے ہی ہو کر رہ گئے تھے اس لیے یہ ٹرپ ایک طرح سے ان کے لیے زندگی کی جانب واپس لوٹنے کا پہلا قدم تھا۔

"ابے یہ جیپ ہے یا کوئی کھوتا ریڑھی؟" وجدان جب جیپ لے کر آیا تو رستم بے ساختہ بولا۔

"جب چلے گی تو پوچھوں گا کہ یہ کھوتا ریڑھی تھی یا ایف سکسٹین......؟" وجدان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

جیپ پرانے ماڈل کی تھی لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ جب وہ بہاولپور سے براستہ احمد پور اور ڈیرا نواب ہوتے ہوئے چولستان میں داخل ہوئے تو رستم...بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں کے شاکس کچھ اتنے اچھے نہیں ہیں..... لیکن باقی گاڑی بہترین ہے۔ اور ڈرائیور تو تو بڑا ہی کوئی کمینہ ہے۔" رستم نے وجدان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ان تینوں میں زبان کا کافی تیز واقع ہوا تھا۔ باقی دونوں اکثر اس کی "زبان درازی" کا شکار ہوتے رہتے تھے۔

وہ سہ پہر کے وقت وہاں پہنچے۔ سورج ڈھلنے لگا تھا لیکن اس کی تمازت ابھی بھی برقرار تھی۔ کسی زمانے میں وہاں ایک حویلی بھی تھی لیکن حوادثِ زمانہ کا شکار ہو کر اب ایک ویران آسیبوں کا ٹھکانا معلوم پڑتی تھی۔ وہاں پہنچ کر جب انہوں نے حویلی کا جائزہ لیا تو دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ حویلی کی چھت کافی جگہ سے منہدم ہو چکی تھی اور دھوپ اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اندر سے بالکل ہی کسی بدروحوں کے تاریک ٹھکانے کا تاثر دیتی۔

"ارے یہ دیکھو..... یہ کیا ہے؟" ناصر نے اُن دونوں کو پکارا۔

وہ ایک پرانے طاقچے کے پاس ٹھہرا تھا جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اپنی اصل شکل کھو چکا تھا۔ اس کے ایک کونے پر چھت کے ٹوٹے ہوئے حصے سے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور وہاں کوئی چیز جگمگا رہی تھی۔ وہاں ایک پوٹلی کی جھلک نظر آ رہی تھی جس کے بیچ میں کچھ چمک رہا تھا۔ وجدان اور رستم بھی وہاں آ گئے۔ معمولی تگ و دو کے بعد جب وہ پوٹلی نکالنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پوٹلی میں بسکٹ جیسی شکل کی سونے کی ڈلیاں چمک رہی تھیں۔ اس پوٹلی میں موجود سونے کا وزن کوئی چار پانچ کلو کے لگ بھگ ہی تھا۔ وجدان نے فوراً ہی طاقچے کو مزید کھودنا شروع کیا لیکن چھت سے گرنے والے ملبے نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تینوں پوٹلی اٹھا کر باہر آ گئے..... وہ تینوں ہی سونا ملنے پر بے حد پُرجوش تھے۔

"میرے خیال میں ہم لوگ ابھی یہیں رکتے ہیں..... شام اور رات کا سفر مناسب نہیں رہے گا۔" وجدان نے رائے دی۔ "ویسے بھی کل دن میں نکلنے کے بعد اس سونے کا بندوبست کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا....." رستم نے اس کی تائید کی۔

سونا ملنے اور باتوں میں انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ وہ رات کے قیام کے لیے خیمہ لگانے لگے۔ انہوں نے الاؤ بھی روشن کر لیا جس پر ڈبا بند خوراک گرم کرنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے ان کے درمیان پھر سے سونے کے بارے میں بات چیت کا آغاز ہو گیا۔

"کیا تم دونوں کو بھی لگتا ہے کہ اس حویلی سے ہمیں مزید سونا مل سکتا ہے؟" ناصر نے پوچھا۔ اس پر رستم اور وجدان کا قہقہہ نکل گیا۔

"لگتا نہیں...... بلکہ یقین ہے۔" رستم بولا۔

"شہر جا کر اس سونے کو محفوظ کرنے کے بعد پہلا کام ... ہم کو یہی کرنا ہے کہ آلات وغیرہ لے کر یہاں آئیں اور کھدائی کر کے مزید خزانہ نکال لیں۔" وجدان نے کہا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس بات کی بھنک بھی کسی کو نہ پڑے۔ سنا ہے کہ حکومتِ پاکستان ایسے دفینوں کے ملنے پر صرف دس فیصد ڈھونڈنے والے کو دے کر باقی ماندہ اپنے تصرف میں رکھ لیتی ہے۔"

"یعنی اگر ایک کروڑ کا خزانہ ہمیں ملے تو اس میں سے صرف دس لاکھ ہمارے حصے میں آئیں گے؟" رستم نے منہ بنایا۔

"اور اس کے بعد تین برابر حصے دار ہونے پر محض تین لاکھ تینتیس ہزار تین سو تینتیس روپے۔" ناصر نے حساب کتاب مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ایک روپیہ بچ گیا.....اس کا کیا کرتا؟" وجدان جل کر بولا۔

"کیا یاد کرو گے ہماری سخاوت...... بچپن سے تمہیں پالتے آئے ہیں سو وہ تم رکھ لینا....." رستم نے چوٹ کی جس پر وجدان مزید سلگ کر رہ گیا لیکن ہنسی مذاق کے ماحول میں ہی بات ٹل گئی۔ ایسے ہی باتیں کرتے ہوئے وہ سو گئے لیکن وجدان جاگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں شیطان ڈیرے ڈال چکا تھا اور وہ اپنی الگ ہی کھچڑی پکانے میں مصروف تھا۔

صبح ناصر اور رستم کی آنکھ جیپ کا انجن غرانے کی آواز سے کھلی..... جب تک وہ خیمے سے باہر نکلتے، وجدان سب کچھ سمیٹ کر نکل چکا تھا۔

☆☆☆

اب انہیں تیسرا دن تھا اور وہ چولستان کے ریگزار میں بھٹک رہے تھے۔ وہ چلتے جا رہے تھے لیکن ایک ٹیلا عبور کرتے تو اس سے بلند ایک اور ریت کا ٹیلا ان کا منتظر ہوتا۔ ریتیلی زمین ان کے قدموں تلے جیسے گرم توا بنی ہوئی تھی۔ بوٹ پہنے ہونے کے باوجود تپش ناقابلِ برداشت تھی۔ کوئی

پُراسرار آنکھیں جو انہیں دیکھ رہی تھیں لیکن نظروں سے اوجھل تھیں...... شاید یہ موت کی نگاہیں تھیں۔ وقت بھی کسی کے لیے نہیں رکتا لیکن ان کے لیے جیسے اس بیابان میں وہ بھی تھم کر رہ گیا تھا۔

"رستم......"

"اب کیا ہے؟"

"ہم...... ہم کچھ دیر کے لیے آرام نہیں کر سکتے؟" ناصر کے لہجے سے بے چارگی ٹپک رہی تھی۔

رستم نے آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا...... دور اُفق پر نارنجی لہریں امنڈ آئی تھیں۔ سورج کی سرخی ایسا تاثر دے رہی تھی کہ جیسے کوئی کانا جنونی قاتل انہیں اپنی اکلوتی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔

"ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا......" رستم بولا۔ "ہم تب آرام کریں گے۔"

اپنی پشت پر لدے بوجھ کو اس نے اس دوران ہلایا جلایا تا کہ مستقل وزن کے درد سے نجات حاصل کر سکے۔ کینوس کے بنے اس بیگ میں کھانے کا خشک سامان موجود تھا۔ رستم کے انکار پر ناصر کی شکل ایسی ہو گئی کہ جیسے ابھی رو دے گا۔ رستم پروا کیے بغیر آگے بڑھنے لگا...... وہ جانتا تھا کہ ناصر کے بدن میں اتنی نمی بھی باقی نہیں رہی تھی کہ وہ روتے ہوئے آنسو بہا سکے۔ ناصر اس کے پیچھے سست روی سے بڑھنے لگا۔

انہوں نے ابھی چلتے ہوئے کوئی ڈیڑھ دو کلو میٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ ناصر پھر سے رک گیا۔

"وہ...... وہاں پر کچھ ہے۔" ناصر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا......"

"وہاں اُس طرف......" ناصر نے رستم کے قریب ہو کر اس جانب اشارہ کیا تا کہ صحیح سمت سمجھا سکے۔

"کیا ہے؟" رستم نے قدرے شش و پنج سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ناصر کی نظر واقعی اس سے کہیں گنا تیز ہے۔

"پتا نہیں...... ہم بہت دور ہیں اُس سے...... صحیح سے معلوم نہیں پڑ رہا۔"

وہ اس جانب ہی بڑھنے لگے۔ ان کی آنکھیں مسلسل تیز دھوپ میں دیکھنے کی وجہ سے دکھنے لگی تھیں۔ پپوٹے بھی سوج کر درد کرنے لگے تھے۔

"رستم......" ناصر یکلخت ہی چلّا اٹھا۔ "اوہ میرے خدا...... رستم دیکھو...... وہ جیپ ہے...... ہماری جیپ۔"

رستم کو بھی شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ ناصر کی بات سچ ہے۔ وہ مزید کچھ سننے کے بجائے جیپ کی جانب دوڑنے لگا۔ جلدی میں گرتے پڑتے وہ اس جانب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔

یہ انہی کی جیپ تھی لیکن شدید خستہ حالت میں...... چند جھاڑیوں کے پاس وہ الٹی پڑی تھی۔ وہاں پر گڑھا سا بنا ہوا تھا جس میں شاید وہ قریبی ٹیلے سے پھسل کر گری تھی۔ اس کے تین ٹائر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ونڈ اسکرین ٹوٹ کر بکھر چکی تھی...... اور پوری باڈی میں ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ کافی شدید قسم کا حادثہ لگ رہا تھا۔

رستم نے آگے بڑھ کر جائزہ لیا لیکن جیپ کے اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ گڑھے میں اور آس پاس بھی کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ وجدان کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی پانی کی وہ چار بوتلیں جیپ میں تھیں جو وہ حویلی سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

ناصر تھوڑی ہی دیر میں ہانپتا کانپتا وہاں تک آن پہنچا۔

"وجدان؟" اپنی سانس بحال کرتے ہوئے اُس نے بمشکل پوچھا۔

"یہاں نہیں ہے۔ نکل چکا۔"

"ہماری طرح...... پیدل؟" ناصر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں......"

"کیا ہوا؟ اس نے جیپ کیسے تباہ کر ڈالی؟"

"شاید رفتار ضرورت سے زیادہ تیز تھی اور وہ قابو نہ رکھ پایا...... جیپ کے شاکس پہلے ہی اچھی حالت میں نہیں تھے اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" رستم نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

"کیا ہم اِسے ٹھیک کر سکتے ہیں؟ یہ چلنے لگ جائے گی؟"

"نہیں......"

"کیوں نہیں......؟" ناصر کو رستم کے انکار پر مایوسی ہوئی۔ "تمہیں اللہ کا واسطہ ہے رستم...... اِسے ٹھیک کر لو۔"

"اس کا ریڈی ایٹر خراب ہو چکا...... ٹائر برسٹ ہو چکے...... انجن اور اسٹیئرنگ بھی ٹوٹ پھوٹ سے نہیں بچے ہیں۔ اسے ہم نے کسی معجزے کی مدد سے چلا بھی لیا تو تمہارے خیال میں یہ کہاں تک چل پائے گی؟" رستم نے جیپ کی تباہ شدہ حالت کی تفصیل ناصر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ریڈی ایٹر......" ناصر ایسے بولا جیسے اس کے دماغ کی بتی روشن ہو چکی ہو۔" رستم اس کا ریڈی ایٹر......"

"میں پہلے ہی دیکھ چکا...... اگر اس ایکسیڈنٹ کے بعد اس میں کوئی پانی تھا بھی تو وجدان نے وہ بھی نکال لیا۔"

"نہیں......" ناصر اب کی بار قابو نہ رکھ پایا۔ وہ پوری شدت سے چلایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونے لگا۔ وہ دونوں بازو جسم سے لپیٹے جھوم رہا تھا اور ساتھ ساتھ روئے جا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" رستم بھی اب ضبط کھونے لگا تھا۔ "اٹھو......"

"کوئی فائدہ نہیں......" ناصر ہذیانی انداز میں بولا۔ "کوئی فائدہ نہیں...... ہم یہاں پیاس سے ہی مر جائیں گے۔"

"بے غیرت، کتے...... اٹھ جا۔ وہ...... کا بچہ بھی یہیں کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ چل اسے کہیں چل کر ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے پاس پانی کی چار بوتلیں ہیں۔ ہم اسے پکڑ بھی سکتے ہیں۔" رستم نے وجدان کے ساتھ ساتھ ناصر کو بھی بے دریغ گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

"کیسے......؟ وہ تو کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوگا۔"

"کیا پتا جیپ کریش ہوتے وقت وہ بھی زخمی ہو گیا ہو۔ اگر وہ پیدل ہونے کے ساتھ ساتھ زخم خوردہ بھی ہے تو زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔"

"اس کے پاس دو ڈھائی دن سے زیادہ کا وقت تھا رستم......" ناصر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی اس صورت میں جب یہ ایکسیڈنٹ وہاں سے نکلنے کے پہلے دن ہی ہو گیا ہو۔"

"تو بیٹھ کر حساب کتاب کر...... اور یہیں مرتا رہ۔" رستم گڑھے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"کوئی فائدہ نہیں رستم...... کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

ناصر چلاتا رہا لیکن رستم نے اس بار اسے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ گڑھے کا جائزہ لینے کے بعد وہ مغرب کی جانب چلنے لگا۔ ناصر ابھی تک گھٹنوں کے بل بیٹھا اسے دیکھتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں رستم اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ صبر نہ کر سکا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتی چال چلتے ہوئے وہ اس کے پیچھے روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شام کا دھندلکا پھیلنے ہی لگا تھا جب رستم نے پہلی پانی کی بوتل دیکھی۔

خستہ حال جیپ سے کچھ فاصلے پر ہی اسے کچھ نشانیاں ملی تھیں جن کو دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ راستے میں اسے ٹوٹی ہوئی جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی علامتیں بھی دیکھنے کو ملیں جس سے معلوم پڑتا تھا کہ وجدان کا آگے کا سفر چلنے پر کم اور گھسٹنے پر زیادہ مشتمل ہے۔

نقش پا پہلے شمال کی جانب تھے اور پھر یکلخت ہی بدل کر مغرب کی سمت ہو گئے تھے جہاں ڈیرا نواب نامی شہر واقع تھا۔ اس چولستان میں داخل ہوتے وقت وہی آخری بڑا شہر تھا۔ شہر تو وہ نام کا ہی تھا اسے البتہ ایک قصبہ ضرور کہا جا سکتا تھا۔

پانی کی بوتل کانٹے دار جھاڑیوں کے ساتھ پڑی تھی۔ رستم نے اسے اٹھایا اور ہلا کر دیکھا۔ خالی...... اس نے مایوسی سے اسے اپنے کینوس کے تھیلے میں ڈال لیا۔ دور اسے ناصر بھی دکھائی دے رہا تھا جو اس طرح سے قدم اٹھاتے ہوئے آ رہا تھا جیسے نشے میں ہو۔ اسے نظر انداز کر کے رستم نے پھر سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

کوئی پانچ منٹ کے فاصلے پر ہی اسے دوسری پانی کی بوتل بھی نظر آ گئی۔ وہ بھی خالی تھی...... اس کی بے تابی مزید بڑھ گئی۔ وہ اپنی بچی کچھی ہمت مجتمع کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

وہ مزید کوئی سو قدم ہی چلا ہوگا جب اُسے تیسری بوتل دکھائی دی...... تبھی اس کی نگاہ اس پر پڑی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک گدھ بیٹھا تھا۔ سرمئی پڑتے آسمان پر کچھ اور پرندے بھی منڈلا رہے تھے لیکن وہ بڑا سا گدھ اپنی پوری ہیبت کے ساتھ ایک جانب دیکھ رہا تھا۔ وہاں قریب ہی ایک ٹیلے کے ساتھ موجود قد آدم جھاڑیوں نے ایک سایہ دار جگہ بنا دی تھی جہاں اس کی بھوکی نگاہیں مرکوز تھیں۔

رستم دوڑتے ہوئے وہاں تک پہنچا...... وہ اپنے بازو تیزی سے ہلا رہا تھا، پرندے کو اُڑانے کی کوشش میں وہ چلا بھی رہا تھا لیکن پیاس کی شدت کے باعث اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ آواز سے زیادہ اس کے بازو ہلانے سے وہ گدھ اپنے بڑے بڑے پر ہلاتا ہوا وہاں سے اُڑ گیا لیکن وہ کہیں دور نہیں گیا تھا...... اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں اس کے سر پر ہی منڈلا رہا تھا۔ رستم جھاڑیوں کے سائے میں موجود بے حس و حرکت جسم کے پاس پہنچا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

وجدان کی ابھی سانسیں چل رہی تھیں لیکن ڈوبتی ہوئی نبض اور اس کی برباد حالت دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا

کہ وہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ انتہائی غیر فطری انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ یہ اس کی ہمت اور حوصلہ ہی تھا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ تقریباً تین دن میں وہ ایک میل کا سفر طے کر چکا تھا۔

چوتھی بوتل اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ وجدان کی گرفت کافی مضبوط تھی لیکن رستم کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے زور لگا کر بوتل اس سے چھینی اور اپنے منہ سے لگالی۔ خالی...... یہ بھی بالکل خالی تھی اور پانی کی ایک بوند تک نہ تھی۔ بوتل ایک جانب پھینک کر وہ وجدان کو جھنجوڑنے لگا۔

''کتے...... خود تو مر رہا ہے، ہمیں بھی جیتے جی مار ڈالا۔'' رستم منہ میں آنے والی ہر گالی سے وجدان کو نواز رہا تھا لیکن وہ اس سب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ عالم نزاع میں اپنے برے بھلے کی تمیز کھو چکا تھا۔

رستم نے اسے ایک جانب دھکیلا اور اس کے کندھے سے بیگ اتارنے لگا۔ بیگ کھول کر دیکھا تو اس میں سونے کی ڈلیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے شدید مایوسی ہوئی...... منزل سمجھ کر یہاں پہنچنے کے باوجود وہ اپنے مقصد کو نہ پاسکا تھا۔ یہ سونا اس کے کسی کام کا نہ تھا۔ پانی کی چند بوندوں کے سامنے اس وقت تمام کائنات کے خزانے بھی ہیچ معلوم ہو رہے تھے۔

دوڑتے قدموں کی آواز سن کر وہ بمشکل کھڑا ہو پایا۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اپنی سوجی آنکھوں کے ساتھ وہ بس وجدان کو گھورے جا رہا تھا جو کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ریت پر لیٹا تھا۔

''رستم...... تم نے ڈھونڈ لیا اسے؟'' ناصر نے آتے ہی پوچھا۔

''ہاں مل گیا یہ......'' رستم نے ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ مر چکا ہے؟''

''ہاں...... تقریباً۔''

''پانی کا بتاؤ...... وہ کہیں سے ملا؟''

''نہیں...... ایک بوند تک نہیں بچائی سالے نے۔''

''اوہ میرے اللہ...... اب کیا ہوگا رستم؟'' ناصر رونے لگا۔

''بکواس بند کرو......'' رستم دہاڑا۔ ''اپنی یہ نحوست پھیلانا بند کرو گے تو میں کچھ حل سوچ پاؤں گا۔''

''ختم ہو گیا...... سب کچھ ختم ہو گیا...... اب ہم نہیں بچ پائیں گے۔'' ناصر پر الٹا ہی اثر پڑا اور وہ مزید زور و شور سے رونے لگا۔

''یار تم رونا بند کرو گے......؟'' رستم نے اس بار قدرے نرمی سے کہا۔

''ہم دونوں بھی اس کی طرح مر جائیں گے......''

ناصر کے ذہن پر موت کا خوف سوار ہو چکا تھا اور وہ اپنی ہی رو میں بولتا جا رہا تھا۔ ''ہماری موت بھی پیاس سے ہوگی۔ ہماری لاشیں گدھ نوچیں گے۔''

رستم کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے ناصر کو ایک لات رسید کر دی۔ ناصر لات کھا کر ریت پر گر گیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا......'' رستم سختی سے بولا۔ ''سن رہے ہو نا تم...... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''ہم مر جائیں گے...... ہم مر جائیں گے...... ہم مر جائیں گے......'' ناصر اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا اور بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کیے جا رہا تھا۔

''ہم نہیں مریں گے......'' رستم اتنی زور سے دہاڑا کہ ایک بار اس کی آواز اس ویرانے میں گونج کر ہی رہ گئی۔

☆☆☆

جھلسی جلد، سکڑے بدن اور سر تا پا ریت میں اٹے ہوئے وہ کسی مجسمہ ساز کے نرم مٹی سے تراشے ہوئے نمونے لگ رہے تھے۔ چار دن بعد وہ چولستان کی سختیاں برداشت کرنے کے بعد قریبی آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو پائے۔

ان کی ہیئت کذائی اور بعد میں سنائی جانے والی داستان سننے والوں کے لیے حیرت کا موجب تھی۔ کسی ایکشن فلم کا گمان ہونے والی اس کہانی نے علاقے کے لوگوں کو پُرجوش کر دیا تھا۔ وہ ان کی آمد پر ایسے خوش تھے جیسے رستم اپنے تھیلے میں موجود سونے کی ڈلیوں کی موجودگی پر تھا۔ ڈیرا نواب میں ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی...... ان کا استقبال کسی مشہور شخصیت کی طرح ہی کیا گیا تھا۔ ویسے بھی اب وہ مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ امیر بھی ہو چکے تھے۔

وہ امیر ہو چکے تھے لیکن انہوں نے کسی کو اصل واقعے کی بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ جہنم سے فرار پا کر آئے تھے اور اس بات نے انہیں علاقے کے ہیرو کا درجہ دے دیا تھا۔

ایک ہفتہ سے زائد اسپتال میں انتہائی نگہداشت میں گزارنے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوئے کہ اپنی نارمل روٹین کا آغاز کر سکیں۔ اس عرصہ میں جھلنے والے زخم بھر چکے تھے۔ ناصر کو اس دوران بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ وہ عجیب

طرح کا رویہ اختیار کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں ہمہ وقت گردش کرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی کبھی غیر انسانی آوازیں نکالنے لگتا تھا۔ ابتدا میں تو ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ اس صدمے سے گزرنے کے بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے تو اسے کسی نفسیاتی علاج گاہ میں منتقل کرنا ہی مناسب ہوگا۔ کچھ دنوں بعد اس کی حالت میں بہتری آئی تو انہوں نے اپنی رائے بدلی...... لیکن اب وہ نہایت خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی خاموشی پر رستم نے زیادہ توجہ نہ دی...... اس کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناصر کی حالت مزید بہتر ہو جائے گی۔

''جب آپ امیر ہوتے ہیں تو آپ کے سارے مسئلے امارت کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔'' ایک شام ناصر سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا۔

ناصر نے حسبِ توقع کوئی جواب نہ دیا۔

وکٹوریا اسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد وہ بہاولپور اپنے مکان میں واپس آ چکے تھے۔ اس کے بعد سے ہی رستم نے چولستان میں موجود اپنی آبائی زمین کے قانونی حصول و منتقلی کے لیے کوششیں تیز کر دی تھیں۔ وہ وہاں پورے حق کے ساتھ جا کر حویلی کی ایک ایک اینٹ کھرچ کر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ مزید کا حصول اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

ایک رات وہ واپس آیا تو ڈائننگ روم میں ناصر اندھیرے میں بیٹھا تھا۔

''لائٹ تو جلا لیا کرو......'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا لیکن لائٹ جلانے کی زحمت نہ کی۔ دوسرے کمرے سے آتی روشنی ہی ماحول کو دیکھنے کے قابل بنا رہی تھی۔ وہ اسے چولستان جانے کے حوالے سے اپنے انتظامات کا بتانے لگا۔ ناصر نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔

رستم نے بھی کندھے اُچکائے اور فریج سے ایک پیپسی کا ٹن نکال کر کھولا اور وہیں ٹھہر کر پینے لگا۔

''میں کچھ سوچ رہا ہوں رستم......'' اس کے پیچھے سے ناصر بولا۔

''تمہارے لیے اچھا ہے...... کیا سوچا؟''

''میں وجدان کے بارے میں سوچ رہا ہوں......'' ناصر نے اپنی آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

رستم چند لمحوں تک اسے بغور دیکھتا رہا پھر پیپسی کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے گویا ہوا۔

''تمہیں اُس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔''

''کیوں؟''

''بس نہیں سوچنا چاہیے...... بلکہ اُسے بھول جاؤ تو ہی اچھا ہوگا۔'' رستم بولا۔

''میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں رستم......؟'' ناصر کی آنکھوں میں جہان بھر کے سوالات در آئے تھے۔ ''اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ چولستان میں دراصل کیا ہوا تھا تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟''

''پاگل مت بنو ناصر......'' رستم کا لہجہ درشت ہو گیا۔

''ہم پیاسے تھے...... بہت شدت سے پیاس لگی تھی۔ ہے نا؟'' ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ ہم نے جو کیا، وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہی کیا۔''

''ہاں......'' ناصر بولا۔ ''ہم نے اپنی جان بچانے کے لیے وہ سب کیا جو ہم کر سکتے تھے۔''

وہ کرسی سے اٹھ کر رستم کے پاس آ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ناچ رہی تھی۔

رستم کو پہلی بار اُس سے خوف محسوس ہوا۔

''کک...... کیا؟'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی کہیں اٹک کر رہ گئے تھے۔

''تم جانتے ہو رستم...... ہم کیا ہیں؟ تم جانتے ہو ہم کیا بن گئے ہیں؟ میں کیا بن گیا ہوں؟'' ناصر کے لہجے میں کسی درندے کی غراہٹ گونج رہی تھی۔ ''جانتے ہو جب ہم نے وجدان کو چیر پھاڑ کر اس کا خون بوتلوں میں اکٹھا کیا تھا تو ہم کیا بن گئے تھے؟''

ناصر نے پینٹ میں اُڑسا ہوا خنجر نکال لیا۔ اندھیرے میں رستم پہلے نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اب خنجر کی خطرناکی دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا تھا۔ اس سے کچھ بھی نہیں بولا جا رہا تھا۔

''ہم جانور بن گئے تھے۔'' ناصر نے سرگوشی کی۔

رستم سب جانتا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ بھاگتا...... اسے دیر ہو چکی تھی۔ ناصر دھکا دے کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور خنجر اس کے گلے میں گھونپ دیا۔ اس کے گلے سے خون بھل بھل کرتے ہوئے بہنے لگا۔

''میں پیاسا ہوں...... میں ابھی بھی پیاسا ہوں رستم۔'' ناصر ہذیانی قہقہے لگا رہا تھا اور اس کے قہقہے... پورے مکان میں گونج رہے تھے۔

❖❖❖

شعرزدہ

منظر امام

کہانیاں مصنف کی پہچان ہوتی ہیں... آغاز ہی سے دامن پکڑ لیتی ہیں... منظر امام کا اندازِ تحریر اور قلم کی روانی وقت گزرنے کا احساس چھین لیتی ہیں... اس دفعہ ان کے کردار شعرو شاعری کے میزان سے الجھے ہوئے ہیں۔

مجھے میرے احساس نے مار دیا تھا۔

یہ کیا بات ہوئی کہ زندگی کی کوئی خوشی میرے پاس نہیں تھی۔ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔

دولت تو بہت دور کی بات ہے، کوئی گیسو کسی آنچل کا سہارا بھی نہیں تھا۔ اسی ناامیدی کی کیفیت میں اپنے ایک جاننے والے اطہر بھائی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایسے آدمی تھے جن کو میں نے ہمیشہ خوش ہی دیکھا تھا۔

میں نے جب ان سے ان کی ہر دم خوشی کا راز پوچھا تو

ہنستے مسکراتے انداز میں شعر گوئی سے شعرزدہ ہو جانے والے مظلوم کا احوال

انہوں نے جواب دیا جو بہت آسان تھا۔ "میاں ایک شعر سُن لو۔ اسی میں راز چھپا ہوا ہے۔"

"چلیں سنا دیں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔" انہوں نے شعر سنا دیا۔

شعر واقعی بہت اچھا تھا اور ایک فارمولہ بتا دیا گیا تھا کہ اس پر عمل کر جاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"اطہر بھائی۔ شعر تو بہت اچھا ہے۔" میں نے تعریف کی۔

"میاں فارمولہ بھی اچھا ہے۔ تم ابھی سے اس پر عمل کرو۔ ایک ہفتے کے بعد آ کر بتاؤ۔ کیا ہوا؟"

میں اطہر بھائی کے پاس ایک خاص کام سے گیا تھا۔ اس دن میری جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میں اطہر صاحب سے ایک ہزار روپے لے لوں گا۔ اس کے بعد وہیں سے ٹیکسی کر کے راستے سے کھانے پینے کی چیزیں لے کر گھر واپس آ جاؤں گا۔ کم از کم دو دنوں تک کا خرچ چل ہی جائے گا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ابھی تک شادی نہیں ہو سکی تھی۔

"اب یہ بتاؤ کہ اگر ہزار روپے مل جائیں تو تم خوش ہو جاؤ گے؟"

"ظاہر ہے اطہر بھائی۔ اس سے کئی کام نکل جائیں گے۔"

"تو بس میں تمہیں پیسے نہیں دے رہا۔ تم کو ابھی سے اس فارمولے پر عمل کرنا ہے۔ دیکھ لینا تم نے اس شعر کو اپنے ذہن میں اتار لیا تو پھر تمہیں کوئی غم بھی نہیں ہوگا۔"

میں ان ...... سے پیسے لیے بغیر اس شعر کی سوغات لے کر واپس آ گیا۔

گھر آ کر مجھے نفیسہ کا خیال آیا۔ میں نے نفیسہ نام کی ایک لڑکی سے محبت کی تھی جو یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے باپ سے جا کر ملوں۔ میں نے اسے ایک شعر بھی سنایا تھا۔

میری حیات کی راہوں میں پیچ و خم ہیں بہت
یہ خوب سوچ لے پہلے جو میرے ساتھ چلے

نفیسہ کے باپ سے ملاقات کو میں ابھی تک ٹال رہا تھا لیکن اب ان سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھے۔ ان کے ذریعے کوئی جاب بھی ہو سکتی تھی۔

میں نے نفیسہ کو فون کر کے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں تمہارے ابو سے جا کر مل ہی لوں۔"

"ہاں ہاں چلے جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں نے ابو سے بات کی ہوئی ہے۔ بس ان کو تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ وہ تمہارا انتظار ہی کر رہے ہیں۔ تم ان سے جا کر مل لو۔"

نفیسہ کے والد ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار تھے۔ بہت دھاک تھی ان کی۔ ان کے پاس جاتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی لیکن نفیسہ نے مجبور کر کے مجھے ان کے دفتر بھیج ہی دیا۔

اس نے اپنے ابو سے میرے بارے میں بات کر لی تھی۔

میں دوسرے دن بہترین ڈریسنگ کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنی پوری شان کے ساتھ اپنے کمرے میں ہی تھے۔

"آؤ صاحب زادے، آؤ۔ نفیسہ نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔"

"جی...... جی جناب۔" میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا انٹرویو دے رہا تھا۔

"تم خدانخواستہ میری بیٹی سے عشق تو نہیں کرنے لگے ہو؟"

انہوں نے ایک ایسا سوال کیا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی باپ نے براہِ راست ایسا سوال ہونے والے داماد سے کبھی نہیں کیا ہوگا۔

"شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

"عشق کیا جناب، بس نفیسہ مجھے بہت پسند ہے۔ میں اسے ہر حال میں خوش رکھوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی ہماری گفتگو اتنی آگے نہیں بڑھی کہ تم خوش رکھنے یا نہ رکھنے کی بات کرو۔" انہوں نے کہا۔

میں ایک بار پھر چکرا کر رہ گیا۔ عجیب بے دھڑک انسان تھے۔

"کام کیا کرتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جاب کی تلاش میں ہوں جناب۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ بہت جلد کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔"

"اور اس وقت تک کیا اپنی بیوی کو بھوکا رکھو گے؟"

''نہیں جناب، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو خود کھاؤں گا اس کو بھی کھلاؤں گا۔''

''جب تمہارے پاس خود کھانے کو نہیں ہے تو اس کو کہاں سے کھلاؤ گے؟''

''اس کی فکر نہ کریں۔ شادی کے بعد نفیسہ میرا مسئلہ ہوگی۔''

''لیکن شادی سے پہلے تک تو میرا مسئلہ ہے نا؟ اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تم جیسے ناکارہ انسان سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔''

میرے سینے پر برچھیاں سی چل کر رہ گئیں۔ نفیسہ میرے لیے سب کچھ تھی۔ زندگی میں اب تک سوائے محرومیوں کے اور کیا ملا تھا۔ کوئی خوشی نہیں۔ کوئی ترنگ نہیں۔ اب وہ بھی ہاتھ سے چلی گئی تھی۔ دل چاہا کہ در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر آنسو بہاؤں۔

اور ابھی وقت اطہر بھائی کا شعر یاد آ گیا۔ ''خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔''

کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ نفیسہ نہیں ملتی نا سہی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں کیوں ایک روگ پال کر بیٹھ جاؤں۔ خوشی کو چھوڑ دے۔ اور میں نے خوشی کو چھوڑ دیا۔ میں نے نفیسہ کو فون کر کے مطلع کر دیا تھا کہ میں زندگی کی راہ میں اس کا ہم سفر نہیں بن سکوں گا۔

وہ کچھ دیر کی بک بک کے بعد خاموش ہو گئی۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کے باپ کا فیصلہ درست ہی تھا۔

اب زندگی کے کٹھن شب و روز میرے سامنے تھے۔ گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی اپنا کھانا خود ہی بنا لیا کرتا تھا۔ ورنہ عام طور پر سامنے والے ہوٹل سے جا کر کھا لیتا تھا۔

میں محلے کی دکان پر پہنچ گیا۔ دکان دار مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ شاید اسے خیال آیا ہو کہ میں اس کا پچھلا قرض ادا کرنے آیا ہوں۔

''تنویر بھائی! چائے تو چلے گی نا؟'' اس نے پوچھا۔ ''بس دو منٹ میں آ جائے گی۔''

''نہیں بھائی، مجھے اس وقت چائے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو بس دو کلو آٹا۔ ایک کلو چینی اور کھانے کا تیل دے دو۔''

''ابھی لو۔ پچھلا حساب تو لے کر آئے ہو نا؟''

''نہیں بھائی، میں تو یہ بھی اُدھار لے کر جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

اچانک وہ بھڑک اٹھا۔ اس کی خوش اخلاقی ختم ہوگئی۔

"رہنے دو بھائی رہنے دو۔ کمال ہے پچھلا قرض ادا نہیں کیا اور چلے آرہے ہیں ادھار لینے۔ اب کیا اس محلے میں بے وقوف بنانے کو ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ جاؤ بھائی کوئی اور دکان ڈھونڈو۔"

اس کی بک بک سن کر بہت دکھ ہوا۔ سوچا تھا کہ سامان مل جائے گا تو دو چار وقتوں کے کھانے ایک ساتھ بنا کر رکھ لوں گا اچانک ایک بار پھر اطہر بھائی کا شعر یاد آگیا۔" خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔"

میں نے خوشی چھوڑ دی اور کچھ لیے بغیر ہی واپس آگیا۔ ہشاش بشاش۔ کوئی غم نہیں تھا۔ دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

گھر کے دروازے ہی پر نیازی صاحب کھڑے ہوئے دکھائی دے گئے۔ نیازی صاحب اپنی نوعیت کے ایک کمال انسان ہیں۔ بہت خوش اخلاق اور بہت ہی شاہ خرچ۔ انہوں نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگا کہ خدا نے اس وقت فرشتہ بھیج دیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ نیازی صاحب نے میرا کس کس موقع پر ساتھ دیا تھا۔ جس کوارٹر میں رہ رہا ہوں اس کا ایڈوانس بھی نیازی صاحب نے دیا تھا۔

میں ان سے جا کر لپٹ گیا۔ "بھائی اچانک کیسے آگئے؟" میں نے پوچھا۔

"بس تنویر صاحب! تمہاری یاد آئی تو تم سے ملنے چلا آیا۔" انہوں نے کہا۔

"ارے یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ آئیں اندر آئیں۔"

ہم اندر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ نیازی صاحب کچھ الجھے ہوئے تھے۔ گھر میں اتنا چائے کا سامان تھا کہ دو چار کپ چائے بن سکتی تھی۔ میں نے انہیں چائے لا کر دی۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ "تنویر صاحب! میں ایک عجیب کشمکش میں ہوں۔"

"خیریت تو ہے، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ بہ ظاہر خیریت ہے لیکن اپنے وجود میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔"

"کیسی ہلچل؟"

"بھئی بات یہ ہے کہ میں لوگوں کا ساتھ دیتا رہا ہوں۔ آج بھی اسی ارادے سے گھر سے نکلا ہوں لیکن ایک عجیب بات ہے۔"

"وہ کیا؟" میرا دل دھڑکنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ کسی کی مدد یا کسی کے کام آجانا میری خوشی رہی ہے۔ میں احسان تو نہیں کہتا کیونکہ اس میں میری خوشی ہے لیکن ہوا یہ کہ جن کو میں نے اپنے طور پر خوشیاں دیں۔ انہوں نے غم دیے۔ ایک قول ہے کہ جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔ میں خوشی کی جستجو میں رہتا تھا اور ایسی خوشی مجھے کسی کے کام آکر ہی ملتی تھی۔ آج بھی گھر سے پچاس ہزار لے کر نکلا ہوں۔"

"ارے نیازی صاحب! یہ تو آپ کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ورنہ اس زمانے میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سنیں تو سہی۔ یہ میری خوشی ہے اور یہی میری جستجو ہے۔ میں گھر سے نکلا تو میرے ایک جاننے والے مل گئے طفیل صاحب۔ بہت باذوق انسان ہیں۔ ادب سے بہت دلچسپی ہے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے ایک شعر سنا دیا۔"

"واہ۔ یہ تو اچھی بات ہوئی۔ ویسے وہ شعر کیا تھا؟"

"تنویر صاحب۔ یقین کریں کہ اس شعر کو سنتے ہی ایسا لگا کہ میرے سر سے سارے بوجھ اتر گئے ہوں۔ سمجھ میں آگیا کہ میں کہاں بھٹک رہا ہوں۔"

"واہ صاحب۔ پھر تو بہت مبارک شعر ہوا۔ مجھے بھی سنائیں۔"

"وہ شعر ہے۔ ؏ خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔"

ایک بار پھر وہ لعنتی شعر میرے سامنے آگیا تھا۔

"ایک بات میں آپ سے کہنے آیا ہوں۔" نیازی صاحب نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ میں نے اب تک آپ کا ساتھ دیا ہو لیکن اب میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔ کیونکہ اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آگیا ہے۔"

"ارے نیازی صاحب۔" میں بوکھلا کر بولا۔ "لعنت بھیجیں اس شعر پر۔ آپ تو نیکی کیے جائیں۔"

"نہیں تنویر صاحب۔ اب اس قسم کی کوئی نیکی میں نہیں کرسکوں گا۔ اس انقلابی شعر نے میری سوچ بدل دی ہے۔ میں یہی کہنے حاضر ہوا تھا۔"

دل چاہا کہ یا تو اپنا گلا گھونٹ لوں یا اس شاعر کو زہر دے دوں جس نے یہ شعر کہا ہوگا۔

نیازی صاحب کچھ دیر بیٹھ کر اس شعر پر لیکچر دے کر روانہ ہوگئے اور میں اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرتا رہ گیا۔

خیر وہ دن تو کسی نہ کسی طرح گزار لیا۔ شام کو بھوک نے جب بے تاب کیا تو میں اپنی خالہ کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی اسی

شہر میں اور میرے محلے سے کچھ فاصلے پر رہتی تھیں۔ وہ کباب بہت اچھے بناتی تھیں۔ ان کے کباب کھا کر لطف آ جاتا تھا۔ ایک میری چھوٹی خوشی سی یہ بھی تھی کہ میں ان کے بنائے ہوئے کباب کھایا کرتا۔

خالہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہوگئیں۔ ''ارے بیٹا تو بالکل صحیح وقت پر آیا۔ میں نے تیری پسند کے کباب بنائے ہیں۔''

''کیا بات ہے خالہ آپ کی۔'' میں خوش ہوگیا۔ ''خالہ ہو تو آپ جیسی ہو۔''

''ارے بیٹا! بس دس منٹ انتظار کر۔''

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کتنی دیر بعد کچھ کھانے کو ملے گا۔ اسی دوران اچانک وہی شعر میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ خالہ کے ہاتھوں کے کباب میں میری خوشی تھی۔

اگر میں اس خوشی کو چھوڑ دیتا تو کوئی غم نہیں ہوتا۔ صبر کی دولت میرے پاس آجاتی۔ جس کے سامنے دنیا بھر کی نعمتیں ہیچ ہیں۔ ''خالہ'' میں نے آواز لگائی۔ ''خالہ میں جارہا ہوں۔ ایک کام یاد آگیا ہے۔''

''ارے بیٹا! کباب تو کھاتا جا۔''

''نہیں خالہ پھر کبھی سہی۔'' اور میں اس مکان سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی بھوک سے چکر سا آگیا تھا لیکن اپنے پیٹ کو دبائے ہوئے چلتا چلا گیا۔ جب نقاہت بہت بڑھ گئی تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔

اسی وقت کسی نے مجھے آواز دی۔ ''ارے تنویر صاحب! کہاں کھڑے ہیں؟''

وہ بھی میرا ایک جاننے والا تھا۔ اسلم جے پوری۔ موصوف شاعر بھی تھے۔ وہ سامنے سے چلا آرہا تھا۔ میرے پاس آکر بولے۔ ''خدا کی قسم۔ اس وقت کچھ اور مانگ لیتا تو شاید وہ بھی مل جاتا۔ قبولیت کی گھڑی تھی لیکن میں نے آپ کو مانگا اور آپ مل گئے۔''

''کیسے ہیں اسلم صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں؟ دل میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے؟''

''خیریت تو ہے نا کیا ہوا؟''

''بھئی کیا پوچھتے ہو۔ ایک بہت زبردست غزل رات کو کہی ہے۔ ایک مشاعرے میں پڑھنی ہے۔ لیکن میرا یہ دستور ہے کہ مشاعرے سے پہلے میں اپنے کسی دوست کو سنا کر داد لے لیتا ہوں۔ تاکہ کچھ رہ گیا ہو تو وہ اصلاح کردے۔''

''ارے صاحب میں اس قابل کہاں ہوں۔'' میں گھبرا کر بولا۔ ''آپ کسی اور کو سنادیں۔''

''یہ کیا بات کردی۔ آپ جیسا باذوق اور کہاں ملے گا۔ چلیں سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ بھی کہیں گے کہ کس مشکل زمین میں غزل کہی ہے۔ چلیں۔'' انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اب میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آئے، انہوں نے دو چائے کے آرڈر کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی منگوا لیے۔ اس وقت مجھے پیٹ میں کچھ سہارے کی شدید ضرورت بھی تھی۔ بسکٹ سامنے آئے اور اسی وقت وہ کم بخت شعر یاد آگیا۔ اس وقت خالی پیٹ کچھ کھانا میرے لیے بہت ضروری ہوگیا تھا۔ ورنہ میں بے ہوش ہی ہوجاتا۔

لیکن پھر وہی شعر خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔ اس موقع پر بھی اس شعر نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ''لیں جناب۔'' اسلم صاحب نے بسکٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کیوں یوں ہی بیٹھے ہیں؟''

''نہیں اسلم صاحب۔ اس وقت کچھ نہیں لے سکوں گا۔ میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔''

''اوہو۔ پیٹ میں گڑبڑ ہے تو آپ کو چائے بھی نہیں پینی چاہیے۔''

''جی جی ہاں۔'' میری جان نکلی جارہی تھی۔

انہوں نے ایک لمحہ انتظار کے بغیر ایک چائے کا آرڈر کینسل کردیا اور مزے سے خود چائے اور بسکٹ کھانے لگے۔ جبکہ میرا یہ حال تھا کہ میں غم اور خوشی کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے اور اپنی بے تکی غزل سنانے لگے۔

ایک تو غزل بے تکی۔ پھر اتنی طویل جیسے پوری اردو شاعری لکھ کر لے آئے ہوں۔ میں کچھ دیر تو بہت حوصلے سے سنتا رہا۔ پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور میں بے ہوش ہوکر کرسی سے لڑھک گیا۔

مجھے اتنا تو ہوش ہے کہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسلم صاحب مجھے پکار رہے تھے۔ کچھ اور آوازیں بھی تھیں۔ میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے جارہے تھے لیکن مجھے ہوش نہیں تھا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔ میں ایک بستر پر لیٹا تھا۔ نقاہت تو تھی لیکن اتنی نہیں جتنی پہلے محسوس ہورہی تھی۔ میرے بستر کے آس پاس کچھ اور بستر بھی تھے۔ جن پر مریض لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر ایک مہربان صورت کی نرس میرے پاس آگئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہتر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ سول اسپتال ہے۔" اس نے بتایا۔

"کون لایا ہے مجھے؟"

"تم کہیں بے ہوش ہو گئے تھے۔ لوگ اٹھا کر لائے ہیں۔"

"لوگ لائے ہیں؟ اور وہ کہاں ہے جس کی غزل سنتے سنتے میں بے ہوش ہوا تھا؟"

"پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو لیکن تمہیں ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ بس کمزوری کی وجہ سے یہ حال ہو گیا تھا۔"

"ہاں۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ تم اب ٹھیک ہو تو جا سکتے ہو۔ بیڈ کسی اور کو بھی چاہیے۔"

میں اس نرس کا شکریہ ادا کر کے اسپتال سے باہر آ گیا۔ اسی وقت اطہر صاحب دکھائی دے گئے۔ وہی اطہر صاحب جن کے سنائے ہوئے شعر نے میری یہ حالت کر دی تھی۔ وہ تیز قدموں سے کسی طرف چلے جا رہے تھے۔

میں نے ان کو آواز دے کر روک لیا۔ وہ رک کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ "ارے تنویر بھائی، یہاں کیسے؟ کیا کوئی رشتے دار اسپتال میں ایڈمٹ ہے؟"

"رشتے دار تو نہیں، میں خود ایڈمٹ تھا۔" میں نے بتایا۔

"خیریت؟"

"کچھ مت پوچھیں۔ آپ کے سنائے ہوئے شعر نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے والے شعر نے۔"

"ہاں۔ بہت اچھا شعر ہے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے اشعار یاد ہیں مجھے۔ تم ذرا میرے ساتھ چلو۔ سامنے ہی جانا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ارے بھائی، میرا ٹی وی دو مہینوں سے خراب پڑا ہوا ہے۔ دل بہل جاتا ہے۔ خبریں سننے کو مل جاتی ہیں۔ دو تین میری پسند کے ڈرامے بھی چل رہے ہیں۔ پتا نہیں کتنی قسطیں نکل گئی ہوں گی۔ ہمارے پاس اور کوئی تفریح تو ہے نہیں۔ بس ٹی وی دیکھ کر دل بہلاتا رہتا ہوں۔ تو میں نے اپنے ایک جاننے والے سے بیس ہزار مانگے تھے۔ بہت دنوں سے ٹال مٹول کر رہا تھا۔ لیکن کل میں اس کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ اس نے اس وقت چیک دینے کے لیے بلایا ہے۔ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ بس چیک لے لوں اس کے بعد اطمینان سے کہیں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔

"اطہر صاحب! کیا ٹی وی کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی تھی؟"

"کیوں نہیں گزر سکتی؟"

"تو پھر۔ آپ ہی نے تو سنایا تھا کہ خوشی کو چھوڑ دے۔ غم بھی نہ ہوگا۔"

"اوہ۔" اطہر صاحب ہنس دیے۔ "ارے بھائی کس زمانے کی بات کرتے ہو؟ اب جو خوشی کو چھوڑ دیا تو درجنوں غم لگ جائیں گے۔ شاعر لوگ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔ شاعروں کی ساری شاعری شراب کی مستی میں ہوتی ہے۔ ایسا کون سا شاعر ہے جو شراب نہ پیتا ہو اور ایسا کون سا سیاست داں ہے جو پوری قوم کو سادگی کا درس نہ دیتا ہو۔ اور خود اس کی زندگی اس کے عیش دیکھو تو اپنی زندگی اکارت معلوم ہونے لگتی ہے۔ میاں اب دوسرا شعر سن لو۔ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ سمجھ گئے؟"

"جی صاحب سمجھ گیا اور اب مجھے اجازت دیں کہ میں پہلے شعر کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں۔"

وہ روکتے رہ گئے لیکن میں وہاں سے نکل پڑا۔ سب سے پہلے میں جلالی صاحب کے پاس پہنچا۔ درانی صاحب کے یہاں گیا۔ اسلم کو جا پکڑا۔ اور شام کو واپسی میں میرے پاس پندرہ ہزار ہو چکے تھے۔

میں نے ایک ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا بھی کھا لیا تھا۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ میں بابر نہ ہونے کے باوجود عیش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے بعد ایک مستقل کام شروع کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ عزتِ نفس چلی جاتی ہے۔ تو عزتِ نفس کی کون پروا کرے؟ کیا ہمارے سیاست داں حضرات پروا کرتے ہیں؟ ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا ان کو پروا ہوتی ہے کہ ان کے اکاؤنٹ سے کتنے پیسے نکل رہے ہیں؟ ان کے گھروں پر چھاپے پڑتے ہیں تو کتنا مال ملتا ہے؟ کرتے ہیں پروا؟ نہیں نا؟ تو پھر آپ اور میں کیوں پروا کریں۔ ہمیں تو اسی راہ پر چلنا ہے جو راہ ہمارے حکمران ہمیں بتا رہے ہیں۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

❖ ❖ ❖

دامِ گل

عبدالرب بھٹی

میاں بیوی زندگی کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں...کبھی دکھوں سے رفاقت بڑھ جاتی ہے تو کبھی سکھ ہی سکھ زندگی کو تروتازہ کردیتے ہیں...ایک ایسی ہی کہانی جہاں وفاؤں اور جفاؤں نے ڈیرے ڈال لیے تھے...

خار و گل سے دوستی

اور دشمنی کا سودائے جنوں

ڈاکٹر توقیر کی کار خرم ریاض کے شاندار بنگلے کے گیٹ کے قریب پہنچ کر رکی تو چوکیدار نے اسے اور اس کی گاڑی کو پہچانتے ہی گیٹ کھول دیا اور ساتھ ہی سلام بھی جھاڑ دیا۔ ڈاکٹر سر کی جنبش سے کھڑکی سے ہی اسے جواب دیتے ہوئے کار اندر لے آیا۔

اپنے کلینک سے واپسی پر اور اپنے گھر تک پہنچنے سے پہلے اکثر اسے دو تین روٹین کے وزٹ نمٹانے ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی وزٹ کی کال نہیں ہوتی یا اس کی نوٹ بک کا کسی دن یا تاریخ والا صفحہ ہی خالی ہوتا اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی دن ایک ساتھ دو یا تین وزٹ نوٹڈ ہوتے تھے۔ صبح میں وہ ایک بڑے سرکاری اسپتال میں ایم ایل او تھا۔

یہ وہ مریض تھے جو کلینک آنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے، بلاشبہ اس میں ان کی امارت اور کچھ مرض اور مریض کی نوعیت کا بھی دخل ہوتا تھا، یا پھر وہ مریض ہوتے جو مستقل بستر علالت پر رہتے تھے۔ آخر الذکر مریضوں میں ضعیف مریضوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔

آج کلینک سے اٹھتے وقت اس کی سیکریٹری قدسیہ نے اسے صرف ایک ہی وزٹ کے بارے میں مطلع کیا تھا۔

''سر۔۔۔! آج آپ کا صرف ایک ہی وزٹ ہے، مسز خرم ریاض۔۔۔'' ڈاکٹر توقیر کا بیگ بناتے ہوئے قدسیہ نے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دبلی پتلی اور سانولی رنگت کی پرکشش لڑکی تھی۔ عمر اس کی تیس برس رہی ہوگی مگر اپنی اسمارٹنس کے باعث پانچ سال کم ہی کی نظر آتی تھی۔

''اوہ۔۔۔ مسز خرم ریاض۔۔۔!'' ڈاکٹر توقیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا اور اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے جو فوراً ہی غائب بھی ہوگئے۔

''اوکے، تھینکس۔'' ڈاکٹر توقیر نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اپنی کار میں سوار ہونے تک اس کے ڈسپنسر شاہد نے بیگ کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔

مسز خرم ریاض کے بنگلے کی جانب گامزن ڈاکٹر توقیر کا ذہن ہمیشہ ایک عجیب اور نامعلوم سی الجھن کا شکار ہو جاتا۔ اس کے اندر ایک کھد بد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی۔ اس نے بارہا کوشش چاہی بھی کہ اپنی اس نامعلوم سی ''کھد بد'' کو ذہن سے جھٹک دے اور ایسا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا تھا لیکن جب بھی اس کے وزٹ کا مقررہ دن آتا وہ پھر اسی کیفیت کا شکار ہونے لگتا تھا۔ ایسا صرف مسز خرم ریاض کے سلسلے میں ہی ہوتا تھا۔ کیوں۔۔۔؟ اس کا جواب شاید ڈاکٹر توقیر کے پاس بھی نہیں تھا۔ تاہم معاملہ عاشق اور معشوق کا ہرگز نہیں تھا۔

کار سے اتر کر اس نے اپنا بیگ سنبھالا ہی تھا کہ مرکزی دروازے سے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ برآمد ہوئی اور آتے ہی سلام کر کے اس کا بیگ سنبھال لیا۔

دیدہ زیب محرابی آرچ والے بیش قیمت لکڑی کے مرکزی کے دروازے سے گزرتے ہی ایک راہداری میں داخل ہوا تو غیر ارادی طور پر ڈاکٹر توقیر نے دائیں جانب کے کمرے میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا تھا جہاں اسے اکثر و بیشتر ایک ''نظارہ'' دیکھنے کو ملتا تھا۔

آج بھی اس نظارے کی جھلک نے اس کی طبیعت ذرا مکدری کر دی۔ وہ دونوں اسے اندر ہنستے اور باتیں کرتے دکھائی دیے تھے، ساتھ ہی اندر سے تازہ پھولوں کی خوشبو اور پرفیوم کی لپٹیں بھی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھیں۔ ایک مردانہ آواز اور مترنم ہنسی نے اس کے اندر کی نامعلوم ''کھدبد'' کو مزید سوا کر دیا۔

وہ ہمیشہ کی طرح سر جھٹک کر ملازمہ کے آگے آگے چلتا ہوا ایک زینے سے دوسری منزل پر آگیا۔ اس کے بعد وہ ایک وسیع وعریض اور شاہانہ طرز کے آرام دہ بیڈ روم میں داخل ہوا۔

سامنے جہازی سائز کے بیڈ پر اس وقت جو خاتون دراز تھی، اسے دیکھ کر ڈاکٹر توقیر کو نہ چاہتے ہوئے بھی کسی زندہ لاش ہی کی مثال یاد آجاتی تھی۔ ایسے بیشتر مریض اس نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے، ان کے ہمدردانہ جذبات بھی پیدا ہوتے مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ جذبات اور محسوسات محض ''اختارمل'' بن کر رہ گئے، مگر اس جوان مریضہ شبانہ کے سلسلے میں معاملہ کچھ اور تھا۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر توقیر کے اندر کوئی زور زور سے دستک دینے لگتا تھا، کوئی چیخ چیخ کر اس سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس وقت تو حد ہی ہو جاتی جب شبانہ خاموش خاموش اور یک ٹک نگاہوں کے ساتھ اسے تکتی رہتی۔

وہ گزشتہ دو سال سے صاحب فراش تھی، اس کی طبیعت اچانک بگڑی تھی اور پھر نہیں سنبھل سکی تھی، بتدریج وہ بیماری 'جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا' کے مصداق اس حد تک جا پہنچی تھی کہ شبانہ اب ہلنے جلنے اور بات کرنے تک سے قاصر تھی، مگر نہیں۔۔۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں، ڈاکٹر توقیر کو وہ باتیں کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس سے کچھ کہتی ہوئی اور کچھ التجا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ گزشتہ ایک سال سے یہاں اس مریضہ کو دیکھنے آرہا تھا۔ اتنی مدت میں ایک ڈاکٹر کے ساتھ مریضہ اور اس کے لواحقین کافی حد تک گھل مل جاتے ہیں،

زیادہ نہیں تو ان کا حدود اربع تو معلوم ہو ہی جاتا ہے، لہٰذا ڈاکٹر توقیر کو بھی کچھ خرم کی زبانی اور کچھ اپنی ''آبزرویشن'' سے..... جو پتا لگا تھا اس کے مطابق ـــــ شبانہ ایک دولت مند باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ خرم سے اس نے محبت کی شادی کی تھی۔ حالانکہ خرم میں سوائے مردانہ وجاہت کے اور کوئی خوبی نہیں تھی، وہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا اور اسی طرح کی نوکری بھی کرتا تھا، شبانہ کے باپ نے بھی بیٹی کی پسند کو اولیت دی اور یہ رشتہ منظور کرلیا۔ آج کل خرم ریاض نے اپنے سسر کے مرحوم ہونے کے بعد اس کا کاروبار سنبھال لیا تھا، کیسے؟ یہ وہی جانتا تھا۔

شبانہ کی عمر زیادہ نہیں تھی، تیس سال کیا عمر ہوتی ہے بھلا، پانچ سال پہلے اس کی خرم سے شادی ہوئی تھی، تین سال پیار و محبت میں بیتے تھے، یہ سب باتیں ملازم زمان اور شبانہ سے اسے معلوم ہوئی تھیں، جب شبانہ کی حالت بیماری ابتدائی اسٹیج میں تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر توقیر نے بارہا خرم سے کہا بھی تھا کہ اپنی بیوی کو کسی اچھے ہاسپٹل میں مکمل طور پر ایڈمٹ کروا دے، خرم نے اس ہدایت پر عمل بھی کیا تھا مگر کوئی فرق نہیں پڑا تھا، یوں لگتا تھا جیسے بیماری نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ تب خرم، شبانہ کو گھر ہی لے آیا تھا اور ڈاکٹر توقیر ہی اب اسے دیکھا کرتا تھا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک نفیس سے مہنگے فریم میں وہ اپنے شوہر خرم ریاض کے ساتھ مسکراتی ہوئی کھڑی کسی شہزادی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر توقیر ایک نگاہ صاحب فراش، زندہ لاش کی شکل پڑی شبانہ اور دوسری نگاہ، اس کی فریم شدہ تصویر کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھر لیتا تھا۔

ڈاکٹر..... نے اپنا بیگ کھول کر شبانہ کے معمول کا چیک اَپ شروع کردیا۔

''آہا..... ڈاکٹر صاحب! تشریف آوری کا شکریہ۔''

ایک آواز اسے سنائی دی، اس نے معائنے کے دوران سرسری نظر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اسی خاموشی میں اپنا کام نمٹاتا رہا۔ دروازے پر مریضہ شبانہ کا شوہر خرم کھڑا تھا اور حسبِ سابق اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ وہ اس نے قریب آکر بڑے ہی محبت بھرے انداز میں اپنی بیمار بیوی کے پہلو میں رکھ دیا۔

''میری جاں سے عزیز پیاری بیوی شبانہ کے لیے.....''

ڈاکٹر کو اس کے لہجے میں چال بازی اور منافقت کی بُو محسوس ہوئی تھی، اسی لمحے اس نے شبانہ کے پژمردہ چہرے کو غور سے دیکھا، اس کی وہی بولتی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ ڈاکٹر توقیر کے دل کو ایک گھونسا لگا، اسے وہ وقت یاد آیا جب شبانہ اسی طرح بیڈ پر لیٹے لیٹے نحیف و نزار لہجے میں اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔

اب وہ اپنی آنکھوں سے اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ اسی لمحے شبانہ کا معائنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر توقیر چونکا۔ یہی وہ وقت تھا جب خرم نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیسی طبیعت ہے اب اس کی ڈاکٹر صاحب؟''

''حیرت انگیز۔'' اچانک ڈاکٹر توقیر نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' خرم کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔

''امپرومنٹ کے آثار نمودار ہو رہے ہیں..... چند ضروری ٹیسٹ لکھ کے دے رہا ہوں، وہ کل ہی کروا لو اور رزلٹ ملتے ہی مجھے واٹس ایپ کردینا۔''

''یہ تو بڑی خوش خبری ہے ڈاکٹر صاحب!'' خرم یک دم خوش ہو کر بولا مگر ڈاکٹر کو اس کا لہجہ اوپرا اوپرا سا محسوس ہوا۔

''ہاں! بعض بیماریاں اسی طرح ہی اچانک ریکور ہونے لگتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے کچھ زیادہ بلند آواز میں یہ الفاظ کہے تھے تاکہ شبانہ بھی سن لے اس خوش خبری کو۔ مگر ڈاکٹر نے اس کی نگاہوں سے ایک خوشی کے بجائے ایک کرب کی کیفیات کو محسوس کیا۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، خرم معذرت کر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور دوسری جانب غائب ہوگیا۔ ڈاکٹر توقیر نے ٹیسٹ لکھے اور جلدی جلدی بیگ سمیٹنے لگا، یوں جیسے اسے بھی دروازے کی جانب جانے میں جلدی ہو، وہ بیگ سنبھالے دروازے سے باہر آیا تو اسے وہ پری چہرہ اور غزال چشم .... والی دوشیزہ نظر آگئی جسے اس نے توقیر کے ساتھ اکثر دیکھا تھا، راہداری سے گزرتے سے کھڑکی سے نظارے کے دوران.....

اس کا نام خرم نے گل بانو بتایا تھا۔ بس یہی تعارف کروایا تھا اس نے ڈاکٹر سے اس کا......

اب ڈاکٹر یہ سوچتے ہوئے اس شوخ سی کم عمر حسینہ گل بانو کا اور ان گلوں کا موازنہ کرتا جو خرم گل دستے کی صورت میں نہایت منافقانہ محبت سے اپنی بیمار بیوی شبانہ کے پہلو میں بیڈ پر رکھتا تھا کہ ایک گل کی صورت یہ حسینہ دام ڈال رہی تھی اور دوسرا گل وہ تھا جو شبانہ کے قریب گل دستے کی صورت پڑا،

اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔
"یہ میرے دفتر کی ساتھی ہے ڈاکٹر! کسی غلط فہمی میں مت پڑنا۔"
ایک دن ڈاکٹر توقیر کو سرد نظروں سے گل بانو کی طرف دیکھتے ہوئے خرم نے جھٹ سے کہا تھا۔
"شبانہ کی بیماری کی وجہ سے میں جا نہیں سکتا تو یہ آ کر سارے دن کی رپورٹ مجھے دے دیتی ہے۔"
ڈاکٹر جانتا تھا کہ وہ کیا اور کیسی "رپورٹ" اسے دیتی ہو گی اسی لیے وہ خاموشی سے رخصت ہو جاتا۔

☆☆☆

شبانہ کی نئی میڈیکل رپورٹس خرم نے رزلٹ ملتے ہی اسے واٹس ایپ کر دیں اور اسے دیکھتے ہی ایک حیرت آمیز خوشی محسوس ہونے لگی۔ اس نے خرم کو خوش خبری سنا دی کہ شبانہ کی بیماری اب ریکوری کی جانب گامزن ہو چکی ہے، اگرچہ اب بھی اس میں مہینے لگ سکتے ہیں مگر بہرحال اب اس کی بیماری بتدریج موت کی جانب سفر کے راستے سے پلٹ کر زندگی کی جانب بڑھنے لگی ہے۔
اب ڈاکٹر کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اسے اپنے اندر ہونے والی نامعلوم سی اس "کھُد بُد" سے چھٹکارا مل جائے گا۔ مگر ہوا اس کے برعکس، اس کی کھد بد سوا ہو گئی بلکہ وہ ایک بے چینی میں بدلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ اسے تسلی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟
ایک ماہ بیتا تو شبانہ کچھ کچھ ہلنے جلنے کے قابل ہونے لگی اور اگلے پندرہ روز میں اس نے تھوڑا تھوڑا بولنا شروع کر دیا۔
"ڈ ..... ڈاکٹر! ام ..... مجھے خ ..... خرم کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔"
اس روز شبانہ نے اٹک اٹک کر بہ مشکل کہا تھا۔
"کیوں؟ کیسے؟ تم نے بھلا کیسے اندازہ لگا لیا؟" ڈاکٹر توقیر نے سرگوشی میں پوچھا۔ خرم اس وقت کمرے میں نہیں تھا۔
"میں نے اس کے ساتھ ایک خوب صورت سی --- لڑکی کو دیکھا ہے۔" وہ بولی۔
"پھر، اس سے کیا ہوا بھلا؟" ڈاکٹر نے یونہی کہا۔ "وہ اس کی آفس گرل ہے اور اسے رپورٹس ....."
"ڈاکٹر .....! میں تمہاری مشکور ہوں لیکن ..... خ خ ..... خدا کے لیے کچھ کرو، مجھے اپنی ..... جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔" اس کے لہجے اور آواز کی طرح اس کے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے۔ بدن بھی مترشح تھا۔
"تم فکر مت کرو، اب تم ٹھیک ہو رہی ہو، زندگی کی طرف لوٹ رہی ہو، تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں آتا رہوں گا۔"
"شش ..... شکریہ تمہارا ڈاکٹر!" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

☆☆☆

اس روز نامعلوم سی کھد بد نے ڈاکٹر توقیر کی بے چینی اور تشویش میں اضافہ کر ڈالا تو اس نے سوچا شبانہ کی تشویش اور اس کی کھد بد خالی از علت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ معاملہ کچھ اسراریت کی طرف جانے لگا تھا۔ متعلقہ تھانے کا ایک پولیس آفیسر انسپکٹر جواد اس کا جاننے والا ہی نہیں، کلاس فیلو بھی تھا۔
اس نے سوچا کہ خود سے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ انسپکٹر جواد سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن سا ہو گیا اور اس کی بے چینی میں بھی کمی واقع ہونے لگی۔

☆☆☆

فرید پور تھانے کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ..... انسپکٹر جواد نے ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔
دوسری جانب سے پہلے اس طرح چڑھی ہوئی سانسوں کی آوازیں آنے لگیں، جیسے کوئی پھنسی پھنسی سانس لینے کی کوشش میں بولنے کی سعی چاہ رہا ہو، بالآخر ایک گھبرائی اور بوکھلائی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔
"پپ ..... پولیس اسٹیشن، تھانہ ....."
"ہاں ..... ہاں ..... بولا ..... میں انسپکٹر جواد بات کر رہا ہوں۔"
"م ..... میں ..... دد ..... دراصل اپنی بیوی کے قتل کی رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔"
انسپکٹر جواد کا جسم تن گیا۔ اس کی گرفت ریسیور پر مضبوط ہو گئی۔ اسی لہجے میں بولا۔ "تم کون ہو؟"
"میں ..... میں ..... خرم ریاض ہوں۔"
اس نام پر انسپکٹر جواد کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "کہیں تمہاری بیوی کا نام ..... شبانہ تو نہیں ..... جو ایک عرصے سے بیمار تھی؟"
"کک ..... کیا مطلب؟" دوسری جانب سے خرم نامی آدمی جیسے بُری طرح چونکا۔ اسے حیرت ہوئی ہو گی کہ بھلا انسپکٹر کو کیسے معلوم ہوا۔
"میری بات کا جواب دو؟" انسپکٹر جواد نے لہجے کو سخت کر لیا۔ ابھی کچھ دن پہلے اپنے ایک ڈاکٹر دوست توقیر سے

ملاقات کے دوران شبانہ اور خرم کے سلسلے میں ڈسکس کی ہوئی وہ باتیں اور خدشات اس کے دماغ میں چکرانے لگے تھے۔

"جج..... جی ہاں! آپ نے بالکل درست کہا۔" خرم نے یوں جواب دیا جیسے جملے اس کے حلق سے اٹک رہے ہوں۔"

"لاش کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"گھر پر..... میں اپنے گھر سے بول رہا ہوں..... م..... میری اپنی بھی طبیعت شاید..... ٹھنھ..... ٹھیک نہیں..... آہ....." اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

"ہم..... بالآخر اس خبیث نے اپنی بیوی شبانہ کو قتل کر ہی ڈالا اور اب وہ اس کی دولت اور بزنس کا واحد مالک تھا، شاید اب دولت اور نوعمر حسینہ دونوں اس کے قبضے میں ہوں..... دیکھتا ہوں بچو تجھے بھی....." اس نے خود کلامی کی۔

یہ اس کی زندگی کا شاید واحد اور عجیب کیس تھا جس میں ایک قاتل خود ہی فون کر کے اپنے جرم کے بارے میں اسے آگاہ کر رہا تھا اور فخر سے کہہ رہا تھا۔ "انسپکٹر.....! مجھے گرفتار کر سکتے ہو تو کر لو آ کر..... ہنہ....."

اس نے اپنے دو ساتھیوں کو ساتھ لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر خرم ریاض کے بنگلے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کا پتا ڈاکٹر توقیر نے اسے بتا رکھا تھا۔

☆☆☆

خرم ریاض دروازے کے سامنے کھڑا ان کا منتظر تھا۔

انسپکٹر جواد نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کڑی نظروں سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ وہ ایک متناسب جسم کا آدمی تھا اگرچہ اس کے بال جھڑنے لگے تھے اور کھوپڑی کے کچھ حصے پر گول نشان نمایاں ہو گیا تھا، لیکن اس کا جسم ہر طرح سے جوان ہی دکھائی دیتا تھا۔

اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی اور کالر کھلے ہوئے تھے، چہرے اور آنکھوں سے وہ بے حد غمگین اور بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔

پولیس کی گاڑی دیکھ کر اس نے چوکیدار کو اشارہ کر دیا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ پھر وہ ان کے ساتھ اندر آ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بالائی منزل پر واقع اس کی خواب گاہ....." اس نے جملہ زبان سے مکمل نہیں کیا بلکہ ہاتھ سے زینے کی طرف اشارہ کر دیا۔

انسپکٹر جواد اور اس کا ماتحت حیات بخش تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ خرم سوگوار چہرہ لیے ان کے ساتھ ساتھ اوپر آ رہا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے تک ان کی رہنمائی کی اور ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

خرم کی بیوی شبانہ خون میں نہائی ہوئی، بستر پر دراز تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے عملی طور پر اسے مسخ کر دیا ہو۔

انسپکٹر جواد نے غور سے لاش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے پر کرب کی کوئی علامت نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مقتولہ نے مر کر سکون پا لیا ہو۔ بے اختیار جواد جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

"لاش کی حالت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس عورت نے مرنے سے پہلے زیادہ جدوجہد نہیں....." اس کے ماتحت کانسٹیبل حیات بخش نے تبصرہ کیا۔ انسپکٹر جواد پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے خاموش کھڑا شبانہ کی لاش کو گھورتا رہا۔

اس کا چہرہ قدرے زرد پڑ گیا تھا اور جبڑے بُری طرح بھینچے بھینچے سے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے معمولی سی جھریاں نظر آنے لگی تھیں، جو شاید طویل عرصہ بیماری کی رہینِ منت تھیں۔

کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ میز اور الماریوں کی درازیں کھلی تھیں اور ان کی اشیاء اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، خواب گاہ میں لگی ہوئی ہر تصویر کو چاک کر ڈالا گیا تھا۔ سنگار میز کا شیشہ بھی اپنی جگہ سے نکلا ہوا تھا۔

کمرے کی ایک کھڑکی کے نیچے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کھڑکی کو زبردستی کھولا گیا ہو۔ قاتل نے شیشہ توڑ کر اس خلا میں ہاتھ ڈالنے کے بعد کھڑکی کھولی تھی۔

انسپکٹر جواد نے باتھ روم کی طرف دیکھا، وہاں کی ہر چیز البتہ اپنی جگہ موجود تھی۔ غسل خانوں کی اشیاء کے علاوہ پورے گھر کا فرنیچر تک الٹ پلٹ تھا، ہر الماری کھلی ہوئی تھی اور ہر دراز کی اشیا منتشر تھیں۔

"لوٹ مار کی واردات معلوم ہوتی ہے۔" کانسٹیبل حیات بخش نے پھر لقمہ دیا۔

"ہاں.....! بہ ظاہر تو معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔" جواد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تائید کی۔ "ڈاکٹر توقیر کو فون کرو اور اس کے ساتھ ساتھ فوٹو گرافر کو بھی بلا لو۔ فنگر پرنٹس کا عملہ بھی فوراً یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

وہ واپس اس کمرے میں آیا جہاں خرم ریاض ایک کھڑکی کے قریب کھڑا باہر گھور رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ وہ اس نے انہیں دیکھ کر پھینک دی۔

"بڑی ہولناک واردات ہے۔" جواد نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بے حد دکھ ہو رہا ہے، مسٹر خرم..... لیکن میں تفصیلات بتانے کے لیے آپ کو زحمت ضرور دوں گا۔"

اس کی بات سن کر خرم نے اپنے گلے میں اٹکی ہوئی کوئی رقیق شے کو نگلا تو ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے اس کا لمحے بھر کے لیے دم گھٹ گیا ہو۔ پھر اس نے کندھوں کو اچکا کر خود کو گویا سنبھالتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز دھیمی اور گھٹی گھٹی سی تھی۔

"کوئی بات نہیں..... میں بیان دینے کے قابل ہوں۔" اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے جواد کی طرف دیکھا تھا۔

"اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں مزید مہلت دینے کے لیے ملازمہ سے باز پرس کرلوں؟"

"وہ آج چھٹی پر ہے اور یہ بات غالباً ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھی۔"

"کن لوگوں کو؟" انسپکٹر جواد نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ریاض نے بے چارگی سے کندھوں کو اچکایا۔ "ممکن ہے، وہ صرف ایک ہی آدمی رہا ہو۔ میں نے تو ایک ہی آدمی کو دیکھا تھا۔"

جواد نے گہری نظر سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پہلی بار اسے ایک خراش دکھائی دی۔ یہ خراش خرم کی پیشانی پر تھی اور اس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا البتہ زخم پر سوزش پیدا ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تمہیں پوری کہانی سنا دینی چاہیے۔" بالآخر جواد نے قدرے بے تکلفی کا انداز اختیار کیا۔

خرم نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آتش دان کی طرف بڑھا۔ وہاں فلاسک دھرا تھا، پاس دو مگ تھے۔ دونوں میں اس نے کافی انڈیلی جو اس نے جانے کس وقت کے لیے بنا رکھی تھی یا پھر تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے پیتا رہا تھا، ایک مگ جواد کی طرف اور دوسرا اپنے لیے بنانے کے بعد اس نے ایک نیا سگریٹ بھی سلگا لیا پھر گھبراہٹ آمیز انداز میں گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

"میں معمول کے مطابق اپنی گاڑی میں گھر واپس آیا تھا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہانی کا آغاز کیا۔ "راستے ہی میں اسی معمول کے مطابق میں نے اپنی بیوی کے لیے پھولوں کا آرڈر دے رکھا تھا......" اس نے رک کر کافی کا ایک سپ لیا اور پھر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے آگے بولا۔

"جس روز ملازمہ رخصت ہوتی تھی، میں اپنی بیوی کے لیے ایک گلدستہ ضرور لاتا تھا۔ یہ ایک جذباتی سی بات ہے، پھر وہ بے چاری بیمار بھی تھی، ایسی چھوٹی چھوٹی جذباتی خوشیاں اس کے لیے مفید ہو سکتی تھیں۔

"میں کھانے کا ہلکا پھلکا سامان بھی ساتھ لاتا تھا اور اس کھانے کے دوران پھولوں کو دیکھ کر شبانہ بے حد خوش ہوتی تھی۔" اس نے رک کر گلا صاف کیا۔

"پھولوں کو دیکھ کر......"

"ایک منٹ۔" جواد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس وقت کتنے بج رہے تھے؟"

"پانچ بج کر چھپن منٹ۔"

"تم نے پھول غالباً پھول نگر نامی دکان سے خریدے تھے؟"

"ہاں..... سب جانتے ہیں کہ وہاں اچھے اور تازہ پھول ملتے ہیں، اسی حساب سے لوگوں کا وہاں رش بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ میرا آرڈر روز کا ہوتا تھا اسی لیے جب میں وہاں پہنچا تو میرا گلدستہ تیار تھا۔ وہاں سے جب میں اپنی کار میں گھر واپس آیا تو عمارت کا اندرونی دروازہ بند تھا۔ پوری عمارت روشن تھی۔ میں یہ دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ عقبی دروازہ بھی اندر سے بند ہوگا۔"

"عام حالات میں اندرونی دروازہ باہر سے مقفل ہوتا تھا؟" جواد نے دریافت کیا۔

"ہاں..... لیکن آج دروازہ اندر سے بولٹ کیا گیا تھا۔"

"تم نے کسی کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی تھی؟"

خرم نے سر کو منفی جنبش دی۔ "ملازمہ دروازوں کو ہدایت کے مطابق بند اور مقفل کرنے کی عادی ہے، جب میں نے اندرونی دروازے کو اندر سے بولٹ پایا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی کھڑکی یا دروازہ توڑے بغیر اندر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ شبانہ سیڑھیاں اتر کر دروازہ اندر سے بند کرنے کے قابل نہیں تھی اس لیے کسی اور کی موجودگی یقینی تھی۔ میں نے سوچا احتیاط کا تقاضا ہے، کسی نہ کسی طرح خاموشی سے اندر چلا جاؤں اور گھر میں موجود شخص کو ہوشیار ہونے کا موقع نہ دوں۔"

"تم بہت جلد فیصلہ کر لیتے ہو، خرم!" انسپکٹر جواد نے تعریفی انداز میں کہا۔

خرم نے کافی کا ایک گھونٹ اور لیا پھر ایک طویل سانس لینے کے بعد نیم وا آنکھوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

''فطری طور پر سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنی بیوی کا خیال آیا کہ اگر گھر میں کوئی ناپسندیدہ شخصیت موجود تھی تو میں کم از کم اپنی بیوی کو بطور چارہ یا بطور ڈھال استعمال ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ یوں میں گھر کے گرد چکر لگاتا ہوا ایک دیوار تک پہنچا اور اس پر چڑھ کر اپنی بیوی کی خواب گاہ کی بالکونی میں پہنچ گیا۔ جب میں بیوی کے کمرے میں پہنچا تو گھر کے اندرونی حصے سے چیزیں الٹ پلٹ کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن خواب گاہ میں کوئی نہیں تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے...... '' اس نے رک کر دم گھٹنے والے انداز میں تھوک نگلا اور ایک بے ساختہ قسم کی ہچکی ضبط کی۔

''جو کچھ بھی تم نے دیکھا، وہی بالآخر ہمیں بھی نظر آیا؟'' انسپکٹر جواد نے نرمی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم نے کھڑکی توڑ کر راستہ بنایا تھا؟''

اس پر خرم ریاض نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''میں نے دیکھا، وہ مر چکی ہے، مارے خوف کے میں مفلوج سا ہو کر رہ گیا۔ چند منٹوں تک تو مجھے بالکل ہوش ہی نہیں رہا۔ آوازیں اب بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ یکایک مجھ پر دیوانگی کا دورہ سا پڑا۔ میں نے خواب گاہ میں رکھا ہوا، ماربل کا ایک وزنی مجسمہ ہاتھ میں لیا اور قاتل کی تلاش میں ہال کی طرف دوڑ پڑا۔''

''کیا وہ بالائی منزل پر تھا؟''

''ہاں...... وہ کسی کمرے سے باہر آیا تھا...... غالباً میرے ہی کمرے سے...... ہم ہال میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے، شاید میرا توازن بگڑ گیا تھا، اس لیے میں قدرے لڑکھڑا گیا...... یا پھر دیوانگی نے میرے ذہن پر پنجے گاڑ دیے تھے کہ میں نے مجسمہ گھمایا لیکن وہ نشانے پر لگنے کے بجائے میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد میں گر گیا۔''

''ہاں...... وہ مجسمہ ابھی تک ہال کی راہداری ہی میں پڑا ہے۔'' انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

خرم نے اپنی پیشانی کی خراش کو سہلایا اور کراہ کر بولا۔ ''اس چوٹ سے میرا سر بُری طرح چکرا گیا اور میں لحاتی بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

''جب مجھے ہوش آیا تو ایک کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی...... میں دوڑتا ہوا زینے سے نیچے پہنچا تو فرنٹ ڈور کھلا ہوا تھا۔''

''اس شخص نے اپنی کار کہاں پارک کر رکھی تھی؟''

''یقیناً اس نے دوسری جانب کہیں قریب ہی کار کھڑی کی ہوگی ورنہ میں گھر پہنچتے ہی اس کی کار ضرور دیکھ لیتا۔'' اس نے ایک کافی کا مگ خالی کیا اور اس دوران سگریٹ بھی پھونک ڈالی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک نئی سگریٹ سلگانے لگا۔

''معلوم نہیں کہ گھر کی کون کون سی چیز غائب ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہم زیادہ رقم گھر میں رکھنے کے عادی نہیں، میرا خیال ہے قاتل کو تجوری کی تلاش تھی وہ یقیناً ہمیں بے حد دولت مند خیال کر کے گھر میں گھسا ہوگا اس نے شبانہ پر تشدد بھی غالباً اسی لیے کیا تھا کہ وہ اس سے تجوری کے بارے میں معلوم کر رہا ہوگا۔ شبانہ اسے تجوری کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر رہی ہوگی کیونکہ ہمارے ہاں واقعی کوئی تجوری نہیں ہے...... اور قاتل نے اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے مسلسل اذیت دی جن کی تاب نہ لا کر......''

اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ اچانک ہی اس کی حالت میں تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ زرد پڑ گیا اور بری طرح کانپنے لگا۔ چہرے سے وہ بے حد دل گرفتہ دکھائی دے رہا تھا۔

''خود کو سنبھالو، مسٹر خرم!'' انسپکٹر جواد نے ازراہِ ہمدردی اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔''

☆☆☆

انسپکٹر جواد گھر سے نکلا اور اس کے گرد ایک چکر لگانے کے بعد اپنی ٹارچ نکال کر ایک جگہ رک گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی اور اب ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

بالکونی کے نیچے کیاری تھی۔ اس میں قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جانے کیوں جواد کو یہ یقین سا ہونے لگا کہ یہ نشانات خود خرم نے ہی بنائے ہوں گے۔

بہرکیف...... وہ ٹہلتا ہوا پارکنگ وے کی طرف نکل گیا اور فلش لائٹ اِدھر اُدھر گھما کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک گہری جگہ تھی جہاں کھڑی ہوئی کوئی بھی کار گھر کے سامنے سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ باہر میں کسی تیز رفتار کار کے ٹائروں کی وجہ سے خاصے گہرے لیکن ایسے نشانات بن گئے تھے، جنہیں شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ نشانات کس گاڑی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

جواد وہیں کھڑا گھر کی عمارت کو گھورنے لگا۔

"بہت اچھی کہانی ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔ "بہت لمبی اور نہ ہی بہت چھوٹی، کوئی بھی شخص یہ سوچ کر گھر میں داخل ہو سکتا ہے کہ خرم کے پاس خاصی رقم موجود ہوگی۔ شبانہ کے جسم پر جو زخم آئے ہیں، وہ کسی تیز دھار چاقو کی مدد سے پیدا ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے، میں غلط سوچ رہا تھا۔ یہ خرم کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس سے اتنی سفاکی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا عمارت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے ہی جواد کی کار کھڑی تھی۔ اس نے گاڑی کو چھو کر دیکھا، انجن گرم تھا۔

اس نے ٹائروں کا جائزہ لیا۔ ان پر زیادہ مٹی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی انہیں دھویا گیا تھا۔ روش پر بریک سے پیدا ہونے والے نشانات تھے۔ غالباً روشنی دیکھ کر اس نے دروازے تک پہنچنے کے لیے رفتار یکایک بڑھا دی ہوگی۔ یہی وہ وقت تھا جب کسی کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔

جواد وہیں کھڑا انتظار کرتا رہا، حتیٰ کہ ڈاکٹر کی کار قریب آ کر رک گئی۔

وہ ڈاکٹر کے ساتھ بالائی منزل پر پہنچا اور لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ پوزیشن دیکھ کر تم کیا اندازہ لگا سکتے ہو، ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر توقیر، شبانہ کی لاش کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اسے افسوس تو تھا، مگر اب اس کا کیا فائدہ، مگر وہ قاتل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے پُرعزم ضرور تھا۔ اپنے عکس میں وہ انسپکٹر جواد سے بولا۔

"یہ عورت مر چکی ہے اور اسے اذیت دے کر مارا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کا چہرہ کتنا پُرسکون ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ چاقو کے پہلے وار نے اس کا کام تمام کر دیا ہوگا۔" جواد نے کہا۔ "جبکہ دوسرے زخم اس کی موت کے بعد لگے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مقتولہ کے چہرے پر سکون دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے تائید میں گردن ہلائی۔ "لیکن کوئی حتمی بات کہنے سے پہلے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا ضروری ہے۔" وہ جھک کر گردن کا زخم دیکھنے لگا۔

"یہ زخم قابل غور ہے۔" کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے دوبارہ کہا۔ "باقی زخم زیادہ خطرناک نہیں ہیں۔"

"باقی زخم، اذیت دینے کے لیے نہیں ہو سکتے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ "ممکن ہے یہ گردن کا زخم آخری رہا ہو۔ میرا مطلب ہے قاتل نے اسے اذیت دے کر معلومات حاصل کرنے کے لیے باقی زخم لگائے ہوں گے یا نہیں؟"

"یہ بھی ممکن ہے۔" ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔

"لیکن...... جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں......" انسپکٹر بولا۔ "اگر کاری زخم بعد میں اور اذیت دینے والے زخم پہلے لگے ہوتے تو مقتولہ کا چہرہ اس قدر پُرسکون نہ ہوتا۔"

"بعض اوقات شدید اذیت سہتے سہتے جب کوئی کاری زخم لگتا ہے تو موت اس اذیت سہنے والے کو پُرسکون بنا دیتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے فی الفور یہ احساس ہوتا ہے کہ اذیت کے لمحے گزر گئے اور اب اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"ممکن ہے مقتولہ سو رہی ہو اور گردن کے پہلے ہی وار نے اسے تکلیف کا احساس دلائے بغیر موت کی آغوش میں پہنچا دیا ہو؟" انسپکٹر بولا۔

"یہ بات بھی پوسٹ مارٹم ہی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ یہ عورت سو رہی تھی یا نہیں...... لیکن تم اتنی سی بات پر مغز ماری کرنے میں وقت ضائع نہ کرو، کوئی بھی ہوشیار وکیل عدالت میں اس شہادت کی بڑے آرام سے دھجیاں بکھیر سکتا ہے۔"

ڈاکٹر کی یہ بات انسپکٹر کے دل پر نہیں بلکہ پیشانی پر لگی تھی، یہی وجہ تھی کہ...... وہ کچھ زیر لب کہتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ کانسٹیبل حیات بخش بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"اگر خرم ریاض معمول کے مطابق، فلاور شاپ سے ہوتا ہوا آیا ہے تو خون کرنے سے پہلے اس کے پاس گھر میں اتنی توڑ پھوڑ کرنے کا ہرگز وقت نہیں تھا۔"

"تم نے اچھی بات کہی، حیات۔" انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن باوجود اس کے مجھ سے زیادہ ڈاکٹر توقیر کو شبے کی حد تک یقین ہے کہ یہ قتل خرم نے ہی کیا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ...... شبانہ کے اس طرح ممکنہ قتل سے پہلے ڈاکٹر توقیر صرف چند دن پہلے اپنے اس خدشے کا اظہار میرے سامنے کر بھی چکا تھا مگر افسوس کہ شاید ہم تساہل یا پھر اوور کانفیڈنس کا شکار رہے۔"

"ایسی بات نہیں سر!" حیات بولا۔ "اگر آپ کے اور ڈاکٹر کے ذہن میں کوئی کھد بد ہے تو وہ ایسے ہی نہیں ہو سکتی۔"

"ہم......" انسپکٹر نے ہونٹ بھینچے۔ اس کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا ہال کی طرف گھوم گیا۔ دروازے کے قریب ایک میز پر پھولوں کا ایک گلدستہ پڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر چند لمحوں تک ان پھولوں کو دیکھتا رہا۔ یہ وہی گلدستہ تھا جو خرم اپنی بیوی کے لیے لایا تھا۔

اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، میز کی درازیں نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ٹائم پیس کو غالباً پھینکا گیا تھا لیکن

ٹائم پیس ایک دراز میں اٹک کر گرنے سے محفوظ رہ گیا تھا۔ جواد نے اسے اٹھا کر دیکھا، ٹائم پیس بند تھا اور اس کی سوئیاں پانچ بج کر ستائیس منٹ پر رک گئی تھیں۔

اس کی پیشانی پر فوراً ہی سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ قاتل نے شبانہ کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہی تجوری کو جنونی انداز میں تلاش کرنا شروع کیا ہوگا۔ اس کام کے لیے وہ ہال یا دوسرے کمرے میں پانچ بج کر ستائیس منٹ پر موجود ہوگا۔ لیکن چھ بج کر چھپن منٹ پر فلاور شاپ میں خرم کا موجود ہونا، بھی کچھ الجھا رہا تھا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے جیسے یہ گتھی سلجھتی چلی گئی اور وہ مطمئن سا نظر آنے لگا۔ وہ پھولوں کے گل دستے کو تو بھول ہی گیا تھا۔ یوں وہ کچھ دیر تک شروع سے آخر تک ہر بات اپنے ذہن میں دہراتا رہا۔ پھر اس نے تیز نظروں سے خرم کو گھورنا شروع کر دیا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں۔

''مسٹر خرم!'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس موقع پر آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں لیکن اگر آپ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پسند کریں تو مہربانی ہوگی۔ آپ کو اپنا حلفیہ بیان دینے کے لیے زحمت دی جا رہی ہے، اس طرح ہمیں تفتیش کرنے میں بے حد آسانی رہے گی۔''

''یقیناً......'' خرم نے سوگواری سے کہا۔

وہ کمرے سے نکل کر جواد کے ساتھ ہال کی طرف چلنے لگا، جواد نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، حیات بخش آؤ چلیں۔''

دونوں ہال سے گزر کر زینے کی طرف چلنے لگے۔

جب وہ دروازے کے قریب رکھی ہوئی میز کے قریب پہنچے تو جواد نے میز سے گلدستہ اٹھایا اور خرم کی طرف بڑھا دیا۔

''تدفین کے وقت یہ پھول تمہارے کام آئیں گے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

خرم رک گیا۔ اس نے چند لمحوں تک گل دستے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ میز پر جم گئی، جہاں سے جواد نے وہ گلدستہ اٹھایا تھا۔

یکایک خرم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بالکل سفید نظر آنے لگا تھا۔ اس کے رخسار کی ایک نس پھڑکنے لگی تھی۔

انسپکٹر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ دیوار سے چڑھ کر اوپر آنے والا کوئی بھی شخص کسی ایسے گلدستہ کو ساتھ نہیں لا سکتا، مسٹر خرم! جب دروازہ اندر سے بند ہو اور بالکونی تک چڑھنا مقصود ہو تو ایسی چیزیں بند دروازے کے باہر ہی چھوڑ دی جاتی ہیں۔''

''معلوم نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔'' خرم غرایا۔ اس کی آنکھوں سے اچانک غصہ اور جھلاہٹ جھلک اٹھی تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ یہ گلدستہ اندر کیسے پہنچ گیا۔ ممکن ہے فرنٹ ڈور کھولنے کے بعد میں اسے اٹھا کر اندر لے آیا تھا..... اور پھر میں نے شاید اسے اس میز پر رکھ دیا تھا۔''

''تم قاتل ہو، خرم!'' انسپکٹر جواد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''گھر سے رخصت ہوتے وقت تم نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔''

خرم لڑکھڑا کر دروازے سے ٹک گیا۔ اس کی آنکھوں سے دیوانگی جھانکنے لگی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' اس نے زہریلی آواز میں کہا۔ ''میں تو...... میں تو اس وقت راستے میں تھا، اپنی کار میں...... لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا تو وقت بھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وقت کا تعین کر سکتی ہے لیکن صحیح وقت نہیں بتا سکتی، ایک گھنٹے کا فرق اس سلسلے میں کوئی بڑی بات نہیں اتنی دیر میں تم اطمینان سے نہا دھو کر کپڑے بدل سکتے تھے اور آسانی سے واپس جا کر پھول لا سکتے تھے۔''

خرم اسے کڑے تیوروں سے دیکھتا رہا۔

''تم نے سب پہلے ہی کر لیا تھا، خرم!'' جواد نے مسکرا کر کہا۔ ''اور اس کے بعد تم موقعِ واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنے میں مصروف ہوگئے تھے۔''

''تم یہ سب کچھ کبھی ثابت نہیں کر سکتے۔'' خرم چیخ پڑا۔

''میں ثابت کر لوں گا۔ میں یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ تمہاری بیوی شبانہ اس وقت سو رہی تھی جب تم نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد تم نے حالیہ صورتِ حال پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔''

خرم دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر بیٹھ گیا اور سسکیاں بھرنے لگا۔ اس بار اس کی سسکیاں حقیقی تھیں۔ انسپکٹر جواد نے گل دستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''احمق قاتل......! تمہیں اس گل دستے کو کار ہی میں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔''

وہ اب شبانہ کے قاتل کے پکڑے جانے کی خوش خبری ڈاکٹر توقیر کو سنانے کے لیے بے چین تھا۔ اسی کے توجہ دلانے پر ہی جواد کی سوچوں کا زاویہ بھٹکنے نہیں پایا تھا۔

خرم جن پھولوں سے بے وقوف بنا رہا تھا اب وہ خود ہی اس کے دام میں آ چکا تھا۔

❖❖❖

باغ سے باغ تک

طاہر جاوید مغل

کچھ واقعات انتہائی غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں... صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود ہمیشہ ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ تاریخ سے جڑے ایک ایسے ہی یادگار واقعے کی ناقابلِ فراموش کہانی... جس کے ایک کردار کی تلاش و کھوج نے کہانی کو ایک نئے رخ سے ہمکنار کر دیا... بہادری... دلیری کا تمغہ سجائے محبت کی فصیلوں کو عبور کرتا ایسا کردار جو ہر دفعہ ایک نئے روپ میں نمودار ہو رہا تھا۔

گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کے پسندیدہ

مصنف کا خوبصورت یادگار تحفہ

رات کا آخری پہر تھا۔ آنیہ جاگ چکی تھی مگر اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی...... وہ اس دروازے کی دوسری جانب کھڑا ہے جو دونوں کمروں کو آپس میں ملاتا ہے پھر دروازہ آہستہ سے کھلا...... وہ بے آواز چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ گیا۔ آج اسے صبح سویرے نکلنا تھا، یہ بات اس نے آنیہ کو کل شام ہی بتا دی تھی۔ آنیہ نے اس کے کپڑے استری کر دیے تھے اور ضرورت کی دیگر اشیا بھی اس کے کمرے میں میز پر رکھ دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آنیہ کو جگائے بغیر نکل جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت دبے پاؤں اس کے بیڈ کی طرف آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ آنیہ وہ مہک محسوس کرتی رہی جو اس کے بدن اور اس کے لباس میں سے اٹھ رہی تھی پھر وہ جھکا۔ اس نے بہت ہولے سے بالوں کی ایک لٹ آنیہ کی پیشانی سے ہٹائی۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے اور تب آواز پیدا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ آنیہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے آنکھیں وا کر کے وال کلاک کی طرف دیکھا اور ذرا سا چونکی۔ شام کو اس نے کہا تھا کہ ساڑھے چار بجے کے قریب نکلے گا مگر ابھی تو تین بجے تھے۔ وہ اتنی جلدی کیوں نکل گیا تھا؟ اس کے حوالے سے وہ ہر وقت اندیشے میں مبتلا رہتی تھی۔ اس کا جلدی نکلنا بھی اسے ٹھٹکا گیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ رات کا سناٹا تھا۔ بالائی منزل پر خاموشی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر وال کلاک کو دیکھا اور اپنے بال سمیٹتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ چپل گھسیٹ کر وہ جلدی سے دیوار گیر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کے ایک بڑے خانے میں کمبل اور لحاف وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے سب سے نیچے موجود ایک لحاف کو دیکھا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس کا دل جیسے چند لمحوں کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ ویلوٹ کا براؤن لحاف ایک جانب سے کٹا ہوا تھا۔ روئی باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ پستول غائب تھا جو آنیہ نے یہاں چھپایا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس نے شال اوڑھی، دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئی۔ وہ ابھی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم...... کہاں جا رہے ہو؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''کیا ہو گیا ہے آنیہ؟ تمہیں بتایا تو تھا۔''

آنیہ نے جلدی سے ہاتھ چلایا اور اس کی سیاہ جیکٹ کے نیچے کولٹ پسٹل کی سختی کو محسوس کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر بائیک کی چابی نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اس کے ہاتھ کو سختی سے پیچھے دھکیل کر بولا۔ ''کیا کر رہی ہو آنیہ؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

آنیہ نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا...... تم نے وعدہ کیا تھا مجھ سے...... اب رک جاؤ گے۔ لیکن تم نہیں رک رہے۔ تم پھر اسی کی طرف جا رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گی۔ ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بائیک کا ہینڈل پکڑ لیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے آنیہ۔ میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ یہ پسٹل تو صرف احتیاطاً لے کر جا رہا ہوں۔''

''نہیں، میں سب جانتی ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہو گئی ہوں...... پلیز پلیز...... مت کرو ایسا۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں پتا ہے میں نہیں رہ سکوں گی تمہارے بغیر...... تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں رہوں گی۔ مجھے اس طرح برباد مت کرو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے آنیہ کو پیچھے دھکیلا۔ ''میں وہیں جا رہا ہوں جہاں کا تمہیں بتایا تھا اور اگر......''

یکا یک وہ چپ ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں کسی قریبی سڑک سے سائرن کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے یہ کسی پولیس موبائل کا سائرن تھا...... آواز نزدیک آ رہی تھی۔

''آنیہ۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اور خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔ اندر جاؤ۔ میں نے کہا ناں، شام سے پہلے میں واپس آ جاؤں گا۔ میں وعدہ کر رہا ہوں تم سے۔ فار گاڈ سیک اندر جاؤ...... فار گاڈ سیک۔'' اس نے بے قراری کے عالم میں آنیہ کو دھکا دیا۔ تاریکی میں آنیہ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس دوران میں وہ موٹر بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ پولیس کار کا سائرن بتدریج بلند ہوتا جا رہا تھا۔ کار یا جیپ یقیناً اسی جانب آ رہی تھی۔ اس نے بائیک کو گیئر میں ڈالا۔ بائیک کا پچھلا پہیا چرچرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ''پلیز رک جاؤ...... پلیز۔'' آنیہ نے ایک بار پھر پکارا مگر تب تک وہ یخ بستہ تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا

آگے بڑھ چکا تھا۔

وہ سکتہ زدہ سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ سائرن کی آواز مزید نزدیک آ گئی تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں عقب میں دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گئی۔

دروازہ اندر سے بند کر کے وہ لڑکھڑاتی ہوئی اسی کمرے کی نیم گرم فضا میں پہنچی اور بستر پر اوندھی گر کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے سینے میں تلاطم بپا تھا۔ پورا جسم لرز رہا تھا۔ سائرن کی آواز اب دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کیا وہ زندہ واپس آئے گا؟ کیا وہ اسے پھر دیکھ سکے گی؟ یہ سوال بار بار ایک دہکی ہوئی میخ کی طرح اس کے دماغ میں پیوست ہو رہا تھا۔

کئی منٹ بعد وہ سیدھی ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرہ بارش میں دھلے سفید گلاب کی طرح نظر آتا تھا۔ ٹوٹنے والی چوڑیوں نے اس کی سرخ و سپید کلائی پر گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے رسنے والا خون ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ تب ایک بار پھر اپنے بال سمیٹے، کندھوں پر شال کو درست کیا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کے سبب کمرے کی کھڑکی کا منظر دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی سے باہر گھر کے صحن میں سفیدے کے پیڑ نیم تیرگی میں خاموش کھڑے تھے۔ بالائی منزل کے کمرے سے ماموں جی کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا، تقریباً دس انچ ضرب چار انچ کا ہوگا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''ہم نہیں مانتے...... ظلم کے ضابطے۔'' نیچے انگوٹھے کا نشان تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اسٹیکر پر یہ نشان روشنائی سے نہیں، کسی اور چیز سے لگایا گیا ہے۔ شاید خون سے۔ اس نشان کی بہت اہمیت تھی آنیہ کے نزدیک...... یہ نشان اس اندوہناک واقعے کی نشانی تھی جو کچھ عرصہ پہلے پیش آیا تھا اور ہمیشہ کے لیے اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔

آنیہ کی نگاہیں اس کھڑکی پر اور اس اسٹیکر پر جمی رہیں...... وہ خیالوں ہی خیالوں میں جیسے کہیں بہت دور پہنچ گئی...... وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھی۔ چند مہینے پہلے کے مناظر اس کے پردۂ تصور پر نمودار ہوئے اور ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

چند ماہ پہلے وہ جالندھر میں تھی۔ جالندھر میں زیادہ مسلمان تو نہیں تھے پھر بھی کئی علاقوں میں وہ رہائش رکھتے تھے۔ آنیہ کے والد بیرسٹر خورشید عالم بھی وہاں کے رہائشی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خواہش رکھنے کے باوجود تقسیم کے وقت پاکستان نہیں گئے اور اب بھی انڈیا میں آباد ہیں۔ بہار کالونی کی ایک کینال کی کوٹھی میں آنیہ اپنے والدین اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کر چکی تھی جبکہ بھائیوں میں سے ایک سیکنڈ ایئر اور دوسرا میٹرک میں تھا۔ اس کوٹھی میں ایک بڑا بیسمنٹ بھی تھا۔ اس بیسمنٹ کا ایک حصہ کتب خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کتب خانے میں زیادہ تر کتابیں تو آنیہ کے والد خورشید عالم صاحب کی تھیں تاہم چند الماریوں میں اس کے پڑدادا کے زمانے کی کچھ کتابیں اور مخطوطے بھی محفوظ تھے۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بڑے اچھے فوٹو گرافر بھی تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسٹل کیمرا ابھی لوگوں کے لیے ایک انوکھی اور نئی چیز تھی۔ اس کے پڑدادا ہاشم علی کا زمانہ وہی تھا جب ہندوستان میں تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ پورے ہندوستان میں لگی ہوئی آگ کے شعلے بتدریج بلند ہو رہے تھے۔ امرتسر میں جب جلیانوالا باغ کا تاریخی واقعہ ہوا، آنیہ کے پڑدادا ہاشم علی کی عمر قریباً پچیس برس ہوگی۔ بے شمار دوسرے ہندوستانیوں کی طرح ہاشم علی نے اپنی آنکھوں میں انگریزوں سے آزادی کا سپنا سجا رکھا تھا۔ شوقیہ فوٹو گرافر ہونے کے باوجود انہوں نے سانحہ جلیانوالا اور اس طرح کے کئی دیگر واقعات کی تصویر کشی کی تھی۔ پرانے کوڈک کیمرے سے کھینچی گئی وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں انہوں نے ایک خود ساختہ البم میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ اس البم کی خصوصیت یہ تھی کہ اکثر تصویروں کے نیچے ہاشم علی نے اپنے ہاتھ سے تصویروں کا پس منظر اور ان کی اہمیت بھی لکھی تھی۔

آنیہ کو اپنے جدِ امجد کی نشانیوں اور خاص طور سے اس البم میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیلانی لڑکی بھی تھی۔ بس جو بات دماغ میں سما گئی، وہ سما گئی۔ ماما کے منع کرنے کے باوجود وہ اکثر تہ خانے میں گھس جاتی اور ان پرانی اشیا میں کھوئی رہتی۔ کبھی کبھی اس پر پینٹنگ کا بھوت بھی سوار ہو جاتا تھا۔

بی سی ایس کا رزلٹ اناؤنس ہو چکا تھا اور اب ماسٹرز میں داخلے تک وہ فارغ ہی تھی۔ اس دن بھی ناشتے کے بعد اپنے موبائل پر ایک دو سہیلیوں سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد وہ بیسمنٹ میں گھس گئی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویروں والا البم ابھی تک مطالعے کی میز پر ہی رکھا تھا۔ اس نے ہیڈ فون لگایا اور میوزک سننے کے ساتھ ساتھ البم کے ورق پلٹنے لگی۔

ابتدائی حصے میں ایک تصویر ہمیشہ اس کی توجہ کو جذب کر لیتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو خصوصی دلچسپی سے دیکھتی چلی گئی اور پھر اس کے نیچے لکھی ہوئی وہ تحریر پڑھنے لگی جو لگ بھگ سو سال پہلے اس کے پڑدادا ہاشم علی نے لکھی تھی۔ صاف ستھری لکھائی تھی۔ ایک زمانہ گزرنے کے باوجود روشنائی کے رنگ میں معمولی فرق پڑا تھا۔ تصویر قدرے زرد ہو چکی تھی مگر اب بھی منظر بالکل واضح تھا۔

آنیہ نے ایک طویل سانس لی، ہیڈ فون اتارا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر تصویر کو بغور دیکھنے لگی۔ یہ ٹھیک سو سال پرانی تصویر جلیانوالا باغ کی تھی۔ یہ اس قیامت کی منظر کشی تھی جو 1919ء میں امرتسر کے اندر عوام کے ایک جم غفیر پر ٹوٹی تھی۔ اپریل کا مہینا تھا اور 13 تاریخ تھی۔ انگریزوں سے آزادی مانگنے والے ہزاروں لوگ اپنے نگارسینوں کے ساتھ اس باغ میں جمع ہوئے تھے۔ ان میں سکھ، ہندو، مسلمان سب شامل تھے اور پھر جنرل ڈائر نام کے ایک درندے نے ان پر موت کی بارش کر دی تھی۔

زیرِ نظر تصویر میں ایک شخص کمر پر گولی کا زخم لے کر زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے اردگرد بھاگتے دوڑتے لوگوں کے پاؤں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ لو دس سال کا ایک بچہ بھی اس تصویر میں موجود تھا۔ وہ اس زخمی کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ پر اوندھا گرا ہوا تھا، جیسے اسے مزید گولیوں سے اور ان لاٹھیوں سے بچانا چاہتا ہو جو عالمِ وحشت میں آفت زدہ لوگوں پر برسائی جا رہی تھیں۔ بچے نے باپ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا...... اور پلٹ کر اس سپاہی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اس کے باپ کو مارنے کے لیے لاٹھی دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک بے مثال تھی۔ اس میں خوف تو بے شک تھا مگر اس میں ایک آگ بھی تھی۔ ایک تر شیر کی سی دلیری، بے خوفی اور غضب ناکی۔ اس چمک نے اس فوٹوگراف کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس تصویر کے نیچے آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے جو دو تین پیراگراف لکھے تھے، وہ بھی اپنی جگہ یادگار تھے۔ آنیہ انہیں کئی مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ اس تحریر میں انہوں نے اس تصویر کا سیاق و سباق بیان کیا تھا۔ انہوں نے تصویر کا عنوان ''شیر بچہ'' رکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

''میں قیامت کی اس شام، خود جلیانوالا باغ میں موجود تھا۔ میں انگریز حاکموں کی اس ناقابلِ بیان سفاکی اور درندگی کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس وحشی جنرل ڈائر نے اپنے ایک بیان میں خود کہا ہے، میں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے نہیں ان کو سزا دینے کے لیے گولی چلوائی تھی اور اس وحشی کی اس سزا نے سیکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں نہلا دیا۔ سیکڑوں جاں بہ لب ایسے تھے جن کے لیے طبی امداد کے راستے مسدود کر دیے گئے اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ مقامی ذرائع کے مطابق 1000 سے زائد لوگ اس بے رحمانہ فائرنگ کی بھینٹ چڑھے۔ یہ تصویر ایک ایسے مسلمان بچے کی ہے جو اپنے زخمی باپ کو بچانے کے لیے اس کے اوپر گر گیا تھا اور ''ابا ابا'' پکار رہا تھا۔ گولیاں اس کے سر کے اوپر سے گزرتی رہیں اور وہ اپنے باپ سے چمٹا رہا۔ وہ اپنے باپ پر برسنے والی گولیوں اور لاٹھیوں کے لیے ایک ڈھال بن گیا۔ یہ تصویر اتارے جانے کے چند سیکنڈ بعد وہ اپنے باپ کے دفاع میں دیوانہ وار ایک سپاہی کی ٹانگوں سے چمٹا اور اسے گرا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور شخص اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مل کر اس نے اپنے زخمی باپ کو گھسیٹا اور خطرے والی جگہ سے دور لے گیا۔ میری معلومات کے مطابق وہ زخمی شخص ان قریباً 1500 زخمیوں میں شامل تھا جو بعدازاں زیرِ علاج ہوئے اور مختلف اسپتالوں میں پہنچائے گئے۔ اس دس سالہ بچے کی حیران کن شجاعت کا بس دس بیس فیصد حصہ ہی اس فوٹوگراف میں قید ہو پایا ہے، باقی میں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اور میرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں، اس روزنہ خانے میں بیٹھے بیٹھے اور اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے آنیہ کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ تصویر 1919ء کی تھی اور اب 2019ء تھا، پورے سو سال گزر چکے تھے اس تصویر کو۔ ان سو سالوں میں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ یقیناً یہ شجاع لڑکا جوان ہو کر اور پھر شاید بوڑھا ہو کر مر چکا تھا۔ اس کے بچے بھی مر چکے ہوں گے، اب شاید تیسری نسل ہو گی۔ کون تھا یہ بچہ؟ کس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب کہاں تھے یہ لوگ؟ کئی سوال یکایک آنیہ کے ذہن میں اُبھر آئے۔ آنیہ کے جدِ امجد ہاشم علی نے اسے کسی نڈر اور بہادر فیملی کا ''شیر بچہ'' قرار دیا تھا۔ اس شیر بچے کی زندگی کہاں اور کیسے گزری، اور اب اس کی اولاد کہاں ہے؟

☆☆☆

آنیہ اپنی سفید آلٹو کار میں سوار امرتسر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی منزل امرتسر کی بڑی پبلک لائبریری تھی۔ یہاں اسے ایک سکھ لڑکی نہار کور سے ملنا تھا۔ نہار

ویسے تو لائبریرین تھی مگر اسے ہسٹری سے خاص دلچسپی تھی۔ آنیہ کو معلوم ہوا تھا کہ نہار کور نے جلیانوالا باغ کے سانحے پر کافی کام کیا ہے۔ خاص طور سے اس نے اس سانحے میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کے درست اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ ان فیملیز کا بھی سراغ لگایا تھا جن کی زندگیاں کسی نہ کسی طور اس اندوہناک واقعے سے متاثر ہوئی تھیں۔

یہ ساری باتیں آنیہ کو تین روز پہلے اپنے پاپا سے ہی پتا چلی تھیں۔ آنیہ کے پاپا بھی اس تصویر کے بارے میں یہ خوب جانتے تھے جو تہ خانے میں رکھے البم کے ایک پیج پر پچھلے قریباً سو برس سے موجود تھی۔ اپنی آنکھوں میں شیر جیسی دلیری کی چمک رکھنے والے بچے کی تصویر نے اس کے پاپا کو بھی متاثر کیا تھا بلکہ وہ ایسی تصویر تھی جو ہر دیکھنے والے کو متوجہ کر لیتی تھی۔ تین روز پہلے آنیہ نے پاپا کو بتایا تھا کہ وہ اس تصویر کے حوالے سے کچھ کھوجنا چاہتی ہے۔ پاپا سمجھ گئے تھے کہ اب جو کچھ آنیہ کے دماغ میں آ گیا ہے، وہ کر کے رہے گی۔ پاپا اس کی کچھ زیادہ مدد تو نہیں کر سکتے تھے تاہم انہوں نے اسے اس لائبریرین نہار کور کا پتا بتا دیا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ شاید آنیہ کو اس سے کچھ معلوم ہو سکے۔

نہار کور مضبوط ہاتھ پاؤں اور لمبے ریشمی بالوں والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ ابھی غیر شادی شدہ تھی اور اپنی والدہ کے ساتھ اندرونی شہر کے ایک کشادہ گھر میں رہتی تھی۔ جالندھر سے ٹرنک روڈ کے ذریعے قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے آنیہ امرتسر پہنچ گئی تھی۔ نہار کور سے اس کی ملاقات لائبریری کے ریڈنگ روم کی ایک میز پر ہوئی۔ آنیہ اپنے اسمارٹ فون میں البم کی وہ خاص تصویر اور اس کے نیچے لکھی ہوئی تحریر کا عکس بھی لے کر آئی تھی۔

نہار کور کو بھی اس تصویر اور اس تحریر میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اسے یہ جان کر بھی خوشی محسوس ہوئی کہ آنیہ اسی کی طرح رومانی مزاج کی لڑکی ہے۔ فینٹسی پر یقین رکھتی ہے اور ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ایک شاندار تصویر پر تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ دونوں میں سیر حاصل گفتگو ہوئی اور نہار کور نے وہ تصویر اور تحریر اپنے موبائل میں لے لی۔ نہار نے آنیہ سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں آنیہ کی جو مدد بھی ہو سکی، وہ کرے گی۔ نہار کور نے جلیانوالا کے حوالے سے جو اعداد و شمار اکٹھے کر رکھے تھے، ان میں چالیس پچاس مسلمانوں کا ذکر بھی تھا۔ ان میں سے کچھ جان سے گئے تھے اور کچھ زخمی ہوئے تھے۔ کم از کم بیس افراد ایسے تھے جن کی فیملیز کے بارے میں بھی معلومات موجود تھیں۔

آنیہ نے نہار کور کو تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''نہار! یہ ایک کلیو ایسا ہے جو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکے۔'' اس نے تصویر پر ایک جگہ انگلی رکھی۔

نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ چیز میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ زخمی باپ کے جسم پر ایک پرانی فوجی قمیص ہے۔ اس طرح کا لباس برٹش انڈین آرمی کا ہوتا تھا۔''

''مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص فوجی تھا، یا ہو سکتا ہے کہ سابق فوجی ہو۔ تم اس اینگل سے کوشش کرو تو شاید کوئی کھوج مل جائے۔''

نہار ایک بار پھر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس کی نگاہیں بدستور تصویر کے عکس پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

تصویر والی بات کچھ اس طرح آنیہ کے دماغ میں سمائی تھی کہ نکل ہی نہیں رہی تھی۔ نہار کور سے ملے ہوئے اسے اب آٹھ دس روز ہو چلے تھے۔ وہ دو بار نہار کو فون بھی کر چکی تھی۔ لائبریری میں کوئی فنکشن تھا جس کی وجہ سے نہار کی مصروفیت بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے آنیہ کو تسلی دی تھی کہ دو چار روز میں وہ اسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کرے گی۔

آج بھی آنیہ بیسمنٹ میں گم صم بیٹھی تھی۔ والد کورٹ جا چکے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے اپنے کام سے نکل چکے تھے۔ وہ مطالعے کی میز پر بیٹھی ایک پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اتنے میں بیسمنٹ کا دروازہ دھڑ دھڑ بجا۔ اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے دوپٹا اپنے سینے پر درست کیا اور دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ماما کھڑی تھیں۔

''کیا ہوا ماما؟'' آنیہ نے پوچھا۔

ماما کے چہرے پر بیزاری تھی۔ ''آنو! کیا ہر وقت یہاں گمی رہتی ہو، کچھ دین دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ فرحان ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا ہے۔''

آنیہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ رسٹ واچ دیکھی۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ فرحان آ ٹپکے گا۔ فرحان اس کا خالہ زاد تھا، عمارتی لکڑی کا کام کرتا تھا۔ اس کا شمار جالندھر کے گنے چنے تاجران میں ہوتا تھا۔ اس کے والد نے بھی اس کام میں نام اور پیسا کمایا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے آنیہ اور فرحان کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی۔

آنیہ ٹھنک کر بولی۔ ''پلیز ماما! کسی طرح اسے ٹال دیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ دبی آواز میں بولیں۔ ''کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کررہی ہو۔ تمہیں پتا ہے، وہ تم سے ملنے آیا ہے۔ کوئی غیر تو نہیں۔ تمہارا خالہ زاد ہے۔ تم پہلے بھی تو اس کے ساتھ جاتی رہی ہو۔ اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟''

''اب ہوگئی ہے ناں ماما۔ آپ لوگ مجھے پھنسا رہے ہیں۔'' وہ پھر ٹھنکی۔

''اچھا بند کرو بکواس۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ کتنی چاہت سے آتا ہے، نئی گاڑی لی ہے۔ سب سے پہلے تمہیں دکھانے آیا ہے۔''

''اُف یہ نئی گاڑی۔'' آنیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اپنا لباس درست کرتی ہوئی ماما کے ساتھ باہر آگئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور فرحان چمچاتی ''ہنڈائی کار'' پر سی سینٹر کی طرف جارہے تھے۔ فرحان اسے لنچ کرانا چاہ رہا تھا۔ فرحان کی عمر اٹھائیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ تھا، پیشانی سے بال اُڑے ہوئے تھے مگر مجموعی طور پر وہ قبول صورت تھا۔ اس وقت بھی کلف دار شلوار قمیص اور واسکٹ میں وہ جچ رہا تھا۔ کوئی ایسی خاص کمی نہیں تھی اُس میں۔ آنیہ کو بہت پسند بھی کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، بطور ایک شریکِ حیات وہ کبھی بھی آنیہ کو بھایا نہیں تھا۔

''گاڑی کا نمبر پڑھا ہے تم نے؟'' اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''گولڈن نمبر ہے۔ تین زیرو والا، ایک لاکھ تو اس نمبر کا ہی دینا پڑا ہے۔'' اس نے حسبِ عادت امارت کا اظہار کیا۔

''تو کیا ایسے نمبر کی وجہ سے گاڑی زیادہ آرام دہ ہو جاتی ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

وہ زور سے ہنسا۔ ''آرام دہ تو نہیں ہوتی لیکن کچھ جلنے والوں کے لیے تکلیف دہ ضرور ہو جاتی ہے۔''

''لیکن ہمیں دوسروں کی تکلیف کے بجائے اپنے آرام اور خوشی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔''

''بھئی اسی لیے تو جارہے ہیں۔ بتاؤ کیا کھانا پسند کرو گی۔ چائنیز یا پھر کانٹی نینٹل۔ ویسے ذاتی طور پر تو مجھے دیسی کھانے ہی زیادہ پسند ہیں۔ مٹن گوشت کی کڑاہی ہو اور......''

''اور ڈھیر ساری ہو۔'' آنیہ نے اُس کی بات اُچکی۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

فور اسٹار چائنیز ریسٹورنٹ میں وہ لنچ سے بمشکل فارغ ہوئے ہی تھے کہ آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔

''ہیلو نہار! کیا حال ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''حال اچھا ہے، اور خبر بھی اچھی ہی ہے۔''

آنیہ کا جسم سنسنا اٹھا۔ ''مطلب کہ پیش رفت ہوئی ہے؟''

''بالکل ہوئی ہے...... مجھے لگتا ہے کہ میں ''شیر تیج'' کی فیملی کا سراغ لگانے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہوں...... تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ایک کام سے ہی نکلی ہوئی ہوں۔''

''آنیہ جانی! اگر اس وقت یہاں آسکو تو بہت اچھا ہو، کل مجھے دفتری کام سے دہلی جانا ہے پھر دو تین روز تو لگ جانے ہیں۔''

''......آ چھا...... میں کوشش کرتی ہوں...... بلکہ میں آرہی ہوں۔ کہاں ملو گی تم؟''

''لائبریری شام سات بجے تک کھلی ہے، میں وہیں پر ہوں۔''

''اوکے...... میں پھر نکلتی ہوں۔'' آنیہ نے بے تابی سے کہا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے فرحان کی طرف دیکھا۔ فرحان کے چہرے پر مایوسی آمیز جھنجلاہٹ تھی۔

''کیا ہوا اب؟'' اس نے پوچھا۔

''فرحان! میری ایک دوست نہار کور کا فون تھا۔ یہ امرتسر میں لائبریرین ہے، میں اس کے ساتھ مل کر ایک آرٹیکل پر کام کررہی ہوں، میرا ابھی اس کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔ آئی ایم ویری ساری فرحان۔''

لائبریری اور آرٹیکل وغیرہ کے ذکر نے فرحان کو مزید ڈسٹرب کیا۔ اسے ایسے معاملات میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی تعلیم واجبی سی تھی۔ بس اتنی ہی جتنی حساب کتاب اور کاروباری سودے کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ بولا۔ ''یہ کن بکھیڑوں میں پڑی رہتی ہو آنیہ ڈارلنگ۔ ایسے کاموں سے حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھو اتنا پیارا چہرہ کتابیں پڑھ پڑھ کر کملاتا جارہا ہے۔ اگر کتابوں میں ہی سر کھپانا تھا تو پھر خالو خورشید کی طرح قانون شانون کی کتابیں پڑھتیں۔ کچھ فائدہ تو ہوتا۔''

"وکیل بیویوں کو سنبھالنے میں دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔" وہ ذرا شوخی سے بولی اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

فرحان احمد اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں کہیں غصے کی جھلک نظر آتی تھی۔

☆☆☆

جالندھر سے امرتسر کا فاصلہ اپنی سوزوکی آلٹو گاڑی پر آنیہ نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور لائبریری میں نہار کے پاس جا پہنچی۔ اب ان دونوں نے کولڈ کافی کے کپ اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے اور معروفِ گفتگو تھیں۔ دونوں کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا، ان کی نگاہیں سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔

نہار کہہ رہی تھی۔ "یہ دیکھو آنیہ جانی! یہ ان میں پچیس افراد کا ڈیٹا ہے جو مسلمان تھے اور جلیانوالا میں شہید یا زخمی ہوئے۔ ان میں سے یہ ایک شخص تاج محمد حیدر برٹش انڈین آرمی میں نائب صوبیدار تھا۔ یہ 1917ء تک برٹش آرمی میں ہی تھا اور بے شمار دیگر ہندوستانیوں کی طرح اپنے انگریز آقاؤں کی جنگ فرانس میں لڑ رہا تھا۔ یہ سب لوگ جرمنی اور اس کے اتحادیوں سے برسرپیکار تھے اور ایک ایسے کاز کے لیے سات سمندر پار، اپنا خون بہا رہے تھے جو اُن کا کاز تھا ہی نہیں۔ ایک خونریز جھڑپ میں تاج محمد حیدر کے سینے پر شدید ضرب آئی۔ جس نے بعدازاں سخت سردی کی وجہ سے نمونیے کی شکل اختیار کر لی۔ بیماری کے بعد 1917ء کے وسط میں تاج محمد کو فوج سے فارغ کر کے واپس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ میری تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جلیانوالا باغ کے اندر زخمی حالت میں گرا ہوا شخص وہی سابق صوبیدار تاج محمد ہے..... اور اس کے اوپر گرا ہوا بچہ اس کا بڑا بیٹا اسداللہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسداللہ کی ایک اور تصویر بھی موجود ہے۔ اس تصویر میں وہ دس سالہ بچہ نہیں بلکہ ایک کڑیل جوان ہے، دیکھنا چاہو گی؟"

دنیا جہان کا تجسس آنیہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ "دکھاؤ پلیز! وہ مٹھیاں بھینچ کر سرخ گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔

نہار نے کی پیڈ سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور اسکرین پر ایک فوجی دستے کا گروپ فوٹو نظر آنے لگا۔ نہار نے کہا۔ "لیکن یہ پہلی جنگِ عظیم کی نہیں دوسری کی تصویر ہے۔ یہ زمانہ ہے قریباً 1942ء کا۔ یعنی 1919ء میں جو لڑکا دس سال کا تھا وہ قریباً 32 سال کا ہو چکا تھا۔ اس گروپ میں پہچاننے کی کوشش کرو کہ وہ کون ہے؟"

آنیہ نے دانتوں میں انگلی دبا کر چند لمحے سوچا اور پھر چوڑے سینے اور روشن چہرے والے ایک دراز قد فوجی پر انگلی رکھ دی۔

"زبردست..... بھئی مان گئے تمھیں۔" نہار نے آنکھیں نچائیں۔ "یو آر ابسولیوٹلی رائٹ..... یہی ہے وہ شیر بچہ۔ اس نے بھی اپنی معاشی مجبوریوں کے تحت آرمی جوائن کی۔ وہ لیفٹیننٹ سے کیپٹن کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا جب اس نے ایک انگریز میجر پر حملہ کیا اور اسے شوٹ کر کے فرار ہو گیا۔ 1947ء تک کوشش کے باوجود اس کا اور اس کے اہلِ خانہ کا سراغ نہیں ملا۔ آزادی کے بعد وہ واپس آیا اور مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں رہائش اختیار کی۔ اس کے چار بچے تھے..... باقیوں کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں تاہم اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تیمور حیدر کافی معروف ہوا۔ وہ ایک زبردست کوہ پیما تھا۔ یعنی اپنے بزرگوں کی طرح اس نے بھی ایک دلیرانہ پیشہ اپنایا۔ اس نے 800 میٹر تک کی کئی چوٹیاں سر کیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ قریباً 48 برس کی عمر تک ایک سرگرم کوہ پیما رہا۔ تیمور حیدر کی وفات 2003ء کے لگ بھگ ہوئی۔ نیپال میں ایک چوٹی سر کرتے ہوئے تیمور نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالتے ہوئے ایک جاپانی کی جان بچائی اور خود شدید زخمی ہوا۔ دو روز بعد اس نے کھٹمنڈو کے اسپتال میں دم توڑ دیا۔ کوہ پیمائی کی فیلڈ کے لوگ اسے ایک ہیرو کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اسی شیر بچے کا شیر بیٹا۔"

"تیمور حیدر کی بھی تصویر ہے؟" آنیہ نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"بالکل ہے۔" نہار بولی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تیمور کی تین چار تصویریں ابھر آئیں۔ اپنے باپ ہی کی طرح کڑیل۔ آنکھوں میں بے خوفی کی بانکی چمک اور صندوق جیسا سینہ۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر تک بھی وہ صحت مند اور مضبوط نظر آتا تھا۔ آنیہ نے بڑی محبت اور عقیدت سے اس جانباز کی یہ تصویریں دیکھیں۔

"اور تیمور حیدر کی اولاد؟" آنیہ نے پوچھا۔

نہار نے ایک فائل میں کچھ تلاش کرنے کے بعد اسے اسکرین پر انلارج کیا اور بولی۔ "تیمور حیدر کا ایک بیٹا اور بیٹی تو یورپ میں کہیں سیٹل ہیں۔ دوسرے بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں راجوری کے علاقے میں

ہے اور کسی اخبار یا چینل وغیرہ سے وابستہ ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے بارے میں درست جانکاری مل سکے۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتا چلا، میں تمہیں انفارم کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے دلی سے واپس آنے تک کوئی کلیو مل جائے۔"

نہار کور اور آنیہ کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو بے حد دلچسپ اور معلومات افزا رہی تھی۔ آنیہ کے لیے تو یہ سب کچھ ایک دفینہ دریافت کرنے جیسا تھا۔ بالآخر اس تصویر سے منسلک لوگ پردۂ اخفا سے باہر نکلے تھے جو سو سال پہلے آنیہ کے جدِ امجد نے جلیانوالا باغ میں اپنے کوڈک کیمرے سے اتاری تھی اور جو اَب تک ایک تہ خانے میں رکھے البم میں دبی ہوئی تھی۔

آنیہ نے اپنے اسمارٹ فون پر ایک بار پھر وہ کہنہ تصویر دیکھی۔ زخمی باپ کے اوپر گرے ہوئے دلیر بچے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک مظلوم کی آنکھیں، جن میں نظر آنے والے غیظ و غضب نے اور جراحت کی چمک نے اس تصویر کو بے مثال بنا دیا تھا۔ آنیہ نے تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور بہ زبانِ خاموشی کہا۔ آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔

☆☆☆

تصویر والا شیر بچہ اب صرف شیر بچہ نہیں تھا۔ آنیہ کو اس کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے اوراقِ زندگی اس کے سامنے کھل چکے تھے۔ اس کا نام اسد اللہ تھا۔ اس نے ایک انگریز میجر کو قتل کیا تھا اور آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کے ہی کسی شہر میں اپنی باقی زندگی گزاری تھی۔ مگر اسد اللہ کی موجودہ نسل کے بارے میں ابھی تک نہار کور اور آنیہ کو کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا تھا۔ دو روز پہلے نہار سے آنیہ کی ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی۔ اس سے آنیہ کو بس اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ کچن جنگ میں جاں بحق ہونے والے کوہ پیما تیمور حیدر کی اولاد میں سے ان کا صرف ایک بیٹا یہاں انڈیا میں ہے اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ان دنوں وہ ہماچل سے آگے کہیں ضلع راجوری میں رہائش پذیر ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے کسی شعبے سے وابستہ ہے۔

آنیہ ہمیشہ سے فینٹسی پر یقین رکھنے والی لڑکی تھی۔ اب یہ بھی ایک طرح کی فینٹسی ہی تھی کہ وہ اس نسل کے کم از کم کسی ایک فرد سے ضرور ملنا چاہتی تھی، بالمشافہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ ایک بھوت سا تھا جو اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔

ایک دن جیسے بیٹھے بیٹھے کسی نے اس کے کان میں پھونک ماری اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ماما ٹی وی دیکھ رہی تھیں، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کیا ہوا آنو؟"

"ماما! میں "راجوری" جا رہی ہوں، کل صبح۔"

"ہائیں! او دیوانی ہو گئی ہے۔ راجوری کیوں جانے لگی تو؟ اور وہاں کیا کام ہے تجھے؟"

"آپ کو بتایا تو تھا کہ ایک آرٹیکل لکھ رہی ہوں، اس کے لیے وہاں جانا ضروری ہے شاید ایک دو دن رکنا بھی پڑے۔"

"آنو...... آنو! کچھ ہوش کے ناخن لے۔ یہ آرٹیکل شارٹیکل والا خناس دماغ سے نکال دے۔ کچھ ڈھنگ کی باتیں سوچ...... اور میں تو تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ اب باقی کی پڑھائی بھی باجی کے گھر جا کر، کر لینا۔ وہ لوگ خود تعلیم کو اہمیت دینے والے ہیں۔ وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی تجھے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" آنیہ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ "تعلیم کو بہت اہمیت دیتا ہے خالہ کا گھرانا اسی لیے سب بچوں کو تعلیم کے زیور سے لاد رکھا ہے۔"

"آنو! بہت زبان چلانے لگی ہے تو...... یہ نہ ہو کہ میں بھی سخت بولنے پر مجبور ہو جاؤں اور میں صاف بتا دوں...... یہ تمہارا راجوری والا پروگرام بالکل نہیں چلے گا۔ اگر جانا ہی ہے تو پہلے پاپا سے مشورہ کر لو اور اگر وہ اجازت دیں تو پھر کسی اور دن کے لیے رکھ لو۔"

وہ اٹھلا کر بولی۔ "پاپا سے اجازت تو مجھے مل ہی گئی ہے...... لیکن...... آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں کہ پروگرام کسی اور دن کا رکھ لو۔"

وہ ٹی وی آف کرتے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں بولیں۔ "کل تیری خالہ مریم کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آنا ہے۔ تمہارے خالو امجد بھی ساتھ ہوں گے۔"

"کس لیے آنا ہے؟" آنیہ نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور تنک کر بولی۔

"بھئی! تھوڑی بہت بات کرنی ہے انہوں نے تمہارے پاپا سے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ باجی مریم بیمار رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جلد از جلد فرحان کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ وہ تو اسی سال کی بات کر رہی ہیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ ابھی ڈیڑھ دو سال کا وقت تو انہیں نکالنا ہی پڑے گا۔"

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ "پلیز ماما! ابھی میرا

شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ابھی آپ میرے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں نے پاپا سے بھی اس بارے میں بات کی تھی۔ وہ مجھ سے ایگری ہیں......"

"لیکن آنو! یہ بھی تو سوچو کہ......"

"پلیز...... پلیز۔" اس نے تیزی سے کہا اور بات بدل کر بولی۔ "باقی رہی جانے کی بات، وہ تو مجھے کل ہر صورت جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ میرا سارا پہلا کام ضائع ہو جائے گا ماما! آپ نے پاپا سے "پرمیشن" کی بات کی ہے تو وہ میں اُن سے لے لوں گی۔"

"کیسے لے لوگی۔" وہ ذرا غصے سے بولیں۔ "اکیلی جانا چاہ رہی ہوناں؟"

"ابھی تو یہی ارادہ ہے۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ میری ایک فرینڈ بھی ساتھ چل پڑے۔ آپ اس پرمیشن والے مسئلے کو مجھ پر چھوڑ دیں۔" اس نے کہا اور اپنے بالوں کو جُوڑے کی صورت میں سمیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ماما کی بات پر اس کا دماغ کھول کر رہ گیا تھا۔ فرحان کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ماما اس سلسلے میں جتنا زور دیتی تھیں، اس کا دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا تھا۔ باقی پاپا سے اجازت لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ اجازت لے ہی چکی تھی۔ اس نے پاپا کو البم کی تصویر کے حوالے سے ہونے والی ساری پیش رفت سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ شاید اسے اس سلسلے میں دو چار دن کے لیے کسی دوسرے شہر جانا پڑے۔ انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماما ان کو فون کر کے قائل کرنے کی کوشش کرتیں۔ آنیہ نے سوچا کہ وہ خود پاپا کو آفس میں فون کر لیتی ہے۔

اسی سہ پہر آنیہ ایک بار پھر امرتسر میں نہار کور کے پاس تھی۔ نہار کور نے ان دنوں لائبریری سے آٹھ دس روز کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ لہٰذا دونوں کی ملاقات نہار کور کے گھر واقع رنجیت کالونی میں ہوئی۔ آنیہ نے نہار کو بتایا کہ وہ دو چار دن کے لیے راجوری جانا چاہ رہی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اسد اللہ حیدر کی موجودہ نسل کے بارے میں معلومات حاصل کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ اسد اللہ کے اس پوتے کا کھوج لگانے میں ہی کامیاب ہو جائے جو اطلاعات کے مطابق راجوری ہی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

آنیہ کا ارادہ جان کر نہار کی آنکھوں میں بھی ایک تفریحی موڈ دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "آنیہ جانی، تم راجوری میں رہو گی کہاں؟"

"یوتھ ہاسٹل میں رہ لوں گی...... نہ ہوا تو ہوٹل تو ہیں ہی۔"

"راجوری میں میرے ایک ماموں بھی رہتے ہیں۔ بڑی خوش باش پرسنالٹی ہے، اگر تم چاہو تو اُن کے گھر بھی قیام کر سکتی ہو۔"

آنیہ بولی۔ "میں اکیلی کیسے قیام کر سکتی ہوں یا تو پھر...... تم بھی ساتھ چلو۔ دو چار دن اچھے گزر جائیں گے۔ ویسے بھی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"

نہار کور ایک دم سوچ میں پڑ گئی۔

اس کے چہرے پر نیم رضامندی کی جھلک دیکھ کر آنیہ نے فوراً زور دیا۔ "ڈیئر! تم نے چھٹیاں بھی لے رکھی ہیں۔ کیا گھر میں پڑی پڑی بور ہوتی رہو گی۔ دونوں چلتے ہیں۔ بڑا مزہ رہے گا۔ ویسے بھی یہ تمہاری فیلڈ کا کام ہے۔ ہم تصویر والے شیر بچے کی موجودہ نسل کے بارے میں جاننے کی دلچسپ کوشش کر رہے ہیں۔"

پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد آنیہ کامیاب رہی۔ اس نے نہار کو اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر لیا۔ نہار نے فون پر اسی وقت اپنے ماموں دلبر سنگھ کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنی ایک دوست کے ہمراہ کل شام تک ان کے پاس پہنچ رہی ہے۔ انہوں نے بہت خوشی محسوس کی۔

نہار کور کا گھر ایک گنجان آبادی میں تھا۔ (وہ اس گھر میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی) دونوں اس وقت گھر کی دو منزلہ چھت پر بیٹھی تھیں۔ یہاں سے مشہور جلیانوالا باغ کا فاصلہ ایک ڈیڑھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ باغ کی باقیات اور وسیع احاطے کی کچھ جھلکیاں چھت سے بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ مخالف سمت میں کچھ فاصلے پر اس آبادی کے خدوخال دکھائی دیتے تھے جہاں ہونے والا ایک واقعہ اس المناک سانحے کا سبب بنا تھا۔ انگلش مشنری کی ایک انگریز ٹیچر بائیسکل پر ایک گلی سے گزر رہی تھی۔ پورے امرتسر میں فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ شرُوڈ نامی یہ ٹیچر بے خبر تھی کہ وہ بھی اس آگ کی زد میں آنے والی ہے۔ مقامی لوگوں کے ایک مشتعل گروپ نے اس انگلش لیڈی کو بائیسکل سے گرا کر پکڑ لیا اور بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ لیڈی کو نہایت نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تشدد کی یہی لہر اس دورانیے میں قریباً 20 ہندوستانیوں اور 5 یورپین کو نگل چکی تھی۔ یہ سارے واقعات جلیانوالا کے قتل عام سے تین روز

پہلے دس اپریل کو ہوئے تھے...... (لیڈی شرووڈ کو بعد ازاں بچالیا گیا تھا)

چھت کے اوپر سے ہی نہار کور نے دور اس گلی کی نشاندہی کی جہاں لیڈی شرووڈ والا واقعہ ہوا تھا اور انگریز انتظامیہ نے اہلِ محلہ کو سزا کے طور پر حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں آنے جانے کے لیے اس گلی میں سے پیٹ کے بل رینگ کر گزریں گے۔

نہار کور کی معلومات اس حوالے سے وسیع تھیں۔ سو سال پہلے کے وہ سارے اندوہناک واقعات پوری جزئیات کے ساتھ آنیہ کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔

پھر دونوں دوست گھر سے نکلیں اور پیدل ہی چلتی ہوئی جلیانوالا باغ کے پیچ وخم میں پہنچ گئیں۔ نہار کور نے ایک گنجان گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''آنیہ! یہی وہ گلیاں تھیں جہاں سے گزر کر ہزاروں لوگ جلیانوالا باغ کے اندر جمع ہوئے تھے۔ وہ سب نہتے تھے۔ وہ صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا چاہتے تھے۔ ان میں جوان ہی نہیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ وہ سب بے خبر تھے کہ جنرل ڈائر نام کا درندہ ان پر کیا ستم ڈھانے والا ہے، نہار کور کی آواز بھرا گئی۔

''اور وہ سامنے والی گلی کے موڑ پر کیا بورڈ لگا ہوا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''یہ وہ گلی تھی جہاں سے جنرل ڈائر مسلح سپاہیوں کے جتھے کے ساتھ باغ کی چار دیواری میں داخل ہوا تھا۔ وہ ہتھیارا تھا اور اس کے سر پر خون سوار تھا۔ تاریخ کے پنوں پر اس کا نام ہمیشہ کے لیے سیاہ حرفوں میں لکھا جانے والا تھا۔''

وہ دونوں باغ کے اندر داخل ہو گئیں۔ آنیہ یہاں پہلے بھی دو تین بار آ چکی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی آج وہ یہاں کے سارے مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ دیواروں پر گولیوں کے بے شمار نشانات...... وہ بلند جگہ جہاں سے فائرنگ شروع کی گئی، وہ اندھا کنواں جس میں سیکڑوں خوف زدہ لوگوں نے جانیں بچانے کے لیے چھلانگیں لگائیں اور پھر باغ کے وہ تنگ راستے جہاں سے بیک وقت سیکڑوں لوگوں نے نکلنے کی کوشش کی اور قریباً دس منٹ تک ہونے والی وحشیانہ فائرنگ کا شکار ہوئے۔

باغ کے وسط میں کھڑے کھڑے آنیہ نے نانک چندی اینٹوں کی ایک دیوار پر نگاہیں جمائیں اور سوچا...... شاید یہی وہ جگہ ہوگی جہاں اسد اللہ حیدر نے اپنے زخمی باپ کو اپنے جسم سے ڈھانپا تھا اور پھر اسے مزید نقصان سے بچانے کے لیے مسلح سپاہی پر جھپٹا تھا۔

''نہار! تم نے مجھے اسد اللہ کے زخمی والد تاج محمد کے بارے میں نہیں بتایا، وہ بچ گیا تھا ناں؟''

''بچ تو گیا تھا آنیہ جانی، لیکن زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکا۔ اس کے پیٹ کے اندرونی عضلات بُری طرح گھائل ہو گئے تھے۔ وہ قریباً ڈیڑھ سال زندہ رہا لیکن تقریباً بیماری کی حالت میں ہی رہا۔ اب ذرا سوچو اس سانحے میں مرنے والوں کے جو اعداد و شمار انگریز بتاتے ہیں، وہ کس طرح درست ہو سکتے ہیں۔ قریباً پندرہ سو لوگ گھائل ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک مہینوں تک زیرِ علاج رہنے کے بعد اس جہاں سے چلے گئے۔''

آنیہ نے وہیں کھڑے کھڑے تصور ہی تصور میں سو سال پہلے کی المناک آوازیں سنیں۔ فائرنگ کی گونج...... چلّانے کی صدائیں، آہ و بکا، بھگدڑ...... للکارے، مرنے والوں کا غیظ و غضب۔ ایسا نہیں تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ سب بھاگتے ہی رہے ہوں گے، ان میں سے کچھ زخم کھا کر پلٹے بھی ہوں گے...... کچھ نے اپنے پیاروں کو خونچکاں ہو کر گرتے دیکھا ہوگا اور بے ساختہ اس جانب بڑھنے کی کوشش کی ہوگی جہاں قاتلوں نے اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی ہوں گی۔ وہ پہنچ نہیں سکے ہوں گے، وہ بھی راستے میں گر گئے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں چمکنے والی چنگاریوں کو موت کی سیاہی نے ڈھانپ لیا ہوگا۔

پھر آنیہ کو یوں لگا جیسے سو سال پہلے کا وہ منظر جیتی جاگتی شکل میں اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ہے۔ اس نے چھوٹی اینٹوں کی دیوار کے پاس اسد اللہ کو زخمی باپ سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈرا ہوا تو تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک بجلی چمکتی تھی اور ایک للکارا گونجتا تھا۔ تم ظلم ہو تو میں بغاوت ہوں۔ تم جبر ہو تو میں ایک دیوانی مزاحمت ہوں۔ میں اپنی ہمت طاقت کے مطابق تمہیں روکنے کی کوشش ضرور کروں گا......

نہار نے آنیہ کا کندھا ہلایا تو وہ جیسے اپنے ٹرانس سے باہر آئی...... اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے اس سورج کو دیکھنے لگی جو آہستہ آہستہ بلند گھروں کی اوٹ میں اوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز آنیہ اور نہار کور جالندھر سے بذریعہ بس راجوری جا رہی تھیں۔ سڑک تھی NH44...... انہیں ہماچل پردیش کے اندر سے ہوتے ہوئے ایک بس بدل کر راجوری

پہنچنا تھا۔ دونوں کے پاس ایک ایک چھوٹا ٹرالی اٹیچی کیس تھا جو بس کے سامان کے خانے میں رکھا تھا۔ مارچ کی وہ پُر بہار صبح بڑی چمکیلی اور سہانی تھی۔ ہماچل پردیش کے خوب صورت پہاڑی نظاروں نے آنیہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے اندر جذب کر لیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں کچھ نیا ہونے والا ہے۔ نیا اور انوکھا...... وہ ایک کہانی کو کھوجنے نکلی تھی اور شاید اس کے ساتھ ساتھ کوئی کہانی بھی جنم لے رہی تھی۔

یہ قریباً 370 کلومیٹر کا سفر انہوں نے ساڑھے سات آٹھ گھنٹے میں طے کیا۔ شام چھ بجے کے لگ بھگ وہ راجوری کے خوب صورت و پُرسکون قصبے میں پہنچ گئیں، جسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ شہر بھی کہا جا سکتا تھا۔ سرسبز پہاڑی نشیب و فراز نے اس دلکش بستی کا احاطہ کر رکھا تھا...... ایک چمکیلا دریا اس کے مضافات کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ دریا کے پل کو پار کر کے وہ شہر میں داخل ہوئیں۔ نہار کور کے ماموں دلبر سنگھ انہیں ریسیو کرنے کے لیے بس اسٹینڈ پر ہی موجود تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ جسم فربہ تھا۔ تاہم اچھی صحت اور خوش باش چہرے کے سبب پینتالیس پچاس کے لگ بھگ نظر آتے تھے۔ وہ قدیم اور جدید کا امتزاج تھے۔ سر پر پگڑی اور پہلو میں کرپان تھی، تاہم لباس ٹی شرٹ اور جینز پر مشتمل تھا۔ حسبِ توقع انہوں نے تپاک سے دونوں لڑکیوں کا استقبال کیا۔

"جی آیاں نوں، ست بسم اللہ۔ میری پُتریاں آئی ہیں۔" انہوں نے باری باری دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نہار کو گلے سے بھی لگایا۔

ایک درمیانی عمر کا ملازم جو شکل سے مسلمان نظر آتا تھا، ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ دلبر صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ "چل اوئے خیرو، ٹک ٹک کیا دیکھ رہا ہے۔ دھی رانیوں کا سامان پکڑ۔"

خیرو آگے بڑھا مگر دونوں نے منع کر دیا اور خود ہی ٹرالی اٹیچی کیس کھینچتی ہوئی ماموں دلبر سنگھ کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔

دلبر صاحب نان اسٹاپ باتیں کرتے تھے اور بڑی اچھی باتیں کرتے تھے۔ گھر تک پیدل پہنچنے میں انہیں دس منٹ سے کم ہی لگے مگر اس دوران میں انہوں نے دو تین گھنٹوں کی باتیں کر لیں۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ وہ دونوں صرف تین چار روز کا پروگرام لے کر کیوں آئی ہیں۔ انہوں نے نہار کو بے تکلفی کے ساتھ گدی سے دبوچتے ہوئے کہا۔ "بچونگڑی، پروہنا آتا اپنی مرضی کے نال ہے پر جاتا میزبان کی مرضی کے نال ہے۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔"

نہار نے کہا۔ "ماماجی! آنیہ کی ماں بڑی سخت ہیں، وہ تین روز سے زیادہ کی اجازت نہیں دیں گی۔"

وہ چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ "میں اس کی ماں سے زیادہ سخت ہوں اور جو پیار والی سختی ہوتی ہے ناں یہ بڑوں بڑوں کو رام کر دیتی ہے۔ میں بہن جی سے فون پر بات کروں گا۔"

نہار کور کے ماموں کا دومنزلہ گھر ایک صاف ستھری بارونق آبادی میں تھا۔ چار پانچ کمرے نیچے، تین چار اوپر تھے۔ کشادہ گیراج بھی تھا جس میں نیلے رنگ کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ دس سال پہلے اپنی پتنی کے گزرنے کے بعد سے دلبر صاحب یہاں اکیلے ہی رہتے تھے۔ بس پرانا ملازم خیرو ان کے ساتھ تھا۔ نہار نے بتایا تھا کہ ماموں کچھ عرصہ انڈین آرمی میں بھی رہے ہیں مگر پھر آرمی چھوڑ دی اور امرتسر سے یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ ایک بڑا پلاٹ ان کے پاس تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے ایک چھوٹی سی مارکیٹ بنالی، اس مارکیٹ کے کرائے سے ان کی گزر بسر بہ آسانی ہو رہی تھی۔

ڈنر زبردست تھا اور چائنیز تھا۔ نہار نے ذرا حیران ہو کر کہا۔ "ماماجی! یہ کیا؟ آپ نے چائنیز منگوالیا۔ آپ تو دیسی کے دیوانے ہیں۔ کڑاہی گوشت، چانپیں، بھاجی پلاؤ وغیرہ؟"

"دھی رانی، آج کل ذرا ڈائٹنگ کر رہا ہوں۔ چائنیز کے دو فائدے ہیں۔ تم خوش ہو کر کھاؤ گی، تے میں کم کھاؤں گا۔"

بہرحال عملاً ایسا نہیں ہوا۔ کم کھاتے کھاتے بھی دلبر ماموں کافی کچھ سمیٹ گئے۔ آنیہ سوچنے لگی۔ اگر یہ ڈائٹنگ پر نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

کھانے کے بعد گفتگو کا دور ہوا۔ دلبر ماموں نے خیرو سے کہا۔ "یار! تم کیا پھٹے پرانے جھنڈے کی طرح کھڑے لہرا رہے ہو، ہم باپ بیٹیوں کو ذرا گل بات کرنے دو۔"

وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ مالک اور ملازم ہونے کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی بے تکلفی تھی۔ اچنبھے کی بات یہ بھی تھی کہ خیرو مسلمان تھا۔

دلبر ماموں نے کہا۔ "اب ذرا کھل کر بتاؤ کہ دھی

رانیاں صرف سیر سپاٹے کے لیے آئی ہیں یا فیر کوئی مشن وغیرہ بھی ہے؟"
نہار نے مسکرا کر کہا۔ "بس، ماماں جی! چھوٹا سا مشن بھی ہے۔"
"کسی منڈے کو قتل شتل تو نہیں کرنا؟" وہ شوخ لہجے میں بولے۔
نہار پھر زور سے ہنسی، آنیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔
"نہیں ماماجی، قتل تو نہیں کرنا کسی کو...... لیکن...... بہت عرصہ پہلے قتل ہونے والے کسی بے گناہ کی آل اولاد کا کھوج ضرور لگانا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے نہار سنجیدہ ہوگئی۔
"کیا بچی مچی کوئی قتل ہوا ہے؟" نہار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کب کی بات ہے؟" دلبر ماموں نے پوچھا۔
"سو سال پہلے کی...... پورے سو سال۔" نہار نے 2019ء کے کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں سمجھا نہیں پتری۔"
آنیہ نے طویل سانس لی اور گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہم جلیانوالا کی بات کر رہے ہیں انکل جی! جلیانوالا اور امرتسر......"
دلبر ماموں کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بھی ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگے۔ انہوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "وہاں اک قتل تو نہیں ہوا تھا دھی رانیو، سیکڑوں ہوئے تھے اور دیکھو، ہوئے بھی کس موقع پر تھے...... بے ساکھی کے موقع پر...... میری ماتا کہا کرتی تھی، تمہارے اک دور کے رشتے دار بھی جلیانوالا میں شہید ہوئے تھے، گھر سے بے ساکھی منانے نکلے اور لاش بن کر آ گئے۔"
جلیانوالا کا ذکر شروع ہوا تو طویل ہوتا چلا گیا۔ نہار کور اور آنیہ نے دلبر ماموں کو اپنے یہاں آنے کا مقصد بتایا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کا عنوان "شیر بچہ" تھا اور جس کے مستقبل کا سراغ لگاتے لگاتے وہ دونوں یہاں آ پہنچی تھیں۔
آخر میں نہار نے کہا۔ "ماماجی! تیمور حیدر ایک کوہ پیما تھے۔ وہ 2003ء میں ایک جاپانی کی جان بچاتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا یہیں کہیں راجوری ڈسٹرکٹ میں ہے، کسی اخبار یا نیوز چینل کے لیے کام کرتا ہے۔ جہاں تک میری جانکاری ہے اس کا نام شہاب حیدر یا شہباز حیدر ہے۔ ہم اسی کو کھوجنا چاہتے ہیں۔ اس کے کھوج سے ہی ہمارا آرٹیکل مکمل ہوگا۔"
دلبر ماموں خوش ہوئے کہ ان دونوں کی اس کاوش کے ڈانڈے جلیانوالا باغ کے تاریخی واقعے سے جا کر ملتے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

☆☆☆

دوسرے روز دلبر ماموں کو ایک تاریخ پر جانا تھا۔ انہوں نے اپنی نیلی سوزوکی گاڑی نہار کور اور آنیہ کے حوالے کر دی۔ اس کے علاوہ ملازم خیرو کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ تینوں سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب ایک لوکل ہندی اخبار کے دفتر پہنچے اور اپنے مطلوب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ کچھ خاص پتا نہیں چلا۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی کا رخ ایک بڑے چینل کے زونل آفس کی طرف کر دیا۔ یہاں تھوڑی سی پیش رفت ہوئی۔ انہیں پتا چلا کہ مطلوبہ نوجوان کا اصل نام شہباز حیدر ہے تاہم اسے صحافتی حلقوں میں شہابی حیدر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شہابی حیدر نے کچھ عرصے تک اس چینل میں بھی کام کیا تھا لیکن اب چھوڑ چکا تھا۔ یہاں آنیہ اور نہار نے شہابی حیدر کی ایک دو تصویریں بھی دیکھ لیں۔ آنیہ اور نہار کو لگا کہ انہوں نے "شیر بچے" کے پوتے کے بارے میں جیسا سوچا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔ دراز قد، چوڑے شانے، روشن پیشانی، مردانگی اس کے پورے سراپا میں رچی بسی نظر آتی تھی۔ وہ کہیں آتشزدگی کے مقام پر بائیک تھامے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں شعلوں کی سرخی منعکس ہو رہی تھی۔
اگلا روز بڑا کارگر ثابت ہوا۔ صبح سویرے ہی انہیں پتا چل گیا کہ معروف کوہ پیما، تیمور حیدر کا بیٹا اور "شیر بچے" کا پوتا، شہابی حیدر دہلی کے ایک انگلش نیوز چینل سے وابستہ ہے اور راجوری ڈسٹرکٹ میں چینل کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ آج کل یہاں سینئر فیلڈ رپورٹر کے طور پر بھی کام کر رہا تھا۔ دوپہر تک اس کی رہائش کا ایڈریس بھی آنیہ اور نہار کو معلوم ہو گیا۔
آنیہ بے حد "ایکسائٹڈ" تھی۔ بالآخر وہ شیر بچے (اسداللہ) کی موجودہ نسل کا کھوج لگانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب وہ اس نسل کے ایک فرد سے ملنے جا رہی تھی۔
دوپہر کے تھوڑی دیر بعد آنیہ اور نہار دلبر ماموں کی سوزوکی کار میں سوار گنجی بادشاہ زیارت کے قریب شہابی حیدر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات کے حوالے سے ان کا ایک پروگرام تھا لیکن جب وہ موقع پر پہنچیں تو ساری پلاننگ دھری رہ گئی۔ وہاں پہلے سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک بڑی کوٹھی جس کی پیشانی پر "زباب منزل" کی تختی لگی ہوئی تھی، ان کے سامنے تھی۔ کوٹھی کے

سامنے درجنوں لوگ جمع تھے۔ بہت سے راہ گیر بھی وہاں رک گئے تھے۔ کوئی زوردار جھگڑا چل رہا تھا۔ نہار اور آنیہ نے کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی چل کر موقع پر پہنچیں۔ انہوں نے شہابی حیدر کو پہچان لیا۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر، مسکین صورت عورت کو کندھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ گرجا۔ ''میں کہتا ہوں اماں جی! آپ اندر چلیں، میں دیکھ لوں گا ان کو...... اندر چلیں آپ۔''

وہ دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت کو کھینچتا ہوا کوٹھی کے گیٹ کے پاس لے آیا۔ اس کے ایک دو مددگار، ادھیڑ عمر عورت کو اندر لے گئے۔ اسی دوران میں بڑی توند والا ایک شخص آگے بڑھا اور کڑک کر بولا۔ ''شہابی! یہ تو اچھا نہیں کر رہا۔ ہم تمہیں اس طرح نہیں کرنے دیں گے۔ چھوکری اور چھوکرے کو باہر نکال، نہیں تو ابھی تماشا لگ جائے گا۔ میں پورا جلوس لے کر آ جاؤں گا۔''

شہابی دہاڑا۔ ''تو لے کر آ جلوس...... میں دیکھ لوں گا تجھے اور تیرے چمچوں کڑچھوں کو بھی۔''

''حرامزادے...... مورکھ...... تیری ساری پھنے خانی اور ''اینکری'' تیری ناک کے راستے نہ نکال دی تو ٹھیکیدار نام نہیں میرا۔''

گالی پر شہابی اور مشتعل ہوا۔ وہ خطرناک انداز میں توند والے ٹھیکیدار کی طرف بڑھا۔ ٹھیکیدار کا ایک ہٹا کٹا ساتھی شہابی کے راستے میں آیا۔ شہابی نے بے دریغ اس کے چہرے پر مکا رسید کیا۔ وہ الٹ کر دوسرے لوگوں پر جا گرا۔ ''سور کے بچے...... باسٹرڈ! تیری گندی زبان کھینچ لوں گا۔'' شہابی پھر توند والے نیم گنجے شخص پر دہاڑا اور اس کی طرف لپکا۔ شہابی کے دو تین ساتھیوں نے شہابی کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ ان کی گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دوسری طرف فربہ اندام ''ٹھیکیدار'' بھی چلا رہا تھا۔ اس کا ایک دبلا پتلا ساتھی اسے مخاطب کر کے بولا۔ ''ٹھیکیدار جی! اس خبیث کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ پولیس کو بلائیں۔''

''ہاں، ہاں بلاؤ۔ ابھی بلاؤ بلکہ میں خود فون کرتا ہوں۔ تمہاری بدمعاشی اب عدالت کے کٹہرے میں جائے گی۔'' شہابی گرجا۔

دونوں طرف کے کئی افراد بیچ میں پڑ گئے اور معاملے کو مزید بگڑنے سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ٹھیکیدار اور اس کے ساتھی قدرے ٹھنڈے نظر آئے۔ وہ دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے۔

آنیہ اور نہار کو رنے بہتر سمجھا کہ اب وہ واپس ہی چلی جائیں۔ شہابی حیدر سے ملاقات شام کو یا پھر کل کسی وقت بھی کی جا سکتی تھی مگر جب وہ اپنی گاڑی کی طرف آئیں تو گاڑی کے پیچھے کوئی اور بندہ اپنی کار پارک کر گیا تھا۔ انہوں نے دو چار منٹ انتظار کیا پھر اپنی کار کا ہارن دینے لگیں۔ کوئی نمودار نہیں ہوا۔ شہابی اور اس کے تین چار ساتھی اب بھی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے موجود تھے۔ وہ دونوں لڑکیوں کو پریشان دیکھ کر ان کی طرف چلے آئے۔

نہار نے شہابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی یہ کار پارک کر گیا ہے جی یہاں۔''

''بڑے بے پروا لوگ ہوتے ہیں۔ گاڑیاں مل جاتی ہیں مگر سڑک پر چلنے کے طور طریقے نہیں آتے۔'' شہابی حیدر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''شیر بچے'' کے پوتے کی آواز سن کر اور اسے اتنا قریب پا کر آنیہ کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جھگڑے کا جو سین ملاحظہ کیا تھا، وہ بھی عین حسب حال تھا اور شہابی حیدر کی جرأت مندی اور طور اطوار کی عکاسی کرتا تھا۔

شہابی نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ آس پاس کار کے مالک کو دیکھیں...... بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے کہا۔ ''او چھوڑو جی! گاڑی کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتے ہیں بلکہ سڑک کے درمیان رکھ دیتے ہیں۔''

دو تین اور لڑکوں نے ہاں میں ہاں ملائی، اس سے پہلے کہ وہ ایسی کوئی کوشش کرتے، آنیہ نے ہمت کی اور دو قدم چل کر شہابی کے پاس آئی۔ ''آپ شہابی حیدر ہی ہیں ناں؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل ہوں، فرمائیں؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''دراصل...... ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے...... ہم ایک آرٹیکل لکھ رہے ہیں تحریکِ آزادی اور جلیانوالا باغ کے حوالے سے...... آپ سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا ملا تھا لیکن اس وقت چونکہ...... یہاں اور طرح کی صورتِ حال بنی ہوئی ہے اس لیے سوچا کہ پھر حاضر ہو جائیں گے۔''

شہابی حیدر چند سیکنڈ چپ رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ بولا۔ ''اب آپ آ ہی گئی ہیں، تو پھر آ جایئے، اس طرح دروازے سے واپس جانا تو ٹھیک نہیں۔''

آنیہ اور نہار نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد وہ دونوں شہابی حیدر کے ساتھ گھر کے سجے سجائے کشادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ یہاں ایک شوکیس میں چند ایک ایوارڈز رکھے تھے اور دیواروں پر کچھ ایسی فریم شدہ تصویریں نظر آ رہی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ شہابی حیدر صحافت کے میدان میں کافی سرگرم ہے۔ چند تصویریں کوہ پیمائی کے حوالے سے بھی تھیں۔ ان میں فلک بوس چوٹیاں نظر آتی تھیں، ان تصویروں کا تعلق یقیناً شہابی حیدر کے مرحوم والد تیمور حیدر سے تھا۔

بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا نوجوان بھی یہاں ڈرائنگ روم میں موجود تھا مگر پھر اس نے شہابی سے اجازت چاہی اور کسی کام سے باہر نکل گیا۔ ایک ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی۔ آنیہ جیسے کہیں کھوسی گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں کے ساتھ ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ اسد اللہ (شیر بچہ) کی تصویر کو وجود میں آئے پورے سو سال ہو چکے تھے اور اب اس کا پوتا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یقیناً یہ اس کا پوتا ہی تھا۔

شہابی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں جالندھر سے آٹھ گھنٹے کا سفر کر کے یہاں پہنچی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ دونوں اصل اور حقیقی موضوع پر آ گئیں۔ نہار نے لرزتے ہاتھوں سے اسمارٹ فون کی اسکرین پر شہابی حیدر کو وہ فوٹوگراف دکھائی جو اُن کے یہاں پہنچنے کا سبب بنی تھی۔

شہابی حیدر نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو شاید جلیانوالا باغ کے واقعے کی ہے۔''

آنیہ نے کہا۔ ''بے شک یہ وہیں کی ہے...... لیکن اس تصویر میں جو دو چہرے نظر آ رہے ہیں، ان کو شاید آپ نہیں جانتے۔''

شہابی حیدر نے نفی میں سر ہلایا اور ایک بار پھر توجہ سے آنیہ اور نہار کور کو دیکھنے لگا۔ ان دونوں نے بھی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تب نہار نے لمبی سانس لی اور ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''شہابی صاحب! شاید آپ کو یہ سن کر بہت حیرانی ہو کہ اس تصویر میں جو کم سن چہرہ نظر آ رہا ہے، وہ آپ کے دادا محترم کا چہرہ ہے، اسد اللہ حیدر......''

شہابی نے ان دونوں پر غیر یقینی نگاہ ڈالی اور تب دوبارہ دھیان سے تصویر کو دیکھنے لگا۔

نہار نے کہا۔ ''اور یہ جو زمین پر زخمی پڑے ہیں، یہ آپ کے پڑدادا ہیں۔''

شہابی حیدر کے چہرے پر بے پناہ حیرت نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ ان دونوں کی تصویر ہی ہے؟''

نہار کور نے کہا۔ ''آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کے پڑدادا جلیانوالا میں زخمی ہوئے تھے اور شاید یہ بھی پتا ہوگا کہ آپ کے دادا اسد اللہ نے، جو اس وقت دس سال کے تھے، برستی گولیوں میں انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ سب...... ٹھیک ہے...... لیکن یہ تصویر...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

شہابی حیدر کو پوری طرح یقین کرنے اور سمجھنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ تصویر کا پورا سیاق و سباق جاننے کے بعد وہ بھی بے حد جذباتی نظر آنے لگا۔ آنیہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ یہ تصویر کیسے اتاری گئی، اب تک کہاں تھی؟ اور کیسے اس تک پہنچی، وغیرہ وغیرہ۔ (آنیہ اور نہار نے اس کلیو کی نشاندہی بھی کی جس نے ان کی تلاش کو آگے بڑھایا تھا۔ یعنی زخمی باپ کے جسم پر نظر آنے والی فوجی قمیص) تصویر کے ساتھ موجود تحریر نے بھی شہابی کو بہت متاثر کیا۔

اس نے تصویر اور تحریر کو اپنے فون میں منتقل کیا۔ پھر جذباتی انداز میں اٹھا اور بولا۔ ''ایکسکیوزمی میں ابھی آیا۔''

وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر اندرونی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس مرتبہ شہابی حیدر کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ دونوں ادھیڑ عمر تھیں۔ ان میں سے ایک بارعب خدوخال اور امیرانہ لباس سے گھر کی مالکن لگتی تھیں۔ پتا چلا کہ وہ شہابی حیدر کی والدہ زباب بیگم ہیں۔ گھر کی پیشانی پر موجود ''زباب منزل'' انہی کے نام سے منسوب تھی۔ دوسری خاتون عام شکل و صورت کی تھیں۔ لباس بھی نسبتاً کم قیمت تھا۔ بہرحال رکھ رکھاؤ ان میں بھی نظر آ رہا تھا۔ گھر کی مالکن بڑے تپاک سے ملیں۔ اس سو سال پرانی تصویر نے انہیں بھی بہت حیران کیا تھا۔ وہ آنیہ اور نہار کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ بڑی توجہ سے تصویر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اگر یہ واقعی میرے شوہر کے محترم والد کی تصویر ہے تو ہم سب کے لیے بے حد اہم ہے۔''

سادہ لباس والی دوسری خاتون بھی اشتیاق سے تصویر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ اپنی مالکن کے پہلو میں کھڑی تھیں، بولیں۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ تیمور صاحب کے والد اسد اللہ صاحب کی ہی تصویر ہے۔ آپ نے بھی تو ان کے لڑکپن کی تصویریں دیکھی ہوئی ہیں۔ یہ وہی

لگا۔''
زہاب بیگم نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔''یہ تو ایک بڑی دریافت ہوگئی ہمارے لیے...... کیوں شہابی؟'' انھوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔
شہابی کی کشادہ پیشانی پر بالوں کی لٹیں تھیں اور وہ بھی جیسے کھو سا گیا تھا۔
''امی! یہ تصویر کے پیچھے والی تحریر بھی پڑھیں۔'' وہ بولا۔
ماں، بیٹا سر جوڑ کر فون کی اسکرین سے تحریر پڑھنے لگے۔ ان کے عقب میں کھڑی دوسری خاتون بھی موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے پڑھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ مالکن کی طرح ان کی عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ تھی، ان کو شہابی، آپا خالہ کہہ کر پکار رہا تھا۔
اس فیملی کے لیے یہ سب کچھ بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ زہاب بیگم نے بھی آنیہ اور نہار سے اس ساری تگ و دو کے سلسلے میں سنا جو اُن دونوں نے اس تصویر کے ساتھ یہاں تک پہنچنے کے لیے کی تھی۔ شہابی حیدر بھی آرام سے بیٹھا یہ گفتگو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے کوٹھی سے باہر ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا تھا، تاہم اس جھگڑے کے سبب کسی طرح کا تناؤ یا تفکر شہابی کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔
کچھ دیر بعد شہابی کے موبائل فون پر ایک کال آگئی۔ اس کے چہرے پر سرخی جھلکی اور وہ کشادہ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جاکر فون پر بات کرنے لگا۔ آنیہ اور نہار کو اندازہ ہوا کہ یہ گفتگو اسی جھگڑے کے سلسلے میں ہے۔
نہار نے ذرا جھجکتے ہوئے زہاب بیگم سے پوچھا۔ ''آنٹی جان! یہاں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟''
انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''جھگڑا تو کسی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ سراسر بدمعاشی ہے جو یہ لوگ کررہے ہیں، جب لڑکا لڑکی بالغ ہیں، راضی ہیں تو پھر یہ لوگ کون ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے سے دور کرنے والے، یہ پکی بات ہے۔ ان خبیثوں کا ارادہ ان دونوں کو مارنے کا ہے۔''
''ہاں جی، باہر کچھ باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں۔ وہ لوگ کسی لڑکی کو باہر نکالنے کا کہہ رہے ہیں۔''
''لڑکی ہے اور اس کا شوہر بھی ہے، دونوں نے اپنی مرضی سے کورٹ میں نکاح کیا ہے، دونوں مسلمان ہیں۔ لڑکی کا باپ پکا مسلمان کہلاتا ہے مگر جس طرح کی باتیں کررہا ہے، وہ اسلام میں کہیں نہیں ہیں۔ ہمیں پکا پتا ہے، صبح کے بہانے یہ لوگ لڑکی لڑکے کو یہاں سے لے جائیں گے اور ان کے ساتھ کچھ بُرا کرگزریں گے۔''
''یہ بڑی توند والا ٹھیکیدار کون ہے۔ وہ کافی بڑھ چڑھ کر باتیں کررہا تھا؟'' آنیہ نے دریافت کیا۔
لڑکی کا باپ سلیم احمد اسی کے پاس فورمین کے طور پر کام کرتا ہے۔ بلکہ ٹھیکیدار کا سارا کام اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹھیکیدار اس طرح بڑھ چڑھ کر سلیم کی حمایت کررہا ہے لیکن اب یہ سب کچھ بیٹے شہابی کے علم میں آگیا ہے۔ وہ اس طرح ان کی سینہ زوری کہیں چلنے دے گا۔'' زہاب بیگم نے ہال کمرے کے گوشے میں کھڑے شہابی حیدر کی طرف دیکھا جو ابھی تک فون پر گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔
زہاب بیگم نے نہار کو اور آنیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''آؤ، میں تمہیں دکھاؤں ان دونوں بچوں کو۔ بالکل سیدھے سادے ہیں، کیا زندہ رہنا ان کا حق نہیں ہے۔''
زہاب بیگم نہار اور آنیہ کو لے کر ایک قالین پوش راہداری سے گزریں اور پھر ایک کشادہ کمرے میں پہنچیں۔ آپا خالہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ کمرے میں ایک لڑکا اور لڑکی ڈرے سہمے پرندوں کی طرح بیٹھے تھے۔ لڑکا بمشکل بیس سال کا ہوگا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ کے لگ بھگ دکھائی دیتی تھی۔ لڑکی کے گورے چٹے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اس کے نکاح کو ایک دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ معصومیت اس کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ لڑکا ذرا ہوشیار دکھائی دیتا تھا تاہم اس کے چہرے پر بھی سچائی کی چمک تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں وہی سوکھی سڑی غریب صورت عورت جائے نماز بچھائے سسک رہی تھی۔ جسے تھوڑی دیر پہلے آنیہ اور نہار نے باہر جھگڑے کے دوران میں دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ''لڑکے ظہیر'' کی بیوہ والدہ ہے اور دونوں بچوں کے انجام سے سہمی ہوئی ہے۔
زہاب بیگم نے اُسے گلے سے لگا کر تسلی دی اور کہا۔ ''فکر نہ کرو بہن، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
دبلی پتلی عورت نے روتے ہوئے کہا۔''بیگم جی، شہابی بیٹے سے کہیں کہ ہمیں اپنی اس چار دیواری سے نہ نکالے۔ یہ لوگ چیر پھاڑ کھائیں گے ہم کو۔''
زہاب بیگم بولیں۔''کہا ہے ناں، وہ نہیں نکالے گا اور اگر ضروری بھی ہوا تو اس سے زیادہ محفوظ جگہ پر رکھے گا تمہیں۔ وہ ابھی علاقے کے ڈی ایس پی سے بات کررہا

تھا۔ وہ اس کے جاننے والوں میں سے ہے۔ ویسے بھی کورٹ میرج کے پیپر تمہارے پاس ہیں، قانون تمہاری طرف ہے، ان لوگوں کی طرف نہیں۔"

معصوم صورت لڑکی کا نام نادیہ اور لڑکے کا ظہیر تھا۔ زباب بیگم کو دیکھ کر نادیہ بھی سسکنا شروع ہو گئی تھی۔ زباب بیگم نے اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا اور پھر آنیہ اور نہار کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

شہابی اب بڑے مطمئن انداز میں صوفے پر بیٹھا ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے والدہ کو بتایا کہ ڈی ایس پی اور مقامی ایم پی اے راجا انوار سے اس کی بات ہو گئی ہے۔ جب تک یہ معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا، لڑکا، لڑکی اور لڑکے کی والدہ ایم پی اے راجا انوار کی تحویل میں رہیں گے اور پوری تسلی تشفی ہونے کے بعد ہی انہیں کہیں اور بھیجا جائے گا۔

زباب بیگم کے چہرے سے بھی اضطراب اور تناؤ کی کیفیت کم ہو گئی۔ گفتگو کا موضوع ایک بار پھر وہی نادر تصویر بن گئی۔ زباب بیگم نے اپنے مرحوم شوہر تیمور حیدر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی اکثر جلیانوالا باغ کا اور وہاں ہونے والے سنگین واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ 1988ء میں جب تیمور نے پہلی بار "نانگا پربت" سر کی تھی تو چیری گڑھ میں ان کے لیے ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ ان کے والد مرحوم (اسداللہ حیدر) کی قبر بھی وہیں پر ہے۔ ہم ان کی قبر پر بھی گئے تھے۔ قبرستان میں ہی نیم کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر تیمور نے جلیانوالا باغ کا سارا واقعہ دہرایا تھا اور بتایا تھا کہ اس اندوہناک واقعے نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کس طرح نئی روح پھونکی تھی...... اور اس قتلِ عام کے بعد کس طرح برصغیر میں جابر انگریزوں کے دن گنے گئے تھے۔

زباب بیگم نے معروف مسلمان قانون دان سیف الدین کچلو کا ذکر بھی کیا جن کی گرفتاری کے بعد مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے خلاف اشتعال میں زبردست اضافہ ہوا اور انہوں نے اپریل 1919ء میں جلیانوالا کے مزاحمتی اجتماع میں بھرپور شرکت کی۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو زباب بیگم نے محبت بھری نظروں سے آنیہ اور نہار کور کی طرف دیکھا اور بیٹے شہابی حیدر سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "بھئی، یہ اتنی دور سے چل کر ہمیں ملنے آئی ہیں، ان کو ذرا راجوری میں گھماؤ پھراؤ۔"

شہابی نے میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "تو کہاں جانا پسند کریں گی آپ؟"

نہار ایک دم بول اٹھی۔ "یہ دنیدھر فورٹ کہاں ہے۔ اس کے بارے میں کافی سنا ہے۔"

"زیادہ دور نہیں، آپ کہتی ہیں تو کل چلے چلیں گے۔ یہاں سے بمشکل پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہو گی، آپ کے گھر سے تیس چالیس منٹ کی۔ موسم اچھا ہی ہے۔ صبح کے وقت بھی جا سکتے ہیں۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے اگلے روز فورٹ اور سائیں گنجی بادشاہ زیارت دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ زباب بیگم نے آنیہ اور نہار سے وعدہ لیا کہ وہ کل ڈنر ان کے ساتھ کریں گی اور نہار اپنے ماماجی دلبر سنگھ کو بھی ضرور ساتھ لائے گی۔

☆☆☆

موسم ذرا ابر آلود تھا۔ مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ شہابی اپنی ایلمین گاڑی پر آیا تھا۔ نہار اور آنیہ اس کے ہمراہ آدھ پون گھنٹے میں DHANIDHAR FORT (دنیدھر فورٹ) پہنچ گئیں۔ کل والا وہ نوجوان بھی شہابی کے ساتھ ہی تھا جس کے بال لمبے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا نام ان دونوں کو راسو معلوم ہوا تھا۔ شہابی حیدر اسے بے تکلفی سے راسو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کی موجودگی آنیہ اور نہار کو کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی لیکن وہ چپ بیٹھی رہیں۔ آنیہ اور نہار گاڑی کی پچھلی نشست پر تھیں۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر تھے۔ فورٹ پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترے تو آنیہ نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ اسے راسو کے جسم سے اور لباس سے سگریٹ نوشی کی بو آتی رہی تھی۔

دنیدھر قلعے کا منظر شاندار تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ کا ایک دلکش نمونہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں، محرابوں اور شکستہ چبوتروں میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی۔ نہار کور اس میں خاص دلچسپی محسوس کر رہی تھی۔ شہابی کسی گائیڈ کی طرح نہار کو مسلسل معلومات فراہم کر رہا تھا۔ "یہ انیسویں صدی کے وسط میں تعمیر ہوا تھا۔ یہاں ڈوگرے، اناج اور دیگر سامانِ رسد بھی جمع کرتے رہے ہیں۔ دراصل راجوری کے پرانے گورنر نے ......" شہابی بول رہا تھا مگر آنیہ کو اس کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو سن رہی تھی۔ اس کے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز، اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کا اسٹائل۔ وہ ایک نامعلوم سی کشش محسوس کرنے لگی تھی اس کی طرف۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس شخص کو بہت پہلے سے جانتی ہے۔ اس کی ہر ادا سے واقف ہے۔ یہ شاید "شیر بچے" کی

جرنلسٹ تک آن پہنچی تھی۔ شہابی سے کل دوپہر جو پہلا تعارف ہوا تھا، وہ بھی اس انسیت اور عقیدت کو بڑھانے کا سبب بنا تھا۔ چوڑے شانوں اور آنکھوں میں بے خوف چمک رکھنے والا یہ شخص ویسا ہی تھا جیسا اس نے تصور کیا تھا۔

وہ شہابی حیدر کو دیکھ رہی تھی جب اچانک چونک گئی۔ اس کی نگاہ شہابی حیدر کے دوست راسو پر پڑی۔ راسو کی نگاہیں اسے تاڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دم جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بے ترتیب سا بندہ کچھ اور بھی ناپسندیدہ محسوس ہوا۔ کہنے کو وہ شہابی کا دوست تھا مگر دونوں کی بول چال، حلیے اور طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شہابی حیدر جتنا نفیس اور خوش لباس تھا، وہ اتنا ہی اجڈ اور خستہ حال نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ دونوں لڑکیوں کی پروا کیے بغیر مسلسل سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ وہ کم بولتا تھا مگر اس کی نگاہوں میں ایک تیزی سی تھی جو چبھتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ چاروں قریباً ایک گھنٹے تک فورٹ میں گھومتے رہے۔ یہاں سیاحوں کی اور ٹولیاں بھی موجود تھیں۔ آنیہ ذرا تھکن محسوس کرنے لگی مگر نہار تو دیوانی سی ہو رہی تھی۔ وہ جیسے اس فورٹ کے ہر ایک گوشے کو اپنے کیمرے میں قید کر لینا چاہتی تھی، بادل گھرے ہو رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ جلدی یہاں سے نکل جائیں۔ وہ سب جوس وغیرہ پینے کے لیے ایک سائبان کے نیچے بیٹھے تو نہار پھر کیمرا لے کر فورٹ کے پیچ وخم میں گم ہو گئی۔ وہ پانچ منٹ میں آنے کا کہہ گئی تھی مگر اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ ''آپ بولتی ہی کم ہیں یا ہم سے زیادہ بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔'' شہابی نے آنیہ کو بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اس کے سارے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل نہار زیادہ بولتی ہے اس لیے آپ کو لگ رہا ہے کہ میں کم بولتی ہوں۔'' اس نے بمشکل کہا۔

اس سے پہلے کہ شہابی حیدر کوئی جواب دیتا، ایک تیز کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دوپہر کے وقت ہی گہری شام کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ بوچھاڑیں ان کے پاؤں بھگونے لگیں۔

''میرا خیال ہے اس شیڈ میں تو ہم بھیگ جائیں گے۔'' شہابی حیدر نے کہا۔

''اور لگتا ہے کہ بارش مزید تیز ہو گی۔'' راسم عرف راسو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

وہ تینوں شیڈ کے نیچے سے نکلے اور بھاگتے ہوئے ایک کوٹھری نما جگہ پر گھس گئے۔ یہ کوٹھری جیسی جگہ قلعے کی بیرونی فصیل کے قریب ہی تھی۔ یہاں وہ تیز بوچھاڑوں سے محفوظ ہو گئے تاہم ان کے کپڑے جزوی طور پر گیلے ہو گئے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو کی نگاہیں ایک بار پھر آنیہ پر تھیں۔ اس نے چادر کو اپنے جسم پر درست کیا اور ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ بارش کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سیاحوں کی چار پانچ اور ٹولیاں بھی قلعے کے اندر ہی مختلف پناہ گاہوں میں گھس گئی تھیں۔

''لگتا ہے کہ یہ جلدی تھمنے والی نہیں ہے۔'' شہابی حیدر نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے، گرجتے برستے آسمان کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں وہ کہاں رہ گئی ہے؟'' آنیہ مضطرب ہو کر بولی۔'' پھر شولڈر بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا۔

''ٹھہریں، میں کرتا ہوں۔'' شہابی حیدر بولا اور نہار سے کال ملائی۔

رابطہ ہو گیا۔ وہ قلعے کی عقبی طرف ایک پنجابی فیملی کے ساتھ ایک کشادہ شیڈ تلے پناہ لیے ہوئے تھی، آنیہ اور شہابی کو تسلی ہوئی۔

شہابی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی فرینڈ کو تو ہسٹری اور آثارِ قدیمہ میں بہت دلچسپی ہے، آپ کا شغل کیا ہے؟''

شہابی کے بے تکلفانہ اندازِ گفتگو نے آنیہ کو کچھ حوصلہ بخشا۔ وہ بولی۔ ''نہار کیمرے کی آنکھ سے دیکھ کر تصویر بناتی ہے، میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر بناتی ہوں۔''

''یعنی پینٹنگ۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ آنیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فنونِ لطیفہ والے لوگ تو مجھے بھی بڑے پسند ہیں۔ آپ نے ہمارے ڈرائنگ روم میں کوہ ہمالیہ کے سلسلے کی کچھ پینٹنگز بھی دیکھی ہوں گی۔ آپ کو پتا ہے وہ کس نے بنائیں؟''

''آپ کے مرحوم والد تیمور حیدر صاحب نے؟''

''نہیں، وہ تو صرف پہاڑوں پر چڑھتے تھے۔ یہ تصویریں والدہ زباب بیگم نے بنائی ہیں۔ جوانی میں اور شادی کے بعد بھی انہیں پینٹنگ کا شوق رہا ہے۔ کئی سفروں میں وہ والد کے ساتھ بھی رہیں۔ وہ اپنا کام کرتے رہے، یہ اپنا کام کرتی رہیں۔ جس سفر میں وہ جاپانی کوہ پیما کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے اس سفر میں بھی وہ ان کے ساتھ تھیں اور بیس کیمپ میں موجود تھیں۔''

''دلیری آپ کے خون میں ہمیشہ سے شامل رہی

ہے۔'' وہ یسے بے ساختہ کہہ گئی اور پھر کچھ جھینپ بھی گئی۔

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ویسے وہ پہلے لوگوں جیسا جذبہ اور حق کے لیے مر مٹنے کا عزم ہمارے نصیب میں کہاں؟ یہاں تو قدم قدم پر مصلحت اور مفاہمت کے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔'' پھر وہ ایک دم موضوع بدل کر بولا۔ ''ویسے اگر آپ واقعی اچھی پینٹر ہیں تو پھر آپ کے لیے میرا ایک بڑا قیمتی مشورہ ہے۔'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ پھر چند قدم دور کھڑے راسو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لیکن میں یہ مشورہ راسو کے سامنے آپ کو نہیں دوں گا، ورنہ یہ پتا نہیں کتنوں کو بتا کر اس کی ساری اہمیت اور سارا مزہ ختم کر دے گا۔''

''تمہاری بے اعتباری کبھی ختم نہیں ہو گی۔ بہتر ہے کہ مجھے ساتھ ہی نہ لایا کرو۔'' راسو نے بھاری لہجے میں کہا اور بے تکلفی سے شہابی کو مُکا دکھایا۔

اس دوران میں پتا نہیں کہاں سے ایک چھتری تیز ہوا میں اُڑتی ہوئی ان تک پہنچ گئی۔ شہابی حیدر نے جلدی سے اسے لپک لیا۔ چھتری کے پیچھے کوئی نہیں آیا۔ شہابی حیدر نے کہا۔ ''اسے کہتے ہیں نعمت غیر مترقبہ۔''

کافی کشادہ چھتری تھی۔ دو چار منٹ بعد بارش کا زور تھوڑا سا کم ہو گیا۔ ہوا کی رفتار بھی ماند پڑ گئی مگر کالے سیاہ بادل آسمان پر جمے کھڑے تھے۔ شہابی حیدر کے دوست راسو نے کہا۔ ''چھتری تو آ گئی ہے اگر کہیں تو ان کی فرینڈ کو لے آؤں۔''

''ہاں یہ بہتر رہے گا۔ وہاں پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' شہابی نے کہا۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر چھتری لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب اس نیم تاریک کوٹھری میں آنیہ اور شہابی تنہا تھے۔ آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی، نہ ہی اس کے کردار پر کسی بھی طرح انگلی اٹھائی جا سکتی تھی۔ وہ صنفِ مخالف سے بہت لیے دیے رہتی تھی مگر پتا نہیں کیوں یہاں اس کا سارا دم خم ایک دم ناپید ہو گیا تھا۔

خاموشی بوجھل ہونے لگی تو وہ بولی۔ ''شہابی! آپ کے یہ دوست آپ سے کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''یہ صرف دوست ہی نہیں، ایک طرح سے گھر کا فرد بھی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ گھر میں آپا خالہ کو دیکھا تھا ناں آپ نے؟ راسو ان کا ہی بیٹا ہے۔ ذرا بے پروا سا ہے لیکن دل کا بُرا نہیں ہے۔ آپا خالہ بھی جوانی میں ہی ہمارے پاس آ گئی تھیں۔ وہ زہاب منزل کی سب سے پرانی ملازمہ ہیں۔ بلکہ وہ فیملی کا حصہ ہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں گود میں کھلایا ہے۔ راسو اُن کی واحد اولاد ہے۔''

''یہ کرتے کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے راسو صاحب؟''

''محترمہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ جو کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں لیکن خیر راسو بالکل بھی بیکار نہیں ہے، یہ ایک اچھے معیار کا اسنوکر کلب چلاتا ہے۔ اپنی گزر بسر کر لیتا ہے۔''

''اور آپ اس الیکٹرانک میڈیا کی طرف کیسے آ گئے؟'' آنیہ نے ایک لمحے کے لیے اس سے نظریں ملا کر پوچھا۔

''کیوں؟ نہیں آنا چاہیے تھا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے آپ کے دادا اسداللہ فوج میں تھے، آپ کے والد تیمور حیدر نے کوہ پیمائی جیسی سخت کوش فیلڈ اختیار کی۔''

''تو آپ کا کیا مطلب ہے یہ صحافت، کوہ پیمائی سے کچھ کم ہے؟ نہیں محترمہ! یہ زیادہ مشکل ہے اور سچائی کا ساتھ دینے والوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل۔''

شہابی حیدر کے فقرے نے آنیہ کو متاثر کیا، وہ ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''اور آپ فرمائیں...... آپ دیکھنے میں تو سچائی کو بڑی سنجیدگی سے لینے والی کوئی سائنس اسٹوڈنٹ لگتی ہیں، آپ مصوری کی طرف کیسے آ گئیں؟''

''آپ کو بتایا ہے ناں کہ کمپیوٹر سائنس تو میں پڑھ رہی ہوں، مصوری بس شوق تھا جو دھیرے دھیرے بڑھتا گیا ہے۔''

''اچھا، آپ لینڈ اسکیپ بناتی ہیں یا پورٹریٹ وغیرہ؟''

''لینڈ اسکیپ...... لیکن کبھی کوئی خاص موقع ہو تو پورٹریٹ اور کیلی گرافی وغیرہ بھی کر لیتی ہوں۔''

''یہ تو پھر بڑی اچھی بات ہے، میں ابھی کچھ دیر پہلے آپ سے اسی سلسلے میں بات کرنے لگا تھا۔ یہاں راجوری میں لینڈ اسکیپ پینٹنگز کا ایک بڑا مقابلہ ہونے والا ہے، کافی بڑی انعامی رقم ہے۔ حصہ لینے والوں کو خاصی پروجیکشن بھی ملے گی۔ ابھی باقاعدہ اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی

ہے لیکن میڈیا سے تعلق رکھنے کے سبب میرے پاس اس حوالے سے ایڈوانس انفارمیشن موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اس مقابلے میں حصہ لے سکتی ہیں...... آپ کے پاس اپنے کام کا کوئی نمونہ وغیرہ ہے، میرا مطلب ہے آپ کے موبائل فون میں؟"

شہابی حیدر کا اندازہ درست تھا۔ آنیہ کے اسمارٹ فون میں اپنی پینٹنگز کے کچھ عکس موجود تھے۔ شہابی حیدر کے کہنے پر آنیہ نے اسے وہ فوٹوگراف دکھائے۔ اس نے غور سے دیکھے اور متاثر ہوا۔ دبے دبے جوش سے بولا۔ "میرا تو مشورہ ہے مس آنیہ! آپ اس "کمپی ٹیشن" میں ضرور حصہ لیں۔ موضوع آثارِ قدیمہ ہے۔ میں اس کے لیے آپ کو بڑی اچھی لوکیشن سجیسٹ کرسکتا ہوں۔"

وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے دیکھا۔ موسلادھار بارش کی اوٹ سے دنیدھر فورٹ کے خوب صورت نشیب و فراز اور پیچ و خم نظر آرہے تھے۔ وہ بولا۔ "اگر آپ مقابلے میں حصہ لینا چاہیں تو آپ کے پاس کافی وقت ہے۔ آپ اس فورٹ کے کچھ دلکش حصے کینوس پر اتار سکتی ہیں۔"

یکا یک ہوا کا رخ بدلا۔ بارش کی تیز بوچھاڑیں اس کوٹھری کے اندر تک آنے لگیں۔ آنیہ گھبرا کر بائیں جانب ہٹی تو اونچی ایڑی کے سبب لڑکھڑا گئی۔ شہابی نے اسے بروقت کندھوں سے تھام لیا۔ اپنے کندھوں پر اس کی مضبوط گرفت محسوس کر کے وہ جیسے سرتاپا لرز گئی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "سس سوری۔" وہ گھبراہٹ میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ محویت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش آنیہ نے اپنے نم سراپا پر محسوس کی۔ قلعے کی بلند و بالا فصیل کی برجیوں پر بجلی چمکی اور پھر بادل دہاڑنے لگے۔ آنیہ کو اب گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔ "آپ کا دوست ابھی تک نہیں لوٹا۔"

"شاید وہ بارش کے ہلکا ہونے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کچھ دیر پہلے ہلکی تو ہوگئی تھی۔" آنیہ نے کہا۔

"لیکن پھر تیز ہوگئی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ ابھی پہنچ جاتے ہیں۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

آنیہ کے ذہن میں خواہ مخواہ ہی وسوسے سر اُبھار رہے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ شہابی حیدر کا دوست اس کے ذہن میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کر سکا تھا۔

اس کو پریشان دیکھ کر ہی شاید شہابی نے اپنا موبائل فون نکال لیا مگر اسی دوران میں آنیہ کے فون پر نہار کور کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ پنجابی فیملی کے ساتھ گپ شپ کر رہی ہے۔ جونہی بارش ہلکی ہوتی ہے، وہ دونوں پہنچ جاتے ہیں۔

بارش ہلکی ہونے میں دس پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں آنیہ اور شہابی حیدر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی فیملیز کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ آنیہ تو پہلے ہی بہت کچھ جانتی تھی، زیادہ سوالات شہابی کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آنیہ کو لگ رہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر شہابی حیدر کی طرف کھنچی چلی جارہی ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے جلیانوالا کے باغ والا دلیر اور مزاحم اسداللہ حیدر ایک نئے روپ میں اس کے سامنے ہے۔

کچھ ہی دیر بعد نہار کور اور راسم عرف راسو کی واپسی بھی ہوگئی۔ اب سہ پہر، شام کی طرف سرکنا شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے سائیں کچی بادشاہ کی زیارت کا پروگرام کل پر ڈال دیا اور باقی کا وقت یہیں فورٹ میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

پروگرام کے مطابق نہار کے ماماجی کو بھی ڈنر کے وقت زباب منزل پہنچ جانا تھا۔ آنیہ، نہار، شہابی حیدر اور راسو، گھوم پھر کر آٹھ بجے کے لگ بھگ زباب منزل پہنچے تو وہاں ماموں دلبر سنگھ صاحب پہلے سے موجود تھے اور زباب بیگم و آپا خالہ کے ساتھ دھواں دھار گفتگو فرما رہے تھے۔ ان کو بھی کورٹ میرج کرنے والے لڑکے لڑکی کی کہانی کا پتا چل چکا تھا۔ ان کی ساری ہمدردیاں شادی شدہ جوڑے کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے چھوٹتے ساتھ ہی شہابی کا کندھا تھپکا اور کہا۔ "پتر جی! خوش رہو، حق سچ کا ساتھ دینے سے رب سوہنا راضی ہوندا ہے۔ لڑکا لڑکی بالغ ہیں، سیانے ہیں، اپنی مرضی سے اک ہوئے ہیں تو یہ ٹھیکیدار کون ہوندا ہے ان کو نکھیڑنے والا۔ کارروائی تو ان لوگوں کے خلاف ہونی چاہیے۔"

"انشاءاللہ سب اچھا ہو جائے گا انکل۔" شہابی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"پُتر جی! اب کہاں ہیں وہ دونوں؟" دلبر صاحب نے پوچھا۔

شہابی کے بجائے زباب بیگم نے بتایا۔ "ان کی والدہ اور ان دونوں کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایم پی اے

صاحب کی رہائش پر پہنچا دیا گیا ہے۔"
"جب تک معاملہ پوری طرح سیٹل نہیں ہو جاتا وہ تینوں وہاں رہیں گے۔" شہابی حیدر نے وضاحت کی۔ دلبر صاحب نے ایک بار پھر شہابی کا کندھا تھپکا اور بولے کہ انہوں نے اس کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔
زباب بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سردار صاحب، آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنوایا ہے۔ نہار بیٹی بتا رہی تھی کہ آج کل آپ "ڈائٹنگ" پر ہیں۔"
"اوہو...... بہن جی...... آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیتا ہے۔ ان دونوں دمی رانیوں کی وجہ سے ڈائٹنگ کوئی الحال میں نے گڈبائے کہہ دتا ہے۔"
"کیا مطلب ماماجی؟" نہار کور نے حیران ہو کر کہا۔
"بھئی، ڈائٹنگ نہ چھوڑتا تو پھر تمہاری مہمان نوازی نہیں ہو سکدی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ گھر میں چنگا کھانا پکا ہو تو پھر مجھ سے رہا نہیں جاسکدا۔"
کھانے کے دوران میں بھی ایک دو مرتبہ آنیہ اور شہابی میں نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ جب بھی ایسا ہوا آنیہ کو اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس ہوئیں۔ ایک مرتبہ اسے لگا جیسے نہار کور بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔
کھانے کے بعد کچھ دیر تک گپ شپ کا دور چلا۔ آیا خالہ بھی اس گفتگو میں شریک رہیں۔ ان کا نام رابعہ معلوم ہوا۔ وہ بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والی خاتون تھیں۔ زباب بیگم کو وہ "باجی" کہہ کر بلاتی تھیں۔ آنیہ کو عجیب لگا کہ "آیا خالہ رابعہ" جیسی دھیمے مزاج کی عورت کا بیٹا راسو جیسا ہے۔ راسم عرف راسو کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اپنے اسنوکر کلب کے دوستوں کے ساتھ کسی پارٹی میں گیا ہوا ہے۔
دلبر صاحب نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ شہابی اور اس کے اہلِ خانہ کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور بتایا کہ ان کا مسلمان ملازم خیرو بڑے مزیدار دیسی اور پنجابی کھانے بناتا ہے۔ جلیانوالا باغ کے تذکرے نے جیسے ان دونوں گھرانوں میں ایک قربت سی پیدا کر دی تھی۔
وقتِ رخصت جب وہ لوگ باہر اپنی گاڑی تک آئے تو گراسی لان کی کیاریوں کے قریب آنیہ کی نگاہ ایک بار پھر ایک دراز قد، سفید پوش لڑکی پر پڑی۔ وہ گارڈن لائٹ کی روشنی میں باغیچے کی ایک پتھریلی روش پر خاموش بیٹھی تھی۔ بالکل گم صم اور کھوئی ہوئی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال ایک چوٹی کی صورت اس کے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔
اس جواں سال لڑکی کو آنیہ اور نہار نے پہلے روز بھی یہاں زباب منزل میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ سفید لباس میں تھی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ درست نہیں تھی اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چلتی تھی۔ اب کی بار آنیہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زباب بیگم سے پوچھا۔ "آنٹی جان! یہ کون ہیں؟"
زباب بیگم کے سرخ و سپید چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ پھر سنبھل کر بولیں۔ "یہ راسو کے ایک دوست کی بیوہ ہے۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں، یہاں ہمارے پاس ہی رہتی ہے۔"
اندازہ ہوا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں بس اتنا ہی بتانا چاہتی ہیں۔ شہابی حیدر نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

☆☆☆

ماموں دلبر سنگھ کے گھر میں آنیہ اور نہار نے ایک رات اور گزاری۔ رات کے کھانے کے بعد دلبر ماموں کا ایک دوست آ گیا۔ وہ بھی ان ہی کی طرح جولی تھا۔ وہ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی پر ایک پنجابی ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ پاکستانی اسٹیج ڈراما تھا جس میں پاکستانی اسٹیج اسٹارز امان اللہ اور سہیل احمد وغیرہ نے کام کیا تھا۔ آنیہ کو معلوم ہوا کہ نہار کے دلبر ماموں پاکستانی ڈراموں اور خاص طور سے اسٹیج ڈراموں کے زبردست شوقین ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انڈیا کے بڑے بڑے کامیڈین پاکستانی کامیڈینز کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔
آج سہ پہر نہار کور دنیدھر فورٹ سے جو درجنوں تصویریں اتار کر لائی تھی، ان میں ایک تصویر پتھر کے ایک ٹوٹے ہوئے کتبے کی بھی تھی۔ کتبے پر کچھ لکھا تھا مگر تحریر پتا نہیں کیا تھی، یہ ہندی تھی، نہ سنسکرت، نہ کوئی اور علاقائی زبان۔ آنیہ کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ مگر نہار نے تھوڑی سی کوشش کے بعد اور گوگل سے کچھ معلومات لینے کے بعد تحریر پڑھ لی۔ اس نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ شاید ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے کا کتبہ ہے۔ کسی ڈوگرا رئیس زادے یا شہزادے نے اپنی محبوبہ دھنتی کے لیے لکھا ہے...... پیاری یہ وہ جگہ ہے، جہاں ہم تم راجا صاحب کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ملے تھے اور ہمارے پریم کو زبان ملی تھی۔"
نیچے شاید ہندی کا ایک شعر بھی کندہ ہے مگر وہ حصہ

ٹوٹ چکا ہے۔ صرف چاند اور گگن وغیرہ کے الفاظ ہی نظر آتے ہیں۔'' ''یہ الفاظ تو تمہاری سمجھ میں بھی آرہے ہوں گے۔''

آنیہ نے حیرت سے کہا۔ ''یار! تم نے یہ کیسے پڑھ لیا۔''

''آنیہ جانی! تمہاری یہ خاکسار دوست ہسٹری کی اسٹوڈنٹ ہی نہیں ہے، پرانی زبانوں کی بھی ماہر ہے۔ باقاعدہ کورس کر رکھا ہے میں نے...... لندن کی یونیورسٹی SOAS کی خاک چھان کر آئی ہوئی ہوں۔ کیا سمجھیں؟''

آنیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں، یہ وجنتی کون ہوگی؟ ان لوگوں کے پریم کا انجام کیا ہوا ہوگا؟''

نہار کور مسکرا کر بولی۔ ''اس کا تو پتا نہیں...... لیکن ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ یہ فورٹ ہمیشہ سے ہے رومان پرور...... اور اس رومانیت نے میری آنیہ جانی پر بھی کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' آنیہ چونک کر بولی۔

''تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں جناب۔'' نہار کور نے آنکھیں نچائیں۔

''یہ کیا فضول بکواس ہے۔'' آنیہ کا رنگ ایک دم گلابی ہوگیا۔

نہار زور سے ہنسی۔ ''اس کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں...... نہیں...... چورنی کے بالوں میں تنکا۔ آنیہ جانی میں نے تو صرف رومانیت کا تذکرہ کیا ہے۔ آثارِ قدیمہ میں بھی تو ایک طرح کی رومانیت ہوتی ہے۔ اس میں صنف مخالف وغیرہ کا ہونا ضروری تو نہیں۔''

آنیہ ابھی تک غصے میں نظر آرہی تھی۔ چہرے پر ایک شرمگیں سا تاثر بھی موجود تھا۔ نہار سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے آنیہ! مذاق کی بات تو رہی ایک طرف۔ شہابی حیدر ''پرسنالٹی'' زبردست ہے۔ ویسا ہی سج دھج اور آن بان والا جیسا کہ تم نے ایک تصور قائم کیا تھا اور مجھے شا کرنا، سچی بات کہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی تم سے کچھ نہ کچھ متاثر ہے۔''

آنیہ کچھ دیر تک نہار کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم پنجے نکال کر اس پر جا پڑی۔ دونوں بستر پر گریں۔ ''نہار کی بچی...... شیطان کی ٹولی...... میں تیری طبیعت ٹھیک کر دوں گی۔'' آنیہ نے اس کے پیٹ میں زوردار چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا، مار دیا۔'' نہار نے دبی دبی کراہ کے ساتھ کہا اور آنیہ کو جوابی چٹکی کاٹنے کی ناکام کوشش کی۔

''شرم نہیں آتی، اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔'' آنیہ مصنوعی غصے کے انداز میں پھنکار کر بولی اور اس کی انگلیاں مروڑیں۔

''آتی ہے...... آتی ہے...... رب دی قسم، آتی ہے۔'' نہار نے اس کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور لگایا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا شیشے کا ایک گلاس ٹوٹ گیا۔ قریبی کمرے سے ماموں دلبر سنگھ کی آواز آئی۔ ''او کیا ہوگیا ہے بھئی، خیر تو ہے؟''

وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئیں اور اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ماموں اسی طرف آرہے ہیں۔

دونوں نے جلدی جلدی اپنے لباس درست کیے۔ نہار نے اپنی ٹی شرٹ کی ادھڑی ہوئی آستین لپیٹی۔ اسی اثنا میں ماموں دلبر اندر آگئے۔ انہوں نے ذرا حیرت سے کمرے کا منظر دیکھا۔ ''کیا ہوا دھی رانیو؟''

''کک...... کچھ نہیں ماما جی...... چھ...... چھپکلی اندر آگئی تھی، اسے مارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔'' نہار نے بہانہ بنایا۔

''بھئی کوئی خاص قسم کی چھپکلی ہوگی، گھس بیٹھیوں جیسی۔ ورنہ اِدھر تو کبھی چھپکلی کا کوئی دور کا رشتے دار بھی نظر نہیں آیا۔'' انہوں نے گہری نظروں سے آنیہ اور نہار کا جائزہ لیا پھر دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ شاید اک نہیں دو چھپکلیاں تھیں، جو آپس میں لڑ رہی تھیں۔'' وہ واپس چلے گئے۔ دونوں طویل سانس لے کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ آنیہ اپنے لمبے بال سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے روز انہوں نے شہابی حیدر کے ساتھ پھر راجوری کی تفریحی جگہوں کا ایک ٹور لگایا۔ وہ گنجی بادشاہ زیارت گئے، دریا کا نظارہ کیا، پھر ایک شاندار وزارت دیکھا۔ شروع میں تو شہابی کا دوست راسم عرف راسوان کے ساتھ نہیں تھا مگر جب وہ ''اسٹیڈیم'' کی طرف جا رہے تھے وہ بھی اپنی ہیوی موٹر بائیک پر آیا اور ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کی طرح اس کی بائیک بھی خستہ حال ہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی موجودگی آنیہ کو بے چین سی کر دیتی تھی۔ ویسے وہ کچھ زیادہ بولتا نہیں تھا مگر اس کے دیکھنے کا انداز اور کبھی کبھی گھورنے کا انداز آنیہ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

باتوں کے دوران میں وہ آنیہ سے مخاطب ہوا اور

ہنس کر بولا۔ ''کل تو آپ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ شاید آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ میں نے آپ کی دوست کو اغوا کر لیا ہے۔''

نہار چہک کر بولی۔ ''آپ جمع خاطر رکھیے۔ میں اتنی جلدی اغوا ہونے والی نہیں ہوں۔''

''اغوا ہونے سے پہلے سب ایسے ہی کہتے ہیں۔'' اس نے تُرت جواب دیا۔

شہابی نے کہا۔ ''اچھا بکواس بند کرو، یہ مہمان ہیں اپنی۔ لہٰذا تہذیب کا دائرہ۔''

وہ مسکرایا اور منہ پھیر کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

یہ دن بھی کافی خوشگوار گزرا۔ سیر سپاٹے کے دوران میں آنیہ اور نہار اپنے میزبان شہابی حیدر سے مختلف سوالات بھی پوچھتی رہیں۔ ان سوالات کا تعلق شہابی کے والد تیمور حیدر اور دادا اسداللہ (شیر بچہ) کے حوالے سے ہی تھا۔ دکھانے کے لیے آنیہ اپنی ڈائری میں ''آرٹیکل'' کے لیے کچھ نوٹس وغیرہ بھی لیتی رہی۔ شہابی حیدر کی زندگی میں جھانکنا، معاشرے اور موجودہ اقتدار کے حوالے سے اس کی بے باک گفتگو سننا، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا، یہ سب کچھ آنیہ کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک تفریحی پارک کے مین گیٹ پر انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ کل سویرے آنیہ اور نہار کو بذریعہ بس واپس جالندھر چلے جانا تھا۔ ایک دوسرے سے فون نمبرز اور ای میل وغیرہ کا تبادلہ ہوا، الوداعی کلمات کہے گئے۔ آنیہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی کوئی قیمتی چیز یہاں چھوڑے جا رہی ہے۔

اچانک ایک جانب سے راسو وارد ہوا اور ایک سیاہ گلاب آنیہ کو پیش کر دیا۔ موقع ایسا تھا کہ وہ انکار بھی نہ کر سکی اور گلاب تھام لیا۔ وہ بالکل سیاہ نہیں تھا بلکہ پتیوں کے باہری کنارے ہلکے سے گلابی تھے۔ اس شیڈ نے پھول کو ایک منفرد Look دے دی تھی۔

راسو بولا۔ ''یہ بڑا کم یاب پھول ہے۔ شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ اب بھی صرف ایک ہی ملا ہے۔ ورنہ ایک مس نہار کو بھی پیش کرتا۔''

شہابی نے ہنس کر کہا۔ ''تو مس آنیہ کو ہی کیوں پیش کیا؟''

''اس لیے کہ یہ پینٹر بھی ہیں، رنگوں سے کھیلتی ہیں۔ اگر...... نہار صاحبہ چاہیں تو میں ایک اور پھول کی کوشش بھی کر لیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں...... بہت زیادہ شکریہ۔'' نہار جلدی سے بولی۔ ''آپ نے کہہ دیا۔ سمجھیں مجھے مل گیا۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ آنیہ کی طرح اس کے تاثرات بھی راسو کے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک ''ٹیکسی'' میں بیٹھی واپس اپنی قیام گاہ پر جا رہی تھیں۔ سیاہ گلاب خوب صورت تھا مگر آنیہ کو لگا جیسے وہ ڈراؤنا ہے، اسے اس کے اندر سے بھی سگریٹ کی بو نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی سڑک پر پہنچ کر اسے باہر پھینک دیا۔

☆☆☆

راجوری سے جالندھر واپس آئے آنیہ کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ جو دو تین دن وہاں گزرے تھے، وہ اس کے حافظے پر نقش ہو چکے تھے۔ ایک کشش سی تھی جو اسے مسلسل شہابی کی طرف کھینچتی تھی۔ دو تین بار فون پر بھی اس سے بات ہو چکی تھی۔ شہابی کی شدید خواہش تھی کہ آنیہ مصوری کے اس اہم مقابلے میں حصہ لے اور اس حوالے سے دنیدھر فورٹ کو اپنے کام کا حصہ بنائے۔ ہر مصور کسی بھی مونومنٹ کی چار پینٹنگز اس ''کمپی ٹیشن'' میں شامل کر سکتا تھا۔ یہ ایک انٹر یونیورسٹی ایونٹ تھا اور اسے کافی پروجیکشن ملنے والی تھی۔

شہابی حیدر اور آنیہ کے درمیان جو کچھ چل نکلا تھا، نہار کو بھی اس سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ اس حوالے سے بڑی شوخ تھی۔ وہ آنیہ کو مسلسل مشورہ دے رہی تھی کہ وہ راجوری جائے اور مقابلے میں حصہ لے۔ اس سلسلے میں اس نے خود ہی آنیہ کے پاپا سے بھی بات کر چھوڑی تھی اور انہیں باور کرایا تھا کہ اسے اس مقابلے میں حصہ لینا چاہیے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس نے دفتر سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لے رکھی ہے اور وہ آنیہ کے ساتھ راجوری جانے کے لیے تیار ہے۔ وہاں وہ دونوں پہلے کی طرح بڑی سہولت سے دلبر ماموں کے گھر پر قیام کر سکیں گی۔

آنیہ کی ماما اس آئیڈیا کی سخت مخالف تھیں۔ گھر میں دو تین سنجیدہ قسم کی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ پاپا ہمیشہ کی طرح آنیہ کی سائڈ لے رہے تھے مگر ماما کا لب و لہجہ بڑا سخت تھا۔ انہوں نے آنیہ کے پاپا کو مخاطب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''آپ بیٹی کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رہے ہیں۔ یہ آپ کے لاڈوں سے ہی بگڑی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جائیں۔ یہ پڑھائیاں اور مصوریاں وغیرہ بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ اس کے ہاتھ پیلے کریں

اوراس کے گھر بھیجیں اِسے، میں تو کہتی ہوں کہ یہ فرحان کی سعادت مندی ہے اور آپا مریم کی بھی مہربانی ہے کہ اس کی تیزی طراری کو نظرانداز کر رہے ہیں وہ لوگ۔ ہم ایسا رشتہ ڈھونڈنے نکلیں گے تو دانتوں پسینے آجائیں گے۔"

کافی بحث ہوئی لیکن بالآخر آنیہ اور اس کے پاپا کے سامنے ماما کو اپنا رویہ کچھ نرم کرنا پڑا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹی بالکل ہی خودسر ہو جائے اور اپنی مرضی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں کچھ کردار نہار کے ماموں دلبر سنگھ صاحب نے بھی ادا کیا۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے اور ہر کسی کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتے تھے۔ وہ اپنے کسی کام سے امرتسر آئے ہوئے تھے۔ وہیں سے بالآخر آنیہ کے گھر آن ٹپکے۔ وہ جب آنیہ کو پُتری یا دھی رانی کہہ کر بلاتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ واقعی ان کی بیٹی ہے۔ انہوں نے آنیہ کی ماما کو پورا یقین دلایا کہ آنیہ بڑی سہولت اور حفاظت سے ان کے گھر رہے گی۔ نہار بھی اس کے ساتھ ہوگی، دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔

ایک رات جب ماما دوا کھا کر سو رہی تھیں اور آنیہ بیسمنٹ میں پاپا کے ساتھ موجود تھی، پاپا نے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے "شیر بچے" والی تصویر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کھوج لگا لیا۔ اب تو میرا دل چاہنے لگا ہے کہ تمہاری اس نئی دریافت شہابی حیدر سے ملا جائے۔ دیکھنے میں بھی کافی شاندار لگتا ہے۔"

"جی ہاں۔" آنیہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا پھر جلدی سے بولی۔ "اور پاپا! اصل بات اس کی ظاہری شکل صورت میں نہیں، اصل بات اس کے مزاج اور شخصیت میں ہے۔ وہی بے باکی، وہی دلیری اور وہی ظالم کا پنجہ مروڑنے والی خُو بُو۔ سمجھیں سارے ڈانڈے اسی تصویر سے جا کر ملتے ہیں۔"

اس کے پاپا دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "تمہارے بعد ایک دن فرحان آیا تھا۔ کچھ اَپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اسے لگتا ہے کہ شاید تم اسے پوری اہمیت نہیں دیتی ہو۔"

آنیہ ٹھنک کر بولی۔ "پاپا...... میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا، مجھے اس میں کوئی اہمیت والی بات نظر آئے تو میں اسے اہمیت دوں ناں، ایک اور گاڑی..... ایک اور مہنگا فون، ایک اور پلاٹ...... یہ باتیں اہمیت دینے والی تو نہیں ناں....."

"لیکن بیٹا! اس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔ تمہاری ماما اس بارے میں بڑی سنجیدہ ہیں۔"

"وہی سنجیدہ ہیں ناں۔" آنیہ نے عجب بیزاری سے کہا پھر جلدی سے بات بدل کر بولی۔ "پاپا! آپ نے بھی کیا بدمزہ کرنے والا موضوع چھیڑ دیا۔ پلیز چینج اِٹ...... میں آپ کے لیے بڑا اچھا سا قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔" وہ ان کے کندھے دباتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی، بیرسٹر خورشید عالم پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

......راجوری سے واپسی کے تین ہفتے بعد آنیہ اور نہار ایک بار پھر راجوری کا رخ کر رہی تھیں۔ اس مرتبہ مصوری کے سارے لوازمات ایزل، پالٹ، برش اور رنگ آنیہ کے ہمسفر تھے۔ نہار مستقبل قریب میں ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کا پروگرام بنا رہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں راجوری ڈسٹرکٹ اور اردگرد کے قلعہ جات پر کچھ کام کرنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال یہ بات نہار بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ راجوری میں اس کی واپسی کی اصل وجہ وہ ایک انوکھا رومانی تعلق ہی ہے جو آنیہ اور شیر بچے کے پوتے کے درمیان پیدا ہوا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس تعلق کا پیدا ہونا جیسے بہت عرصہ پہلے ہی ٹھہر گیا تھا۔

حسبِ سابق وہ قریباً 370 کلومیٹر کا فاصلہ سات آٹھ گھنٹے میں طے کر کے راجوری ٹاؤن پہنچ گئیں۔ دلبر ماموں کی طبیعت زکام کی وجہ سے کچھ ناساز تھی لہٰذا بس اسٹینڈ پر انہیں شہابی حیدر نے خود ریسیو کیا۔ وہ ہاف سلیو سفید ٹی شرٹ اور نیلی جین میں بڑا باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے آنیہ نے عجیب سنسنی محسوس کی۔ ایک ایسی سنسنی جس میں بے خوفی اور تحفظ کا احساس بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

آنیہ نے سب سے پہلے اس نوعمر جوڑے کے بارے میں ہی پوچھا جو محبت اور شادی کی پاداش میں چھپتا پھرتا تھا۔ شہابی نے بتایا۔ "وہ ایم پی اے صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی طرف سے پوری طرح باخبر ہوں۔ لڑکے ظہیر کی والدہ بھی وہیں پر ہیں۔ میں ہر روز دو تین دفعہ انہیں فون کرتا ہوں۔ کوششیں ہو رہی ہیں کہ لڑکی کے گھر والے بڑے دل سے اسے معاف کریں اور کچھ ایسے معتبر ضامن ہوں جو لڑکی لڑکے کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کریں۔"

"اس روز جو بڑی توند والا ٹھیکیدار بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا، وہ کون تھا؟" نہار نے پوچھا۔

"وہی خبیث سارے فساد کی جڑ ہے۔ ٹھیکیدار تو ویسے ہی اس کی عرفیت بن گئی ہے۔ اس کا اصل نام نرائن

ات ہے۔ تھوڑا بہت سیاست میں بھی پاؤں رکھتا ہے۔ یہ لڑکی جس نے کورٹ میرج کی ہے اس کے ''کپڑا سپلائی'' کے کارخانے میں کام کرتی رہی ہے۔ باپ بھی وہیں پر کام کرتا ہے۔ نرائن کی اس لڑکی پر نظر تھی۔ پر اب یہ نرائن لڑکی کے باپ سلیم کا سب سے بڑا ہمدرد بنا ہوا ہے اور اسے اور اس کے خاندان کو بھڑکا رہا ہے۔''

''اب کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''چاہنا کیا ہے۔ وہ اس نکاح کو مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ہماری لڑکی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر نکاح کیا ہے۔ یہ لڑکی کو واپس لے جائیں گے۔ اس کے ایک ملنگ نما کزن سے اس کی شادی کر دیں گے۔ لڑکے کی ٹانگیں شانگیں توڑ کر اسے کہیں پھینک دیں گے لیکن اب ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔''

...... آنیہ کی نگاہوں میں لڑکے لڑکی کی ڈری سہمی صورتیں گھوم گئیں۔ وہ ان کبوتروں کی طرح دکھائی دیے تھے جن کے گرد کوئی خوفناک بلی گھوم رہی ہو اور وہ دم بخت ہو گئے ہوں۔

اسی دوران میں شہابی کے فون پر کال آ گئی۔ پیدل چلنے کے دوران میں وہ بات کرنے لگا۔ ''زیادہ ہوشیار مت بنو۔ ایس ایچ او سے بات کراؤ میری۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

چند سیکنڈ بعد وہ یوں گویا ہوا۔ ''ایس ایچ او رمضان بول رہا ہے؟ ہاں میں شہابی بول رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے تم ایزی لے رہے ہو۔۔۔ یہ بڑا نقصان دہ ہو جائے گا تمہارے لیے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے شہابی نے سرخ چہرے کے ساتھ سنا پھر پھنکارا۔ ''تم مجھے قانون مت پڑھاؤ۔ جب ملزم کی ضمانت ہو گئی ہے تو پھر موٹر سائیکل کو کیوں اپنی ٹانگوں میں گھسا کر بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھے ایک گھنٹے میں موٹر سائیکل تھانے سے باہر چاہیے۔'' منہ میں کوئی سخت لفظ بڑبڑا کر شہابی نے فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ بدستور سرخ تھا۔

چند سیکنڈ بعد آنیہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

پہلے تو شہابی نے گول مول بات کی، پھر بتا دیا کہ راسم کو کسی واردات کے شبے میں پکڑ لیا گیا تھا لیکن کل اس کی ضمانت ہو گئی ہے۔

''واردات کیا تھی؟'' نہار نے پوچھا۔

''بینک سے نکلنے والے کسی بندے سے کچھ رقم چھینی گئی تھی۔ واردات کا شکار ہونے والا ٹھیک سے بائیک کا نمبر نہیں پڑھ سکا۔ ملتے جلتے نمبروں والے دو تین لڑکے پکڑ لیے گئے۔''

آنیہ اور نہار نے کن انکھیوں سے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ شہابی کے یاروں دوستوں میں سے یہ راسو کچھ علیحدہ ٹائپ کا ہے۔ اب ان کے اندازے اور شبہے کو مزید تقویت مل رہی تھی۔

بہرحال اس موضوع پر شہابی حیدر نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ آنیہ اور نہار نے بھی چپ رہنا مناسب سمجھا۔

گھر پہنچ کر آنیہ اور نہار کو معلوم ہوا کہ زکام بخار تو صرف بہانہ تھا ورنہ دلبر ماموں کی طبیعت خوش خوراکی کی وجہ سے خراب ہوئی تھی۔ اکیلے میں انہوں نے فوراً ہی اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ ''دراصل، میں پھر سے ڈائٹنگ شروع کرنے والا تھا۔ سوچا کہ اس سے پہلے ایک بار ذرا رج کے بدپرہیزی ہی کر لوں۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو میری کمزوری ہیں ...... اور اس ویلے میری کمزوری کی وجہ بھی ہیں۔ کافی سارے موشن آئے ہیں۔ کل تک تو اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا مگر اب ٹھیک ہوں۔ ابھی کچھ دیر بعد پاکستانی ڈراما شرطیہ میٹھے دیکھوں گا تو طبیعت اور بھی مٹھی مٹھی ہو جائے گی۔ وشواس کرنا، شرطیہ میٹھے شرطیہ طور پر چالیس پچاس واری دیکھ چکا ہوں، اسی طرح لنڈا بازار...... بڑا مزہ آئے گا...... اور لیقا اِن امریکا وغیرہ ہیں۔'' وہ بے تکان بولتے چلے گئے۔

وہ سیاست پر بھی مزیدار گفتگو کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ انڈین حکومت اور انڈیا میں ہندوؤں کی بالادستی سے خوش نہیں ہیں۔ فوج سے ان کے نکل جانے کی وجہ بھی یہی ناخوشی تھی۔ 1984ء میں دربار صاحب کے خونی واقعات اور بعد میں اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں سکھوں پر ہونے والے ظلم و ستم نے انہیں موجودہ نظام سے متنفر کر دیا تھا۔

آنیہ نے شہابی کے مشورے کے مطابق اگلے ہی روز سے فورٹ میں جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک خستہ حال محراب کے عقب میں نظر آنے والا لینڈ اسکیپ منتخب کیا اور اس کو رنگوں کی مدد سے کینوس پر اتارنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں شہابی نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے نہ صرف پینٹنگ کی اجازت لے کر دی بلکہ دیگر سہولیات بھی مہیا کیں۔ یہ مصوری آنیہ نے فقط اس لیے شروع کی تھی کہ شہابی کو قریب سے دیکھنے اور اُسے سمجھنے کا موقع ملے ...... لیکن جب ایک بار کینوس سے رنگوں کا ملاپ

شروع ہوا تو پھر بتدریج آنیہ کو اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ شہابی اپنی موٹر بائیک یا چھوٹی گاڑی پر سوار گاہے بگاہے فورٹ کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔

ایک دن وہ آیا تو آنیہ ایزل کے سامنے کھڑی بڑی محویت سے برش چلانے میں مصروف تھی۔ اس نے عقب سے آکر ایک دم زور سے ہیلو کہا تو وہ جیسے بدک گئی۔ رنگ میں لتھڑے ہوئے برش نے پینٹنگ پر ایسا اسٹروک لگا دیا جو وہ ہرگز نہ چاہتی تھی۔ وہ ٹپٹا گئی۔ ''یہ آپ نے کیا کر دیا شہابی؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''اُفوہ...... یہ تو واقعی غلطی ہو گئی۔'' شہابی نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ آپ یوں ڈر جائیں گی، ویری سوری۔''

آنیہ نے جلدی جلدی پائلٹ میں کچھ اور رنگ مکس کیے اور اس اضافی اسٹروک کو مہارت سے چھپا دیا۔ اس دوران میں شہابی پشیمان سا گم صم کھڑا رہا۔ آخر میں اس نے توصیفی نظروں سے تصویر کو دیکھا اور بولا۔ ''بھئی واہ، آپ تو چھپانے میں مہارت رکھتی ہیں۔''

''آپ شاید زیادہ رکھتے ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''اس کو مہارت نہ کہیں...... یہ تو خوف ہے۔'' وہ بھی معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کس بات کا خوف؟''

''انکار کا...... ناراضگی کا۔''

اُس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں جھوم رہی تھیں۔ انہیں برش کے پچھلے حصے سے اپنے کان پر اڑس کر وہ بولی۔ ''ناراضگی تو ناراض ہونے والی بات پر ہوتی ہے۔''

''کیا بات؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

آنیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سنہری دھوپ نے اس سرخی میں آمیزش کی اور اسے کچھ اور بھی دلکش بنا دیا۔

''آپ پتا نہیں کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں، ایک تو یکا یک نازل ہو کر خراب کیا، اب وقت بھی خراب کر رہے ہیں۔'' آنیہ نے ڈھلتے سورج کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔''

وہ بیچ بیچ مڑا اور بڑے اسٹائل سے چلتا ہوا اپنی چمک دار موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی مگر جب لگا کہ وہ واقعی بائیک اسٹارٹ کر کے چلا جائے گا تو بولی۔ ''سنیے۔''

وہ بھی شاید اسی آواز کا منتظر تھا فوراً پلٹ آیا...... اور سن گلاسز اتار کر چیسٹ پاکٹ میں اُڑس لیے۔ بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ وہ ادا سے بولی۔ ''آپ نے سوری کہا ہے۔ معذرت کی ہے لیکن یہ تو جانا ہی نہیں کہ میں نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''اوہ ہاں، یہ تو واقعی ٹیکنیکل غلطی ہوئی۔ آپ نے معذرت قبول کی یا نہیں؟''

''غیر مشروط طور پر قبول نہیں کی۔ اب میرا کام کا موڈ بالکل اُڑن چھو ہو گیا ہے۔'' آنیہ نے برش اور پائلٹ وغیرہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''آرٹسٹوں کا موڈ یقیناً اچھی چائے وغیرہ سے بحال ہوتا ہے اور یہاں قریب ہی راجوری ٹاؤن کی سب سے اچھی چائے ملتی ہے۔''

وہ مسکرا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ شہابی کے پیچھے تنی ہوئی بائیک پر بیٹھ رہی تھی، اس کے کشادہ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کو اپنے اندر ایک عجیب سی فرحت بخش کپکپی محسوس ہوئی۔

اگلے آٹھ دس روز بڑے دلکش تھے، سوائے اس کے کہ دو تین بار جالندھر سے اس کے خالہ زاد فرحان کا فون آیا اور وہ اس کی عامیانہ باتیں سن کر بدمزہ ہوئی۔ آنیہ سے شہابی کی ملاقات تقریباً روز ہی ہو جاتی تھی۔ آنیہ صبح نہار کے ساتھ ہی دلبر ماموں کے گھر سے نکلتی تھی، سواری عموماً رکشا یا ٹیکسی ہی ہوتی تھی۔ نہار، آنیہ کو دنیدھر فورٹ پر اتار دیتی تھی اور خود راجوری ٹاؤن کی بڑی لائبریری کی طرف چلی جاتی تھی۔ وہ مختلف زبانوں اور پرانے مخطوطوں کو پڑھنے اور جاننے کا زبردست شوق رکھتی تھی۔ یہاں راجوری میں اسے کچھ ایسی کتابیں مل گئی تھیں جو ڈاکٹریٹ کے تھیسس میں اس کے کام آسکتی تھیں۔ آنیہ نے دو شاندار پینٹنگز مکمل کر لی تھیں اور تیسری پر کام شروع کر دیا تھا۔ دن کے کسی حصے میں شہابی بھی فورٹ پر آجاتا۔ اگر لنچ کا پروگرام بنتا تو وہ لنچ پر چلے جاتے یا پھر اپنے پسندیدہ چائے خانہ میں کشمیری چائے یا قہوہ پی کر واپس آجاتے، وہ دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ نصف دن گزر جاتا تو آنیہ شدت سے اس کا انتظار کرنے لگتی۔ جبکہ شہابی کے تاثرات سے بھی صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جا رہی تھی اور جیسے بہار کی سہ پہر دھیرے دھیرے ایک دلکش شام میں ڈھلتی ہے یہ عادت بھی محبت میں ڈھل رہی تھی۔

ایک دن وہ دونوں بڑے اچھے موڈ میں ایک ریسٹورنٹ کے اوپن ایریا میں بیٹھے تھے کہ وہی، بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بالوں والا راسم عرف راسو وہاں آدھمکا۔ وہ جیسے ایک ہی لمحے میں آنیہ کو سرتاپا دیکھ لیتا تھا اور اپنی آنکھوں کے اندر جذب بھی کر لیتا تھا۔ اس کا یوں دیکھنا آنیہ کو بڑا الارمنگ لگتا تھا۔ آج تو وہ ویسے بھی بڑے اکھڑے اکھڑے موڈ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک میلی سی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ اس واقعے کی نشانی تھی جب کسی ڈکیتی کے شبے میں اسے پولیس نے پکڑا تھا اور شاید اس کے ساتھ کچھ مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ جتاتے ہوئے انداز میں شہابی حیدر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اِدھر ذرا اکیلے میں آ کر میری بات سن لو۔''

''ایکسکیوزمی آنیہ! بس ایک منٹ۔'' شہابی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں ایک طرف جا کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ راسو ابتر موڈ میں تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر طیش میں باتیں کر رہا تھا۔ گفتگو کے آخر میں راسو کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ اس کے ایک دو فقرے آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک فقرہ کچھ اس طرح تھا۔ ''اسے ہر صورت سرجری کی ضرورت ہے مگر کسی بڑے اسپتال میں لے جائیں گے تو فوراً گرفتاری ہو جائے گی۔''

کچھ دیر بعد شہابی حیدر اسے رخصت کر کے واپس میز کی طرف آ گیا۔ جو آئسکریم وہ دونوں کھا رہے تھے، وہ پگھل چکی تھی۔ شہابی نے آئسکریم دوبارہ منگوانا چاہی تو آنیہ نے منع کر دیا۔ اس کا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ وہ دونوں باہر آ گئے۔ شہابی آج کار پر آیا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ آنیہ نے راسو کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ شہابی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اس کی آمد پر وہ ایسے ہی گم صم ہو جایا کرتی تھی۔ شہابی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے بے ترتیب ریشمی بالوں کو اپنی انگلیوں کی کنگھی سے سنوارا۔ اس کے رخسار کے تل کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنی شہادت کی انگلی سے چھوا اور جذب سے بولا۔ ''آنیہ میں جانتا ہوں وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا، شاید وہ بہت سے لوگوں کو اچھا نہیں لگتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک دیرینہ تعلق کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں۔ وہ آیا خالہ کا بیٹا ہے اور میری زندگی کا بڑا حصہ اس کے ساتھ گزرا ہے۔ پلیز میری اس مجبوری کو سمجھیں۔''

اس نے آخری الفاظ کچھ ایسی اپنائیت اور انکساری سے کہے تھے کہ آنیہ کو اپنا غصہ کافور ہوتا محسوس ہوا۔

آنیہ کے تاثرات دیکھ کر شہابی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے آنیہ کو اپنے ساتھ لگایا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

دوسرے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہڑتال کی وجہ سے سواری دستیاب نہیں تھی مگر آنیہ کو پینٹنگ پر کام کرنے کے لیے فورٹ بھی لازمی جانا تھا۔ شہابی کو پتا چلا تو وہ خود گاڑی پر آنیہ کو لینے آ گیا۔ ماموں دلبر سے اجازت لے کر آنیہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے جب ایک جگہ سڑک کے کنارے جمگھٹا سا نظر آیا۔ ایک شاندار ہلیو کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک نہایت پھٹیچر سی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ ایک ممی ڈیڈی ٹائپ لڑکا جو یقیناً کار سے نکلا تھا، ایک ادھیڑ عمر شخص سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ طیش میں بار بار اس شخص کو دھکے دے رہا تھا۔ فیشن ایبل لڑکے کی عمر مشکل سے سولہ سترہ سال رہی ہو گی، تاہم قد کی وجہ سے وہ بڑا لگتا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر شہابی نے بے ساختہ بریک لگا دیے۔ اس کے چہرے پر مخصوص سرخی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ''ایک منٹ آنیہ۔'' اس نے کہا اور پھر موبائل پر بات کرنے لگا۔ ''تم کہاں ہو بیدی؟...... ٹھیک ہے...... کیمرا پاس ہی ہے؟...... جلدی آؤ...... دو منٹ میں۔'' شہابی نے کہا اور فوراً گاڑی سے نکل کر موقع پر پہنچ گیا۔

آنیہ وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ اُسے جھگڑے کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ شہابی جاتے ساتھ ہی دراز قد امیر زادے اور مفلوک الحال شخص کے درمیان آ گیا۔ وہ دونوں کو تحمل کا مشورہ دے رہا تھا مگر اسی دوران میں ایک اور لگژری جیپ وہاں پہنچ گئی۔ اس میں سے ایک فربہ اندام بارعب شخص نکلا۔ جیسا کہ آنیہ کو بعد میں معلوم ہوا وہ فیشن ایبل لڑکے کا باپ تھا۔ اس کا نام مہندر ناتھ تھا اور وہ ایک بڑا بیوروکریٹ تھا۔ اس کا رویہ اپنے بیٹے سے بھی بدتر نکلا۔ اس نے آتے ساتھ ہی اپنی افسرانہ شان دکھانا شروع کر دی۔ اسی دوران میں آنیہ نے دیکھا کہ نیلی پگڑی والا وہ سکھ کیمرا مین بھی موقع پر پہنچ گیا جسے شہابی حیدر نے ہنگامی طور پر بلایا تھا۔

دوسری طرف جھگڑا مزید زور پکڑ چکا تھا۔ چٹاخ کی آواز سنائی دی اور ہٹے کٹے بیوروکریٹ نے ایک طمانچہ ادھیڑ عمر شخص کے منہ پر جڑ دیا۔ اس حرکت پر شہابی بھی مشتعل نظر آنے لگا۔ آنیہ نے دیکھا کہ شہابی اور مہندر ناتھ کے درمیان زوردار مکالمہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی گاڑی سے نکل کر

موقع پر پہنچ گئی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے مہندر ناتھ قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔ مفلوک الحال شخص اپنے حلیے سے مسلمان ہی نظر آتا تھا۔ مہندر ناتھ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو بڑے بھائی! بات جتنی بڑھاؤ گے بڑھتی چلی جائے گی۔ حاصل وصول کچھ نہیں ہونا ہے۔ بچے کی ٹانگ پر چوٹ لگی ہے۔ بھگوان نے اس کی جان بچالی ہے۔ آٹھ دس روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے چھوٹے بھائی کو بھی معمولی رگڑیں آئی ہیں۔''

اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ دیر اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ کانا پھوسی کی پھر ہزار ہزار کے چار نوٹ ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا دیے۔

رقم دیکھ کر ادھیڑ عمر شخص متذبذب نظر آنے لگا۔ چند لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ رقم تھام لے گا مگر اسی دوران میں شہابی بول اٹھا۔ ''ٹھہرو انکل! پہلے اسپتال سے معلوم کرنے دو۔''

شہابی اپنے فون سے اسپتال کا نمبر ملانے لگا۔ اردگرد جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے آنیہ کو پتا چلا۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام رحیم ہے۔ سامنے ہی اس کی چھوٹی سی بیکری تھی۔ رحیم کا چھوٹا بھائی سلیم، رحیم کے آٹھ نو سالہ بیٹے کو لے کر دکان پر آ رہا تھا کہ اس تیز رفتار کار نے چچا اور بھتیجے کو ٹکر مار دی۔ اب وہ دونوں تو ایک رکشا والے کی مدد سے اسپتال پہنچ گئے تھے اور یہاں زخمی بچے کا باپ عبدالرحیم کار والے کو روکے کھڑا تھا۔ کار سوار نوجوان لڑکے نے بچے کو زخمی کرنے کے علاوہ ایک کھڑی وین کو بھی ٹکر مار کر نقصان پہنچایا تھا۔

اسپتال فون کرنے کے بعد شہابی کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ وہ مہندر ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ جسے ٹانگ کی معمولی چوٹ فرما رہے ہیں، وہ معمولی نہیں ہے۔ بچے کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ چکی ہے۔ بُری طرح مضروب ہوا ہے وہ۔''

''لیکن...... اس میں سارا دوش میرے بچے کا تو نہیں......''

''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔ اس میں سارا دوش آپ کے بچے کا نہیں...... کیا یہ آپ کی ذمے داری نہیں تھی کہ آپ اپنے اس کم عمر بچے کو گاڑی لے کر نکلنے سے روکتے۔ اس کا تو ابھی شناختی کارڈ بھی نہیں بنا ہوگا، لائسنس کہاں بن گیا ہوگا......''

مہندر ناتھ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، موقع پر موجود ایک ٹریفک سارجنٹ آگے بڑھا...... اور شہابی کو ایک طرف لے جا کر کانوں میں بات کرنے لگا۔ آنیہ کو صاف پتا چلا کہ وہ جیپ سوار مہندر ناتھ، کا شناسا ہے اور اس کی طرف داری میں کچھ کہہ رہا ہے۔

حسبِ توقع شہابی حیدر نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ پلٹ کر مہندر ناتھ کی طرف آیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''مہندر صاحب! آپ اس طرح اس غریب فیملی کو نہیں دبا سکتے۔ آپ کی اور آپ کے بچے کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔ آپ جو چار ہزار روپیا اس پریشان باپ کو پیش کر رہے ہیں یہ تو بچے کے علاج کے پہلے دو تین روز میں ہی ٹھکانے لگ جائے گا...... یہ احسان آپ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔''

''تو پھر اچھا کیا ہے؟'' مہندر ناتھ کا جوشیلا بیٹا تنک کر بولا۔

''اچھا یہ ہے کہ تم بھی اپنے پتا کی طرح اس بوڑھے شخص کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤ بلکہ ایک سے زیادہ لگاؤ تاکہ اسے سمجھ آئے کہ جب تم جیسے امیرزادے سڑک پر ہوں تو سب ایروں غیروں کو اپنی جان کی قدر و قیمت جانتے ہوئے سڑک خالی کر دینی چاہیے۔''

لڑکا گرجا۔ ''اوئے دو ٹکے کے صحافی، منہ سنبھال کر بات کر...... ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' شہابی نے کہا اور اسے دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا پھر وہ تیر کی طرح شہابی کی طرف آیا۔ وہ سینہ تانے کھڑا تھا۔ مہندر ناتھ کا ایک ساتھی ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس دوران میں مہندر ناتھ، شہابی کے کیمرا مین کو دیکھ چکا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے غصے میں ادھیڑ عمر شخص کو جو تھپڑ رسید کیا ہے، وہ بھی ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اس کے تیور ایک بار پھر بدل گئے۔ اس نے مشتعل بیٹے کو جھاڑا...... اپنے دو ساتھیوں اور سارجنٹ سے مشورہ کیا۔ پھر ہزار ہزار کے پورے بارہ نوٹ نکال کر ادھیڑ عمر عبدالرحیم کی طرف بڑھا دیے۔ عبدالرحیم نے نوٹ لینے چاہے مگر شہابی نے ایک بار پھر منع کر دیا۔ ''ان کو اپنے پاس ہی رکھیں جناب! آپ یقیناً کوئی بڑا وکیل ہی کریں گے، اتنے روپے تو وہ ایک دو پیشیوں کے ہی لے لے گا۔''

اب بیوروکریٹ مہندر ناتھ کا پتا پانی ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے نابالغ بیٹے کو گاڑی دینے کے علاوہ اس نے سرعام مضروب بچے کے والد کو تھپڑ بھی مارا ہے۔ یہ سب

کچھ ٹی وی پر آن ایئر ہونے والا تھا۔ بھاری مالی نقصان کے علاوہ اس کی ملازمت اور نیک نامی بھی داؤ پر لگنے والی تھی۔ اب وہ ساری تن فن بھول کر مصالحت کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے ٹی وی کیمرے کی طرف دیکھا، پھر عبدالرحیم اور شہابی سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا۔

"یہاں تماشا لگ رہا ہے..... چلیں سامنے آپ کی دکان (بیکری) میں بیٹھتے ہیں۔ شانتی سے بات کرتے ہیں۔"

آنیہ دوبارہ گاڑی میں آن بیٹھی۔ معاملہ گمبھیر تھا مگر اسے حل ہونے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ شہابی حیدر چہرے پر کامیابی کی چمک لیے گاڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ آنیہ اس سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ جو شخص شروع میں رحیم کو صرف چار ہزار روپے دے کر ٹرخا رہا تھا۔ اس نے پورے ستر ہزار کا چیک دیا ہے، یہ رقم بچے کے علاج معالجے اور دیگر نقصانات کے لیے تھی، آنیہ حیرت سے شہابی حیدر کی جانب دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

راجوری کی خوشگوار فضائیں تھیں اور بہار نے ہر طرف رنگ بکھیر رکھے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کے رقص اور بہتے پانیوں کی موسیقی، اس ماحول میں آنیہ اور شہابی حیدر کا تعلق بڑے دلنشیں انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ نہار کور اپنی سہیلی کی ہمراز ہی نہیں مددگار بھی تھی۔ آنیہ تقریباً روزانہ ہی ایک دوبار گھر میں بھی فون کر لیتی تھی۔ وہ ماما سے زیادہ پاپا سے قریب تھی اور بے تکلف بھی۔ اس نے پاپا کو شہابی حیدر کی تصویریں بھیجی تھیں اور انہیں شہابی حیدر کے بارے میں مزید بھی کافی کچھ بتایا تھا۔ کچھ واضح الفاظ میں بتایا تھا اور کچھ اشاروں کنائیوں میں۔ پاپا اپنی اکلوتی بیٹی کے پورے مزاج آشنا تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کی سوچیں کس رخ پر جا رہی ہیں اور حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بھی آنیہ کے خالہ زاد فرحان کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک روز دریائے تاوی کے کنارے کنارے موٹر بائیک پر سواری کرتے ہوئے وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے۔ ایک جگہ کھڈے کی وجہ سے بائیک اچھلی تو پیچھے بیٹھی ہوئی آنیہ بھی لڑکھڑا سی گئی۔ شہابی نے کہا۔ "اتنا ہٹ کر نہ بیٹھیے..... گر جائیں گی۔"

وہ مسکرائی۔ "ہٹ کر نہ بیٹھنے میں بھی تو "گرنے" کا اندیشہ ہے، ویسے آپ کے کندھے پر ہاتھ تو رکھا ہی ہوا ہے۔"

"صرف ہاتھ نہ رکھیے..... اپنی زندگی کا پورا بوجھ ڈال دیجیے میرے کندھوں پر۔ میرے لیے اس بوجھ سے بڑھ کر خوب صورت چیز اور کوئی نہیں ہوگی۔"

آنیہ کے گال دہک سے گئے۔

شہابی جلدی سے بولا۔ "دیکھیے..... دیکھیے..... آگے پھر خراب سڑک آ رہی ہے۔"

"تو آپ اپنی رفتار تھوڑی سی کم کر دیں ناں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"میں اپنی رفتار کم کر دوں لیکن آپ اپنی رفتار میں تھوڑی سی تیزی نہ لائیے گا۔" شہابی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دونوں بلند آواز میں ہنس دیے۔ آنیہ غیر محسوس طور پر شہابی کے قریب سمٹ گئی۔ اس روز شام کو آنیہ نے فون کے ذریعے شہابی کو بتایا کہ وہ اسے پاپا سے ملوانا چاہتی ہے۔

"یعنی آپ مجھے جالندھر لے کر جائیں گی؟" شہابی نے پوچھا۔

"نہیں جالندھر کو یہاں لاؤں گی..... بھئی وڈیو لنک کے ذریعے بات کریں گے آپ..... اپنی وہ لائنوں والی وائٹ شرٹ پہن لیجیے گا۔ اچھی لگتی ہے آپ کو۔" وہ دبے لہجے میں کہہ گئی۔

وڈیو لنک کے ذریعے بات کرنے کا پروگرام اگلے روز کا تھا مگر دوپہر کو ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت وہ حسب معمول نہار کور کے ساتھ دنیدھر فورٹ پہنچی۔ آنیہ کو اتار کر نہار آگے نکل گئی۔ اچانک آنیہ کو یاد آیا کہ اسے ایک چھوٹا برش بھی چاہیے۔ اس نے نہار کو آواز دینا چاہی مگر وہ کافی آگے نکل چکی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور پیدل ہی ایک بغلی سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں انواع و اقسام کی دکانیں تھیں۔ کچھ آگے جا کر ایک اور بغلی سڑک نکلتی تھی۔ اس دوسری سڑک کے وسط میں اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان تھی۔ وہاں سے مطلوبہ برش مل سکتا تھا۔ آنیہ نے شلوار قمیص کے ساتھ اسپورٹ شوز پہن رکھے تھے۔ اس نے بڑی سہولت کے ساتھ کوئی نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔ یکایک اس کی نگاہ قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ یہ پچاس پچپن سالہ وہی عبدالرحیم تھا، چند دن پہلے جس کے بچے کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

"انکل!" آنیہ نے آواز دی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

آنیہ نے پاس پہنچ کر پوچھا۔ "انکل! آپ کے بیٹے کا اب کیا حال ہے؟"

وہ حیرانی سے آنیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ آنیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ایکسیڈنٹ کی جگہ پر موجود تھی۔ شہابی حیدر میرے ساتھ ہی وہاں آئے تھے۔ وہ

میرے کزن ہیں۔"
شہابی حیدر کا نام سن کر عبدالرحیم کے چہرے پر تشکر کے تاثرات پھیل گئے۔ وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولا۔
"شہابی صاحب کو اللہ نے ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا، ورنہ طاقتوروں کے سامنے ہم کمزوروں کی کون سنتا ہے۔ دیکھوناں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اتنی بڑی بڑی گاڑیاں دے کر سڑکوں پر بھیج دیتے ہیں، دوسروں کے بچوں کو مارنے اور اپاہج کرنے کے لیے۔"
"آپ کا بچہ اب کیسا ہے؟" آنیہ نے دوبارہ پوچھا۔
"ایک آپریشن ہو چکا ہے، ایک ابھی ہونا ہے۔ علاج معالجے پر روپیا آج کل پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اگر شہابی صاحب کی کوشش سے یہ تیس ہزار نہ ملتا تو کہاں سے اتنا خرچہ کرتا میں۔"
آنیہ ذرا چونکی۔ "تیس ہزار؟"
"ہاں بیٹی، شاید شہابی صاحب نے آپ کو بتایا نہیں۔ انہوں نے پورے تیس ہزار نکلوائے ہیں مہندر ناتھ سے، علاج معالجے کے لیے......"
آنیہ چپ سی ہو گئی۔ شہابی حیدر نے اسے خود بتایا تھا کہ مہندر ناتھ نے بچے کے علاج کے لیے ستر ہزار کا چیک دیا ہے۔ اس نے یہ چیک دکھایا بھی تھا۔
کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی بات کر کے آنیہ نے عبدالرحیم سے اجازت چاہی۔ وہ عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ فورٹ میں جا کر برش اور رنگوں سے کھیلتے ہوئے بھی اس کا دھیان عبدالرحیم سے ہونے والی گفتگو کی طرف ہی لگا رہا۔ سہ پہر سے ذرا پہلے شہابی فورٹ میں آیا۔ آج اس کا کیمرا مین بھی ہمراہ آیا تھا تاہم وہ اسے فورٹ سے باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔
آنیہ نے شہابی سے اس اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا جو آج عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ جب آنیہ نے وہ تیس ہزار والی بات بتائی تو شہابی حیدر واضح طور پر چونکا۔ آنیہ نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرتے دیکھا۔ بہرحال وہ فوراً سنبھل کر بولا۔ "ہاں، عبدالرحیم کو تیس ہی مل سکا ہے، لک...... کچھ اور اخراجات بھی تھے۔"
"اور اخراجات؟"
"بھئی، وہ جس اسٹیشن ویگن کا نقصان ہوا اس کا مالک بھی تو پارٹی تھا۔ کچھ اس کو دینے پڑے، موقع پر موجود ٹریفک سارجنٹ کا بھی کچھ حصہ تھا۔ ایسے معاملے اسی طرح سے نمٹتے ہیں۔"
آنیہ نے مزید سوال جواب مناسب نہیں سمجھے مگر اس کی اُلجھن رفع ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ شہابی اسٹیشن ویگن کے مالک کا ذکر کر رہا تھا مگر وہ بھلا مانس سا شخص تھا۔ تصفیہ ہونے سے پہلے ہی وہ تاسف سے سر ہلاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ آنیہ نے اسے خود جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ باقی رہی ٹریفک سارجنٹ کی بات تو اس کا منہ بھی ڈیڑھ دو ہزار سے بہ آسانی بند ہو سکتا تھا۔ اصل بات آنیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہابی حیدر کوئی نچلے درجے کا شخص نہیں تھا۔ ایک بلند و بالا شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے حوالے سے کوئی منفی سوچ رکھنا بھی آنیہ کو گناہ کی طرح لگ رہا تھا۔
شہابی کی آواز نے اُسے خیالوں سے چونکایا۔ "کس سوچ میں کھو گئیں آپ...... شاید حساب کتاب جوڑنے لگ گئی ہیں۔"
"نن...... نہیں...... میں تو یونہی سوچ رہی تھی، اُس بچے کے بارے میں......"
"اس کا علاج بڑی سہولت سے ہو رہا ہے آنیہ...... میں نے پوری خبر رکھی ہوئی ہے۔"
فون پر کال کے سگنل آئے اور شہابی کو بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔ دوسری طرف شہابی کا کزن نما دوست راسو ہی تھا۔ شہابی اس سے بات کرتا ہوا تھوڑے سے فاصلے پر چلا گیا۔ کوئی پریشان کن بات ہی رہی ہو گی جس کے سبب شہابی کے لب و لہجے میں کچھ تناؤ محسوس ہونے لگا۔ گفتگو کا بس کوئی کوئی لفظ ہی آنیہ کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ ان میں ایک لفظ سدرہ بھی تھا۔ آنیہ کی معلومات کے مطابق سدرہ اسی گم صم لڑکی کا نام تھا جس کی ایک ٹانگ میں نقص تھا اور جسے آنیہ نے دو مرتبہ زباب منزل یعنی شہاب کی رہائش گاہ پر دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ اس لڑکی کا کیا معما تھا؟
شہابی حیدر جلدی میں آیا تھا اور فون سننے کے بعد جلدی میں ہی واپس چلا گیا۔ اس نے شام کو پھر ملنے کا کہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد آنیہ گم صم سی ایزل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں یہ بندہ کیوں ہر وقت شہابی سے چمٹا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے...... تو پھر...... یہ راسو، شہابی کا دوست کیوں تھا؟
آنیہ کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آج اس نے وڈیولنک کے ذریعے شہابی کی ملاقات پاپا سے کرائی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس ملاقات کو دو چار دن آگے کر دے۔
وڈیولنک پر ملاقات کا وقت شام آٹھ بجے کا تھا۔ آنیہ

کے پاپا اس وقت اپنی لاء فرم کے آفس سے فارغ ہو جاتے تھے۔ بہر حال آنیہ کے لیے اچھا ہی ہوا کہ سات بجے کے لگ بھگ آنیہ کو شہابی کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آنیہ ڈیئر! معذرت چاہتا ہوں ایک ضروری کام میں پھنس گیا ہوں، آج تو آپ کے پاپا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

''چلیں، کوئی بات نہیں، پھر کسی دن کا رکھ لیتے ہیں۔'' آنیہ نے رسان سے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد دلبر ماموں تو ایک پاکستانی اسٹیج ڈراما دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ آنیہ اور نہار کور نے ملازم خیرو سے زبردست قسم کی ادرک والی چائے بنوائی اور ٹیرس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ آنیہ کچھ بھی نہار سے چھپاتی نہیں تھی جو ہلچل سی اس کے اندر مچی ہوئی تھی، وہ سب اس نے نہار پر آشکار کر دی۔ ایک طرح سے نہار بھی شہابی حیدر اور اس کے ماضی کی پرستار تھی۔ اسے بھی یہ ساری بات سن کر شاک لگا۔ کچھ دیر خیالوں میں کھوئے رہنے کے بعد بولی۔ ''آنیہ جانی! اکثر جو کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ ہوتا نہیں ہے۔ شہابی حیدر جیسے شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی...... ہرگز نہیں۔''

''مگر نہار! یہ سب کچھ ہوتا تو ہے ناں...... زرد صحافت بھی ہمارے اردگرد موجود ہے۔ میڈیا کے کچھ لوگ خبر تیار کر لیتے ہیں----فوٹیج وغیرہ بنا لیتے ہیں پھر ملوث لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ خبر آن ایئر کروانی ہے یا معاملہ رفع دفع کروانا ہے؟''

''آنیہ! تم کیسی بات کر رہی ہو، ہم شہابی حیدر کے بارے میں ایسا سوچ بھی کب سکتے ہیں......''

''نہیں نہار، میں تو ایک جنرل بات کر رہی ہوں۔ شہابی کے ماضی اور اس کے آباؤ اجداد کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں کچھ غلط سوچنا حماقت لگتا ہے۔''

''حماقت بلکہ اپرادھ۔'' نہار نے کہا پھر کچھ دیر پُرسوچ انداز میں خاموش رہ کر بولی۔ ''بس ایک بات ہے جو تمہاری طرح مجھے بھی اُلجھن میں رکھتی ہے۔ یہ راسو...... شہابی کے اتنا قریب کیوں ہے---- اور...... پھر وہ ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ؟ جس کے بارے میں شہابی نے بتایا تھا کہ اسے راسو نے اس کے گھر رکھا ہوا ہے، تم نے کبھی پوچھا نہیں شہابی سے اس لڑکی کے بارے میں؟''

''بس ایک روز تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ راسو کے ایک قریبی فرینڈ کی بیوہ ہے، بالکل بے سہارا ہے۔''

''اور ٹانگ؟''

''سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی تھی۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، دلبر ماموں دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ گلاب جامن اور موتی چور کے لڈو ان کی کمزوری تھے اور خاص طور سے لڈو، کوئی ایک درجن تازہ بہ تازہ لڈو انہوں نے اسٹیل کے تھال میں ڈال رکھے تھے، بولے۔ ''لو جی رانیو! کھاؤ اور میرے سامنے کھاؤ۔''

''آپ کے سامنے کیوں ماما جی؟'' نہار نے استفسار کیا۔

''میں تو کھا نہیں سکدا، پر جب تم کھاؤ گی تو مجھ کو وہی مزہ آئے گا۔''

نہار بلند آواز میں ہنسی۔ ''آپ کو تو مزہ آ جائے گا پر یہ لڈو ہمیں ہضم نہیں ہوں گے۔''

''اوئے کچھ نہیں ہوندا بے وقوفے، ماں پیو دی نظر بچوں کے کھانے کو نہیں لگدی۔'' انہوں نے کہا اور بڑی محبت سے ایک ایک لڈو آنیہ اور نہار کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ دوپہر کے بعد آنیہ نے شہابی کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانا تھا۔ یہ شہابی ہی کا پروگرام تھا۔ وہ اسے ایک قریبی جھیل دکھانا چاہتا تھا۔ آنیہ نے دلبر ماموں سے اجازت لے لی تھی مگر دو بجے کے قریب شہابی کا فون آیا، وہ بولا۔ ''راسو بھی ساتھ جانا چاہ رہا ہے کیوں ناں اس کو ''گروپ ٹور'' بنا لیں۔ آپ نہار کو بھی ساتھ لے لو۔''

راسو کا نام سن کر آنیہ چڑ گئی۔ اس نے کہا۔ ''پلیز شہابی! اگر آپ نے پہلے والا پروگرام رکھنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں نہیں جا رہی۔''

''اوہو، تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو ٹھیک ہے، میں اسے ہینڈل کر لیتا ہوں۔''

آنیہ نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''اوکے...... اوکے...... تم بس تیار ہو جاؤ میں دس پندرہ منٹ میں لینے آ رہا ہوں۔'' اس نے 'بائے' کہہ کر فون بند کر دیا۔

یہ بھی ایک چمکیلی اور خوشگوار دوپہر تھی۔ بلندیوں سے چلنے والی ہوا میں سفیدے اور پاپلر کے درخت جھوم رہے تھے۔ اس ہوا میں نباتات کی مہک کے علاوہ ایک جدا طرح کی خوشبو تھی۔ شہابی گاڑی میں سینڈوچ، کافی اور فروٹ وغیرہ بھی رکھ لایا تھا۔ اس کے ذہن میں پکنک کا سا ماحول تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نفیس لباس میں تھا۔ پرفیسی کے اسپرے نے اسے مہکا رکھا تھا۔ تاہم اس مہک کے اندر سے ایک ''دوچغلی'' سی بھی پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ یہ اسموکنگ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ آنیہ جان چکی تھی کہ شہابی کبھی کبھی

اسموکنگ کرتا ہے۔ اسے یقین سا تھا کہ یہ بدعادت اسے راسو سے ہی پڑی ہوگی۔

ابھی وہ ٹاؤن سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک فون کال نے انہیں ڈسٹرب کر دیا۔ کوئی اروڑا صاحب تھے جو شہابی کو فوری طور پر بلا رہے تھے۔ شہابی نے ٹالنے کی کوشش کی مگر نہ صرف ناکام ہوا بلکہ مزید پریشان بھی۔ غالباً دوسری طرف سے ذرا سخت لہجے میں بات کی گئی تھی۔

''او کے آرہا ہوں۔'' شہابی نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

''کون ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔

''بس ہے ایک مصیبت، پندرہ بیس منٹ اب ضائع ہونے ہی ہونے ہیں، چلو کوئی بات نہیں۔''

اس نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور ایک ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک شاندار ہاؤسنگ سوسائٹی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ یقیناً نئی سوسائٹی تھی۔ بہت سے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ سوسائٹی کا وسیع و عریض آفس بھی زبردست تھا۔ پارکنگ اور سیکیورٹی وغیرہ کا ہائی فائی انتظام تھا۔ شہابی نے آنیہ کو آفس کی ائرکنڈیشنڈ انتظارگاہ میں بٹھایا اور اس سے بیس پچیس منٹ کی اجازت لے کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ ڈسٹرب نظر آرہا تھا۔ انتظارگاہ میں اور بھی خواتین و حضرات موجود تھے۔ اندر جانے کے لیے آئی ڈی کارڈ اور موبائل فون وغیرہ جمع کرانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

آنیہ نے پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر اس کے اندر کھد بد ہونے لگی۔ شہابی کو یہاں اچانک کیا کام پڑ گیا تھا؟ جستجو بڑھی تو وہ جیسے ان دفاتر کی سیر کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئی ڈی کارڈ اور موبائل وغیرہ جمع کرا کر وہ اندر چلی گئی۔ یہاں صاف شفاف خاموش راہداریاں تھیں، کاؤنٹرز تھے، آراستہ انتظارگاہیں تھیں۔ آنیہ نے شہابی کو شیشے کی ایک دیوار کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔ یہ دفاتر کا اندرونی پورشن تھا۔ وہ اس طرف گئی تو اسے روکا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ گیس ایپلی کیشن کا اسٹیٹس جاننا چاہ رہی ہے۔ گارڈز نے اسے جانے دیا مگر وہ گیس ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے کے بجائے بائیں جانب ایک خاموش کوریڈور میں مڑ گئی۔ کچھ آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ یہ آوازیں شیشے کی دیواروں والے ایک اپارٹمنٹ کے اندر سے آرہی تھیں اور ان میں شہابی کی آواز بھی نمایاں تھی۔ یہ سوسائٹی کے کسی خاص الخاص عہدیدار کا آفس تھا۔ اندر پردے تھے۔ ایک جھری میں سے آنیہ نے ڈرتے ڈرتے جھانکا اور بے طرح چونک گئی۔ ایک نہایت بیش قیمت آفس ٹیبل کے پیچھے ایک درمیانی عمر کا بارعب شخص تھری پیس سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوب صورت لڑکی فائل تھامے کھڑی تھی اور ایک مؤدب، مسلح گارڈ موجود تھا۔ بارعب شخص کی اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں، سرخ آنکھیں اور جبڑوں کا ابھرا ہوا گوشت اس کی سخت گیری کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ شہابی حیدر اس کے سامنے چپ چاپ کھڑا تھا۔ شہابی کی آواز آنیہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اروڑا صاحب! لڑکی بالغ ہے۔ باقاعدہ اس کی کلائیوں کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ ساری رپورٹس موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کورٹ میں نکاح ہوا ہے اور......''

''مجھے قانون مت پڑھاؤ۔'' بارعب شخص گرجا۔ ''اور...... یہ کھڑے کیسے ہو تم؟ اپنے ہاتھ باہر نکالو پتلون کی جیبوں سے...... باہر نکالو۔''

شہابی حیدر کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''سوری۔'' اس نے کہا اور ہاتھ پینٹ کی جیبوں سے باہر نکال لیے۔

جس شخص کا نام اروڑا لیا گیا تھا، وہ ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر شہابی کے سامنے آیا۔ اس نے شہابی کی طرف انگلی اٹھائی اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''دیکھ شہابی! تیرا واسطہ پڑ گیا ہے کرنل اروڑا سے...... ساری صحافت تیری ناک کے راستے سے خارج ہو جائے گی اور وہ جو حرامی ایم پی اے تیرا یار ہے ناں اس کی پتلون گیلی ہونے میں بھی دیر نہیں لگے گی...... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس لڑکی اور لڑکے کو ٹھیکیدار کے حوالے کر دو...... اور چوبیس گھنٹے کا مطلب چوبیس گھنٹے ہی ہوتا ہے۔''

''پپ...... پر اروڑا صاحب! یہ میرے لیے عزت بے عزتی کا معاملہ بن چکا ہے، اگر آپ......''

''اوئے بھاڑ میں جائے تیری عزت۔ جب چینل والے تیری تشریف پر لات مار کر تجھے نوکری سے نکالیں گے تو اس وقت تیری عزت بچ جائے گی؟ اور جب جس بے جا اور اغوا کا کیس ٹھوکوں گا تیرے اوپر تو پھر کس کی ماتا کو ماسی کہہ کر بلائے گا؟ بتا کس باسٹرڈ کے چرنوں میں گرے گا؟''

آنیہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ شہابی حیدر کا رنگ زرد تھا اور پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ اروڑا کچھ دیر اسے قہرآلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس نے رومال نکال کر شہابی کی پیشانی تھپتھپائی اور بدلے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اس پرائے پنگے میں سے اپنی ٹانگ نکال لے۔

خود بھی سکون میں آجا اور دوسروں کو بھی شانتی سے جینے دے۔ ہم دشمنوں کے دشمن ہیں تو یاروں کے یار بھی ہیں......"

پاس ہی کھٹ پٹ ہوئی۔ آنیہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور ایک دیوار گیر شیشے سے باہر لان ڈور باغیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ دو باوردی ملازم فائلوں کے ایک پلندے کے ساتھ کسی اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔

اندر کی مدھم آوازیں اب بھی آنیہ تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ شہابی حیدر کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اب وہ مصالحت کی بات کر رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ جس شخص کا نام کرنل اروڑا ہے، وہ شہابی کو بُری طرح دھمکانے کے بعد اب شاید اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

شہابی کی مری مری آواز آنیہ کے کانوں میں جیسے سیسہ پگھلا گئی۔ "اگر کوئی سخت بات کہہ دی ہو تو معافی چاہتا ہوں اروڑا صاحب! آپ کی بات ٹال نہیں سکتا......"

وہ بولتا رہا۔ آنیہ وہاں سے ہٹ گئی اور بے جان قدموں سے چلتی ہوئی واپس "مین سٹنگ ایریا" کی طرف چلی گئی۔ اس نے کیا دیکھ اور سن لیا تھا؟ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنے تصور کے کینوس پر پچھلے کئی برسوں میں جو ایک پُرشکوہ پینٹنگ بنائی تھی وہ یکا یک اپنے سارے رنگوں سے محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت کی تند بارش نے اسے سارے کا سارا دھو ڈالا ہے...... یکسر بیکار کر دیا ہے۔

وہ جھیل دیکھنے نہیں گئے...... وہ کہیں بھی نہیں گئے۔ آنیہ نے شدید سر درد کا بہانہ بنایا۔ شہابی حیدر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اب تفریحی موڈ میں نہیں ہے۔ آنیہ کو دلبر ماموں کے گھر چھوڑنے کے بعد اس نے کل ملنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

رات کو آنیہ نے سب کچھ نہار کے گوش گزار کر دیا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک سکتہ زدہ بیٹھی رہیں۔ جب تصورات کے عالیشان بت ٹوٹتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے...... یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ نہار نے بتایا کہ وہ اس آکاش اروڑا کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہے۔ اس نے کہا۔ "یہ دو سال پہلے ہی انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا ہے۔ اب اپنے بھائی کا نام استعمال کرتے ہوئے اس نے یہاں راجوری میں یہ بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنائی ہے۔ اثر و رسوخ والا طاقتور بندہ ہے۔ وزیر امیر اسے سلام کرنے آتے ہیں۔"

"تو اب کیا ہوگا؟" آنیہ نے عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "شہابی حیدر اس لڑکے اور لڑکی کو ٹھیکیدار کے حوالے کر دے گا؟"

"بظاہر تو یہی لگ رہا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔"

آنیہ نے بیزاری کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلایا، پھر کہنے لگی۔ "نہار! ہم کل واپس جالندھر جا رہے ہیں۔"

نہار ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک توقف کے بعد بولی۔ "آنیہ جانی! اتنی جلدی کسی کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے اب بھی وشواش نہیں ہو رہا کہ جلیانوالا باغ کے کرداروں سے شروع ہونے والی کتھا اس طرح ختم ہو سکتی ہے۔ ہم ٹھیک جگہ پر پہنچے ہیں۔ اصل وارث سے ملے ہیں۔ شہابی حیدر میں اس تاریخی تصویر والی ساری جھلکیاں موجود ہیں اور......"

"خاک موجود ہیں۔" آنیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، اس نے ساری فینٹسی اور ساری خوش فہمیوں کے بخیے اُدھیڑ دیے ہیں۔"

نہار اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ آنیہ کو ذرا دھیرج سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ آنیہ کا شہابی سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آنیہ اور نہار کو اس جوڑے کی طرف سے بھی پریشانی تھی جسے شہابی نے پہلے اپنے گھر میں اور پھر کسی دوست ایم پی اے کے پاس پناہ دی تھی۔ جو کچھ آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے دفتر میں سنا تھا، اس کے بعد اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اس لڑکے لڑکی کی اب خیر نہیں۔ مغرب کے بعد آنیہ نے ایک بار پھر شہابی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ فون یا تو اٹینڈ نہیں ہوتا تھا یا بند ملتا تھا۔ پچھلے دس بارہ گھنٹے سے وہ مسلسل بند تھا۔ آنیہ جھنجلا سی گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ شہابی کی اور اس جوڑے کی موجودہ صورتِ حال جان کر ہی رہے گی۔ آنیہ اور نہار نے مشورہ کیا۔ دلبر ماموں شام کے بعد انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر کے عمومی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ نہار گھر میں ہی رہے گی اور کمرے کو اندر سے بند کر کے لائٹ آف کر دے گی۔ دلبر ماموں آئے تو یہی سمجھیں گے کہ دونوں لڑکیاں جلدی سو گئی ہیں۔

نو بجے کے قریب آنیہ خاموشی سے نکلی اور ایک رکشا پکڑ کر سیدھی زہاب منزل شہابی کے گھر جا پہنچی۔ زہاب منزل کی کچھ کھڑکیاں روشن اور کچھ تاریک نظر آ رہی تھیں۔ تاہم زیادہ تر گارڈن لائٹس آن تھیں۔ آنیہ کو امید تھی کہ یہاں وہ شہابی سے مل سکے گی اور اس سے پوچھ سکے گی کہ وہ اپنا فون بند کیے کیوں بیٹھا ہے؟ وہ اس ڈرے سہمے جوڑے کے انجام کے بارے میں بھی شہابی سے جاننا چاہتی تھی اور اگر ان کے بچاؤ کے سلسلے میں کچھ ہو سکتا تو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ دروازہ کھولنے والا وہ شخص ہوگا جسے وہ ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے بالوں والا راسو تھا۔

''زہے نصیب...... آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں، آ جائیے...... آ جائیے۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

''شہابی کہاں ہیں؟''

''سب یہیں ہیں، آپ اندر تو تشریف لائیں۔'' اس نے کہا۔

آنیہ جھجکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راسو نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ بند کیا' دونوں گراسی لان کے درمیان والی روش پر چلتے ہوئے اندرونی حصے میں آ گئے۔ آنیہ کو کچھ خاموشی سی محسوس ہوئی۔

''زہاب بیگم اور آپا خالہ کہاں ہیں؟''

''بھئی سب یہیں ہیں، آپ ڈر کیوں رہی ہیں؟'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور آنیہ کو اندر لے آیا۔

آنیہ کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔ گیراج کی جانب کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ راسم عرف راسو رہائشی حصے کا داخلی دروازہ بند کر چکا تھا۔ کسی قریبی کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ لیونگ روم کے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ گھبرائیے نہیں...... بیٹھیے...... میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔''

آنیہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ایک صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ راسو بظاہر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''سدرہ کی متاثرہ ٹانگ میں پانچ چھ روز سے شدید درد ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ امی (آپا خالہ) اس کے پاس ہیں۔''

''اور باقی لوگ؟'' آنیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ سب ایک شادی پر ہوشیار پور گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل رات تک لوٹیں گے۔''

آنیہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ''اچھا...... تو میں...... چلتی ہوں۔''

''او ہو بھئی...... چلی جائیے گا لیکن جس کام سے آئی ہیں، وہ تو کرتی جائیے...... شہابی سے تو مل لیں۔'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ گھر میں کوئی اور نہیں؟''

''تو فون پر بات کر لیں۔''

''فف...... فون تو اُن کا بند ہے۔''

''مجھے پتا ہے کہ اس کا فون بند ہے...... اور شاید اسی لیے آپ کو چل کر یہاں آنا پڑا ہے۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ اس کے دیکھنے کا انداز آنیہ کو کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور آج تو بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہی برے کی طرح اندر تک گھستی ہوئی نگاہیں جن میں ایک طرح کی حسرت سی شامل رہتی تھی۔

آنیہ نے دروازے کی طرف قدم بڑھانا چاہا تو راسو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں، دو منٹ بیٹھ جائیں۔ میں شہابی سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔ اس کا ایک دوسرا نمبر بھی ہے اور وہ کھلا ہے۔''

اس نے اپنی جین کی جیب میں سے اپنا موبائل فون نکالا۔ اس پر ایک نمبر پریس کیا، چند سیکنڈ بعد بولا۔ ''ہیلو شہابی! تمہاری ایک بہت بڑی فین تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہیں لو ان سے بات کرو۔ بہت پریشان ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون آنیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو شہابی! کہاں ہیں آپ...... کوئی ایک سو کالز تو کی ہوں گی میں نے۔''

''دراصل ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا اس لیے دوسرا فون بند کرنا پڑا۔'' شہابی نے کہا۔

آنیہ نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔ ''کہیں یہ وہ...... اسی لڑکے ظہیر...... اور لڑکی نادیہ والا مسئلہ تو نہیں؟''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے سناٹا سا چھا گیا پھر شہابی نے پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟''

''دراصل آج نہار کور کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ راجوری کا کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر اس لڑکی نادیہ کی واپسی کے لیے سخت پریشر ڈال رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کو زبردستی اس کے وارثوں کے حوالے کر دیا جائے۔''

''نہار کو یہ سب کس نے بتایا؟''

''بس کسی طرح پتا چل گیا اُسے۔ ابھی میں نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی۔'' آنیہ نے بات بتائی۔

''تو تم صرف اُس لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں زباب منزل چلی آئی ہو؟''

''نہیں شہابی! میں آپ کے لیے بھی پریشان تھی۔ مجھے آپ کی کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔''

شہابی اور آنیہ کے درمیان تین چار منٹ گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں دراز قد راسو اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑا رہا۔ شہابی حیدر نے تسلیم کیا کہ وہ جس مسئلے کا ذکر کررہا تھا، وہ ظہیر اور نادیہ سے ہی متعلق ہے۔

''تو اب کہاں ہیں وہ؟'' آخر میں آنیہ نے پوچھا۔ وہ شہابی کے لیے اپنی ناپسندیدگی بمشکل چھپا پارہی تھی۔

''انہیں نکال دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس...... سمجھو کہ وہ اب ایم پی اے کے پاس نہیں ہیں۔ انہیں محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔ باقی میں ایسی جگہ ہوں جہاں زیادہ لمبی بات نہیں کرسکتا۔ کل میں خود تم سے بات کر کے تفصیل بتاؤں گا۔ تم ذرا جلدی سے راسو کو فون دو...... بس ایک منٹ کے لیے...... ذرا جلدی کرو پلیز......''

آنیہ نے شہابی کی عجلت محسوس کرتے ہوئے بیزاری کے ساتھ فون راسو کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شہابی سے سرگوشیوں کے انداز میں بات کرتا ہوا آٹھ دس قدم دور چلا گیا۔ راسو کے انداز سے ظاہر تھا کہ دونوں دوستوں میں تلخ کلامی ہورہی ہے۔

آنیہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی تو راسو فون بند کرکے پھر اس کے سامنے آگیا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا مس آنیہ! آپ کچھ کھائے پیے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتیں۔ یہ زباب منزل کی روایت نہیں ہے۔ پلیز بیٹھیں۔''

''نہیں مجھے فوراً جانا ہے، میں ماموں کو بتائے بغیر آگئی ہوں۔'' وہ ذرا سختی سے بولی اور پھر بند دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اس بار راسو نے اس کی کلائی تھام لی۔ کھلے گریبان سے اس کے سینے کے گھنے سیاہ بال جھانک رہے تھے اور وہی سگریٹ نوشی کی بُو باس، وہ مسکرا کر بولا۔ ''مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے مگر جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنا...... ایک کپ کافی کا پینا میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔''

اپنی کلائی پر راسو کا لمس آنیہ کو کسی انگارے کی طرح محسوس ہوا۔ ''چھوڑیں مجھے۔'' وہ طیش سے بولی اور اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھ کی پشت بڑے زور سے راسو کے چہرے سے ٹکرائی۔ یوں لگا جیسے اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ راسو کے منہ پر دے مارا ہو۔ دو سیکنڈ میں راسو کے بالائی ہونٹ سے خون رس آیا۔

''جانور نہیں ہوں کہ تمہیں پھاڑ کھاؤں گا۔'' راسو پھنکارا اور اس کی کلائی کو زور سے آگے پیچھے ہلایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بھی اسے کوئی چوٹ لگا دے گا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنی بائیں آستین سے وہ خون پونچھا جو ہونٹ سے رس آیا تھا۔ تب نسبتاً ٹھہرے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ ''پہلے تو صرف درخواست تھی لیکن اب تمہیں ''کچھ وقت'' میرے ساتھ گزارنا ہی پڑے گا۔'' آنیہ کی کلائی پر اس کی گرفت سخت تھی۔

اُسے لگا کہ وہ ایک جال میں آپھنسی ہے۔ زباب منزل خالی پڑی تھی۔ دروازے بند تھے۔ وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''میں سوری بولتی ہوں، میں نے جان کے نہیں مارا، پلیز مجھے جانے دو۔''

وہ مسکرایا۔ ''شاید تم ''وقت گزارنے'' والی بات سے ڈر گئی ہو۔ کوئی غلط مطلب مت لو۔ بس ایک ساتھ بیٹھیں گے، کافی پئیں گے۔ تھوڑی سی باتیں کریں گے ــــ پھر میں تمہیں خود باہر تک چھوڑ کر آؤں گا۔ بڑے دنوں سے حسرت تھی کہ کہیں اکیلے میں تمہارے ساتھ بیٹھوں۔ تمہیں بڑے اطمینان سے دیکھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں کہ تمہارا چہرہ کیوں اتنا جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

آنیہ کو اس کی باتوں سے ڈر لگنے لگا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔

''آجاؤ ناں پلیز ــــ یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں۔ لان کی ساری پھلواری، فوارے اور روشنیاں نظر آرہی ہیں، میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔''

اس نے پہلے ذرا آرام سے اور پھر سختی سے اُسے دیوار گیر کھڑکی کی طرف کھینچا۔ ''اُف پلیز ــــ مجھے درد ہورہا ہے، میری کلائی ــــ''

اس نے گرفت ذرا نرم کردی اور اسے کھڑکی کے قریب رکھی خوب صورت میز کے سامنے بٹھا دیا۔ آنیہ نے سوچا کہ جراحت کا رویہ اس جذباتی شخص کو تلخی کی طرف مائل

کر سکتا ہے۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کافی کے ساتھ کیا لاؤں؟" وہ بولا۔ "شہابی نے بتایا تھا کہ تمہیں آلو کے چپس بہت پسند ہیں۔"

"اس وقت کچھ نہیں...... بلکہ...... کافی بھی نہیں۔" وہ منمنائی۔ "میں...... آدھا کپ چائے پی لوں گی۔"

وہ سامنے ہی واقع کچن میں داخل ہو گیا۔ آنیہ نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ مقفل تھا اور چابی آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہی تھی پھر اس کا دھیان اپنے موبائل فون کی طرف گیا۔ کیا وہ کسی طرح نہار یا ماموں دلبر کو اس ناگہانی مصیبت سے آگاہ کر سکتی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی جب راسو نے کچن کا دروازہ پورا کھول دیا۔ اب وہ اس کی کوئی بھی حرکت دیکھ سکتا تھا۔ آنیہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ وہ دل میں دعائیہ کلمات دہرانے لگی۔ زریاب منزل بالکل خالی تھی۔ جو ایک دو ملازم تھے غالباً وہ بھی چھٹی پر تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چائے کے دو گرما گرم کپ اور چپس لے کر آنیہ کے سامنے میز پر بیٹھا تھا۔ آنیہ نے پلکیں جھکا رکھی تھیں اور چائے کے چھوٹے چھوٹے "سپ" زہر مار کر رہی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کے چہرے کے ایک ایک انچ ایک ایک ملی میٹر کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

اچانک بولا۔ "محبت، حاصل کر لینے کا ہی نام تو نہیں۔ یہ احساس بھی تو بڑا دلنشیں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں، وہ ہماری چاہت سے باخبر ہے۔"

آنیہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب بے ساختہ کپکپا کر رہ گئے۔

"مس آنیہ! یہ میری ایک بڑی حسرت تھی جو آج پوری ہوئی ہے۔ تمہیں قریب سے دیکھنا...... بغیر کسی کی مداخلت کے تمہاری آواز سننا...... تمہاری آنکھوں کے رنگ کے اندر ڈوبنا اور اس فرحت بخش کیفیت کو محسوس کرنا کہ جالندھر سے آنے والی یہ لڑکی صرف میرے لیے میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتا...... اور نہ ہی چاہوں گا۔ مجھے پتا ہے ہم دو مختلف راستوں کے راہی ہیں۔ تمہاری زندگی میں شہابی کی جو اہمیت ہے، وہ بھی میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔ پھلواری میں پھول جھوم رہے تھے۔ بڑے فوارے کے پانی میں چاندنی کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے آنیہ کے خوب صورت ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھا۔ "مجھ سے ڈر تو نہیں آ رہا؟" راسو نے پوچھا۔

آنیہ نے پلکیں جھکائیں اور بے ساختہ کہہ گئیں۔ "پ...... پہلے آ رہا تھا مگر اب نہیں۔"

"میں اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا...... ساری زندگی۔" اپنے آخری دو الفاظ پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ "ساری زندگی...... اور زندگی پتا نہیں کتنی ہے۔"

وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر پھر اسے یہ سب کچھ بے فائدہ لگا۔ وہ ایک بار پھر اٹھنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ راسو نے اپنا ہاتھ عادتاً سگریٹ کے پیکٹ کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھایا مگر پھر آنیہ کی موجودگی کو محسوس کر کے رک گیا۔ آنیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گارڈن لائٹ، اس کے چہرے کی ایک سائڈ کو روشن کر رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ اسے اتنا برا نہیں لگا جتنا لگا کرتا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ وہ اس گھر میں یکسر تنہا ہونے کے باوجود اب تک اخلاق کے دائرے میں رہا تھا۔

اس نے اپنا بایاں ہاتھ اب بھی آنیہ کے کومل ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کو اپنی کھردری گرفت میں لے کر ہولے سے دبایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "یاد رکھنا کہ کوئی تمہیں چاہنے لگا تھا...... اس کی زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہو گئی تھی...... چلو آؤ...... تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آنیہ کو یوں لگا جیسے مدتوں کی قیدِ تنہائی کے بعد کسی نے اس کے زنداں کا دروازہ کھول دیا ہو۔

ابھی وہ لان کی طرف آ ہی رہے تھے کہ آٹومیٹک رائفل کی زبردست تڑتڑ سنائی دی۔ یہ ایک لمبا برسٹ تھا جو کہیں پاس ہی چلایا گیا تھا۔ راسو بے طرح ٹھٹک گیا۔ آنیہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے باہر لان میں آیا۔ یہی وقت تھا، جب دوسرا برسٹ چلا۔ اب آواز کی سمت اور فاصلے کا بھی درست اندازہ ہوا۔ یہ برسٹ کم و بیش دو فرلانگ کی دوری پر چلے تھے۔ اسی دوران میں سنگل فائر بھی شروع ہو گئے۔ جیسے دو گروپ ایک دوسرے پر گولی چلا رہے ہوں۔ راسو نے جلدی سے موبائل فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر اضطراب صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ تب وہ کمرے میں آ کر ایک الماری کی طرف گیا اور کوئی چیز اپنی شرٹ کے نیچے چھپائی۔ آنیہ کو یہی لگا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔ اس کے خوف میں اضافہ ہو گیا۔

اسی دوران میں راسو کے موبائل پر کال آ گئی۔ ایک

بارپھر اس نے تیز سرگوشی کے لہجے میں چند فقروں کا تبادلہ کیا اور آنیہ کی طرف آیا۔

کچھ کہے بغیر اس نے آنیہ کا بازو تھاما اور لان سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کچھ ہی فاصلے پر کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ راسو رک گیا۔

"یہ...... کیا ہو رہا ہے؟" آنیہ نے ہراساں آواز میں قریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔

وہ آنیہ کو دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ چند لمحے تک باہر کی آوازوں پر غور کرتا رہا پھر مضطرب مگر ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا۔ "مین بازار کے بڑے چوک کے پاس کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ شاید ایک دو بندے مر بھی گئے ہیں۔ ابھی ہمارا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔" اس نے دیوار گیر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ دو قریبی کمروں کی روشنیاں بجھا دیں اور ٹیبل پر رکھے ہوئے چائے کے برتن بھی کچن میں پہنچا دیے۔ آنیہ ڈری سہمی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس فائرنگ سے راسو کا اور زباب منزل کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

اب ایک دو ایمبولینس گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دینے لگے تھے۔ فضا میں سنسنی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنیہ نے پچھلے دنوں پہلے ہی یہ نیوز پڑھی تھی کہ راجوری میں گینگ وار کا سا ماحول بن رہا ہے۔ دو متحارب گروہ ایک دوسرے کے درپے ہو رہے ہیں، کوئی بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ وہی معاملہ تو نہیں؟ اس نے سوچا۔

اگلے دس منٹ بے حد تشویش کے عالم میں گزرے۔ پھر راسو کو ایک ایسی فون کال آئی جس نے اسے زیادہ ڈسٹرب کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک سرخی سی چھا گئی تھی۔ اس نے بے حد بے چینی سے مین گیٹ اور اندرونی دروازے کے درمیان دو تین چکر لگائے۔ تب ایک اور کال سننے کے بعد تیزی سے آنیہ کے پاس آیا۔

"مس آنیہ! ویری ساری...... ابھی آپ یہاں سے نکل نہیں سکتیں...... معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے...... آپ کا سیل فون کہاں ہے؟"

آنیہ نے اسے سیل فون دکھایا جو اس نے جلدی سے جھپٹ کر جیب میں ڈال لیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" آنیہ حیران ہوئی۔

"یہ سوال جواب کا وقت نہیں...... آ...... آپ میرے ساتھ آئیں...... جلدی۔"

آنیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی راسو نے اس کا بازو پکڑا اور اسے قریباً کھینچتا ہوا زباب منزل کی اپر اسٹوری پر لے آیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو دروازے کھولے اور آنیہ کو ایک اسٹور نما جگہ پر لے آیا۔ وہ ہکا بکا تھی۔ سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔ "یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس پر عمل کریں۔ ورنہ آپ کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ آپ کا شولڈر بیگ کہاں ہے؟"

"وہ...... تو نیچے پڑا ہے۔"

وہ دوڑ کر گیا اور شولڈر بیگ بھی اوپر اس اسٹور نما کمرے میں لے آیا۔ اس نے اپنی جینز کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ دو چابیاں آنیہ کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ چابی اس کمرے کی ہے۔ یہ دوسری چابی باہر کے چھوٹے گیٹ کی ہے لیکن آپ کو یہاں سے ابھی نہیں نکلنا۔ کم از کم...... کم از کم دن کی روشنی اچھی طرح پھیلنے کا انتظار کرنا ہے۔ کسی کو فون نہیں کرنا، کسی کو پکارنا نہیں۔ بس یہی لگے کہ اس گھر میں کوئی موجود ہی نہیں۔"

"میری سمجھ میں...... کچھ نہیں آ رہا، کیا آپ کہیں جا رہے ہو؟"

راسو نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا گریبان کچھ اور کھل گیا۔ سینے کے گھنے بال مزید نمایاں ہو گئے۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ "یہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دو بندے مر گئے ہیں۔ پولیس یہاں زباب منزل کے باہر بھی موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ مجھے بھی یہاں سے گرفتار کر کے لے جائیں۔ مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دو چار روز تک میں پھر باہر آ جاؤں گا لیکن اگر پولیس کو یہاں آپ کی موجودگی کا پتا چل گیا تو یہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا——"

وہ آنیہ کو مختلف ہدایات دے ہی رہا تھا جب زباب منزل کا بیرونی گیٹ دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ آنیہ کا موبائل فون اسے واپس کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا لیکن پھر جلدی سے واپس آیا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں گیا اور کوئی چیز ڈبل بیڈ کے نیچے کسی خفیہ جگہ پر چھپائی۔ آنیہ نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ راسو کا موبائل فون ہے۔ پھر آنیہ پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔

بوکھلائی ہوئی آنیہ نے راسو کی ہدایت کے مطابق اسٹور نما کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور لائٹس آف کر کے دم سادھ لیا۔

اگلے پانچ دس منٹ کافی سنسنی خیز اور بے حد تناؤ

بھرے تھے۔ زباب منزل کے مختلف حصوں میں بھاری بوٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ دروازے دھڑا دھڑ کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ کچھ آوازیں اس اسٹور نما کمرے کے بالکل نزدیک بھی سنائی دیں۔ کسی پولیس افسر کا ایک کرخت جملہ آنیہ کے کانوں تک بھی پہنچا۔ وہ غالباً راسو سے ہی پوچھ رہا تھا کہ وہ لنگڑی کہاں ہے؟ اشارہ یقیناً اس سدرہ نامی لڑکی کی طرف ہی تھا۔

اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ آنیہ کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد آہٹوں، آوازوں اور للکاروں سے آنیہ کو اندازہ ہو گیا کہ راسو کو گرفتار کر کے زباب منزل سے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ دم سادھے، سکتہ زدہ کھڑی رہی۔

☆☆☆

آنیہ گہری تاریکی میں اس تنگ کمرے کے اندر ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ راسو کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

راسو کے حوالے سے وہ پہلے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی اور اب تو جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بے حد تشویشناک اور پُرخطر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا دو بندے مر گئے ہیں تو کیا ان ہلاکتوں سے اس کا کوئی براہِ راست تعلق تھا؟ اس سے پہلے وہ کسی واردات کے شبہے میں پکڑا گیا تھا اپنی موٹر بائیک سمیت، اور اس سے پہلے بھی خبر نہیں کیا کچھ کر چکا تھا (آنیہ کو وہ واقعہ بھی یاد تھا جب وہ اپنے کسی زخمی ساتھی کا خفیہ طور پر علاج کرانا چاہتا تھا)

فی الوقت آنیہ کے نزدیک سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں کب تک بند رہے گی۔ راسو کو اندیشہ تھا کہ اس کی گرفتاری کے بعد بھی پولیس زباب منزل کے قریب موجود رہے گی۔ تو کیا وہ ساری رات یہیں بند رہ کر گزار دے گی؟ آنیہ کے والد ایک بڑے وکیل تھے۔ جالندھر بلکہ پورے ضلع میں ان کو بڑی اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے آنیہ کے جی میں آئی کہ وہ پاپا کو فون کرے اور اس ساری صورتِ حال کے بارے میں بتا دے۔ وہ والدہ سے زیادہ والد کے نزدیک تھی اور ان سے ہر طرح کی بات کر لیتی تھی۔ بہرحال کچھ مزید سوچنے کے بعد اس نے پاپا کی پریشانی کے خیال سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

تب اس کا دھیان نہار اور دلبر ماموں وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ نہار یقیناً اس کے لیے پریشان ہونا شروع ہو گئی ہو گی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اطلاع دینا ضروری تھا۔ زباب منزل میں اب مکمل خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی وقت کسی پالتو بلّی کی ''می آؤ...... می آؤ'' سنائی دے جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد آنیہ نے تھوڑی سی ہمت کی اور راسو کی دی ہوئی چابیوں میں سے ایک چابی ہضمی قفل میں لگا کر اس اسٹور نما کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ دروازہ، دیوار کا ہم رنگ تھا اور دیوار کی PENELING کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اسے علیحدہ سے دیکھنا آسان نہیں تھا۔ اردگرد کے کمروں میں بے ترتیبی سی تھی۔ جاتے جاتے پولیس والوں نے کافی اکھاڑ پچھاڑ کی تھی۔ مختلف اشیا یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

اس نے لابی کی لائٹس آن نہیں کیں، اندھیرے میں ہی دھیان سے قدم رکھتی ہوئی ایک کشادہ سلائڈنگ ونڈو کے پاس پہنچی۔ شیشے کے پار زباب منزل کے سامنے والی سڑک کا کچھ حصہ اور ایک دو گلیاں نظر آتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ گلی کے موڑ پر ایک نیلی روشنی ''ریوالو'' کر رہی تھی۔ یقیناً یہ کسی پولیس کار یا جیپ کی روشنی ہی تھی۔ راسو کا اندیشہ درست تھا۔ پولیس یہاں موجود تھی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے دوبارہ سے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر سوچ کر اس نے اپنا موبائل آن کیا اور جلدی سے ایک ٹیکسٹ میسج نہار کے لیے بھیج دیا۔ اس نے لکھا۔ ''میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں ایک مشکل میں ضرور پھنس گئی تھی لیکن اب بالکل خیر خیریت سے ہوں۔ صبح آٹھ نو بجے تک واپس آجاؤں گی۔ فی الحال میرا فون بند رکھنا ضروری ہے اگر ممکن ہوا تو رات کو کسی وقت کال کروں گی۔ خدا حافظ۔'' میسج بھیج کر اس نے فون دوبارہ آف کر دیا۔

اس کا دھیان ایک بار پھر شہابی اور اس سے ہونے والی گفتگو کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ نجانے کیوں آنیہ کو لگنے لگا تھا کہ وہ جھوٹ بھی بولتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ظہیر اور نادیہ کو ایم پی اے کے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شاید اصل حقیقت یہ تھی کہ اس نے ان دونوں مصیبت زدگان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے بُرے انجام کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اگلے قریباً دو گھنٹے آنیہ نے اسی کمرے میں بند رہ کر گزارے۔ سیکڑوں ہی وسوسے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر پھر دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہونے لگا۔ رات

کے قریباً ایک بجے کا عمل تھا۔ زباب منزل میں مکمل خاموشی تھی۔ کم از کم اتنا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس عمارت کے اندر کوئی پولیس والا موجود نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور باہر نکل آئی۔ تاریک لابی میں سے دیکھا۔ سڑک کے موڑ پر پولیس کی موجودگی کو اب بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا، بہر حال نیلی لائٹ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس مستطیل بیڈ روم کی جانب آ گئی جہاں راسو نے جاتے جاتے کچھ چھپایا تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر وہ گھٹنوں پر جھک گئی اور بیڈ کے نیچے جھانکنے لگی۔ کئی منٹ کی کوشش سے وہ بیڈ کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا چور خانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس خانے میں کچھ اشیا موجود تھیں۔ سب سے پہلے آنیہ کی نظر سیاہ رنگ کے کولٹ پسٹل پر پڑی۔ وہ فلی لوڈڈ تھا۔ پسٹل کے پاس ہی راسو کا موبائل فون بھی رکھا تھا۔ غالباً یہی دونوں اشیا تھیں جو گرفتاری سے پہلے راسو نے یہاں رکھی تھیں۔ اس نے موبائل نکالا وہ آن تھا مگر سائیلنٹ پر لگا ہوا تھا۔ اس پوشیدہ خانے میں تھوڑی سی جیولری نظر آ رہی تھی۔ کسی گاڑی کی رجسٹریشن بک تھی اور ڈارک براؤن کور والی ایک ڈائری تھی۔

آنیہ نے وہیں قالین پر بیٹھ کر راسو کے موبائل فون پر نگاہ دوڑائی۔ راسو اور شہابی کے بارے میں جاننے کی شدید خواہش اس میں موجود تھی۔ اس نے ''کال لاگ'' چیک کی، پھر پیغامات دیکھے۔ تین چار آخری پیغامات نے اسے چونکایا۔ غالباً راسو جلدی میں انہیں ڈیلیٹ نہیں کر سکا تھا۔ کل رات نو بجے راسو نے اپنے کسی دوست شادے کو ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا۔ ''میری اطلاع کے مطابق لڑکی نادیہ کی طبیعت خراب ہے...... نادیہ اور ظہیر تھوڑی دیر میں کلینک جانے کے لیے نکلیں گے۔ ایم پی اے صاحب کا گارڈ اور ڈرائیور ساتھ ہوگا۔ یہ بہترین موقع ہے۔ تم تیار رہو، میں آ رہا ہوں۔''

قریباً دو گھنٹے بعد رات گیارہ بجے راسو نے ایک مبہم سا پیغام اپنے کسی جاننے والے یا دوست ''شکیل اسنوکر'' کو ارسال کیا تھا۔ ''دونوں پنچھی، چیل کے جھپٹے سے بچ گئے ہیں۔ ہمارے پاس ہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں۔ سمجھو کہ چہچہا رہے ہیں، تھینکس گاڈ۔''

قریباً 15 منٹ بعد سوا گیارہ بجے یکے بعد دیگرے شہابی کی تین کالز راسو کے اس نمبر پر آئی تھیں جو اس نے اٹینڈ نہیں کی تھیں۔ پھر شہابی کا ٹیکسٹ میسج راسو کے لیے آیا تھا۔ ''تم سؤر کی اولاد ہو۔ مجھے پتا ہے، جو کیا ہے تم نے کیا ہے۔ تمہاری یہ پائے خانیاں ہم سب کو لے ڈوبیں گی۔ اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا ٹینٹوا ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا نا تو یاد رکھو، وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، لعنت ہو تم پر۔''

آخری میسج آج صبح سویرے کا تھا اور یہ راسو نے شہابی کو بھیجا تھا۔ ''فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوگا اور اگر کوئی مشکل آئی بھی تو خود پر ہی لوں گا۔ ان پنچھیوں کو دردناک انجام سے بچا کر جو راحت ملی ہے، اس کے بدلے میں دو چار ہڈیاں بھی تڑوانا پڑیں تو گھاٹے کا سودا نہیں۔''

یہ پیغامات دیکھ کر، جیسے ایک تصویر سی آنیہ کی نگاہوں کے سامنے مکمل ہو گئی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہو رہی تھی کہ ''ظہیر'' اور ''نادیہ'' کو واقعی ایم پی اے انوار کے گھر سے نکال لیا گیا ہے اور اروڑا وغیرہ سے دور کر دیا گیا ہے مگر یہ کام شہابی حیدر نے نہیں راسو نے کیا تھا...... اور...... ابھی تھوڑی دیر پہلے راسو کی جو گرفتاری عمل میں آئی تھی، اس کے پیچھے بھی غالباً اس کی یہی سنگین کارروائی تھی۔

لگ یہی رہا تھا کہ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے مین بازار میں جو فائرنگ ہوئی ہے، وہ پولیس اور راسو کے ساتھیوں میں ہوئی ہے۔ شاید راسو کا کوئی ساتھی پولیس کے ہتھے بھی چڑھا تھا اور اسی وجہ سے پولیس چند منٹ میں دندناتی ہوئی زباب منزل پہنچ گئی تھی۔ مقامی پولیس اور راسو کے تعلقات پہلے بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ یہ شخص عجیب سا گورکھ دھندا تھا۔ ایک دن نہارکور نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی تنظیم وغیرہ سے ہو۔ ممکن تھا کہ وہ اپنی اسنوکر کلب والی مصروفیت کو صرف ایک آڑ کے طور پر استعمال کرتا ہو۔

آنیہ نے راسو کے موبائل میں کچھ مزید جھانکا۔ وہ جو اسنوکر کلب چلا رہا تھا، اس کی کچھ تصاویر تھیں، کچھ تصویریں اس کے قریبی دوستوں کی تھیں۔ وہ بھی اسی کی طرح اپنے حلیے سے بے پروا اور آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ چند پیغامات ایسے تھے جن میں کسی اچھے کھلونے کا ذکر کیا گیا تھا۔ آنیہ کو یہی لگا کہ کھلونے سے مراد کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔۔۔۔ اور جس بچے کے لیے کھلونا درکار ہے وہ خود راسو یا اس کا کوئی ساتھی ہے۔ کوئی ایک ماہ پرانی ایک تصویر دیکھ کر وہ بری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کے اندر راسو کے لیے ناپسندیدگی اور غصے کی لہر سی ابھری۔ یہ خود آنیہ کی تصویر تھی اور راجوری میں اس کی پچھلی آمد کے موقع پر اتاری گئی تھی۔ آنیہ فورٹ میں بڑی محویت سے ایک محرابی دروازہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے

بال منتشر تھے اور گلابی آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا۔ یہ تصویر آنیہ کی بے خبری میں اتاری گئی تھی۔ راسو کے موبائل میں موجود اس تصویر کے نیچے ایک شعر لکھا تھا۔

خطا تو جب ہو کہ ہم حال دل کسی سے کہیں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

آنیہ کا دل چاہا کہ تصویر کو ڈیلیٹ کر دے مگر پھر اسے یہ مناسب نہیں لگا۔ اس نے موبائل اسی طرح چور خانے میں واپس رکھ دیا۔ اس نے گاڑی کی بوسیدہ رجسٹریشن بک دیکھی اس میں بھی کچھ رسیدیں اور فوٹو گراف موجود تھے۔ ان میں سے دو فوٹوز چونکا دینے والی تھیں۔ ایک فوٹو میں وہی ٹانگ سے معذور لڑکی سدرہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو شخص نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً وہی کرنل اروڑا تھا جسے آنیہ نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے عالیشان آفس میں دیکھا تھا۔ اس نے سدرہ کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور بے دردی سے کھینچ کر کسی کمرے سے باہر لا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اپنے کمرے یا دفتر سے باہر دھکیل رہا ہے۔

دوسری کارڈ سائز تصویر بالکل مختلف منظر پیش کرتی تھی۔ اس میں کرنل اروڑا شادی کے لباس میں تھا اور اگنی کے پھیرے لے رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جو دلہن اس کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی، وہ سدرہ تھی۔ ادھیڑ عمر اروڑا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جبکہ کومل سی خوبرو سدرہ مظلومیت کی تصویر نظر آتی تھی۔

آنیہ چکرا سی گئی۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ایک ادھیڑ عمر ہندو سے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے ہندو ہو گئی ہو؟ یہ ناممکن تھا۔ پھر سدرہ کی ٹانگ کا نقص۔ کم از کم ان تصاویر سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تب سدرہ کی ٹانگ ٹھیک ہی تھی۔ وہ سوچتی رہی، پھر ایک نیا خیال آنیہ کے ذہن میں آیا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سدرہ پہلے ہندو ہو، بعد میں مسلمان ہوئی ہو مگر اتنی خوب صورت لڑکی کی شادی اتنی بڑی عمر کے فوجی افسر سے..... جس تصویر میں اروڑا، سدرہ کو بالوں سے کھینچ کر کمرے سے باہر دھکیل رہا تھا، اس میں ایک اور چیز بھی نوٹ کرنے والی تھی۔ اروڑا کے گھبرے گندمی چہرے پر کسی سرخ بال پوائنٹ سے کراس کا نشان لگایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس شخص سے نفرت کا اظہار بھی تھا۔ یہ اظہار کس نے کیا تھا؟ کیا یہ راسو کی طرف سے تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پڑھا جانے والا میسج آنیہ کے ذہن میں آیا۔ شہالی نے راسو کو لکھا تھا۔ ''اس کنجر اروڑا نے سب سے پہلے میرا ٹینٹوا ہی دبانا ہے اور اگر اسے کوئی ثبوت مل گیا ناں تو یاد رکھو وہ تمہاری بھی ساری اگلی پچھلی کسر نکال دے گا، تصویر کی پشت پر سرخ روشنائی سے ہی ایک فقرہ بھی درج تھا..... ہم نہیں مانتے، ظلم کے ضابطے۔

پتا نہیں کہ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟ آنیہ نے تصویروں سمیت رجسٹریشن بک دوبارہ پوشیدہ خانے میں رکھ دی تھی۔ اسے ان سارے معاملات سے سخت اُلجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی رات کے دو بجے تھے۔ کم از کم پانچ چھ گھنٹے مزید اسے اسی خالی زباب منزل میں گزارنے تھے۔ عمارت کے عقبی باغیچے کی طرف سے ایک بار پھر بلی کی ''می آؤ می آؤ'' سنائی دی۔ پھر دو بلیاں لڑنے لگیں۔ آنیہ کا دل چاہا کہ وہ موبائل فون آن کر کے نہار کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرے مگر پھر راسو کی تاکید یاد آئی کہ وہ اپنا فون بند ہی رکھے تو بہتر ہے۔

اس نے ہاتھ لمبا کر کے بیڈ کے چور خانے میں سے ڈارک براؤن کور والی ڈائری نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اس ڈائری میں بس کہیں کہیں دو چار فقرے ہی ہندی ٹیکسٹ میں لکھے ہوئے تھے باقی ساری ڈائری کی تحریریں کسی اور زبان میں تھیں۔ بہت باریک، نفیس سی لکھائی تھی مگر کوئی لفظ پلے نہیں پڑتا تھا۔ یہ سنسکرت ہرگز نہیں تھی۔ شروع میں آنیہ کو لگا کہ شاید یہ گجراتی یا کشمیری ہے مگر یہ خیال بھی غلط ہی ثابت ہوا۔ پتا نہیں کہ آنیہ کے ذہن میں کیا آیا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور دس پندرہ منٹ میں اس ڈائری کے ساٹھ ستر صفحات کی تصاویر لے لیں۔

بعد ازاں اس نے ساری اشیا اسی ترتیب کے ساتھ دوبارہ چور خانے میں رکھیں اور اسے بند کر کے واپس اسٹور نما کمرے میں آ گئی۔ موبائل فون تو وہ آن کر ہی چکی تھی۔ اس نے حیران و پریشان نہار کور سے رابطہ کیا اور بڑی دھیمی آواز میں اسے زباب منزل کی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

گفتگو کے آخر میں نہار کور نے بے حد پریشان لہجے میں اسے مشورہ دیا کہ وہ صبح سویرے پانچ اور چھ بجے کے درمیان وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس وقت رات بھر ڈیوٹی دینے والے پولیس اہلکار اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلی بار نہار کور بھی خوف زدہ محسوس ہوئی تھی۔ یہاں کے سارے معاملات بہت بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

تاریخ کے اوراق پر بکھری داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

زمین وزن

احمد اقبال

عرصہ دراز سے جی ڈی پی سے منسلک سینئر مصنف احمد اقبال آج کل علیل ہیں... اسی بیماری میں آخری لمحوں میں ان کی یہ کہانی موصول ہوئی ہے
بند کواڑوں کے پیچھے بہت کچھ مخفی ہوتا ہے... ان مخفی باتوں کے انکشاف سے ایک تباہی و بربادی کا سیلاب آنے کا اندیشہ ہوتا ہے... معاشی طور پر پسے ہوئے افراد کے ناگفتہ بہ حالات جو رفتہ رفتہ انسان کی ذہنیت اور فطرت کو مشتعل بنا دیتے ہیں۔ ایک ایسے ہی گھرانے کی ان کہی باتیں... وقت کو دھکیل کر وہ اپنی ناآسودہ خواہشات اور تمناؤں کو حاصل کرنا چاہتا تھا...

ایک بے عمل شخص کا

ماجرا جس کے حصے میں

خسارے کا سودا آیا تھا۔

عمر نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے سوئچ آف کر دیا۔ چھت سے معلق چالیس واٹ کا زرد روشنی والا بلب بھی اندھیرے میں گم ہو گیا۔

''کون ہے؟'' چارپائی پر پڑے میلے بدبودار ڈھانچے نے پوچھا۔

بڈھا اب رو نہیں رہا تھا لیکن درد و کرب اس کی آواز سے ٹپک رہا تھا جس کی شدت کو خود اس کے سوا کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا اور یہی اس کا المیہ تھا۔ اس بو کے علاوہ جو بڈھے صدیق کے جسم کی بستر میں خارج کردہ غلاظت سے اٹھ رہی تھی، رفتہ رفتہ رات کی بوجھل سیاہی کمرے میں بھر گئی تھی۔ وہ چند فٹ دور اس خالی چارپائی پر بیٹھ گیا جس پر ابھی دو دن پہلے تک اس کی ماں سوتی تھی۔ اس نے سگریٹ جلائی تو ماچس کے پل بھر روشن رہنے والے شعلے میں اس نے بڈھے کی تقریباً بے نور آنکھوں کو اپنی طرف مرکوز دیکھا۔ درد سے کراہتی ہڈیوں پر منڈھے سیاہ چمڑی والا ستر سال پرانا وجود اب خود اس کے لیے بے مقصد عذاب بن چکا تھا۔

''تو نے یہ اچھا نہیں کیا عمر!'' بڈھا اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو فکر نہ کر ابا! ان پیٹ بھروں میں سے آج رات کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ میٹھے چاول وہ کل کھالیں گے۔ شیدے خلیفہ کی ماں کا سوئم ہے۔ سوئم ہو یا چہلم......! کیا فرق پڑتا ہے اور مائیں بھی سانجھی ہوتی ہیں شیدے کی ہو یا عمر کی جیسے پلاؤ زردے کی دیگیں سانجھی ہوتی ہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔

خاموشی کا ایک بوجھل پُر اذیت وقفہ ان کے درمیان حائل رہا۔

''تیری ماں کی روح کتنی دکھی ہو گی۔'' بڈھے نے رک رک کر کرب کے ساتھ کہا۔ ''کیا تجھے اندازہ ہے؟''

''اس کے دکھ کا تو پتا نہیں ابا۔'' اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے عمر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں کو آہستہ آہستہ خارج کیا۔

''لیکن تو بہت دکھی ہے اس کے بغیر۔ بہتر ہے کہ تو اس کے پاس چلا جا۔ اس دنیا میں کوئی کام بھی نہیں اب تیرا۔ پڑا پڑا کھاتا رہتا ہے۔ ماں نے تو خیر اتنا عرصہ جھیل لیا، اس کی مجبوری جو تھی مگر وہ بھی تجھے تنگ آ کر چھوڑ گئی۔ اب تجھے ایسی کون سی مجبوری ہے جینے کی۔ یہ سب کون کرے گا اب جو ماں کرتی تھی؟''

جب وہ سگریٹ کا کش لیتا تو بڈھے کی دھندلی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکتی۔ ایک طویل وقفے کے بعد عمر نے مزید کہا۔ ''ماں ایسے کیسے سوتے ہوئے مر گئی۔ سوتے ہوئے بغیر کسی وجہ کے سب سے یہی کہا تھا تو نے کہ وہ صبح اسی جگہ سوتی رہ گئی۔ تجھے پتا ہی نہیں چلا!''

بڈھے کی رقت بھری آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

''اور کیا کہتا۔''

''اور کسی نے شک نہیں کیا تجھ پر۔'' عمر تلخی سے بولا۔ ''سب جانتے تھے نا کہ تو اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ تیری بات مان لی سب نے۔ شہر میں مشکل پڑ جاتی تجھے۔ پوسٹ مارٹم۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر پہلے لاش کو چیر پھاڑ کے اپنا اطمینان کرتے۔ موت کی وجہ بتاتے۔ پھر دفن کرنے کی اجازت دیتے۔ یہاں وہ جو ڈاکٹر ہے۔ جو ڈھور ڈنگروں کے بھی ٹیکے لگاتا ہے، وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا ہارٹ فیل ہوا ہو گا۔ پرانا بلڈ پریشر ہو گا اسے۔ پتا نہیں چلا اس کا۔ تجھ پر تو کسی نے شک بھی نہیں کیا ابا۔ سب کو پتا ہے تو کتنی محبت کرتا تھا۔''

''چپ کر جا۔ سؤر کے بچے۔'' بڈھے نے حلق سے عجیب سی آواز نکالی۔

عمر نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ ''اگر آج تو مر جائے ابا۔ تو مجھ پر بھی شک کوئی نہیں کرے گا۔ سب جانتے ہیں میں اکلوتا بیٹا ہوں، کتنی محبت کرتا ہوں تم سے۔''

بڈھا جھٹکے لینے لگا۔ اب وہ رو رہا تھا۔

''سب کہیں گے کہ بیوی سے کتنی محبت تھی۔ دو دن نہیں جی سکا اس کے بغیر.....'' عمر نے سگریٹ کا آخری کش لے کر باقی کے حصے کو فرش پر ڈالا اور مسل دیا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت اندھیرے کا وجود عمر کو بہت مہربان لگا۔ اس نے باپ کی زندگی کا ایسا کوئی آخری لمحہ نہیں دیکھا جو یاد بن کے پھر کبھی خیال میں آتا تو اسے پریشان کرتا۔

☆☆☆

وقت کے اس پھیلاؤ کا تصور مشکل تھا جو بڈھے نے اسی کیفیت میں پڑے پڑے گزارا تھا۔ آج اس وقت کا کوئی خیال عمر کو بھی نہیں آتا تھا جب وہ بھینسوں کے باڑے کو اکیلا سنبھالتا تھا اور منڈی میں دودھ پہنچا کے اتنا کما لیتا تھا کہ اس کی بھینسوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس ہو گئی تھی پھر بیس۔ دودھ پہنچانے کے لیے پنڈی کے محلہ وارث شاہ تک ریڑھا لے کر جاتا تھا۔ جان محمد جب کڑھاؤ میں سے

گرم ابلتے دودھ کا پیالہ بھرتا تھا تو اس میں سنگھاڑے اور مونگ پھلی کے آٹے سے تہ دار ہونے والی انگشت بھر زردی مائل ملائی کا ٹکڑا بھی ڈالتا تھا اور نام ہوتا تھا صدیق گجر کے خالص دودھ کا...... اس میں جلیبی ڈال کے کھانے والے یقین کرتے تھے کہ چوک فوارہ سے آگے کشمیری بازار میں اس کے بھائی خان محمد کی دکان کے سوا یہ سواد پنڈی شہر میں کہیں نہیں ملے گا۔ وہاں بھی تو صدیق ہی دودھ لاتا ہے۔

لیکن وقت اسی طرح اپنے اپنے نصیب کے لکھے کے مطابق جوانی کی بھی قیمت دیتا ہے اور نکل جاتا ہے۔ صدیق گجر کو اس نے برسوں پہلے منہ مانگی گھر والی دے دی تھی لیکن وہ شادی کے بعد ایک لڑکا جن کے بیٹھ گئی۔ اور پھر کوئی اولاد نہ ہو سکی اور اس کے پاس اللہ کی رضا پر صبر کے سوا چارہ نہ رہا۔ دس سال گزرے تو صدیق نے پکا کوٹھا بھی بنوالیا۔ زندگی کے اگلے بیس برس تک میاں بیوی نے دن رات کا ہر لمحہ عمر کے لیے وقف رکھا۔ باڑے میں صدیق نے اپنے رشتے کے ایک سالے کو بھی رکھ لیا تھا۔ اسے پہلوانی کا شوق تھا۔ ایک دن صدیق نے اسے دودھ کی جھاگ بھری بالٹی سے منہ لگا کے غٹاغٹ دودھ پیتا دیکھ کے نکال دینے کا سوچا تو اس کی بیوی آڑے آ گئی کہ آخر روٹی کے علاوہ اسے کم دیتے کیا ہو۔ سمجھ لو اس کی محنت کی اُجرت بھی ہے۔ صدیق نے سوچا اور پھر اس میں بھی فائدہ نکال لیا۔ اگلے دن سے اس نے دودھ میں ڈول بھر پانی اور ڈال دیا۔ عمر اسکول سے شہر کے کالج تک گیا تو صدیق نے اس کو بیوی کی مخالفت کے بعد تانگا لگوا دیا لیکن دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ عمر نے موٹر سائیکل کے لیے بھوک ہڑتال کر دی تو صدیق اس کے ساتھ شہر گیا۔ وہاں عمر ایک لاکھ والی 125 سی سی پر اڑ گیا اور صدیق نے سوچا کہ جہاں سیر وہاں سوا سیر...... اس کی کمائی آخر ہے کس کی ---- عمر نے شہزادگی کے شوق کبھی باپ کو بے وقوف بنا کے تو کبھی ضد میں بھوک ہڑتال کر کے پورے کیے۔ سہالہ کا باسی صدیق کیسے جان سکتا تھا کہ سپوت اس کا پیسہ کہاں اڑاتا ہے۔ اس کے لیے بیٹے کی افسری کے خواب ہی بہت تھے۔

اس نے بیٹے کے بی اے پاس کر لینے کی خبر سنی تو نذیرے حلوائی سے کہہ دیا کہ لڈو کا لنگر تین دن نہ رکے لیکن عمر نے لنگر روک دیا۔ ''ایسے پیسہ مت پھینک ---

مجھے اب گاڑی چاہیے۔''

''گاڑی؟'' صدیق جہاں کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔

''لیکن پُتر ابھی نئی ہے تیری موٹر سائیکل۔ دو سال ہی ہوئے ہیں......''

عمر نے اس کے ساتھ بیٹھ کر بازو اس کے گلے میں ڈال دیے۔ ''تیرا پُتر اب اسٹوڈنٹ نہیں رہا...... میں اب مقابلے کا امتحان دوں گا...... تیرا بیٹا افسر لگے گا اور افسر کیا اچھا لگتا ہے موٹر سائیکل چلاتا؟''

بیٹے کو گاڑی دلوانے کے لیے صدیق اپنی ساری جمع پونجی نکالنے پر راضی ہوگیا۔ بیٹے کو ماں کی حمایت حاصل تھی اور وہ خود بھی اپنے اکلوتے پن کے ٹرمپ کارڈ کا بہترین استعمال کر لیتا تھا لیکن پھر قسمت کا چکر الٹا چلنے لگا اور صدیق کی ایک نہ چلی۔ اس کا پہلوان سالا ایک مقابلے میں گردن تڑا بیٹھا۔ صدیق نے اس کی جگہ دوسرے کو رکھا تو پہلے اس کی ایک بھینس چوری ہوئی۔ مہینہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری گئی۔ دادفریاد لاحاصل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مویشی چرانے والوں کا تھانے سے کاروباری رشتہ تھا۔ عمر شہر سے آیا تو افسر ہونے کی تو کوئی بات نہیں کی، گاڑی کے چوری ہوجانے کی بُری خبر لایا...... پھر باری باری اس کی بھینسوں کو ایک مہلک بیماری نے آلیا، بیس دن میں باڑا خالی ہوگیا۔ اس سے بھی صدیق سنبھل جاتا۔ ایک ایک بھینس کر کے وہ اجڑے ہوئے باڑے کو پھر آباد کر لیتا لیکن ایک روز وہ خود باڑے کے کنویں میں گر گیا۔ اسے زندہ تو نکال لیا گیا مگر سر کی کسی چوٹ نے اسے ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا...... شہر کے دو بڑے اسپتالوں کے ڈاکٹروں نے اسے صاف بتا دیا کہ اگر وہ ولایت چلا جائے تو شاید آپریشن سے چلنے پھرنے لگے لیکن زیادہ امکان یہی تھا کہ باپ دادا کے ساتھ لیٹنے کے لیے اسے تابوت میں ڈال کے واپس لایا جائے۔ یہ بھی بڑا خرچہ ہوگا۔ کم سے کم دس لاکھ...... وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اگلے پانچ سال صدیق کو بیوی نے کھانا پانی دے کر اور جھاڑ پونچھ کے اسے بس زندہ رکھا۔ پھر شاید وہ بھی تھک گئی اور ایک رات ایسی سوئی کہ سوتی رہ گئی۔ وجہ کا کسی کو پتا نہ چلا۔ سہالہ میں تو اس کی دگنی عمر کے جینے والے بھی بہت تھے۔ صدیق نے لیٹے لیٹے اسے کندھوں پر گھر سے جاتا دیکھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ عمر اپنا گھر بیچ کے پنڈی یا اس سے بھی آگے لاہور چلے جانے کے پروگرام پر عمل کرتا، نوشابہ دخترِ مولانا ابوبکر کی اکلوتی بیٹی نے اس کا راستہ روک لیا۔ صدیق اس کے بچپن کا یار تھا اور وہ اس کے سوم میں شریک ہوئے تو باہر انہوں نے اور گھر کے اندر نوشابہ نے مہمانوں کی خاطر داری کا سارا انتظام سنبھالے رکھا۔ اکلوتے سعادت مند بیٹے نے باہر شامیانہ لگوایا تھا اور اپنے پرائے سب پر پلاؤ زردے اور قورمے کی دیگوں کے منہ کھول دیے تھے۔ پکانے والے اس نے پنڈی شہر سے بلائے تھے۔ دو بار مولانا مغرب اور عشا کی اذان اور نماز کے لیے مسجد بھی گئے۔ ان کے واپس آنے تک نوشابہ ہی سامان سمیٹنے والوں سے نمٹتی رہی اور بچا ہوا کھانا ادھر اُدھر بھجواتی رہی۔ اس نے انتظامات کی نگرانی کسی پروفیشنل کی طرح کی اور عمر کو حیران کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا نوشابہ کی زندگی مسجد کی حدود میں ملے ہوئے مؤذن کے حجرے میں ہی گزری تھی حساب کتاب کے لیے وہ متاثر کرنے والی متانت کے ساتھ براہِ راست عمر سے بات بھی کرتی رہی۔ یوں جیسے وہ ساتھ پل کر بڑے ہونے والے کزن ہیں حالانکہ عمر کو صرف اتنا معلوم تھا کہ مولانا کی ایک بیٹی جس کی ماں مرچکی ہے برقع میں لپٹی دینو کے تانگے میں بیٹھ کے کہیں پڑھنے جاتی ہے۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو دینو نے اسے دیکھا تھا۔ اب اس کے ہاتھ سے پیسے یا رسیدیں لیتے اور دیتے ہوئے کئی بار عمر نے اسے نظر بھر کے دیکھا تو اس کے ملاحت آمیز اجلے رنگ والے بیضوی چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑی آنکھوں کی شفاف چمک کی تاب نہ لاسکا کئی بار اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے نوشابہ کے ہاتھوں کے لمس کی سنسنی کو محسوس کیا اور پھر ایک بار اس نے ہمت کر کے کسی رسید کے ساتھ نوشابہ کی انگلی بھی پکڑ لی جو اس نے بُرا مانے بغیر نرمی سے چھڑالی۔ اس کے قرب کی عجیب سی مہک کو وہ رات بھر محسوس کرتا رہا جو کسی قیمتی غیر ملکی پرفیوم سے زیادہ مسحور کن تھی۔ اور اسے عجیب عجیب روپ میں دیکھتا رہا۔ ایک نیم غنودگی کے خواب میں وہ ''مغلِ اعظم'' کی انارکلی بنی رقص کر رہی تھی اور وہ شہزادہ سلیم بنا فریفتگی کا اظہار کر رہا تھا۔ صبح ہونے تک اتنا سمجھ میں آیا اور وہ مولانا ابوبکر کی خدمت میں حاضری دینے چلا گیا۔ اس نے دروازے پر لہراتے پردے کے پیچھے ہاتھ ڈال کے دستک دی۔

''کون ہے؟'' چند سیکنڈ بعد نوشابہ نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔

''میں ہوں عمر...... چچا سے ملنے آیا تھا۔''

''وہ مسجد میں ہوتے ہیں اس وقت ---'' نوشابہ کے بظاہر سپاٹ لہجے میں عمر کو اپنائیت کی خنکی محسوس ہوئی کہ عمر --- تم کو یہ بھی یاد نہیں رہا --- شہر جا کے سب بھول گئے۔ یہ اتنی پرانی بات تو نہیں --- شاید پردے کے پیچھے وہ مایوس تھی، وہ خفیف سا صحن کی وسعت کو عبور کرنے لگا۔

مولانا ابوبکر طلبا کے نیم دائرے میں مسجد کے چمکتے فرش پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ عمر سلام کر کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ درس سے فارغ ہو کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''اچھا کیا تم آ گئے۔ کل تو موقع نہیں ملا تم سے بات کرنے کا بھی۔''

''جی چچا میں نے سوچا شکریہ ادا کر دوں آپ کی مدد کا --- آپ کی صاحبزادی نے ایسے سلیقے سے انتظام سنبھالا --- جو میرے بس کی تو بات نہیں تھی۔'' عمر نے لہجے میں اپنائیت کی سعادت مندی سمو کے کہا۔

مولانا نے ایک گہری سانس لی۔ ''شکریہ کیسا --- صدیق ایک ہی یار تھا دنیا میں میرا --- تم تو جانتے ہو سب --- صدیق کا اور میرا بس مہینہ بھر کا فرق تھا۔ چنانچہ نام بھی ایسے رکھے گئے ہمارے --- اچھا برا وقت سب پر آتا ہے مگر کبھی نہ اس نے میرا ساتھ چھوڑا نہ میں نے اس کا۔ یہ حادثہ ایک بہانہ بن گیا ورنہ لوگ گرتے رہتے ہیں کنویں میں --- میں تو دو بار گرا تھا۔ ایک بار بچپن میں اور دوسری بار شادی کے بعد۔ دو بندے مر بھی گئے تھے مجھے یاد ہے --- تیرا باپ گرا تو بس نہ زندوں میں رہا نہ مردوں میں --- ایک خدمت کرنے والی تھی تیری ماں --- وہ بھی نہیں رہی --- اسے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کہتے ہیں دل بند ہو گیا سوتے میں --- واللہ اعلم --- صدیق تو رہ گیا نا اکیلا --- اکیلا وہ جیتا تو کیسے جیتا --- تیسرے دن چلا گیا اسی کے پاس --- میں تو کچھ بھی تو نہیں کر سکا اپنے یار کے لیے --- اس کا بڑا دکھ ہے۔'' انہوں نے عمامہ کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے۔

عمر پلک جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس وقت کوئی بات چھیڑنا مناسب رہے گا۔

''حوصلہ کریں چچا --- مجھے دیکھیں کہ آیا تھا ماں کو سپردِ خاک کرنے اور جا رہا ہوں باپ کو بھی دفنا کے ---''

سامنے پردہ پڑے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔ ''چائے لے جائیں ابا۔''

نوشابہ کو پھر دیکھنے کی آرزو نے دم توڑ دیا۔ وہ پھر پہلے کی طرح مکمل اجنبی ہو گیا تھا جس کے سامنے وہ آج تک اتفاقیہ بھی نہیں آئی تھی اور پھر آنے کی بھی نہیں۔ وہ چائے پی کے مایوس لوٹ آیا۔ دن بھر میں اس نے سب معاملات کو ترجیحی ترتیب میں رکھا جو اسے واپس جانے سے پہلے فوری طور پر نمٹانے تھے۔ اسباب تو سب بے مصرف تھا وہ کسی مستحق کو دے سکتا تھا لیکن گھر یوں کھڑے کھڑے بیچا نہیں جا سکتا تھا --- قیمت کا کچھ اندازہ اسے تھا لیکن یہاں تو قیمت آج کچھ تھی کل کچھ ہوگی۔

☆☆☆

فیڈرل کیپٹل ایریا میں آ جانے کے بعد یہ سارا علاقہ تیزی سے بدلا تھا۔ راولاکوٹ جانے والی ذیلی سڑک والا پر واقع سہالہ ایک گمنام سا گاؤں تھا۔ وہ اسلام آباد ایکسپریس وے پر آ گیا تھا تو اس کی قسمت بدل گئی تھی۔ زمینوں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ اس سے بھی آگے کی جگہ ڈی ایچ اے نے لے لی تھی اور سہالہ میں محمد علی جناح یونیورسٹی کا اسلام آباد کیمپس قائم ہو رہا تھا۔ اس نے گھوم پھر کے پچھلی طرف کے خالی پڑے احاطے کو دیکھا۔ بھینسوں کی کھرلی سے کچھ دور کونے میں وہ کنواں تھا جس نے اسے یتیم کیا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کے گہرائی میں پانی کی سناک چمک سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ اس نے اندازہ کیا کہ یہ سب جگہ 15 مرلے سے زیادہ ہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے باہر گھوم پھر کے نئی تعمیرات کو دیکھا، سڑک پر تین پیٹرول پمپ تھے اور چار بینک۔ اس جگہ کو دونوں طرف سے گھوم کر جانے والی سڑک اسلام آباد ایکسپریس بائی وے سے ملا رہی تھی۔

عمر ایک اسٹیٹ ایجنسی میں داخل ہو گیا جو اس کے بچپن کے دوست رفیق کی تھی۔ پرانی پرچون کی دکان کو اس کا باپ چلاتا تھا۔ بی اے میں فیل ہونے کے بعد اس نے رفیق کو ساتھ لگایا مگر باپ کے مرتے ہی رفیق نے دکان میں رنگ روغن کرا کے شیشے کا دروازہ لگوایا اور اس پر ''رفیق اسٹیٹس اینڈ بلڈرز'' لکھ کے اندر کرسی میز ڈال کے بیٹھ گیا۔ یہ عقلمندی کا فیصلہ تھا۔ مین روڈ پر ایک نئی مارکیٹ بن چکی تھی جس میں سپر اسٹور بیکری کیسٹ اور شو اسٹور وغیرہ جدید وضع اور چمک دمک کے ساتھ نمودار ہو رہے تھے اور اس میں 25 سال پرانی شیدے کی دکان بیکار تھی۔ دو چار پلاٹ نکالنے کے بعد فیکے نے ایک 5 مرلے کے مکان کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا تو اس کا بزنس جم گیا۔

''بیٹھ نا --- کدھر سے آ رہا ہے؟ مگر پہلے بتا ٹھنڈا پیے گا کہ گرم ---'' اور جواب سنے بغیر فریج میں سے کوک

نکال کے عمر کے سامنے رکھ دی۔ ”گری ہر سال بڑھتی جا رہی ہے...... درخت کاٹ دیے ہیں اسلام آباد بنانے کے چکر میں۔“

”فیکے...... میری زمین کا سودا کرا دے۔“ عمر براہِ راست مطلب کی بات پر آ گیا۔

”خیال تو تھا میرا ابھی کہ اب تو یہاں کیسے رہ سکتا ہے۔ وہاں کیا کر رہا ہے تو...... پنڈی کے کسی دفتر میں ہے نا تو؟“

”بابو گیری...... افسری تو کرنے سے رہا ایک بی اے فیل...... مگر سب کو بتا نا مت پھرنا......“

فیکا ہنسنے لگا۔ ”پاگل نہیں ہوں میں...... زمین تیری ہے 15 مرلے...... ٹھیک؟“

عمر نے سر ہلایا۔ ”50 مل جائیں گے نا؟“

رفیق سوچ کے بولا۔ ”کھڑے کھڑے نہیں...... ٹائم لگے گا...... 45 میں ابھی دلا دوں...... یاری میں کمیشن بھی چھوڑ دوں گا۔“

”کتنا ٹائم؟“ عمر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”تین مہینے تو پکے...... منتقلی ایک دن میں نہیں ہوتی...... ابھی تو زمین ہے چاچا صدیق کے نام...... تیرا وراثت نامہ بنے گا...... لاکھ اس میں نکل جاتے ہیں...... ورنہ سال نکل جاتا ہے......“

عمر کچھ مایوس ہوا۔ ”چل جانے دے لاکھ۔ بات یہ ہے یار کہ مال ہو پاس تو بندہ باہر نکلنے کا سوچے ورنہ ادھر تو بس خواری ہے اور کچھ نہیں۔“

”کرنے والوں کے لیے ہے عمر...... بڑا بزنس ہو سکتا ہے اتنا مال ہو تو...... کیا ضرورت ہے باہر کھجل خوار ہونے کی...... شادی تو نہیں کی نا ابھی...... کڑی پھنسی ہے کوئی؟“

”او یار کڑیاں بہت...... بس میں نہیں پھنسا تھا اب تک...... لیکن یہ کام بھی کرنا تو ہے...... پہلے پنڈی میں گھر تو ہو اپنا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بات سُن...... یہ کام مختار نامہ ...... پر نہیں ہو سکتا؟“

فیکے نے سر کھجایا۔ ”مگر مختار نامہ دینے والا نہ ہو تو...... خیر...... پاکستان میں کیا نہیں ہو سکتا۔ میں کرتا ہوں بات کسی سے...... تو پیسے پکڑ اور نکل جا...... آگے میں سنبھال لوں گا......“

☆☆☆

نماز ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن ہال میں کوئی نہیں تھا۔ مؤذن ظہر کی امامت کے بعد اپنے حجرے میں جا کے سو گیا تھا۔ عمر مسکرایا۔ مخبر کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہ پلٹا اور صحن عبور کر کے مولانا ابوبکر کے دروازے تک گیا۔ پردے کے پیچھے ہاتھ ڈال کے اس نے کنڈی بجائی...... ضرور باپ کے دستک دینے کا کا انداز جدا ہوگا کہ کچھ دیر بعد نوشابہ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کون ہے؟ مولانا تو جنازہ پڑھانے گئے ہیں۔“

”نوشابہ، میں عمر ہوں...... پلیز ایک بات سُن لو میری......“ عمر نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”بس ہاں یا نہ میں جواب دے دو...... پھر میں ہال میں جا کے لیٹ جاؤں گا اور چچا ابوبکر کی واپسی کا انتظار کروں گا...... تم سن رہی ہو نا......؟“

”جی...... ایسی کیا بات ہے۔“ اس کی ہلکی سی نرم پُرسکون آواز نے کہا۔ ”جلدی کہیں۔“

عمر کا دل ایک پُر طمانیت خوشی سے بھر گیا۔ ”میں...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ چچا سے بات کرلوں......“

خاموشی...... مزید متجسس خاموشی جو خوف کو آواز دیتی ہے پھر جیسے سکوتِ شب میں کلی چٹکتی ہے اور پتھر سے پھوٹ کے قطرۂ آب میں جلترنگ اتر آتی ہے۔ نوشابہ کی ہلکی سی پُرسکون اور شوخی کا شائبہ رکھنے والی آواز نے کہا۔ ”کرلیں۔“ مگر عمر کے دل کی دھڑکن انہی دولفظوں کی تال سے ہم آہنگ ہوگئی...... کر...... لیں...... کر...... لیں......

عمر نے تھینک یُو کہا اور پلٹ گیا حالانکہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ہال میں جا کے اس نے ایک کونے کا پنکھا چلایا اور لیٹ کر ایک خوبصورت پُرمسرت مستقبل کا خواب دیکھنے لگا جس کی تعبیر اب اسے دسترس میں لگتی تھی۔ یہ مسجد کے تقدس بھرے پُرسکون ماحول کا اثر تھا کہ اس نے اپنے دل کو تشکر اور ممنونیت کے جذبات سے معمور پایا...... یہ اس کا نصیب ہی تو تھا جو اسے تمام خطرات اور نقصانات کے راستوں سے بحفاظت نکال کے اس مبارک ساعت تک لے آیا تھا جب اس کے پاس دولت مندی کی دہری خوشی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ نوشابہ جیسی سلیقہ شعار اور حسنِ بے مثال کی مالک شریکِ حیات کے ہاتھ میں تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں وہ قارون کا خزانہ تھا جو دنیاوی راحتوں اور مسرتوں کا ضامن تھا۔ خود اپنی طرف سے تو اس نے اپنی بے راہ روی سے خود کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مسجد کی سفید چھت کے اسکرین پر اس وقت فلم

کے ٹوٹنے چلنے لگے جو گزر چکا تھا۔

اچانک اس نے نوشابہ کو دروازے کے فریم میں ایک قدِ آدم تصویر کی طرح دیکھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''نوشابہ...... '' وہ قریب جا کے سرگوشی میں بولا۔

''مؤذن نے شہر سے آ کے بتایا ہے کہ ابا اب مغرب کے بعد آئیں گے۔ ان کے کسی دوست کی بیٹی کا نکاح پڑھانے کے بعد......'' وہ اپنی پُرسکون خوف سے بھری سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے...... کچھ بات کرنی ہے تم سے۔'' وہ ایک دم پلٹ کے اپنے گھر کی طرف چلنے لگی۔ عمر بے یقینی کے شش و پنج میں کھڑا رہا اور پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔ پردے کے پیچھے کا دروازہ اس کا ہاتھ لگتے ہی کھل گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دو کوٹھریوں کے کوارٹر میں قدم رکھا۔

وہ سامنے ہی حسن و رعنائی کا پیکر بنی کھڑی تھی اور نیم تاریکی میں بھی اس کے عارض پر حیا کی شفق روشن لگتی تھی۔

''دروازہ بند کر دیجیے۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور کمرے میں موجود واحد چارپائی کے ایک کنارے پر ٹک جانے کے بعد عمر کو دیوار سے لگی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے سامنے تپائی جیسی میز رکھی تھی۔

''جی اب کہیں کیا بات تھی؟'' عمر بیٹھنے کے بعد بولا تو اس کا حلق خشک ہونے کے باعث آواز مشکل سے نکلی۔ ''لیکن...... لیکن...... پانی ایک گلاس پہلے......''

نوشابہ نے صراحی میں سے اسٹین لیس اسٹیل کا گلاس بھر کے تپائی پر رکھا اور پھر چھ فٹ دور اپنی جگہ پر جا بیٹھی، اب عمر نے دیکھا کہ وہ کاسنی پھولوں والے زرد شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی اور اس کا یہ اندازِ حسن مبہوت کرنے والا تھا۔

''میں جاننا چاہتی تھی کہ آپ تو شہر میں ہی رہے۔ اب تک کوئی......'' اس نے تھوک نگلا۔ ''میرا مطلب ہے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک......؟''

عمر مسکرایا۔ ''میں سمجھ گیا آپ کا مطلب...... خدا نے ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت رکھا ہے۔''

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ سچ بتانا نہیں چاہتے مجھے......''

عمر نے نیچے دیکھا اور پیر سے فرش کریدتا رہا۔ ''مجھے...... مجھے ڈر ہے......''

نوشابہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں...... سچ کیسا بھی ہو۔ میں سن سکتی ہوں...... اس کا کوئی اثر ہمارے مستقبل پر نہیں پڑے گا۔ میرے لیے ابا سوچتے ضرور ہوں گے لیکن ابھی تک مجھ سے کسی کی بات نہیں کی۔ آپ تو خود ہی فیصلہ کر سکتے تھے پھر اب تک کیوں رکے رہے؟''

''او کے نوشابہ...... تمہارا ایسا سوچنا غلط نہیں۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ شہر کا ماحول مختلف تھا۔ مجھے لڑکیاں ملیں...... دو تو...... اچھی نہیں تھیں۔ ایک بس دل لگی کرتی تھی اور سب کو ہی بے وقوف بناتی تھی۔ دوسری ایسے فیشن کرتی تھی کہ لگتا تھا اچھے گھر کی ہو گی لیکن اس کا باپ چپراسی تھا......'' اب عمر میں شیخی بگھارنے کا پرانا جذبہ سر اٹھانے لگا۔ ''پھر ایک تو میری محبت میں دیوانی تھی، وہ بہت خوبصورت بھی تھی اور اچھے گھر کی تھی...... کسی خبیث نے اس کو بتا دیا کہ میرا باپ گوالا ہے اور میں کلرک ہوں...... تو اس نے مجھے تھانے میں بند کرا دیا اور ایک ہفتے بہت مار لگوائی...... اس کا کوئی چچا ڈی ایس پی تھا۔ آخری کے ماں باپ بڑے کمینے تھے۔ انہوں نے مجھے انکار کر دیا۔ وہ دولت مند بزنس فیملی تھی مگر میرے جیسا داماد انہیں کہاں ملتا...... انہوں نے مجھے بہت بے عزت کیا کہ دودھ بیچنے والے کی اولاد...... تیری ہمت کیسے ہوئی...... اور چوکیدار سے مجھے دھکے دے کر نکلوا دیا...... بعد میں اس لڑکی نے کہا کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ مجبوری ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی اسے...... مجھے سخت غصہ تھا اپنی بے عزتی کا...... میں نے انکار کر دیا۔ اس نے بار بار کہا لیکن میں نے کہا کہ اب تمہارا باپ میرے پیر پکڑ کر معافی مانگے گا تو شادی ہو گی...... دو دن بعد وہ مر گئی۔''

''مر گئی؟ یعنی...... خودکشی کر لی اس نے؟'' نوشابہ نے چونک کے کہا۔ ''مگر کیوں؟''

عمر فرش کریدتا رہا۔ ''کیوں کیا...... سب کو معلوم ہو جاتا...... کہ وہ ماں بننے والی ہے۔''

''تمہارے بچے کی؟'' نوشابہ چلائی۔ ''تم نے دو قتل کیے بے غیرت...... شیطان...... ایک سچ مچ تم سے محبت کرنے والی لڑکی کا...... دوسرا اپنی اولاد کا...... اور تم یہ سب مجھے اتنی بے شرمی کے ساتھ بتا رہے ہو۔ چلو اٹھو...... اسی وقت نکل جاؤ...... میں تھوکتی ہوں تم پر......''

وہ ہکلایا۔ ''میری...... میری بات تو سنو......''

مولانا ابوبکر نے اسے جھنجوڑا۔ ''بس اٹھ جاؤ بیٹا...... عصر کی اذان کا وقت ہے۔''

عمر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ وہ وہیں مسجد کے ہال میں تھا جہاں لیٹا تھا۔ نوشابہ صحن کے پار کہیں اپنے کمرے میں ہوگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ سب ایک خواب تھا۔ وضو کر کے اس نے باجماعت نماز ادا کی اور جب نمازی چلے گئے تو مولانا ابوبکر نے کہا۔ ''تم مجھ سے ملنے آئے تھے۔ بیٹی نے بتایا...... کوئی کام تھا؟''

وہ صف پر ان کے مقابل بیٹھ گیا۔ ''جی...... ایک بات کرنی تھی آپ سے...... خفا تو نہیں ہوں گے؟''

مولانا ہنسے۔ ''مجھے کسی سے بھی خفا ہونا نہیں آتا...... تم تو بیٹے جیسے ہو۔''

عمر نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ ''آپ جانتے ہیں ابا نے...... اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ اپنے حلال وسائل سے مجھے پڑھایا...... بدقسمتی میری کہ صرف بی اے کر سکا۔ بڑے جتن سے ایک سرکاری محکمے کی نوکری مل گئی ہے جہاں ایک پیسے کے رزقِ حرام کی گنجائش نہیں...... الحمدللہ...... تنخواہ کم ہے ابھی لیکن میں نے سوچا ہے کچھ اور کر کے آمدنی بڑھانے کا......''

مولانا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اگر تم مجھ سے مشورہ چاہتے ہو تو میں کاروباری معاملات میں صفر ہوں......''

عمر زیرِلب مسکرایا۔ ''نہیں چچا...... یہ معاملہ کاروباری نہیں...... کیا ماں نے مرنے سے پہلے کوئی بات کی تھی آپ سے میرے بارے میں؟''

''تمہارے بارے میں؟ نہیں...... میرا خیال ہے ایک ہفتے پہلے میں گیا تھا۔ وہ بھلی چنگی تھی۔ شربت بھی بنا کے لائی تھی میرے اور اپنے لیے......''

''خیر...... ابا نے انتقال سے قبل...... اسی دن صبح مجھ سے کہا کہ میں شادی کر لوں...... آپ کی صاحبزادی سے۔'' یہ آخری الفاظ بول کے عمر نے سکون کی گہری سانس لی۔

مولانا ابوبکر نے سوچتے ہوئے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں کہا مرحومہ نے......''

عمر نے مایوس سا چہرہ بنایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا فرش کو دیکھتا رہا۔ ''اچھا، پھر تو میرے کہنے کو کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں چچا...... پرسوں ڈیوٹی پر جانا ہے۔''

مولانا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''بیٹھو...... یہ بتاؤ تم بھی وہی چاہتے ہو جو صدیق نے کہا اور جو تمہاری ماں چاہتی تھی؟''

صدیق کا حوصلہ بڑھا۔ ''اتنا ناخلف نہیں ہو سکتا تھا میں کہ انکار کر دیتا ابا کو...... اور پھر اس کے بعد...... جب میں نے ابا کے سوم پر آپ کی بیٹی کا سلیقہ دیکھا تو مجھے آپ کی تربیت کا اندازہ ہوا۔ آپ نے اسے اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جس گھر میں جائے گی آپ کا نام روشن کرے گی۔''

''اگر تم یہی بات کرنے آئے تھے...... اور خود بھی چاہتے ہو...... تو میں انکار نہیں کروں گا۔'' مولانا نے ایک گہری سانس لی۔ ''بیٹیوں کو اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن...... اچھا تھا اگر...... آپ ان سے بھی پوچھ لیتے...... نوشابہ...... اپنی صاحبزادی سے......''

''بے شک پوچھنا میرا فرض ہے لیکن اس کا جواب کیا ہوگا، یہ بھی مجھے معلوم ہے بیٹا۔'' مولانا مسکرائے۔

عمر کا چہرہ چمک اٹھا، اس نے مولانا کے ہاتھ چوم لیے۔ ''اللہ آپ کا سایہ ہم پر سلامت رکھے...... آپ دیکھیں گے میں اسے کبھی کوئی شکایت نہیں ہونے دوں گا۔''

مولانا ہنسے۔ ''وہ بڑا صابر اور شاکر مزاج رکھتی ہے عمر بیٹا...... شکایت کرنا جانتی ہی نہیں۔''

عمر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں کل ہی سارے گاؤں میں لڈو بانٹ دوں گا۔''

''نہیں...... یہ موقع نہیں ہے بیٹا...... جلدی کیسی...... والدین کا چہلم تو ہو جانے دو...... اس کے بعد میں خود سب کو بتاؤں گا۔ منگنی کی شرعی حیثیت کوئی نہیں...... تم چاہو تو نکاح ممکن ہے کچھ لوگوں کی موجودگی میں...... رخصتی تمہاری سہولت پر کچھ عرصے بعد کی جا سکتی ہے۔''

''نہیں چچا...... میں معاملے کو بلاوجہ طول دینا مناسب نہیں سمجھتا...... بس میں چہلم کے لیے دس دن کی چھٹی لے کر آؤں گا تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔'' مسرت اب عمر کے لہجے سے ابل رہی تھی۔ اس کا ایجنڈا دو نکات پر مشتمل تھا لیکن اب مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ اس نے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ نماز کے بعد دوسری بات چھیڑتا تو عشا کے لیے رکنا پڑ جاتا۔ دوسری بات اس نے اگلے دن پر ملتوی کر دی۔ اس میں مولانا کے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

ایک اور رات سوتی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے بیتی۔ پہلے اس نے ایک گھر دیکھا جس میں خوبصورت پردے اور صوفے تھے...... پھر ایک کار میں اپنے ساتھ

نوشابہ کو بیٹھے دیکھا جو اس کے باپ کی دلائی ہوئی ڈبیا جیسی مہران سے بہت بڑی تھی۔ اس کے بعد والا خواب بے تکا تھا جس میں وہ سب لڑکیاں باری باری ایک اسٹیج پر آتی تھیں جو اس کی پیچھے رہ جانے والی زندگی کا حصہ بنی تھیں۔

ان سب نے عمر سے ایک ہی سوال کیا۔ تمہاری یہ گاؤں کی گوری...... کیا میں اس سے کم ہوں...... تم نے مجھ سے محبت کے کیسے دعوے کیے تھے...... کمینے آدمی۔ ثابت کر دیا تم نے کہ نالی کا کیڑا نالی میں ہی خوش۔''

اس نے چیخ کر کہا۔ ''شٹ اَپ...... شٹ اَپ آل آف یُو...... تم سب کی کوئی اوقات نہیں' نوشابہ کے سامنے...... تم کیا تھیں...... راستے کا پتھر اور وہ ہے کوہِ نور ہیرا...... میں محبت نہیں کرتا تھا تم سے...... جیسے تم نے بنایا ایسے ہی میں بے وقوف بناتا تھا تم سب کو...... لیکن نوشابہ سے محبت ہے مجھے...... جیسی مجنوں کو لیلیٰ سے تھی۔ عشق ہے جیسا رانجھے کو تھا۔''

وہ اٹھا تو اس کا بدن پسینے میں تر تھا۔ نہا کے وہ ناشتے کے لیے رفیق کے گھر چلا گیا، وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی ''اوئے تو صبح صبح......'' اس نے دروازہ کھول کے کہا۔

''تیری دوہٹی کو دیکھنے نہیں آیا۔ ناشتا کروں گا میں......'' عمر ہنسا۔

رفیق بھی ہنسنے لگا۔ ''آجا آجا...... ناشتا بھی کر اور دوہٹی میری چنگی لگے تو لے جا اسے بھی...... اپنے یاروں کے یار......''

عمر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''اوئے ہم کوئی کباڑی ہیں کہ سیکنڈ ہینڈ مال اٹھائیں...... وہ مُلاّ مان گیا ہے...... ملا ہاتھ......''

رفیق نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''اوئے زبردست...... اس پر تو یار میں بھی مرتا تھا پھر یہ مل گئی تیری بھرجائی۔''

بچے ابھی سو رہے تھے۔ رفیق کی بیوی کے ہاتھوں کے بنے دیسی گھی والے گرما گرم پراٹھے...... بھنا قیمہ...... ملائی اور لسی والا ناشتا کرتے ہوئے عمر نے نوشابہ کی محبت کے موضوع پر اپنا سارا زورِ بیان صرف کر دیا۔

رفیق کی بیوی ہنستی رہی۔ ''سُن رہے ہو اپنے دوست کی باتیں؟''

''مت ماردی ہے اس کی تو ایک کڑی نے...... اب ایسی جنت کی حور بھی نہیں ہے وہ...... سب دل آنے کی بات ہے۔ سب برابر ہو جاتی ہیں بعد میں...... خیر...... آگے کیا

سوچا ہے۔۔۔؟"

"بس یار آگے موجاں ای موجاں۔۔۔۔ ایک ہاتھ میں پچاس لاکھ۔ دوسرے میں اپنی مس ورلڈ۔۔۔۔ ابھی یہاں سے جاتا ہوں مُلا جی کی طرف۔۔۔۔ اس سے بات کر لیتا ہوں کہ وہ میرا اٹارنی بھی بن جائے سسر کے ساتھ۔۔۔۔ گھر کی چابی اسے دوں۔۔۔ اور نکل جاؤں پنڈی شہر۔۔۔۔ اب کام تو کچھ رہا نہیں یہاں۔۔۔۔"

"کاغذ بھی لے جانا دکان سے۔۔۔۔ میں بتا دوں گا تجھے کہاں دستخط کرانے ہیں۔۔۔۔ اسٹام رجسٹر میں چاچا صدیق کا انگوٹھا میں لگوا لوں گا کسی سے بعد میں۔۔۔ لیکن یار عمر۔۔۔ پیش امام مان جائے گا؟۔۔۔۔ یہ کام تو جعلی ہے نا۔"

عمر نے ایک قہقہہ لگایا۔"اوئے مانے گا کیسے نہیں۔ آخر میں جنوائی ہوں اب اس کا۔ ایک دستخط بھی نہیں کرے گا میرے کہنے سے کیا؟"

اسٹامپ پیپرز کے رول کے ساتھ عمر مسجد پہنچا تو مولانا بیس پچیس بچوں کو سیپارہ۔۔ پڑھا رہے تھے۔۔۔۔ ان کے اشارے پر وہ قریب ہی بیٹھ گیا۔ ہر بچے کا الگ سیپارہ تھا۔ اسے الگ درس دینا ضروری تھا۔ وہ ان کے پُرشفقت انداز پر بڑا حیران ہوا۔ روایتی طور پر ان کے پاس کوئی بید نہیں تھی چنانچہ طلبا شور زیادہ کر رہے تھے اور کبھی دوڑ بھاگ بھی کرنے لگتے تھے۔ وہ ایک ڈانٹ لگاتے تھے۔"اوئے دل نہیں کرتا پڑھنے کو تو جاؤ گھر۔۔۔ ادھر وقت برباد کرنے کیوں آتے ہو۔" تو تھوڑی دیر کے لیے سکون ہو جاتا تھا۔

عمر کو خلافِ توقع ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنا پڑ گیا۔

بارہ بجے کے قریب انہوں نے عمر سے پوچھا۔

"خیریت ہے بیٹا۔۔۔ اس وقت کیسے؟"

"جی میرا خیال تھا کہ بارہ بجے تک نکل جاؤں تو آج ہی آفس جوائن کر لوں۔۔۔ مگر ایک کام بھی تھا آپ سے۔۔۔" اس نے جیب سے چابی نکالی اور ان کو پیش کر دی۔"یہ میرے گھر کی چابی ہے۔۔۔"

مولانا ابوبکر نے کچھ دیر چابی کو دیکھا اور پھر کُرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

عمر نے کاغذات کا رول پھیلایا۔"یہ پاور آف اٹارنی کے کاغذات ہیں۔ تمام عدالتی قانونی معاملات سے میرا دوست رفیق نمٹ لے گا۔ اس نے کہا ہے کہ میرے مکان اور زمین کے مجھے 50 لاکھ تک مل جائیں گے۔ میں تو روز آ نہیں سکتا۔۔۔ دفتر سے چھٹی نہیں ملے گی۔۔۔ آپ میرے اٹارنی بن جائیں۔ دستخط کر دیں یہاں۔۔۔۔"

مولانا ابوبکر اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

"چابی کا تو مجھے تھا کہ تم دے ہی جاؤ گے۔۔۔۔ لیکن بیٹا عمر۔۔۔۔ کیا تمہیں نہیں معلوم۔۔۔۔ کہ اس گھر کے اور ملحقہ زمین کے مالک تم نہیں ہو۔"

"اور کون ہے پھر۔۔۔۔" عمر کے دماغ کو جھٹکا لگا۔

"صدیق نے کوئی مہینہ بھر پہلے یہ سب مسجد کے نام وقف کر دیا تھا۔ اس نے تمہیں نہیں بتایا؟" مولانا نے سکون سے کہا اور عمر کے چہرے کو رنگ بدلتا دیکھتے رہے۔

عمر کا سارا جسم پتھر کا ہو گیا۔"ابا ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ میں اکلوتا بیٹا ہوں اس کا۔" وہ چلّایا۔

"منتقلی کے کاغذات اس کی زندگی میں ہی عدالت میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ خود گیا تھا رڑھے پر۔۔۔۔"

ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے اندر سے آتش فشاں کی طرح کھولتا عمر مسجد کے صحن کو عبور کر چکا تھا۔ پچاس لاکھ کے نئے کرارے نوٹوں کی ہزار والی گڈیاں اس آتش فشاں میں اڑ اڑ کر گر رہی تھیں اور راکھ ہو رہی تھیں۔ وہ ایک بھی نوٹ کو جلنے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ پچاس لاکھ کے راکھ ہونے کی فلم تھی جو صرف وہ دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ جس میں عمر کا خون جل رہا تھا۔ اس کا مستقبل جل رہا تھا۔ اس کے سارے خواب جل رہے تھے۔ وہ نیم دیوانگی میں چلتا سڑک کی طرف گیا۔ رفیق کی ایجنسی کا دروازہ لات مار کے کھولا اور قانونی کاغذات میز پر پھینک دیے۔

رفیق کاغذات اور پھر عمر کی صورت دیکھ کر ساری بات سمجھ گیا۔"نہیں مانا مولوی؟ مجھے پتا تھا۔"

"جائے جہنم میں۔۔۔۔۔۔ بنوا لے اپنا مزار شریف میرے گھر میں۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔"

"اوئے چھوڑ غصہ۔۔۔۔ ٹھنڈا ہو جا۔۔۔۔" اس نے فریج میں سے کوک کا ٹن نکالا۔"تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔۔۔۔ تو آئے گا شادی کے لیے تب تک میں کچھ کر لوں گا۔"

عمر کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ یخ بستہ ٹن کو حلق میں انڈیل کر عمر نے ایک لمبی سانس لی۔"نہیں فیکے۔۔۔ اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں۔۔۔۔ شادی کے لیے شہر میں کم ہیں لڑکیاں۔۔۔۔"

وہ باہر نکلا اور پیٹرول پمپ پر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

❖❖❖

انعام خور

نجمہ مودی

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے... اور انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی... وقت کے دھیان میں رہنے والے اپنے کام کا آغاز کہاں سے کرنا ہے... مکمل ادراک رکھتے ہیں... ایک ایسے پیشہ ور شخص کی ریشہ دوانیاں جس نے اپنی دلیل... حجّت اور موزوں وقت سے بھرپور استفادہ اٹھایا تھا...

اقتدار اور اختیارات کے

ترازو میں الجھی انصاف

شکن کہانی کے اُتار چڑھاؤ

ملک میں نئی حکومت آنے کے بعد سے بھونچال آیا ہوا تھا۔ سابق حکومت کے وزیروں، سیاسی رہنماؤں کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے بیوروکریٹس کے خلاف بھی انسدادِ بدعنوانی کا کوئی نہ کوئی ادارہ کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزام میں مختلف کیس بنا رہا تھا اور ان میں سے بیشتر لوگوں کو دھڑا دھڑ مختلف جیلوں میں بھیجا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے، ان ساری کارروائیوں پر ملک میں ایک قسم کا کہرام بھی برپا تھا لیکن میرے لیے صورتِ حال خاصی خوش کن تھی۔

یہ مت سمجھیے گا کہ میرا تعلق برسرِاقتدار آنے والی پارٹی یا اس کی اتحادی جماعتوں سے تھا۔ میری ہمدردیاں کسی سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں تھیں اور نہ ہی میں کسی پارٹی کا مخالف تھا۔ میں خود اپنی جگہ ایک پارٹی تھا۔ میری ہمدردیاں صرف اپنی ذات کے ساتھ تھیں۔ ویسے بھی میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور سرکاری ملازم تو ہر آنے والی سرکار کا ملازم ہوتا ہے۔ ہر آنے والی سرکار یہی کہتی ہے کہ سرکاری ملازموں کو بالکل غیرسیاسی اور غیرجانبدار ہونا چاہیے۔ میں ہر آنے والی سرکار کے اس حکم کی بے چون و چرا پابندی کرتا ہوں۔ ہر آنے والی سرکار کو مستعدی سے سلیوٹ کرتا ہوں۔

میں سپرنٹنڈنٹ جیل ہوں جسے قصبوں میں اور کم تعلیم یافتہ لوگوں میں عموماً اختصار سے جیلر کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ ازراہِ احترام یا روبرو بات کرتے ہوئے ”جیلر صاحب“ بھی کہہ دیتے ہیں۔

ظاہر ہے، جب سے کرپشن کے الزامات میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تھی، میری جیل میں بھی کافی ”رونق میلہ“ لگا ہوا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کسی کی ضمانت منسوخ ہو رہی تھی، کسی کی منظور ہو رہی تھی۔ کسی کو سزا سنا کر بھیجا جا رہا تھا، کسی کو جوڈیشل ریمانڈ پر ہمارے حوالے کیا جا رہا تھا۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ حالات بڑے خوش کن تھے کیونکہ اس میں میری ”بھلائی“ کے بہت سے پہلو پوشیدہ تھے۔ چنانچہ جب بھی کسی بڑے آدمی کو جیل بھیجا جاتا تھا تو میں بہ نفسِ نفیس آگے جا کر نہایت خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کرتا تھا۔ تاہم اردگرد موجود لوگوں کو سنانے کے لیے نو وارد قیدی کو مختصر سا ایک لیکچر ضرور دیتا تھا جس کا مفہوم کچھ یوں ہوتا تھا:

”دیکھیے جناب! اگر آپ کو یہاں بھیجا گیا ہے تو اس میں ہمارا قطعی کوئی قصور نہیں۔ آپ کو عدالت نے یہاں بھیجا ہے۔ ہمیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ آپ پر جو الزام لگے ہیں، وہ سچ ہیں یا جھوٹے۔ ہم تو یہاں صرف اپنی ڈیوٹی دینے کے لیے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ”تعاون“ کریں گے تو ہمارے لیے اپنی ڈیوٹی انجام دینا آسان ہو جائے گا اور آپ کے لیے بھی یہاں وقت گزارنا مشکل نہیں ہوگا۔ آپ ہمارے لیے مشکلات کھڑی کریں گے تو ہوسکتا ہے آپ کے لیے بھی کچھ مشکلات کھڑی ہو جائیں۔ آپ بڑے لوگ ہیں۔ ہم چھوٹے موٹے سرکاری نوکر ہیں لیکن آپ کو پتا ہے، سرکاری نوکر بہرحال سرکاری نوکر ہوتا ہے۔ بڑے لوگوں کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات چھوٹا سرکاری نوکر اس کے بڑے مسائل حل کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد کرسکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے سے زندگی آسان ہو جاتی ہے، کیوں بھائیو؟“

تقریر کے اختتام پر میں اپنے اردگرد کھڑے ماتحتوں کی طرف دیکھتا۔ وہ سب زور شور سے تائید میں سر ہلاتے۔ ایک دو کانسٹیبل تو چمچہ گیری کا کچھ زیادہ ہی حق ادا کرتے ہوئے تالیاں بجا ڈالتے۔ میں اپنی تقریر میں لفظ ”تعاون“ پر بہت زور دیتا تھا۔ کرپشن کے الزام میں آنے والا تقریباً ہر نیا قیدی میرا مطلب آسانی سے سمجھ جاتا تھا۔ ظاہر ہے وہ سب بہت تیز لوگ ہوتے تھے۔ اربوں روپے اِدھر سے اُدھر کرنے والے بدھو اور کوڑھ مغز تو نہیں ہوسکتے تھے؟

اس روز جب نئے قیدی توقیر فاروقی کو میرے سامنے لایا گیا تو میں نے اپنی وہی تقریر کی جس میں اب مجھے کافی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ پوری تقریر مجھے ازبر تھی۔ کسی لفظ پر میں اٹکتا نہیں تھا۔ توقیر فاروقی نے خاصے توجہ اور انہماک سے میری تقریر سنی لیکن میرے خاموش ہونے کے بعد نہ جانے کیوں وہ چھت کی طرف دیکھ کر طنزیہ سے انداز میں مسکرا دیا۔

میرے ڈپٹی اعجاز خان نے اسے مسکراتے دیکھا تو غرانے کے سے انداز میں کہا۔ ”صاحب کی بات پر اس طرح طنزیہ انداز میں مسکرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اعجاز خان میری موجودگی میں اسی طرح ایک اچھا ماتحت ہونے کا حق ادا کرتا تھا اور کسی بڑے سے بڑے طرم خاں کو میرے سامنے اکڑفوں دکھانے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تھا تو مجھ سے پہلے خود اسے سنبھال لیتا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ میرا بہت اچھا ساتھی تھا لیکن مجھے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجھے

بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو کب کا مجھے گلے سے ہی لٹکوا چکا ہوتا۔ وہ تو میرا ''کھونٹا'' بہت مضبوط تھا اس لیے اس نے بھی ایسی کوشش نہیں کی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ جس دن بھی اسے موقع مل گیا، وہ میرا تختہ الٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرے گا اور مجھے کسی نامعلوم دانشور کا یہ قول بہت پسند تھا کہ جب تمہیں معلوم ہو کہ دشمن تمہیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس پر حملے میں پہل کر دو، پہل کرنے والا اور دشمن کو سرپرائز دینے والا عام طور پر کامیاب رہتا ہے۔

میں بھی اعجاز خان کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ وہ میرے لیے بڑا خطرہ تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ضروری تھا۔ دراصل اس کے اور میرے مزاج، کردار اور نظریات میں بڑا فرق تھا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ آج کل کرپشن اور احتساب کے نام پر جن لوگوں کو دھڑا دھڑ جیلوں میں ڈالا جا رہا تھا، ان میں سے بیشتر پر شاید الزامات درست ہوں لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو اتنے بڑے نہیں تھے، جتنا انہیں ظاہر کیا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ محض ''رگڑے'' میں آ گئے تھے۔ جب بھی کہیں بہت زیادہ اٹھا پٹخ ہوتی ہے تو بہت سے لوگ محض رگڑے میں بھی آ جاتے ہیں۔ ہمارا نظام، ہمارے اداروں کا طریقۂ کار وغیرہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔

جیل آنے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جن کے اپنے جرائم کمتر ہوتے تھے لیکن انہیں دوسروں کے لیے کام کرنے کی زیادہ سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ میں یہ سب باتیں اعجاز خان کو بتاتا تھا۔ اسے سمجھاتا تھا کہ ہمیں لوگوں پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا چاہیے، انہیں جو سزا مل رہی ہے، ان کے لیے وہی کافی ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ سختی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اعجاز خان بظاہر تو میری اس بات کی مخالفت نہیں کرتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ دل ہی دل میں وہ مجھ سے بالکل متفق نہیں تھا۔

اس کا بس چلتا تو وہ ان سب لوگوں کو پھانسی دے دیتا یا گولی مار دیتا۔ وہ زبان سے تو زیادہ اظہار نہیں کرتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے نظریات میں بہت شدت پسند تھا۔ اسے اختیار مل جاتا تو شاید وہ مجھے بھی پھانسی دینے یا گولی مارنے سے دریغ نہ کرتا۔ مجھے اس کے ساتھ بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ میں اگر بہت زیادہ تجربہ کار اور اپنی لائن کا پکا آدمی نہ ہوتا تو وہ کب کا میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔ اس کے تبادلے کے بھی دور دور تک آثار نہیں تھے اور وہ خود بھی شاید میری ہی دُم سے بندھا رہنا چاہتا تھا۔ شاید وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار بھی رہتا تھا اور اس سے چھٹکارے کی تدبیریں بھی سوچتا رہتا تھا۔

توقیر فاروقی نامی جو یہ نیا قیدی ہمارے سامنے لایا گیا تھا، اس کے بارے میں فائلوں میں لکھا تھا کہ یہ ایک بڑے نامی گرامی منسٹر صاحب کا فرنٹ مین تھا۔ اس پر اربوں روپے کی کرپشن، منی لانڈرنگ اور بینکوں وغیرہ سے قرضے لے کر واپس نہ کرنے کے الزامات تھے۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ منسٹر صاحب کے بارے میں ابھی تک صرف تحقیقات ہی جاری تھیں لیکن فرنٹ مین اندر ہو گیا تھا۔

اعجاز خان کی ڈانٹ سن کر توقیر فاروقی کے ہونٹوں سے طنزیہ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بالکل سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر طویل کش لینے کے بعد اسے مخاطب کیا۔ ''توقیر فاروقی صاحب! اس جیل میں آپ کے ابتدائی تین دن ایک طرح سے ''تعارفی'' قسم کے ہوں گے۔ اس دوران ضابطے کی کچھ کارروائیاں پوری کی جائیں گی۔ آپ کا تفصیلی طبی معائنہ ہو گا۔ نفسیات کا ایک ڈاکٹر بھی آپ کا معائنہ کرے گا۔ وہ آپ کے رجحانات کے بارے میں بھی آپ کا ایک ٹیسٹ لے گا۔ آپ جیسے مجرموں کے سلسلے میں ہمیں حکومت کی جانب سے کافی انتظامات اور اہتمام کرنے کی ہدایات ملی ہیں۔''

توقیر فاروقی ایک بھاری بھرکم، ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی جسمانی ساخت بتا رہی تھی کہ اس کے جسم پر کافی فالتو چربی موجود تھی۔ فی الحال وہ ایک مہنگے اور نفیس قسم کے شلوار سوٹ میں تھا جو اس کے جسم پر بالکل نہیں جچ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی محنت مشقت کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ کیونکر منسٹر صاحب کا فرنٹ مین بنا ہو گا، کس طرح اس نے اتنا مال بنانے، اتنی بڑی بڑی رقوم ادھر سے ادھر کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ منی لانڈرنگ کے طریقے سیکھے ہوں گے؟ چند سال پہلے وہ ایک چھوٹے سے بینک میں محض ایک کلرک تھا۔

میں نے میز پر کہنیاں ٹکا کر ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''فاروقی صاحب! کیا آپ کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟''

فاروقی ایک بار پھر مسکرایا لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ طنزیہ ہرگز نہیں تھی، وہ بس محض مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ نرم اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے آپ سے کوئی بات

کرنی بھی ہوگی تو وہ میں آپ سے، اکیلے میں کرنا پسند کروں گا، یہ کہتے ہوئے اس نے اردگرد کھڑے لوگوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

میں نے جواب دینے سے پہلے اعجاز خان کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ میرا جواب سننے کا، فاروقی سے بھی کہیں زیادہ بے تابی سے منتظر تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہو یا پوچھنا ہو، یہیں سب کے سامنے کہو یا پوچھو۔''

اس بار فاروقی عجیب سے انداز میں مسکرایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں پھر بھی بات کرلوں گا۔ مجھے ابھی کافی عرصہ یہاں رہنا ہے۔ پانچ سال کی سزا ہوئی ہے۔''

جیل کا عملہ میرا اشارہ پا کر فاروقی کو میرے آفس سے لے گیا۔ بھی لوگ رخصت ہو گئے۔ صرف اعجاز خان میرے کمرے میں رہ گیا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک دو بار تو وہ مٹھیاں بھینچے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ مجھے معلوم تھا، اس وقت اس کے اندر کیا ابال اٹھ رہا ہے۔

آخر کار وہ اپنے اس ابال پر قابو نہ رکھ سکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھا۔ ''اس کمینے کو صرف پانچ سال کی سزا ہوئی ہے...... مجھے یقین ہے کہ یہ ڈیڑھ دو سال میں ہی رہا ہو جائے گا۔ ملک و قوم کے اتنے بڑے مجرموں کے لیے یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس کی آنکھیں غصے سے سُلگ رہی تھیں۔ میں اس کے نظریات اور محسوسات سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر اعجاز خان اس عدالت کا جج ہوتا جس میں توقیر فاروقی کا مقدمہ چلا تھا، تو بے چارے فاروقی کا انجام نہ جانے کیا ہوتا۔ اعجاز خان نے اسے پھانسی سے کم سزا تو ہرگز نہیں دینی تھی۔ اگر وہ قانونی حدود کی وجہ سے مجبور ہوتا تب بھی کم از کم عمر قید کی سزا سنانے کی کوشش تو ضرور کرتا۔

میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر سگریٹ کا ایک کش لینے کے بعد بزرگانہ انداز میں کہا۔ ''اتنا غصہ نہ کیا کرو اعجاز میاں! اس بے چارے نے کرپشن اور منی لانڈرنگ ہی تو کی ہے۔ قتل و غارت، دہشت گردی یا کہیں خودکش حملہ تو نہیں کرایا۔ ہمارے ہاں ویسے ہی ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنی عمر کے پہلے دن سے ہی ہزاروں روپے کا قرض دار ہوتا ہے۔ توقیر فاروقی پر جتنی رقم کی کرپشن یا منی لانڈرنگ کا الزام ہے، اگر تم اس رقم کو بھی ملک کی ساری آبادی پر تقسیم کردو تو ایک فرد کا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس روپے کا نقصان ہوا ہوگا۔ جہاں بے چاری ہماری قوم نے اتنے بڑے بڑے بوجھ برداشت کیے ہیں...... اور اب تک کیے جارہی ہے، وہاں یہ معمولی سا بوجھ بھی برداشت کرلے گی۔''

اعجاز خان میری طرف دیکھ کر بظاہر خوش دلی سے مسکرایا اور بولا۔ ''آپ تو ہر چیز کو ایک الگ ہی اینگل سے دیکھتے ہیں۔ گستاخی معاف سر......! توقیر فاروقی اس طرح کا کوئی اکیلا آدمی تو نہیں...... اس جیسے ہزاروں...... بلکہ شاید لاکھوں ہیں۔ آپ جس بوجھ کا ذکر کررہے ہیں، میرا خیال ہے وہ اتنا کم نہیں ہوگا سر! اس جیسے سب لوگوں نے مجموعی طور پر قوم پر پچھلے تیس چالیس سالوں میں جتنا بوجھ ڈالا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی خون پسینے کی کمائی سے سیکڑوں اقسام کے ٹیکسوں کی صورت میں کھسوٹا ہوا پیسا جس طرح اپنے للّلے تللّے پر اور احمقانہ منصوبوں پر ضائع کیا ہے، میرا خیال ہے، اس کے نتیجے میں قوم کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔''

''خیر...... ایسی بدفالیں منہ سے نہ نکالو اعجاز میاں!'' میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''ہماری قوم کی کمر ماشاء اللہ بڑی مضبوط ہے۔ بڑے بڑے جھٹکے سہتی آرہی ہے۔ آئندہ بھی سہتی رہے گی۔''

اعجاز خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے غالباً اپنی اندرونی ناگواری کو چھپانے کی کوشش کی پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''فاروقی کو رکھنا کس طرح ہے؟ عدالت نے اس کے بارے میں خاص طور پر کوئی حکم نہیں دیا کہ اسے کون سی کلاس دینی ہے۔ اس کا مطلب ہے، اسے عام قیدی ہی سمجھنا ہے۔ اب آپ بتائیں اسے آرام سے رکھنا ہے یا غریب قیدیوں کی طرح فرش پر سُلانا ہے اور مشقت کرانی ہے؟ اس کی ڈیوٹی دھوبی گھاٹ پر لگا دوں؟''

قید با مشقت کاٹنے والوں کے لیے دھوبی گھاٹ کی ڈیوٹی بہت سخت ذمے داریوں میں سے ایک تھی۔ ایک قیدی کو سیکڑوں قیدیوں کے جیل کے کپڑے پرانے طرز کے دھوبی گھاٹ پر، پیشہ ور دھوبیوں کے انداز میں، پتھر کی سِلوں پر پٹخ پٹخ کر دھونے ہوتے تھے۔ بعض اوقات تو میٹھا پانی بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ کھارے پانی سے کپڑے دھونے پڑتے تھے جس سے مشقت ڈبل ہو جاتی تھی۔

میں نے اپنے سامنے میز پر رکھے فاروقی کے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور بدستور پہلے ہی جیسے نرم اور

دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''اس کے ساتھ قاتلوں اور ڈاکوؤں والا سلوک نہ کرنا۔ اس کا جرم بہرحال وہائٹ کالر کرائم ہے۔ اس پر ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھنا۔''

''وہائٹ کالر کرائم کی تباہیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں سر۔'' اعجاز خان کے لہجے میں وہی پرانا غصہ بول رہا تھا۔ ''فاروقی جس چکر میں پکڑا گیا ہے، اس میں یہ اکیلا تو نہیں ہو گا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے گرگے ہوں گے اور ان کے سرپرست اعلیٰ منسٹر صاحب ہوں گے جو ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے توقیر، منسٹر صاحب کو بچا رہا ہے، ان کی پردہ پوشی کر رہا ہے، خود قربانی کا بکرا بن رہا ہے۔''

''اور خوشی سے بن رہا ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''ظاہر ہے، جیل سے باہر اس کی فیملی وغیرہ کی مکمل ذمے داری لی جا چکی ہو گی۔ عین ممکن ہے، ان سب کو بیرونِ ملک بھجوانے کے انتظامات کیے جا چکے ہوں اس لیے وہ نہایت اطمینان اور خوشی سے جیل میں اپنی سزا کاٹے گا۔'' اعجاز خان نے منہ بنا کر کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بدستور فاروقی پر خار کھا رہا تھا، دل ہی دل میں جل بھن رہا تھا۔ میں نے اپنی سنجیدگی اور متانت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے ذرا بھی شبہ ہو کہ میں دل ہی دل میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور اپنا لہجہ ذرا تشویش زدہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اعجاز! کہیں تمہیں یہ خیال تو نہیں آ رہا کہ منسٹر صاحب نے مجھ سے بھی رابطہ کیا ہو گا اور جیل میں توقیر فاروقی کا خیال رکھنے کا کہا ہو گا؟ مجھے اب وہ حکم تو نہیں دے سکتے لیکن شاید انہوں نے اب گزارش کی ہو گی کہ جیل میں فاروقی کو گھر جیسا آرام فراہم کیا جائے؟ کہیں تم ایسا تو نہیں سوچ رہے؟''

''نہیں سر! میں بھلا ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں؟'' اعجاز خان نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور لہجہ اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا پھر وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے میں اب ذرا اپنا کام شام دیکھ لوں۔ اس کمینے توقیر فاروقی کے چکر میں کافی ٹائم ضائع ہو گیا۔''

میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے احساس ہوا کہ شاید تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال آیا ہو۔ اگر تم ایسا سوچ بھی رہے ہو تو میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھوں گا۔ میں جس عہدے پر ہوں، تمہیں پتا ہی ہے، اس قسم کے عہدوں پر ہمارے ہاں سیاسی اثر رسوخ ضرور ہوتا ہے۔ یہ اثر رسوخ شاید کبھی ختم نہ ہو سکے۔ یہ سیاست داں جب وزارتوں اور اقتدار سے ہٹ جاتے ہیں، زیرِ عتاب آ جاتے ہیں، ہمیں تو اس وقت بھی ان کا کچھ نہ کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیا پتا کل کو حالات پھر پلٹا کھا جائیں۔ ہم جیسے لوگوں کو اپنی سیف سائیڈ تو رکھنی پڑتی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ منسٹر صاحب کی طرف سے ابھی تک مجھے کوئی ایسی ہدایت یا درخواست نہیں ملی۔ اب تمہاری مرضی ہے، یقین کرنا چاہو تو کر لو، نہ کرنا چاہو تو نہ کرو۔''

''مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ وہ یقین کی بات کر رہا تھا لیکن اس کا لہجہ یقین سے عاری تھا۔

''اگر مجھے منسٹر صاحب کا فون آیا ہوتا، تب بھی ضروری نہیں تھا کہ میں ان کی ہدایت یا درخواست پر عمل کرتا۔ میری نوکری کا دارومدار منسٹر صاحب پر نہیں ہے۔ ان منسٹر صاحب سے کچھ بڑے منسٹر صاحبان بھی میرے دوست ہیں، مہربان ہیں۔ میری نوکری پکی ہے۔ میں توقیر فاروقی سے مرعوب نہیں ہوں۔ تمہیں میری وجہ سے اس کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی جیل کا نظام تو اصل میں تم ہی چلاتے ہو۔ اس لیے تم اپنے انداز اور اپنے

خواہش

سردار جی نے بجلی کمپنی کو فون کیا۔ ''یارا! شہر کی بجلی بند کر دو!''

''وہ کیوں؟'' حیرت سے پوچھا گیا۔

''ابھی دماغ میں ایک نئی گالی آئی ہے...... وہ تم کو دینی ہے۔''

سزا

سردار جی کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ جج نے پوچھا۔ ''تمہاری کوئی آخری خواہش؟''

سردار جی بولے۔ ''ساڈی جگہ تسی لٹک جاؤ۔''

پشاور سے راجندر سنگھ کی خوشی

اصولوں کے مطابق اپنا کام کرتے رہو۔ تم اگر چاہو گے تو توقیر فاروقی اس جیل میں ایک عام قیدی کی طرح ہی رہے گا۔"

"بہت شکریہ سر!" اس نے قدرے بے یقینی سے کہا اور دروازہ کھول کر نکل گیا۔

☆☆☆

توقیر فاروقی کے جیل آنے کے تین دن بعد مجھے اس کے طبی معائنے کی تمام رپورٹیں مل گئیں۔ مجھے ان رپورٹوں کا اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ اب میں کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح انہیں پڑھ سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ میں ایک گھنٹے تک ان کے مطالعے میں مصروف رہا پھر میں نے ان میں سے ایک کاغذ الگ کر لیا۔ اسے اپنی مٹھی میں مُڑ تُڑ کر کے، اس کا چھوٹا سا گولا بنا کر میں نے اسے ایش ٹرے میں ڈالا اور لائٹر سے شعلہ دکھا دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ راکھ کی چھوٹی سی ڈھیری میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے توقیر فاروقی کو بُلا بھیجا۔

ایک سپاہی اسے لے کر آیا اور وہ مؤدبانہ انداز میں میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپاہی جا چکا تو توقیر کرسی پر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے میرے میڈیکل ٹیسٹوں کی رپورٹیں آ گئی ہوں گی۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنے سارے ٹیسٹ نہیں کرائے۔ میں تو ڈاکٹروں سے دور بھاگتا ہوں۔ مجھے ان کے پاس جاتے ہوئے خوف آتا ہے۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "توقیر فاروقی! کھڑے ہو جاؤ۔ کیا میں نے تم سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا؟"

اس کے چہرے پر خجالت کی ہلکی سی سرخی آ گئی۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ "میں کوئی عام قیدی نہیں ہوں ایس پی صاحب!"

"میرے خیال میں تو تمہارے اور دوسرے قیدیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تم نے اچھا کیا جو خود ہی کرسی سے اٹھ گئے۔ ورنہ میں ابھی باہر سے سنتری کو بلاتا۔ وہ تمہیں کسی اور ہی طریقے سے کرسی سے اٹھاتا۔"

اس کا منہ لٹک گیا۔ اسے یقیناً میری جانب سے اس قسم کے سلوک کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں نے اس کا ریکارڈ میز سے اٹھایا اور خواہ مخواہ ان کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگا پھر میں نے فاروقی کی طرف دیکھا اور اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ڈیوٹی لانڈری میں لگا رہا ہوں۔ لانڈری خاصا معززانہ سا لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ہماری جیل میں قیدیوں کے کپڑے دھونے کے لیے چھوٹا سا ایک دھوبی گھاٹ موجود ہے جہاں تمہیں روزانہ سیکڑوں قیدیوں کے کپڑے باقاعدہ دھوبیوں کی طرح پتھر کی سِل پر پٹخ پٹخ کر دھونے پڑیں گے...... لیکن میرا خیال ہے، تمہارے حق میں یہ بہتر ہوگا۔ مجھے تمہارے جسم پر خاصی فالتو چربی نظر آ رہی ہے، یہ ختم ہو جائے گی۔"

توقیر فاروقی کا چہرہ کچھ زرد سا ہو گیا اور اس پر الجھن کے آثار بھی نظر آنے لگے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ منسٹر صاحب نے تو کہا تھا، وہ سب معاملات کو دیکھ لیں گے...... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ کون سے منسٹر صاحب نے تم سے کیا کہا تھا۔" میں نے انتہائی رکھائی اور رعب سے کہا۔ "ویسے بھی مجھ پر سابق منسٹرز کے احکام نہیں چلتے۔ کیا منسٹر صاحب نے تمہیں تسلی دی تھی کہ یہاں تمہیں گھر جیسا آرام ملے گا؟ ہر آسائش، ہر سہولت میسر ہو گی؟ بلکہ شاید کبھی کبھار رات کو چند گھنٹوں کے لیے گھر جانے کی اجازت بھی مل جایا کرے؟ ان بے چارے وزیروں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ وہ نہ صرف اپنی طاقت اور اختیارات سے محروم ہو چکے ہیں بلکہ ان کے اپنے گرد بھی خاموشی سے، آہستہ آہستہ شکنجہ تنگ ہو رہا ہے۔"

"منسٹر صاحب مجھے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔" فاروقی ذرا غصے سے بولا۔ "ابھی تو میرے سینے میں بہت سے راز دفن ہیں۔ میں نے پوری طرح زبان کھولی ہی نہیں۔"

"رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسے شاید یاد نہیں رہا تھا کہ اس وقت وہ میرے سامنے قیدیوں والے مخصوص لباس میں کھڑا تھا۔ میرے ڈپٹی، اعجاز خان نے فاروقی کے بارے میں میری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد جیل مینول پر عمل کرانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں ذرا نرمی لاتے ہوئے کہا۔ "منسٹر صاحب کا اثر رسوخ اب اس جیل کی چار دیواری کے اندر کمالات نہیں دکھا سکتا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے، 'اپنے ہاں بس کرسی کو سلام ہوتا ہے'...... لیکن خیر...... اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمہیں لازمی طور پر ہی یہاں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔"

میں نے ذرا توقف کیا کہ وہ میرے دیے ہوئے اشارے کا مطلب سمجھے۔ وہ آنکھیں سکیڑے گویا اب ایک نئے زاویئے نظر سے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن منتظر تھا کہ میں مزید کچھ کہوں۔

میں نے سگریٹ کا کش لے کر اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے اور اسی پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے سخت آدمی بھی نرم ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے تعاون کر کے ہی سب کے کام چلتے ہیں۔''

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا پھر ایک گہری سانس لے کر ہنس دیا اور بولا۔ ''ایس پی صاحب! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھا کہ میں کسی بہت ہی دیانت دار، بااصول اور سخت افسر کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔''

'یہ میری حکمتِ عملی کا حصہ ہے احمق آدمی! تم میری حکمتِ عملی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''تم نے اربوں روپے ادھر سے ادھر کیے ہیں توقیر فاروقی!'' میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب وہ مطمئن نظر آنے لگا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ان میں سے بہت سارے خرچ بھی ہو چکے ہیں۔ ایسی دولت کا وہی معاملہ ہوتا ہے...... ایزی کم...... ایزی گو......'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''لیکن مجھے یقین ہے اب بھی بہت کچھ کونے کھدروں میں پڑا ہوگا۔ راستے میں بھی بہت کچھ لٹایا ہوگا۔ ہم جیسے غریبوں کا بھی کچھ بھلا ہونا چاہیے۔'' میں نے میز پر طبلہ بجانے کے انداز میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید دل ہی دل میں کچھ حساب کتاب لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک شاطر آدمی ہے لیکن شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا پالا کس سے پڑا ہے۔

''میں ایک کروڑ کا بندوبست کر سکتا ہوں۔'' آخر وہ بولا۔

''میں چار کروڑ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' میں نے بلا جھجک کہا۔ ''میں اس جیل میں سب سے بڑی اتھارٹی ہوں اور تمہاری حیثیت اس وقت چوہے دان میں پھنسے چوہے جیسی ہے۔ تمہیں شاید اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔''

اس کے چہرے پر خوف کا سایہ سا آیا اور گزر گیا۔

اس نے تھوک نگلا، بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک لمحے خاموش رہا پھر اس نے رقم کچھ بڑھائی۔ مزید چند لمحوں کی مختصر سی گفتگو کے بعد آخر کار ڈھائی کروڑ میں سودا طے پا گیا۔ میرے خیال میں سودا بُرا نہیں تھا۔

''رقم کا بندوبست کرنے کے لیے مجھے ایک خط جیل سے باہر بھجوانا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کے لیے کاغذ، قلم اور لفافے کا بندوبست کر کے رکھا تھا۔ اب میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے دی اور پوچھا۔ ''جلد از جلد رقم کا بندوبست کب ہو سکتا ہے؟''

''پرسوں تک۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ پرسوں جمعرات ہے۔ تم جسے خط لکھ رہے ہو، اسے لکھنا کہ رقم بڑے نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں ہو۔ اسے پلاسٹک کے ایک شاپر میں پیک کر کے، دوسرے شاپر میں ڈال کر اوپر سے کچھ کچرا ڈال دیا جائے۔'' پھر میں نے اسے ایک مشہور شاپنگ مال کا نام بتایا اور کہا۔ ''اس کے بالکل پیچھے چھوٹی گلی میں، لوہے کا ایک بڑا سا کوڑے دان رکھا ہے جس پر پیلا پینٹ ہے۔ پرسوں

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر

DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI

میں خرید و فروخت کے لیے مستند نام

ریاض حسین

ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

رات ٹھیک نو بجے وہ شاپر کچرے کے شاپر کی طرح اس کوڑے دان میں پھینک دیا جائے۔ پھینکنے والا ایک لمحے بھی وہاں نہ رکے۔ سمجھ گئے؟''

''سمجھ گیا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خط لکھنے لگا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے سب کچھ پہلے سے سوچا ہوا تھا۔ تم ایک لمحے کے لیے بھی کسی بات میں ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئے۔''

''میں اپنا ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور آگے جھک کر دیکھنے لگا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اس دوران میں نے اسے مزید ہدایات دیں۔ ''کوئی نام لکھنے کی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ رقم تمہیں کس لیے چاہیے۔''

اس نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا اور چند منٹ میں خط تیار کر لیا۔ میں نے اسے لفافہ دیا۔ اس نے خط لفافے میں بند کر کے ایڈریس لکھا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے خط جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آج ہی تمہارے آدمی کو پہنچ جائے گا۔''

پھر میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''فی الحال میں تمہاری ڈیوٹی قیدیوں کا حاضری رجسٹر تیار کرنے پر لگا رہا ہوں لیکن اگر جمعرات کی رات تک رقم نہ ملی تو یہاں تمہاری زندگی کا ایک بھیانک دور شروع ہو جائے گا۔''

☆☆☆

رقم مجھ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جمعے کی صبح میں نے اسے اپنے ایک بینک لاکر میں رکھا اور اپنی ڈیوٹی پر جیل پہنچ گیا۔ جیل کے دفاتر کی، سامنے والی راہداری میں ہی میرا سامنا اعجاز خان سے ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اندر ہی اندر وہ غصے سے کھول رہا تھا لیکن میرے سامنے اپنے اس غصے پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے میرے دفتر میں آ گیا۔

اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا اور فوراً ہی اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ ''توقیر فاروقی کو قید بامشقت کی سزا ہوئی ہے اور آپ نے اسے قیدیوں کا حاضری رجسٹر تیار کرنے پر لگا دیا؟''

میں نے سگریٹ کا نیا پیکٹ کھولتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا۔ ''اب اس بات پر تم احتجاجاً نوکری سے استعفا نہ دے دینا۔ یہ بہت بڑی بے وقوفی ہو گی۔ بیس سال لگے ہیں ہمیں یہاں تک پہنچنے میں۔ اب اپنے آپ کو صرف اپنے نظریات سے مخلص ثابت کرنے کے لیے چند منٹ میں یہ عہدہ ہاتھ سے نہ گنوا دینا۔ کبھی نہ کبھی اس پر بہت پچھتاؤ گے۔ میرے خیال میں فاروقی کو کسی ہلکے کام پر لگانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اس سے مشقت کروا کے معاشرے سے ساری برائیاں ختم نہیں ہو جائیں گی اور معاشرہ راتوں رات پاک صاف نہیں ہو جائے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں اپنی سی کوشش تو کرنی چاہیے۔'' وہ اب بھی اپنے اندر اُبلتے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''آپ تو اسے اس طرح یہاں رکھ رہے ہیں جیسے وہ ''پے انگ گیسٹ'' ہو۔''

اس نے لفظ ''پے انگ'' پر زیادہ زور دیا تھا۔ میں نے اس کے لہجے میں چھپے ہوئے زہر کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''فرض کرو میری کرسی پر تم ہوتے تو کیا کرتے؟''

میں نے اس سے یہ سوال تو کر لیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کرسی تک، اس عہدے تک کبھی نہیں پہنچے گا۔ وہ ڈی ایس پی بن گیا تھا، یہی بڑی بات تھی۔ اس جیسے لوگ تو ساری دنیا سے لڑتے جھگڑتے، سرکاری دفتروں کی راہداریوں میں ہی کہیں گم ہو جاتے تھے۔

''میں آپ کی کرسی پر ہوتا تو اسے نانی یاد دلا دیتا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''اور اگر میں جج ہوتا تو اسے موت کی سزا سناتا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ترحم آمیز انداز میں سر ہلایا اور دانشورانہ لہجے میں کہا۔ ''میرے دوست! معاشرے کو سدھارنے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ آپ تلوار لے کر نکل پڑیں اور دھڑا دھڑ لوگوں کے سر قلم کرنا شروع کر دیں۔ ستر سال کے بگاڑ کو درست کرنے کے لیے ہمیں ڈیڑھ دو سو سال کی ضرورت ہو گی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آج سے پوری قوم مل کر تحمل اور سمجھ داری سے اپنے آپ کو ٹھیک کرنا، اپنی خرابیوں کو دور کرنا شروع کرے اور مسلسل کرتی ہی چلی جائے۔ تب کہیں جا کر، دو تین نسلوں کے بعد اپنے خوابوں کی تعبیریں ملتی ہیں۔ تم جیسے لوگوں کو تو اگر اپنے نظریات پر عمل کرنے کا موقع دے دیا جائے تو وہ معاشرے کو سدھارنے کے بجائے اس کا اور بھی بیڑا غرق کر دیں گے۔ بگڑے ہوئے معاشروں میں سدھار لانا بڑا دیر طلب، تحمل طلب اور دانش طلب کام ہے۔ ہم لوگوں میں نہ تو صبر و تحمل ہے اور نہ ہی دانش...... ہم اگر کوشش کرتے بھی ہیں تو اس طرح جیسے کوئی مشرق کی سمت بہتے ہوئے دریا کو یک دم مغرب کی طرف بہانے کی کوششیں شروع کر

دے۔"

اعجاز خان کا چہرہ بظاہر سپاٹ تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے لیکچر سے سخت بور ہو رہا ہے۔ میں نے سرِدست اتنا ہی ڈوز کافی سمجھا اور لہجہ بدلتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ "چلو...... اگر تم بہتر سمجھتے ہو تو فاروقی کی ڈیوٹی لانڈری پر لگا دو لیکن یہ کام تحریری حکم کے ذریعے کرنا۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔ ہمیں ضابطے کی کارروائیاں پوری رکھنی چاہئیں۔ ویسے بھی کس قیدی کو کہاں رکھنا ہے، یہ فیصلہ کرنا تو اصل میں تمہاری ہی ذمے داری ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔" وہ اپنے چہرے پر جھلک آنے والی خوشی کو چھپا نہ پایا۔ شاید اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ وہ فاروقی سے جیسا سلوک کرنا چاہتا ہے، ویسا بھی کر پائے گا۔ اب شاید اسے میری غیر جانب داری پر یقین آ گیا تھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ پلٹ کر بولا۔ "آپ میری باتوں کا بُرا نہ منایئے گا سر! میں کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا ہوں۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "تم کبھی کبھی نہیں، ہمیشہ ہی جذباتی رہتے ہو۔"

تاہم زبان سے میں نے رسمی انداز میں کہا۔ "ارے چھوڑو...... کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھار تو ہم سبھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ البتہ سب کے جذبات کا رخ مختلف ہوتا ہے۔"

وہ طمانیت سے سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ میں قیدیوں کی بیرکس کا معائنہ کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت بیشتر قیدی اپنی اپنی مشقت یا دیگر کاموں کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ڈیڑھ دو گھنٹے کی وقت گزاری کے بعد اپنے دفتر میں واپس آ گیا۔

ابھی مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اعجاز خان اندر آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ رنگت اڑی اڑی سی تھی۔ میں اس وقت اپنے سامنے ایک فائل کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بند کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اعجاز خان کی طرف دیکھا۔

"سر! عجیب ہی واقعہ ہو گیا۔" اعجاز خان پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "وہ اوندھے منہ گرا اور پھر نہیں اٹھا......!"

"کون اوندھے منہ گرا اور پھر نہیں اٹھا؟" میں نے اعجاز خان کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ...... توقیر فاروقی...... سر!" اعجاز خان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "وہ مر چکا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ دل کا مریض تھا۔"

"کیا تم نے اس کے میڈیکل ٹیسٹوں کی رپورٹیں دیکھے بغیر اس کی ڈیوٹی لانڈری پر لگا دی تھی؟" میں نے اپنے لہجے میں بے یقینی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے اس کی فائل دیکھی تھی...... میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" اس کے لہجے میں ذرا بھی خود اعتمادی نہیں تھی۔

میں نے گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا۔

"ریکارڈ روم سے نئے قیدی توقیر فاروقی کی میڈیکل فائل لاؤ۔" میں نے اردلی کو حکم دیا۔

چند منٹ میں فائل آ گئی۔ میں توقیر کے ٹیسٹوں کی رپورٹیں دیکھنے لگا۔ اس وقت تک ایک انسپکٹر اور دو اے ایس آئی بھی میری میز کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر مجھے بتانے لگا۔ "دھوبی گھاٹ میں کپڑے دھونا توقیر کے بس کی بات نہیں تھی سر! وہ تو تھوڑی دیر میں ہی بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس کا منہ لال ہو گیا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں تر تھا۔ اس نے کئی بار ہاتھ جوڑ کر سرکی منت کی کہ اس کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی جائے۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر نے اعجاز خان کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر کا نام رفیق تھا اور اس نے اعجاز خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ رپورٹ یا ایک قسم کی گواہی دینے کی جرأت اسی لیے کی تھی کہ میں نے اس کی ڈیوٹی دھوبی گھاٹ پر لگائی تھی اور اسے حکم دیا تھا کہ توقیر فاروقی پر جو بھی گزرے، وہ اس کی پوری روداد مجھے بلاکم و کاست سنائے۔ میری پشت پناہی حاصل ہونے کی وجہ سے انسپکٹر

حجامت

"بھائی میرے بال اور چھوٹے کرو۔" گاہک نے حجام سے کہا۔

"اور کتنے چھوٹے کردوں...... کنگھا بھی نہیں کر سکو گے!" حجام نے قینچی بجاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

"بس اتنے چھوٹے کر دو کہ میری بیوی کے ہاتھ میں نہ آ ئیں۔"

کراچی سے امتیاز احمد کا حکم نامہ

رفیق نے بے خوفی سے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مگر سر! اعجاز اسے للکارتے رہے کہ تمہارے جرائم کے مقابلے میں تو یہ سزا کچھ بھی نہیں...... تمہیں تو سرعام پھانسی ہونی چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ آخرکار توقیر فاروقی پتھر کی سل پر بیچ بیچ کر کپڑے دھوتے دھوتے خود بھی انہی کپڑوں پر اوندھے منہ گر پڑا اور پھر نہیں اٹھا۔“

میں نے گہری سانس لے کر تاسف زدہ سی نظروں سے اعجاز خان کی طرف دیکھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”سر! اس سے کہیں زیادہ سختی تو ہم دوسرے سیکڑوں قیدیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ دل کا مریض ہوگا اور یوں اچانک ہی مر جائے گا۔“

”اس کے میڈیکل کی فائل تو تمہارے پاس ہی گئی تھی۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھی تھی؟“ میں نے اپنے سامنے میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھی تو تھی سر......!“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن شاید زیادہ توجہ سے نہیں دیکھی تھی۔ قیدیوں کے ٹیسٹوں کی رپورٹس ہم زیادہ دھیان سے کہاں دیکھتے ہیں...... اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں رپورٹس کچھ اتنی زیادہ سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ کسی قیدی کے بارے میں اگر ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں تو جیل اسپتال کے ڈاکٹر کو فون کر کے معلوم کر لیتے ہیں۔“

میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا پھر توقیر فاروقی کی میڈیکل فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے دھیرے دھیرے اس کی رپورٹوں کے ورق پلٹنے شروع کیے۔ پھر ایک جگہ میں رک گیا اور اس کونے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے کاغذات کو اسٹیپل کیا گیا تھا۔ وہاں ایک کاغذ کا چھوٹا سا، آڑا ترچھا ٹکڑا پھنسا ہوا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں سے کوئی کاغذ پھاڑ کر الگ کیا گیا تھا۔

میں نے شک زدہ نظروں سے اعجاز خان کی طرف دیکھا اور گویا دل ہی دل میں معاملے کو سمجھتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا۔ ”یہاں سے کوئی رپورٹ نکالی گئی ہے۔ شاید اسی میں بتایا گیا تھا کہ توقیر فاروقی کے دل کی کنڈیشن کیا ہے...... میرا مطلب ہے، کیا تھی۔“

اعجاز خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بے یقینی سے بولا۔ ”سر! کیا آپ ایسا سوچ سکتے ہیں کہ میں نے وہ رپورٹ غائب کی ہوگی؟“

”نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم کافی عرصے سے میرے ساتھ ہو۔ جہاں تک میں تمہیں جان پایا ہوں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

اعجاز خان کے چہرے پر ذرا طمانیت جھلک آئی۔ وہ تناؤ زدہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مجھے وہ شخص زہر لگ رہا تھا۔ اس جیسے بھی لوگ مجھے زہر لگتے ہیں لیکن میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں، میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دوں یا کوئی ایسا طریقہ اختیار کروں کہ وہ مر جائے۔ ہو سکتا ہے، ان کاغذات کے ادھر سے اُدھر آنے جانے کے دوران، یا پھر ریکارڈ روم میں کسی نے رپورٹ کا وہ ورق غائب کیا ہو۔“

”کیا تمہارے خیال میں رپورٹ کی گمشدگی کے سلسلے میں انکوائری ہونی چاہیے؟ کیا اس سارے معاملے کی تحقیقات ہونی چاہیے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں نہیں......“ وہ غالباً سوچے سمجھے بغیر بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے اعجاز......!“ میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں معلوم ہے، توقیر فاروقی کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ جب اس معاملے کی تفتیش شروع ہوگی تو یہ بہت اہم تفتیش ہوگی۔ میڈیا ہم پر یلغار کر دے گا۔ ان لوگوں کے لیے یہ پتا چلانا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا کہ یہاں توقیر فاروقی جیسے لوگوں سے کون سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا۔ انہیں قربانی کے ایک بکرے کی تلاش ہوگی اور وہ انہیں آسانی سے مل جائے گا۔ ہمارا محکمہ اور وزیر جیل خانہ جات بھی یہی چاہیں گے کہ جلد از جلد اس معاملے سے جان چھڑائی جائے اور ہمارے جیسے محکموں والوں کی جان جلدی تبھی چھوٹتی ہے جب قربانی کا کوئی بکرا ہاتھ آ جاتا ہے۔“

وہ تشویش زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے اور بظاہر سوچ بچار کرتے ہوئے کہا۔ ”میری اور تمہاری بھلائی...... بلکہ ہماری جیل کے پورے عملے کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس معاملے کو اسی چار دیواری کے اندر ختم کر دیں۔“

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ بات یقیناً اس کے دل کو لگ رہی تھی لیکن کچھ واہمے شاید اب بھی اسے ستا رہے تھے۔ وہ تذبذب آمیز لہجے میں بولا۔ ”جس ڈاکٹر نے اس کی ٹیسٹ

رپورٹ لکھی ہوگی، اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم نے اس کی ڈیوٹی لانڈری میں لگائی تھی تو وہ معاملہ خراب کر سکتا ہے۔‘‘

’’ارے...... ان ڈاکٹروں کو ان معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت کہاں ہوتی ہے...... اور پھر اسے کون جا کر بتائے گا کہ توقیر فاروقی کی ڈیوٹی لانڈری میں لگائی گئی تھی۔ یہ ہم چٹی بند بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔‘‘ میں نے کمرے میں موجود باوردی افراد کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا دیے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’اس چار دیواری کے اندر کی دنیا ایک الگ ہی دنیا ہے۔ باہر کی دنیا والوں کو ذرا کم ہی پتا ہوتا ہے کہ یہاں دن رات کیا ہو رہا ہے...... اور انہیں اس سے کچھ زیادہ غرض بھی نہیں ہے جہاں تک اس ڈاکٹر کی بات ہے، وہ تمہارا بھی اچھا دوست ہے اور میرا بھی...... فرض کرو، اگر اسے یہ لانڈری والی بات معلوم ہو بھی جائے، تو اسے یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ انسانوں سے غلطیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر سرکاری محکموں میں......‘‘

میں نے اس کے قریب جا کر اس کا کندھا دوستانہ انداز میں تھپتھپایا۔ اگر اس کے ذہن میں کچھ اندیشے باقی بھی تھے تو وہ دم توڑ گئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

رات کو میری ڈیوٹی ختم ہوئی تو میں سرکاری گاڑی چھوڑ کر اپنی پرائیویٹ کار میں بیٹھ کر اس پوش علاقے میں پہنچا جہاں منسٹر صاحب اور ان کے خاندان کی کئی کوٹھیاں قریب قریب ہی تھیں۔ منسٹر صاحب کافی دنوں سے اپنی ذاتی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ان کے سیکیورٹی والوں نے میری آمد کی اطلاع فوراً ہی اندر دے دی۔ منسٹر صاحب نے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں میرا استقبال کیا۔ چائے اور لوازمات آچکے تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے لیے چائے تیار کی۔ اس وقت تک میں توقیر فاروقی کا تمام قصہ...... بلکہ قصہ پاک ہونے کا قصہ انہیں سنا چکا تھا۔

’’آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے آپ کے لیے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے سر!‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’توقیر فاروقی آپ کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح تھا۔ ابھی اسے صرف ایک مقدمے میں سزا ہوئی تھی لیکن اس پر کئی مقدمے ہیں۔ احتسابی اور تحقیقاتی اداروں نے اس سے پوچھ گچھ کے لیے جیل میں بھی آتے ہی رہنا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب وہ لوگ توقیر فاروقی کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے یا پھر شاید ویسے ہی، غلطی سے اس کی زبان پھسل جاتی۔ آپ کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا ہے۔‘‘

’’ہاں...... یہ بات تو ہے۔‘‘ منسٹر صاحب نے طمانیت سے سر ہلایا۔ ’’لیکن اس کا، دل کا مریض ہونا ہمارے خوب کام آیا۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ دل کا مریض ہے۔ وہ تو دیکھنے میں بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔‘‘

’’اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ دل کا مریض ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’خیر...... یہ اچھا رہا کہ اسے زیادہ تکلیف دہ طریقے سے موت نہیں آئی اور نہ ہی اس میں زیادہ وقت لگا۔ بہر حال مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ ہمارا نہایت وفادار آدمی تھا اور ہم وفاداروں کے قدرداں ہیں۔‘‘ منسٹر صاحب نے کسی حد تک تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

’’ہم نے اسے جیل میں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی سر! اس نے جیل میں جتنا بھی وقت گزارا، بالکل اسی طرح آرام سے گزارا جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔‘‘ میں نے قدرے عاجزانہ سے لہجے میں کہا۔

’’ہم تم جیسے وفاداروں کی بھی بہت قدر کرتے ہیں۔‘‘ منسٹر صاحب نے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور بغیر تار والا ایک بٹن دبا کر کال بیل بجائی۔

چند لمحوں بعد ایک دراز قد، مضبوط اور سرخ و سپید نوجوان اندر آیا۔ منسٹر صاحب نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں خاکی کاغذ کا ایک خاصا موٹا پیکٹ تھا جس پر ٹیپ لپٹی ہوئی تھی۔ منسٹر صاحب کا اشارہ پا کر نوجوان نے پیکٹ میرے حوالے کر دیا۔ پیکٹ کا لمس مجھے بہت اچھا محسوس ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں بہت بڑی رقم ہو گی۔ منسٹر صاحب بہت فراخ دل تھے۔ ان کے لیے انجام دی گئی خدمت اپنی نوعیت کے حساب سے جتنی اہم ہوتی تھی، انعام بھی اتنا ہی بڑا ہوتا تھا۔ کافی عرصے بعد کوئی ایسا ’’کیس‘‘ میرے ہاتھ آیا تھا جس میں ’’دوطرفہ‘‘ منافع ہوا تھا۔

میں جب منسٹر صاحب کی عظیم الشان کوٹھی سے نکل کر، اپنی گاڑی میں گھر کی طرف روانہ ہوا تو غیر ارادی طور پر دھیمے سُروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔

❖❖❖

گولڈن جوبلی

پروین زبیر

موسم سرما کی شامیں اداسی اور خاموشی کا دل کش امتزاج ہوتی ہیں... بعض جگہیں اپنی تمام تر خوب صورتی اور دل لبھانے کے باوجود اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام رہتی ہیں... کیونکہ ان لمحوں میں مقصد اولین اہمیت کا حامل ہوتا ہے... جاسوسی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک ایسی ایڈونچر سے بھرپور کہانی... جس کی ہر سطر میں تجسس... کھوج... جستجو اور آگے بڑھنے کا جذبہ اپنی انتہا پر نظر آئے گا... یخ بستہ راتیں... طلسماتی ماحول... فطرت کا بے پایاں حسن اور قدم قدم پر موت کی ہولناکیوں نے ان کے قدموں کو ڈگمگایا اور دلوں کو لرزیا... بہت عذاب جھیلے مگر منزل تک پہنچنے کی جستجو آڑے آتی رہی...

رومانویت پسندی اور حقیقت نگاری کے سنگ سفر کرتی سنسنی خیز داستان......

کیک بہت خوب صورت تھا۔ ایک اونچا پہاڑ اور اس کے پہلو بہ پہلو دو نسبتاً چھوٹی پہاڑیاں، ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سفید کریم نے بہت خوب صورتی سے یہ برفانی منظر تخلیق کیا تھا۔ کیک کی نچلی سطح پر نمایاں الفاظ میں نندا دیوی کا نام سجایا گیا تھا۔ کیک کے بالائی حصے پر چمک دار سنہرے رنگ میں بڑا بڑا گولڈن جوبلی لکھا ہوا تھا۔ بڑی چوٹی سے تھوڑا نیچے ایک طرف چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ خیمے سے لگے ہوئے تھے اور اس پر ہندوستان کا جھنڈا ایک پن کی مدد سے لگایا گیا تھا۔

ماحول میں انتظار کی کیفیت تھی۔ مہمانِ خصوصی کمانڈر موہن سنگھ کوہلی کی آمد کا انتظار تھا۔ کچھ ہی دیر میں برف جیسے سفید بالوں والا ایک بوڑھا کمرے میں داخل ہوا اور زوردار تالیوں کی گونج میں اس کا استقبال کیا گیا۔ سادہ سی پینٹ شرٹ میں ملبوس ڈاکٹر کوہلی نے ریم لیس چشمے کے شیشوں میں سے ایک نظر اس کمرے میں موجود چند لوگوں کو دیکھا اور آہستہ آہستہ اپنی واکنگ اسٹک کے سہارے مہمانِ خصوصی کی کرسی کی جانب بڑھے اور بیٹھ گئے۔

''ساتھیو! کوہلی سر کے کارناموں سے آپ سب بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ کسی اونچے پہاڑ کا نام لیجیے، جواب ملے گا کہ کوہلی سر اسے سر کر چکے ہیں۔ ان کی کوہ پیمائی نے بھارت کا نام پوری دنیا میں بہت اونچا کیا ہے لیکن آج ہم ان کے جس کارنامے کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں، وہ کچھ اور ہی ہے۔ جس کارنامے کی بات میں کر رہا ہوں، اس کے بارے میں کچھ لوگ تو جانتے ہوں گے اور جو نہیں جانتے، وہ بھی آج جان جائیں گے۔

''آج سر ہمیں خود بتائیں گے کہ انہوں نے جان پر کھیل کر وہ کیا کارنامہ انجام دیا تھا جس نے بھارت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ چین، جو پہلے ہم پر یونہی منہ اٹھا کر چڑھ دوڑا تھا پھر کبھی اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ آنکھ اٹھا کر ہمیں دیکھتا۔ اور اس کے لیے ہم اور پورا بھارت ان کا مقروض ہے۔'' یہ آواز انڈین آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) کے چیف کی تھی۔

''آیئے سر!'' را کے چیف اور آئی بی کے چیف نے مل کر سر کوہلی کو سہارا دے کر ٹیبل کے پاس کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کیک کاٹا اور فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

سی آئی کے مرکزی آفس میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کچھ گھنٹے پہلے ملنے والی خبر نے پینٹا گون کے ساتھ

ساتھ تمام انتظامی اداروں کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔
انیس سو اکسٹھ کے اوائل میں یہ خبریں ملی تھیں کہ چائنا نے ایٹمی پروگرام شروع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام کو آگے بڑھنے اور تکمیل تک پہنچنے میں ابھی کئی سال درکار تھے۔ امریکا ان دنوں روس کی طرف متوجہ تھا۔ جو خلا کی تسخیر کے پروگرام میں اسے ٹف ٹائم دے رہا تھا۔
یہ انیس سو چونسٹھ کا اکتوبر چل رہا تھا کہ اچانک خبر ملی کہ چائنا نے ان سب کی توقع کے برخلاف پچھلے دنوں ایٹمی دھماکا کر ڈالا، اور اس خبر کی دھماکا خیزی نے ان سب کو ہلا ڈالا۔
سی آئی اے کے مرکزی آفس میں یہ ہنگامی میٹنگ اسی دھماکے کا شاخسانہ تھی۔
”جنٹلمین! اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے ایٹمی پروگرام پر گہری نظر رکھی جائے اور براہِ راست سفارتی تعلقات نہ ہونے کے سبب ان کی لاعلمی میں یہ اہم کام سرانجام دیا جانا ضروری ہے۔ اس کی سرگرمیاں اگر ہمارے علم میں آتی رہیں تو ہم مختلف اقدامات کے ذریعے اس کے اس پروگرام کو کنٹرول کرتے رہیں گے۔“ سی آئی اے کے چیف نے گہری نظر ڈالتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے سات آٹھ لوگوں کو مخاطب کیا۔
وہ ساتوں کچھ دیر اسی سلسلے میں گفت و شنید میں مصروف رہے۔ آخر کار ایک مناسب سے جاسوسی پروگرام کے خدوخال بنانے کے بعد اس کا عملی پروگرام ترتیب دے کر ہی اٹھے۔ اب پینٹا گون اور ناسا کو مل کر ایک ایسا فول پروف منصوبہ بنانا تھا جس کے ذریعے انہیں چین کے ایٹمی پروگرام کو لمحہ بہ لمحہ مانیٹر کرنے کا موقع ملتا رہے۔
اگلے روز میٹنگ کا دوسرا پروگرام شروع ہوا۔ کل والے سیشن کے تمام لوگ آج بھی تھے۔ دوبارہ ڈسکشن شروع ہوا۔ کافی دیر چلتا رہا آخر کار طے یہ پایا کہ اس سلسلے میں انڈیا کو بھی شامل کیا جائے۔ تاکہ دونوں کے کشیدہ سرحدی معاملات سے فائدہ اٹھا کر وہ اس مہم کو سرانجام دے سکیں۔
اگلے روز ہی نیلسن بوکارٹ انڈین آئی بی کے چیف کے ساتھ معاملات طے کر رہا تھا۔ سی آئی اے اور آئی بی کا یہ مشترکہ منصوبہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی منظوری کے لیے بھیج دیا گیا۔
”ہمارے لیے اس میں کیا فائدہ ہے؟“ پی ایم نے پوچھا۔

"سر ہمارے اور چین کے درمیان تبت اور لداخ جیسے برننگ ایشوز چل رہے ہیں۔ ہماری ایک جنگ بھی ہو چکی ہے۔ دشمن کی طاقت کا ٹھیک اندازہ ہمیں بھی ہونا چاہیے اس لیے مانیٹرنگ کا یہ پروگرام ہمیں بھی سوٹ کرتا ہے۔"

"ٹاسک کیا ہے؟"

"ٹاسک یہ ہے سر کہ چین کلو سینسنگ آلات، جنریٹر اور اس کے اینٹینا کو، بھارت کی جانب سے سب سے اونچی ہمالیائی چوٹی نندا دیوی تک پہنچانا ہے۔ چوبیس ہزار فٹ کی بلندی اور بالکل دیوار کے جیسی عمودی سطح رکھنے والی نندا دیوی پر چڑھائی انتہائی مشکل اور کٹھن ہے۔"

"تو پھر اس کو لے جایا کیسے جائے گا۔ ہینڈل کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟" پی ایم نے سوال کیا۔

"ساڑھے تین کلو پلوٹونیم کو چار اسٹیل کے سلنڈر نما ڈبوں میں رکھ کر، مخصوص دھاتوں کی تہ در تہ، موٹی اور ٹھوس دیواروں والے ڈبوں میں رکھا گیا ہے۔ اتنی احتیاط کے باوجود، اگر ان ڈبوں پر کوئی شدید ضرب لگ جائے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے تابکاری کے اثرات کب باہر آجائیں۔ ویسے بھی یہ ڈبے خاصے وزنی ہیں۔ انہیں لے جانا جان پر کھیلنے کے مترادف ہے۔"

"بھارت ماتا کے لیے جان پر کھیل جانے والوں کی کمی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ دیش بھگتی ہمارے خون میں دوڑتی ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ شروع کرو تیاری۔ پی ایم ہاؤس سے اپروول مل جائے گی۔" شاستری جی نے منظوری دے دی۔

☆☆☆

مائیکل نے بڑے سے سُوئے کو برف کی دبیز تہوں میں گاڑنے کے لیے ہتھوڑی کی آخری ضرب لگائی، تو ہتھوڑی اچھلی اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر، لہراتی ہوئی اس برف زار کی گہرائیوں میں گرتی چلی گئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر اوپر اٹھایا تو گہرے بادلوں کی دھند میں اسے نندا دیوی کی چوٹی بالکل نظر نہیں آئی۔ چوبیس ہزار فٹ کی بلندی، عمودی چڑھائیاں، عمودی اترائیاں۔ ہمالیائی سلسلہ کوہ میں ہندوستان کی جانب سے یہ بلند ترین چوٹی تھی، جس کو سر کرنا مشکل ترین مرحلہ تھا اور دو سو لوگوں کی یہ ٹیم، اس مشکل مرحلے کو عبور کرنے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف تھی۔

پچاس پچاس لوگوں کے چار گروپ بنائے گئے تھے جو بلندیوں کی طرف گامزن تھے۔ آج انہیں بیس کیمپ سے روانہ ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس دوران بھاری سامان اٹھانے والے دو مزدور حادثے کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ چار کو شدید سردی لگ جانے کے سبب کیمپ میں چھوڑنا پڑا تھا۔ نفری تھوڑی کم ہو جانے کے سبب رفتار میں کچھ کمی آگئی تھی۔ پھر موسم بھی اچانک شدید سرد ہو گیا تھا۔ اب انہیں اپنے جدید ترین تھرمل سوٹ میں بھی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف پھیلے ہوئے اس برف زار میں ایک عجیب اداس کر دینے والی ویرانی تھی۔

نزدیک جو گروپ آگے جا رہا تھا اس کا لیڈر ایشلے تھا۔ اس گروپ کے مزدوروں نے بھی دو بڑے اور بھاری بیگ اٹھا رکھے تھے، جن میں اسٹیل کے چمکدار اور بھاری باکس تھے، جنہیں نندا دیوی کی چوٹی تک پہنچانے کے لیے یہ ساری مہم ترتیب دی گئی تھی۔

مائیکل جب وہاں پہنچا تو ایشلے کی ٹیم رکی ہوئی تھی، اور وہ خود اپنے ہیلمٹ کے تسمے ڈھیلے کیے ہوئے، منہ اوپر کر کے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ بلندی پر آکسیجن کی کمی نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور اس کی لمبی سانسیں دبیز مرغولوں کی شکل میں اس کے منہ سے برآمد ہو رہی تھیں۔

"ہے بڈی! بس اب چل دو۔ ہمارا اگلا کیمپ ابھی دور ہے، ہمیں شام سے پہلے وہاں تک پہنچنا ہے۔ کیپ موونگ......" مائیکل کی بات سن کر ایشلے نے سر ہلایا، اپنے ہیلمٹ کو فکس کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

نندا دیوی کی عمودی چڑھائیوں پر وہ سب رستوں کے ساتھ اوپر چڑھتے ہوئے، دور سے بالکل چیونٹیوں کی قطار کے مانند نظر آ رہے تھے جو رینگتی ہوئی اوپر کی جانب جا رہی تھیں۔ دھند میں لپٹی ان منزلوں کی جانب، جو اپنے اندر نہ جانے کون کون سے بھید چھپائے ان کی منتظر تھیں۔ وہ بلندیاں جن کے ایک جانب ہندوستان اور دوسری جانب چین کی وسیع و عریض سرزمین پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں ملکوں کی سرحد وہ قدرتی دیوار تھی جو ہمالیائی سلسلۂ کوہ کی شکل میں وہاں پھیلی ہوئی تھی اور نندا دیوی وہ کھڑکی تھی جس پر کھڑے ہو کر کوئی بھی دوسری جانب دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنا بیگ پیک اٹھائے، اونچے نیچے راستوں پر گاتی گنگناتی، چھلانگیں لگاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

چار سال سے وہ اپنے گھر سے دور، لداخ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہاں کے دارالحکومت لیہہ کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھی۔ چھٹیوں میں بھی کبھی مختصر وقت کے لیے آنا ہوتا تھا مگر صرف چند دنوں، یا ایک آدھ مہینے کے لیے۔ اس کا دل بھرتا بھی نہیں تھا کہ جانے کا وقت آ جاتا۔ اور جب بھی اس کی واپسی ہوتی تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اداس ہو جاتی تھی۔

اب اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ میڈیکل ٹیکنالوجسٹ کی ڈگری لے کر گھر واپس لوٹ رہی تھی۔ خوشی کے اس احساس کے ساتھ کہ اب وہ اپنے گھر اپنے لوگوں کے ساتھ رہے گی۔

ہمالیہ کی ترائیوں میں، لداخ سے تقریباً چار سو کلومیٹر دور اس کا گھر لانگ نام کی بستی میں تھا۔ یہ ایسی بستی تھی جو موسم گرما میں ایک مختصر عرصے کے لیے سرسبز و شاداب نظر آتی۔ تین سے چار مہینوں تک زندگی کی چہل پہل سے آباد محسوس ہوتی اور سرما شروع ہوتے ہی برف کی دبیز چادر اوڑھ کر چھپ جاتی تھی۔ بستی کے سارے گھر پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے، جن کے مکین پورے موسم گرما اپنے کھانے پینے اور ایندھن کی ضروریات جمع کرنے میں گزارتے، اور سردی میں صرف شکار کے لیے ہی باہر نکلتے تھے۔

اس کا باپ تمار لینگ بستی کا سردار تھا اور اس نے اپنی اکلوتی بیٹی شائی لینگ کو اس وعدے کے ساتھ پڑھنے کے لیے بھیجا تھا کہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کر کے بستی کے لوگوں کی خدمت کرے گی۔ اسی لیے وہ خوش تھی کہ اب اسے کہیں نہیں جانا۔ صرف پہاڑوں میں گھومنا ہے، اور گھر والوں کی محبت کے مزے لوٹنا ہے۔ پہاڑوں میں گھومنا اور ان کی بلندیوں پر ٹریکنگ کے لیے جانا اس کا واحد مشغلہ تھا۔

چند دنوں کے بعد ہی اس نے ایک دن دور پہاڑوں کے دامن میں رنگ برنگ خیمے لگے دیکھے تو غور سے انہیں دیکھنے لگی۔

''اوہ! پھر کوئی پہاڑوں کو سر کرنے جا رہا ہے۔ دیکھنا تو چاہیے شاید میرا بھی جانے کا کوئی آسرا ہو جائے۔''

وہ اُن سے ملی اور اپنے شوق کا اظہار کیا تو کئی بار کی ڈسکشن کے بعد آخر کار وہ اس ٹیم کا حصہ بننے میں کامیاب ہو گئی جو انڈیا کے معروف ٹریکر کمانڈر موہن سنگھ کوہلی کی سربراہی میں نندا دیوی سر کرنے جا رہی تھی۔ وہ اس بات پر خوش ہی نہیں بلکہ فخر محسوس کرنے لگی کہ وہ کمانڈر کی ٹیم کا حصہ بن کر جائے گی۔

''شائی! تمہاری تو ہمیں بہت سخت ضرورت رہے گی۔ ڈاکٹرز تو ہیں ہماری ٹیم میں لیکن کوئی میڈیکل ٹیکنالوجسٹ یا فزیوتھراپسٹ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آخری دن بیمار ہو کر ڈراپ ہو گئے۔ تم خود ٹریکر ہو، تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہارا ساتھ ہمارے لیے کتنا ضروری ہے۔ تمہیں بہترین پیمنٹ بھی ملے گی اور نام بھی ملے گا۔''

''سر! دنیا کے جانے مانے آپ جیسے ٹریکر کے ساتھ کسی ایکسپڈیشن پر جانا تو خود میرے لیے ایک بہت بڑا آنر ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ روانگی کب ہے۔ میں بابا سے اجازت لے کر آتی ہوں۔''

''دیٹس لائک آ گڈ گرل! کل کا دن چھوڑ کر اگلے دن آ جاؤ۔ تھوڑی سی ٹریننگ بھی ہو جائے گی اور باقی ساتھیوں سے بھی مل لینا۔ اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے کر آنا۔ اگلے دن ہم صبح سویرے پانچ بجے نکلیں گے۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم اپنی بھارت ماتا کے لیے سب کچھ کر گزرو گی۔ ایم آئی رائٹ؟''

''آف کورس سر!'' شائی نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ کوہلی اُسے پُرخیال نظروں سے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کسی ڈیوائس پر کہیں رابطہ کیا۔

''ہیلو! ہاں۔ نام ہے شائی لینگ۔ لانگ بستی میں رہتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے لداخ یونیورسٹی سے میڈیکل ٹیکنالوجی میں ڈگری حاصل کر کے آئی ہے۔ اسے کلیئر کرو۔ اوکے۔''

کوہلی فون بند کر کے کیمپ کی طرف آیا۔

وہ سب اس وقت بیس کیمپ میں تھے اور اپنی اپنی تیاریوں میں جتے ہوئے تھے۔ کوہلی نے ایک نظر اٹھا کر دھوپ میں چمکتی نندا دیوی کو دیکھا جس کی چوٹیوں پر جمی برف سے شعاعیں سی لپکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''آ رہا ہوں میں دیوی جی!'' اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اس چوبیس ہزار فٹ بلند چوٹی کو چیلنج دینے والے انداز میں کہا اور ان نیلے خیموں کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی ٹیم کے امریکن ممبر ٹھہرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ سب سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے کچھ نقشے، چارٹ اور گراف وغیرہ پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ ڈیوائسز بھی تھے جن پر موسم کی تازہ ترین صورتِ حال کے

بارے میں ریڈنگز چل رہی تھیں۔ درجۂ حرارت، ہوا کا دباؤ، ہوا کی سمت، بادلوں کی کیفیت، وغیرہ وغیرہ۔

"سب سے زیادہ ہمیں ان چار باکسز کا خیال رکھنا ہے، جس میں انتہائی خطرناک پلوٹونیم ہے۔ پی یو۔ دو سو انتالیس۔ یہ ایندھن ہے ان جنریٹرز کا، جو ان تمام سینسنگ آلات کو توانائی فراہم کریں گے جو ہمیں سب سے زیادہ بلندی پر نصب کرنا ہیں اور جن کے ذریعے ہمیں چین کا ایٹمی پروگرام مانیٹر کرنا ہے۔"

امریکن پروفیسر مائیکل جونس اس ٹیم کا لیڈر تھا، جسے سی آئی اے نے ناسا سے بلا کر اس مہم کو پورا کرنے کی ذمے داری دے کر باقی ٹیم کے ساتھ یہاں انڈیا کے تبتی سرحدی علاقے میں بھیجا تھا۔ اس کے چار اور ساتھی بھی تھے، جو اپنی اپنی فیلڈ میں ماہر تھے اور اس ٹاسک کو پورا کرنے کے لیے مائیکل کے ساتھ تھے۔

آج پورے دن میں انہوں نے بمشکل صرف چند سو فٹ کا سفر طے کیا تھا۔ یخ بستہ تیز ہواؤں اور بڑھتی ہوئی خوفناک ٹھنڈ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ سرشام ہی کوئی مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیں۔ مائیکل اور کوہلی نے کیمپ کے لیے جگہ کا تعین کیا اور وہ جگہ شوخ رنگوں کے لال نیلے، پیلے سردی سے محفوظ خیموں سے آباد ہو گئی۔ ایک جیسی ذمے داریاں نبھانے والے لوگوں کے گروپس کو ساتھ ساتھ یا ایک ہی خیمے میں جگہ دی گئی تھی۔ ایک بڑے خیمے پر سرخ رنگ کا کراس بتا رہا تھا کہ وہ میڈیکل سے متعلق لوگوں کے لیے ہے۔

میڈیکل کی پوری ٹیم سات لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب اپنا سامان سیٹ کر ہی رہے تھے کہ سسٹم انجینئر ایشلے سینہ مسلتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"ہے گائیز! بریدنگ پرابلم۔" وہ خاصی تکلیف میں محسوس ہوا۔ روہم ائر بیڈ میں ہوا بھر چکا تھا۔ شائی نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی۔ پھر جلدی سے آکسیجن سلنڈر نکال کر لائی، اسٹینڈ پر فکس کیا اور ماسک اس کے منہ پر لگا دیا۔ ایشلے نے لمبی سانس لے کر اسے تشکر سے دیکھا۔

اسی وقت ایک شور سا ہوا۔ وہ ایک زخمی مزدور تھا جو وزنی سامان گرنے سے بُری طرح کچلا گیا تھا۔ وہ سب اسے طبی امداد دینے دوڑ پڑے۔

"ڈاکٹر ویدی! یہ تمہارا کیس ہے۔" ڈاکٹر نمرتا نے بڑی ادا سے کہا تو شائی نے ذرا حیران ہو کر اسے دیکھا جو فولڈنگ چیئر پر نیم دراز چیونگم چبا رہی تھی۔ ڈاکٹر ویدی نے سر ہلاتے ہوئے فوراً مریض پر توجہ دی جو درد سے بے حال تڑپ رہا تھا۔ شائی نے بے چین ہو کر ہر وہ کوشش کر ڈالی جس سے اس کی زندگی بچائی جا سکے۔ وہ دونوں پوری کوششوں کے باوجود ہار گئے اور موت جیت گئی۔ اس مزدور کی آخری ہچکی نے شائی کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ اور لاکھ ضبط کے باوجود وہ گالوں پر بہہ نکلے۔

"شائی! بہت نازک دل ہے تمہارا۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔" ڈاکٹر چترویدی نے اس کے گال سے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا تو وہ آنسوؤں کی دھند کے پار اسے دیکھتی رہ گئی۔ آنسوؤں کی دھند ذرا چھٹی تو اس کے مقابل دو جادو اثر آنکھیں تھیں جن میں سکون تھا، نرمی اور جذبات تھے۔ گال پر اس کے لمس نے حدت جگا دی تھی اور وہ اپنے بدلتے ہوئے احساسات کی بڑھتی ہوئی شدت سے پریشان ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔ فضا کچھ گمبھیر سی ہو گئی تھی۔ روہم اور سجنا نے مل کر اس کو سیاہ پولی تھین کے بیگ میں لپیٹا۔ مزدور اٹھا کر باہر لائے، اس کے لیے کچھ دعائیں پڑھیں اور برف میں گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا۔ شائی واپس خیمے میں آئی تو اس نے ڈاکٹر نمرتا، ڈاکٹر انشومن اور ڈاکٹر شیکھر کو کسی مذاق پر زور زور سے ہنستے ہوئے دیکھا، جو اسے بہت ناگوار گزرا۔

"کتنے کٹھور لوگ ہیں یہ۔" اس نے سوچا اور اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر میں کسی مزدور نے تھالی بجا کر ڈنر تیار ہونے کا اعلان کیا تو سب لوگ خیمے سے نکل کر کھانے کے لیے چلے گئے۔ وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر ویدی اندر داخل ہوا۔

"ہے شائی! کیا ہوا؟ تم کھانا کھانے نہیں آئیں؟" اس نے شائی سے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے اداس سے لہجے میں جواب دیا تو ویدی نے پاس بیٹھ کر اسے مخاطب کیا۔

"دیکھو شائی! ہم یہاں جن حالات میں ہیں نا، وہاں ہر روز ایسے حادثات ہوتے رہیں گے۔ کسی کے اس طرح ساتھ چھوڑ دینے پر اگر تم کھانا پینا چھوڑ دو گی۔ تو اتنی مشکل مہم کیسے چلے گی؟ اور اگر تمہیں کچھ ہو گیا، تو ہمارا کیا ہوگا؟ تم تو اس پوری ٹیم کے لیے ہم ڈاکٹروں سے بھی زیادہ ضروری ہو۔ اس لیے مضبوط بنو، اور ہر طرح کی مشکل کا سامنا ہمت سے کرنے کی کوشش کرو۔ چلو اٹھو، شاباش! کھانا ختم ہو گیا تو

تمہارے ساتھ مجھے بھی بھوکا رہنا پڑے گا، چلو۔''
ویدی کے اس قدر میٹھے اور نرم اصرار کے سامنے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے خیمے سے باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر نمرتا کے گروپ نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں بھی اپنا کھانا لے کر انہیں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔
شائی کو کچھ حیرت سی ہوئی جب کھانے کے دوران نمرتا نے اس کے متعلق کچھ چبھتی ہوئی سی باتیں کیں۔ اس نے بغور نمرتا کو دیکھا، لیکن کچھ بولی نہیں۔
بیس کیمپ کے بعد ان کا یہ نمبر دو کیمپ تھا۔ کھانے کے دوران ہی کوہلی نے اعلان کر دیا تھا کہ کل صبح سویرے چھ بجے وہ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ سب لوگ جلد سو کر صبح پانچ بجے سے پہلے اٹھ جائیں۔
اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہی وہ سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں خیموں میں اندھیرا ہو گیا۔
نیلے سرخ اور پیلے رنگ کے وہ سارے خیمے بالکل خاموش ہو گئے اور باہر دیوانی تیز، یخ بستہ ہوائیں اور ہلکی برف کے بگولے اس ویرانے میں ہیبت ناک آوازوں کے ساتھ چکرا تے رہ گئے۔

☆☆☆

آج انہیں بیس کیمپ سے روانہ ہوئے ساتواں دن تھا۔ ان سات دنوں میں انہیں حقیقی معنوں میں احساس ہوا کہ نندا دیوی کو سر کرنا، اب تک ایک خواب کیوں رہا ہے۔
''وہ ایک دیوی ہے اور کوئی بھی دیوی انسانوں کو اپنے برابر نہیں آنے دیتی اسی لیے اس نے آج تک کسی کو اپنے سر پر چڑھنے نہیں دیا۔ یہ امریکن ٹیم سمجھتی ہے کہ اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے اسے سر کر لے گی۔ مگر انہیں نہیں پتا کہ وہ دیوی ہے دیوی۔ یہ سب منہ کی کھا کر واپس ہو جائیں گے۔ تم دیکھ لینا۔'' مزدوروں کے کیمپ میں یہ باتیں چل رہی تھیں۔ اکثر مزدور اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے۔
لیکن وہ خاموشی سے اپنی ذمے داریاں نبھا رہے تھے۔
صبح کی روشنی پہاڑوں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ سب ناشتا کر رہے تھے۔ مزدوروں نے آگ جلا رکھی تھی اور سب کی کوشش تھی کہ وہ آگ سے نزدیک تر ہو کر بیٹھیں۔ کمانڈر کوہلی دور برف میں دبے ایک پتھر پر بیٹھا موٹے دبیز دستانوں میں... چھپے اپنے دونوں ہاتھوں میں چائے کا بھپ کپ تھامے، بھاپ اڑاتی چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہا تھا۔ اس کی نظریں ناشتا کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں پر مرکوز تھیں۔
ڈاکٹر ویدی کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک مبہم سا اشارہ کر کے اسے اپنی طرف آنے کو کہا۔
''یس کمانڈر۔'' ڈاکٹر کی نظروں میں سوال تھا۔
''ڈاکٹر! تم جانتے ہو پچھلے سات دنوں کے اس بلندی کے سفر میں ہم سب نے بہت زیادہ مسائل کا سامنا کیا ہے اور ہمارے کئی ساتھی ہمت ہار رہے ہیں۔ بیشتر کی آنکھوں میں اب یہ سوال نظر آنے لگا ہے کہ واپسی کب ہو گی۔ کیونکہ اکثر کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم کبھی بھی چوٹی تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ تمہاری ٹیم میں کیا صورت حال ہے؟''
''یس سر! خاص طور پر جب سے روپم اور سجنا کھائی میں گرے ہیں۔ بہت مایوسی ہے۔ کہنے کو وہ دونوں نرس تھے لیکن بہت کچھ سنبھالتے تھے۔'' ڈاکٹر ویدی نے کہا۔
''یار! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ سجنا گری تھی، لیکن روپم نے اس کے پیچھے کیوں چھلانگ لگا دی۔''
''سر! وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ شاید ان دونوں کا ایک دوسرے کے بنا جینا ممکن نہیں تھا۔ شاید اس لیے۔''
''او...... ! شاید اس جذبے میں بڑی طاقت ہے۔''
''آف کورس سر! کیا آپ نے کسی سے، اور کسی نے آپ سے کبھی محبت نہیں کی؟''
''نہیں یار! مجھے کبھی اس کی فرصت نہیں ملی۔ میں نے اپنے پیشن سے محبت کرنے میں ساری زندگی گزار دی۔ اس لیے میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ تم بتاؤ! تم نے کی ہے محبت؟''
''جی سر! ڈاکٹر نمرتا۔''
''اوہ! میں سمجھا تھا کہ تم شائی کا نام لوگے۔''
''شائی؟ نو سر! وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ یقیناً محبت کیے جانے کے لائق بھی ہے۔ اگر میرے دل میں نمرتا نہ بسی ہوتی تو شاید میں اس کے بارے میں سوچتا ضرور، اور شاید اس سے محبت ہو بھی جاتی۔ لیکن اب تو یہ ممکن نہیں ہے سر۔''
''تو اس ناممکن کو ممکن بناؤ ڈاکٹر!'' کوہلی نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر حیران ہو گیا۔

''جی؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ نمرتا.....''

''میں جانتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کل شائی میرے پاس آئی تھی۔ وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھی۔ ہمارے یہاں تک پہنچنے میں ہماری ٹیم جس تباہی سے گزری ہے، وہ شاید اس کو خوف زدہ کر گئی ہے۔ اور اب وہ آگے جانے کے بجائے یہیں اس کیمپ میں رہنا چاہتی ہے۔ مجھے تو کچھ مایوس سی بھی نظر آئی۔ وہ شاید تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھی تھی اور تم نے اسے مایوس کر دیا ہے۔''

''سر! وہ جانتی ہے کہ میں نمرتا سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''یہ اُسے کس نے بتایا؟''

''میں نے خود سر! میں نے اس کی دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا اور کیونکہ میں اسے کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہی اسے بتایا کہ میرے دل میں نمرتا بستی ہے۔ کسی اور کی گنجائش کہاں ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو یہیں روک لے۔''

''لیکن اب تمہیں شائی کو یہ بتانا ہے کہ نمرتا نے تمہیں مایوس کیا ہے اور اس نے اپنی حرکتوں سے تمہاری نظروں میں اپنے آپ کو گرا لیا ہے۔ دو چار حرکتوں کے حوالے بھی دے سکتے ہو۔''

''لیکن کیوں سر؟ میں ایسا کیوں کروں؟ کیونکہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ تو ٹھیک نہیں ہے۔''

''یہ تمہیں اس لیے کرنا ہے کہ تم جانتے ہو کہ تمہاری ٹیم کے سات افراد میں سے تین کی موت ہو چکی ہے اور اب ٹیم میں صرف تین ڈاکٹر اور ایک اکیلی میڈیکل ٹیکنالوجسٹ ہے۔ اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ تم تین ڈاکٹر مل کر ٹیم کے لیے اتنے فائدے مند نہیں ہو سکتے جتنی وہ اکیلی۔ اس کا ٹیم کے ساتھ آخر وقت تک ہونا بہت ضروری ہے۔''

''تو وہ ہمارے ساتھ چل تو رہی ہے۔ پھر کیا مسئلہ ہے سر؟''

''یہ کل تک کی بات تھی۔ رات وہ میرے پاس آئی تھی، یہ بتانے کے لیے کہ وہ اب آگے جانے کے قابل نہیں ہے۔ خود کو کافی بیمار محسوس کر رہی ہے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ اسے اسی کیمپ میں چھوڑ دیا جائے۔ واپسی میں وہ ان کے ساتھ نیچے چلے گی اور تب ہی میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ مجھے بیمار سے زیادہ مایوس محسوس ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کی مایوسی کی وجہ تم ہو اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اسے اپنی توجہ کا ٹانک دو۔ تمہاری توجہ اسے باہمت بنا دے گی اور وہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ جانے کو راضی ہو جائے گی۔''

''لیکن سر! یہ تو سراسر دھوکا ہو گا۔ اور پھر نمرتا؟ وہ بدگمان ہو جائے گی۔ پھر میں کیا کروں گا؟''

''یہ دھوکا نہیں، وقت کی ضرورت ہے۔ نمرتا کو تم بعد میں سچ بتا کر منا سکتے ہو۔ وہ بے وقوف نہیں ہے جو تمہیں چھوڑ دے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن سر۔''

''دیکھو ویدی! ہم اس وقت زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم سپاہی ہیں اپنے دیش کے اور ہمیں یہ جنگ ہر صورت جیتنی ہے۔ اپنی بھارت ماں کے لیے ہم شپتھ اٹھا کر آئے ہیں۔ اس لیے وقت کی ضرورت کو سمجھو اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ تمہیں کرنا ہی ہو گا۔ اسے میری ریکویسٹ سمجھو، یا حکم۔ لیکن مان لو۔''

ڈاکٹر ویدی نے یہ نادر شاہی حکم سن کر ایک ٹھنڈی سانس لی جو فضا کی شدید ٹھنڈک کے سبب مرغولے بن کر جمتی چلی گئی۔

''چل بھئی ڈاکٹر! چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کرے گا۔'' وہ مرے مرے قدموں سے آگے بڑھا، کافی کے دو بڑے کپ لے کر خیمے کے اندر داخل ہوا۔

''ہیے شائی! تم باہر نظر نہیں آئیں تو میں سمجھ گیا کہ پرنسس کا آرام کا موڈ ہے۔ کیا ہوا؟ تم ابھی تک تیار بھی نہیں ہو۔ خیریت ہے نا؟''

''یس ڈاکٹر! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں یہیں اس کیمپ پر رک رہی ہوں۔ واپسی پر آپ کے ساتھ نیچے چلوں گی۔''

''لیکن اگر تم یہاں رُک گئیں۔ تو میں اوپر کیسے جاؤں گا؟'' ویدی نے لہجے میں جذبات سموتے ہوئے کہا تو شائی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

ویدی نے مسکراتے ہوئے اس کی حیران آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ اور بھی زیادہ سوچ ... میں پڑ گئی۔

''سر ڈاکٹر نمرتا آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ اوپر لے جائیں گی۔'' شائی نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں نمرتا کو یہاں چھوڑتا اور تم کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ لیکن یہ تو میں کم از کم کر ہی سکتا ہوں کہ تمہیں اپنے کاندھوں پر بٹھا کر اپنے ساتھ

لے جاؤں۔ تمہیں یہاں اکیلے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ تم اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔ ورنہ بعد میں یہ نہ کہنا کہ سب کے سامنے مجھے کندھے پر بٹھا کر سب کو ہنسنے کا موقع دیا۔ اٹھ رہی ہو، یا پھر میں بچ مچ اٹھا کر لے جاؤں۔'' ویدی یہ کہہ کر شرارتاً آگے بڑھا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

گہرے دبیز بادلوں کے بیچ ان کا یہ سفر مزید کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ حدِ نظر کم ہونے کے سبب وہ سب بہت احتیاط سے قدم بڑھا رہے تھے۔ موسم تیزی سے تبدیل ہوا تھا اور نندا دیوی نے گہرے بادلوں کی چادر اوڑھ کر ان کے لیے آنکھ مچولی کا کھیل شروع کر دیا تھا۔

''مسٹر کوہلی! یہ موسم تو ہم کو بہت اوپر ملنا تھا۔ ابھی چوٹی بہت دور ہے۔ یہ بادلوں کی دھند اور فضا میں برف کے ذرات، ابھی سے انہوں نے ہماری مشکلات کو بڑھا دیا ہے۔'' مائیکل نے تشویش کا اظہار کیا تو کوہلی مسکرایا۔

''مسٹر مائیکل! کیا وجہ ہے کہ ایوریسٹ کئی مرتبہ سر ہو چکی ہے، اور نندا دیوی ابھی تک ناقابلِ تسخیر ہے۔ جبکہ اس کی اونچائی ایوریسٹ سے کم ہی ہے۔ اس کو تو بہت پہلے سر ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہی شدید موسم کا لمحہ لمحہ بدلتا آسیب ہے۔''

کوہلی کے ذہن میں اس کی تین بار کی پرانی ناکام کوششوں کا منظر گھوم گیا۔

''رائٹ، یو آر! لیکن ہمیں تو اپنا کام ہر صورت میں مکمل کرنا ہے۔ اب ہوائیں بھی تیز ہو رہی ہیں۔ نہ جانے کب یہ جھکڑوں میں تبدیل ہو جائیں۔ اس لیے سب کو، اور خاص طور پر مزدوروں کو بہت زیادہ احتیاط کی تاکید کر دو۔'' مائیکل نے کہا تو کوہلی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گروپ کو رسی ہلا کر آگے بڑھنے کی ہدایت دی۔

انہیں کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مائیکل کی پیش گوئی درست ثابت ہونے لگی۔ ہوائیں تیز ہو کر جھکڑوں کی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔ ہواؤں کے ساتھ فضا میں برف کے ذرات کی مقدار بھی کافی بڑھ رہی تھی، جس کے سبب پورا ماحول بہت دھندلا گیا۔ بلندی پر برپا شدید برفانی طوفانوں نے نندا دیوی کو گھیر لیا تھا۔ سردی اپنی شدتوں کو چھو رہی تھی۔ شدید برفانی تھپیڑوں اور یخ بستہ طوفانی ہواؤں نے کچھ ہی دیر میں کئی حادثوں کو جنم دیا۔ مزدوروں کی پیٹھ پر لدا ہوا، کھانے پینے اور گرمی فراہم کرنے والا سامان مع مزدوروں کے اس طوفان نے نگل لیا۔ وہ سب حواس باختہ

ہو رہے تھے کہ کیسے اپنے آپ کو بچائیں مگر کہیں پناہ نہیں تھی۔

ایسے میں کسی مزدور کی ایک دہشت زدہ سی چیخ نے ماحول کو شیشے کی چادر کی طرح چکنا چور کر دیا۔ کوہلی سمیت ان سب کو ایک جھٹکا لگا۔ آواز کی سمت نظر دوڑائی تو اس دھواں دھواں سے ماحول میں ایک ایسا مزدور جس نے پلوٹونیم کے باکسس میں سے ایک باکس اٹھا رکھا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ نے اس کے قدم اکھاڑ دیے تھے اور اس وقت وہ وہ رسی کے سہارے ایک ایسے خلا میں جھول رہا تھا جہاں سے واپس روٹ پر آنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ پہلے بھی کئی مزدور حادثات کا شکار ہو کر بچھڑ گئے تھے۔

مزدور رسی پر گرفت حاصل کرنے کے لیے بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ نتیجتاً اس پوری رسّی پر جھٹکوں کے اثر سے ایک ہلچل بچ گئی تھی۔ ایشلے اس ٹیم کا لیڈر تھا اور وہ زور زور سے چلا کر مزدور کو منع کر رہا تھا کہ وہ رسّی کو جھٹکے نہ دے، وہ اسے ریسکیو کر لیں گے۔ مگر نیچے نظر آنے والی اندھی گہرائیاں اسے خوف زدہ کر رہی تھیں۔ ایسے میں اس کی پیٹھ پر بندھا ہوا دھاتی بکس بھی الگ ہو کر رسیوں کے سہارے جھول رہا تھا۔

اسے دیکھ کر باقی لوگوں کو احساس ہوا کہ مائیکل نے احتیاط کے طور پر ان سارے باکسس کو الگ ہونے کے باوجود خاص طور پر ایک دوسرے سے بھی منسلک کر دیا تھا اور یہی چیز ابھی تک باکس کے ساتھ ساتھ مزدور کو بھی بچائے ہوئے تھی۔ لیکن مزدور جان بچانے کے لیے جس طرح جدوجہد کر رہا تھا، اور اس سے جس طرح جھٹکے لگ رہے تھے، انہوں نے سب کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ سب بھی چلّا رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہیجانی کیفیت تھی۔

اچانک اس ہنگامے میں ایک گن فائر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی مزدور کی دہشت زدہ چیخ دور گہرائیوں میں جاتی سنائی دی۔ اس کی جگہ برف پر صرف باکس رہ گیا اور اس جگہ سے مزدور غائب ہو گیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ بے وقوف انسان! تم جانتے بھی ہو، کہ تم نے ہم سب کے لیے کتنا بڑا خطرہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس فائر کی گونج سے پہاڑوں کی برف میں دراڑیں پڑ گئی ہوں گی اور ایوالانچ سرکنا شروع ہو گئے ہوں گے۔ کہیں بھی، کسی بھی وقت، کون سا برفانی تودہ ہمیں روندتا ہوا گزر جائے، اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم نے سب کی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے احمق۔''

مائیکل بُری طرح دہاڑا اور اسٹلے کو شدید غصے کی کیفیت میں للکارا۔ مگر اسٹلے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے بے پروا ان رسیوں کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا، جن سے وہ دھاتی باکس بندھا ہوا تھا۔ ان رسیوں کے دوسرے سرے پر وہ مزدور تھا جو اپنا توازن کھو کر گہری کھائی کے خلا میں جھول رہا تھا۔ اسٹلے نے باکس کو بچانے کے لیے رسی کے اس سرے پر گولی چلا دی جو مزدور سے منسلک تھا۔ رسی ٹوٹی اور مزدور بھیانک چیخ مارتا ہوا موت کی گہرائیوں میں غائب ہو گیا۔ مزدور کی چیخ کے ساتھ کئی اور بے ساختہ چیخیں بھی ابھریں، جن میں نمایاں آواز شائی کی بھی تھی۔

''او گاڈ۔'' وہ ضبط کھو کر چلا چلا کر رونے لگی۔ سب کے ساتھ اس نے بھی صاف طور پر دیکھ لیا تھا کہ اسٹلے نے مزدور کو بچانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے صرف باکس کو بچانے کے لیے مزدور کو موت کی گہری کھائی میں پھینک دیا تھا۔

''ہے شائی! ہیو پیشنس۔ شانت ہو جاؤ۔ پلیز۔ شائی! بس کرو! شانت ہو جاؤ۔'' ڈاکٹر ویدی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا اور وہیں سے وہ شائی کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویدی کی آواز نے اسے ضبط کرنے پر مجبور کر دیا۔

''مسٹر کوہلی! ہمیں جلد سے جلد کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر فوراً پناہ لینی پڑے گی۔ خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ کچھ وقت گزار کر اس کے ٹلنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ ورنہ شاید ہم میں سے کوئی بھی بچ نہ پائے۔ اسٹلے نے ہم سب کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔'' مائیکل نے فکرمندی سے کہا تو کوہلی بھی سوچ میں پڑ گیا۔

''اسٹلے نے صرف ایوالانچز کو جگانے کی ہی غلطی نہیں کی ہے مسٹر مائیکل! اس نے سب کے سامنے مزدور کو جس طرح کھائی میں پھینکا ہے، اس سے مزدوروں میں غم و غصہ بھی جگا دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مزدور کس طرح کے ردِعمل کا اظہار کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آگے جانے سے بھی انکار کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر شاید یہیں سے ہماری واپسی ہو جائے گی۔''

''اسٹلے کی حماقت کے سبب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ فی الحال کیمپ لگانے کے لیے کوئی معقول پناہ گاہ ڈھونڈو۔ ورنہ کوئی اور حادثہ نہ ہو جائے۔''

ان کے اگلے پڑاؤ کی منزل ابھی کافی دور تھی مگر حالات سے مجبور ہو کر انہیں آس پاس ہی قیام کرنا پڑا۔

ایک چٹان کے نیچے چھجے جیسی جگہ پر انہوں نے رکنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سب جلدی جلدی اپنے خیمے نصب کر رہے تھے۔ برف کے تڑخنے اور ٹوٹنے کی مہیب آوازیں ان سب کو ڈرا رہی تھیں۔ یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چٹانوں سے سر پٹخ رہے تھے اور اب وہ خطرہ سامنے آ گیا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ دور ایک چوٹی سے برف کا ایک تودہ سرکنا شروع ہوا اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا تو اپنے آس پاس کے چھوٹے بڑے تودوں کو بھی اپنے ساتھ لپیٹتا ہوا، اپنا حجم بڑھاتا جا رہا تھا۔ وہ سب خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شکر تھا کہ اس ایوالانچ کا رخ ان کی جانب نہیں تھا۔

لیکن کب تک۔ آخر کار جس چٹان کے سائے میں وہ رکے تھے اسی کی چوٹی کے اوپر سے برف کا تودہ پھسلا اور وہ برف کے انبار میں دب کر رہ گئے۔ زندگی کی چاہ میں جان توڑ جدوجہد کے بعد وہ برف کی اس قبر سے باہر آئے تو دم گھٹنے سے جان لبوں پر آ گئی تھی۔ وہ سب منہ پورا کھول کھول کر سانس کھینچ رہے تھے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ صرف آگے بڑھنے کے راستے ہی بند نہیں ہوئے بلکہ ان سب کی ہمت اور حوصلے کا گراف بھی بالکل زیرو پر آ گیا تھا۔ مزدوروں نے بھی صاف لفظوں میں آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ سب سر جوڑے بیٹھے تھے۔ کیا کیا جائے؟

''مسٹر کوہلی! اب واپس جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' مائیکل نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''یو آر رائٹ مائیکل! ہم ایسا کرتے ہیں کہ یہ سارا سامان ہم یہیں اس کیمپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ موسم بہتر ہونے پر ہمیں دوبارہ آنا تو ہے۔ کیونکہ ہر صورت میں یہ مہم تو مکمل کرنا ہے۔ سامان سمیت واپس جانا اور پھر دوبارہ سامان سمیت آنا کافی مشکل ہوگا۔ بہتر ہے آسانی والا راستہ اختیار کریں۔ ہمیں علم تو ہے کہ ہم سامان کہاں چھوڑ رہے ہیں۔ دوسرے چکر میں یہیں سے اٹھا کر اوپر لے جائیں گے۔''

''اِٹس آ گڈ سجیشن کوہلی! سب کو تیاری کا کہہ دو۔ ہم فوراً ہی واپسی کا سفر شروع کر رہے ہیں۔''

واپسی کے اعلان نے سب کے اندر ایک خوشی کی روح پھونک دی۔ دو خیموں میں سینسنگ آلات اور وہ چاروں دھاتی باکس محفوظ کر کے خیموں کو لپیٹ دیا گیا۔ جگہ کی نشاندہی کے لیے نقشہ تیار کیا گیا اور ان سب نے اسی وقت واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں انہیں کئی ایدا

لانچ سرکتے، پھسلتے اور تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ملے۔ وہ ان سے بچتے بچاتے تیزی سے نیچے جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ سب دو نمبر کیمپ تک پہنچ کر رک گئے تھے۔ برف پر دور دور تک رنگ برنگ خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ کھلی ہوئی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر سے آنے والے ایوالانچز نے ان کے راستے بند کر دیے تھے۔ وہ پچھلے دو دن سے اس کیمپ پر رکے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ برف پگھلے، ان کا روٹ کلیئر ہو تو نیچے اتریں۔

شائی خیمے کے باہر فولڈنگ چیئر پر بیٹھی سامنے نظر آنے والے ڈاکٹر چترویدی اور نمرتا کو دیکھ رہی تھی۔ اوپر جانے والے وہ چند دن، جب ویدی کی ساری محبتیں، ساری توجہ اور سارے جذبات کی گرم جوشی، صرف اور صرف اس کے گرد ہالہ کیے ہوئی تھیں اور وہ اس شدید سرد موسم میں بھی اس کے جذبات کی گرم جوشی کو اس طرح محسوس کر رہی تھی کہ جیسے ایک نہیں کئی جنتیں اس کے آس پاس تھیں۔ اسے ہر تکلیف، موسم کی سختی اور سخت محنت بھی پر کاہ محسوس ہوئے تھے۔ اسے اپنا آپ دھنک رنگ ہنڈولوں میں جھولتا محسوس ہوا تھا۔ چاہنے اور چاہے جانے کا یہ خوشگوار احساس اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا، اور اس قدر حسین تھا کہ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑنے لگا تھا۔

واپسی کے سفر میں اسے یہ محسوس ہوا کہ جیسے ڈاکٹر نمرتا نے اس تعلق کو نوٹ کیا اور ویدی کو شائی سے دور رکھنے کی ممکنہ کوششیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ شائی کے سامنے جان بوجھ کر ویدی کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی۔ اس وقت بھی وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے اس سے کوئی بات کر رہی تھی اور مسکراتے ہوئے بار بار دزدیدہ نظروں سے دور بیٹھی شائی کو دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ جتانے کے لیے کہ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ ویدی میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔

لیکن شائی کو محسوس ہوا کہ ویدی کے دل کا دروازہ اب بھی اس کے لیے کھلا ہوا ہے۔ نمرتا کی نظر بچا کر وہ جس طرح ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کو نوازتا تھا، وہ شائی کے لیے اثاثہ تھا۔ اس کے لیے وہ نمرتا کے طنز اور تلخ جملوں اور فضول قسم کی حرکتوں کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتی تھی۔

ویدی نے بتایا تھا کہ وہ، نمرتا، انشومن اور شیکھر پانچ سال کلاس میٹ رہے اور انہوں نے ساتھ ایم بی بی ایس کیا ہے۔ اور چاروں میں بہت اچھی دوستی ہے۔ لیکن شائی کو محسوس ہوا کہ نمرتا اور انشومن میں دوستی سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اس خیال پر اس نے اپنے آپ کو ملامت بھی کیا۔

انہیں اس کیمپ پر رکے ہوئے چھ دن ہو چکے تھے۔ برف پگھلنے کی رفتار کم ہونے کے سبب ان کا روٹ کلیئر نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن ساتویں دن کی صبح ان کے لیے اچھا پیغام لائی۔ کوہلی نے اعلان کر دیا کہ تیاری کر دہم آج اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ سب خوش ہو کر تیار ہوئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا لیکن شام سے پہلے ہی پھر ایک برفانی تودہ پہاڑ بن کر ان کی راہ میں حائل تھا، اور رکنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ پھر ایک جانب خیمے لگائے گئے اور تھکے ہوئے مسافر جلد کھانا کھا کر سرِ شام ہی سونے کے لیے چلے گئے۔

اگلی صبح بہت خوب صورت تھی۔ سب ہشاش بشاش ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہ بھی ان چاروں کے ساتھ تھی کیونکہ اس طرف آتے ہوئے ڈاکٹر ویدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا۔ وہ کیسے انکار کرتی۔ حالانکہ نمرتا کی طنزیہ مسکراہٹ اس کا حوصلہ توڑنے کے لیے کافی تھی۔

وہ سب گھومتے ہوئے کیمپ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے اسنو مین بھی بنایا۔ بقول شیکھر، اس کی شکل انشومن سے بہت زیادہ ملتی ہوئی لگ رہی تھی اس لیے انشومن کے گلے سے لال رنگ کا مفلر اتار کر اسے پہنا دیا گیا تھا۔

''ارے بھائی! ارمانی کا اتنا مہنگا مفلر ہے۔ واپس دو مجھے۔'' انشومن چلایا۔

''اگلی دفعہ آئیں گے نا۔ واپس اتار لینا۔ ابھی آ گے چلو۔'' ویدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

گھومتے گھومتے وہ ایک ایسی جگہ نکل آئے جہاں کسی گلیشیر میں سے پگھل پگھل کر پانی بہہ رہا تھا اور ایک چشمے کی صورت تھوڑی دور بہہ کر پھر برف میں اندر کہیں غائب ہو رہا تھا۔

''پانی...... اُف اتنا شفاف، اتنا سارا پانی۔ کتنے دن سے ہمیں اسٹوو پر برف پگھلا کر تھوڑا تھوڑا پانی دیا جا رہا تھا۔ آج کتنے دنوں کے بعد اتنا سارا پانی دیکھ رہی ہوں۔ مائی گاڈ! دل چاہ رہا ہے کہ ڈبکی لگائیں۔'' نمرتا نے چنچل خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تکلف کیسا؟ جاؤ...... پانی تمہیں بلا رہا ہے۔'' انشومن نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں؟ نہ بابانہ۔ بہت ٹھنڈا ہوگا۔ تھرمل سوٹ کو بھی بیکار کردے گا۔ تم ٹرائی کرو نا۔'' اس نے فرمائش کی۔

''کیوں بھئی؟ مجھے کون سا خزانہ مل جائے گا اس کے بدلے جو میں جان خطرے میں ڈالوں؟''

''بزدل! ڈرپوک کہیں کے۔'' نمرتا نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''اچھا! میں بزدل؟ ٹھیک ہے تو پھر اپنے اس شیر کو ذرا پانی میں دھکا دو۔ دیکھیں کتنی مانتا ہے تمہاری بات۔'' انشومن نے ویدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو نمرتا اٹھلائی۔

''میں جانتی ہوں۔ ویدی میری بات ٹال نہیں سکتا۔''

''کیا مطلب ہے بھئی؟ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتی ہو۔ پر کس کے لیے؟'' ویدی نے مذاق میں کہا تو نمرتا نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد پھیلائے۔ آنکھوں سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی۔ ہاں اور نہیں کی جدوجہد میں نمرتا کے ہاتھ میں پہنے بریسلیٹ کا ہک ویدی کے تھرمل سوٹ میں کاندھے کے نیچے اٹک گیا۔ اسے کھینچ کر نکالا گیا تو سوٹ وہاں سے تھوڑا سا پھٹ گیا۔ اور اسی کھینچا تانی میں ان دونوں نے مل کر ویدی کو اس پانی میں دھکا دے دیا۔ وہ خوشی سے اچھل کود کر رہے تھے کہ ویدی تڑپ کر پانی سے باہر آگیا۔

''لعنت ہو تم لوگوں پر۔ اتنا ٹھنڈا پانی تھا کہ تھرمل سوٹ میں بھی اس نے مجھے آلموسٹ فریز کر دیا ہے۔ چلو یہاں سے۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔''

''اوہ! سوری ویدی! چلو بھئی۔ واپس کیمپ چلو۔ ویدی کو اس وقت گرم کھولتی ہوئی کافی کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ سچ مچ ٹھنڈ کھا جائے گا۔''

انشومن نے اس کا مذاق اُڑانے کے انداز میں کہا تو نمرتا اور شیکھر نے بھی وہی انداز اختیار کیا۔ وہ اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

شائی نے ناگواری سے ان سب کو دیکھا۔

''کیسے بے حس دوست ہیں یہ۔ دوست کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔'' سوچتی ہوئی وہ بھی واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ تمام راستے وہ بار بار ویدی کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ تکلیف میں تھا۔

''شاید پانی کسی طرح میرے سوٹ کے اندر چلا گیا ہے۔ مجھے اپنے بدن پر عجب طرح کی ٹھنڈی ٹھنڈی جلن سی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کچھ زیادہ تکلیف دے رہی ہے۔'' ویدی نے بے چینی سے کہا۔

''او مائی گاڈ! ڈاکٹر پانی اگر آپ کے بدن پر کہیں جما، تو فراسٹ بائٹ کے سبب وہ جسم کے اس حصے کو ڈیڈ کر دے گا۔ ایک منٹ رکیں۔ مجھے بتائیں، تکلیف کس جگہ محسوس ہو رہی ہے۔ میں تھراپی کرتی ہوں۔'' شائی نے بے چین ہو کر اس سے پوچھا۔

''لیفٹ شولڈر کے نیچے۔ تکلیف بڑھتی جا رہی ہے شائی! اگر کچھ کرسکتی ہو، تو جلد کرو۔''

شائی نے اس کے کاندھے کے نیچے پیٹھ پر بھرپور طاقت کے ساتھ مساج شروع کیا۔ تب ہی اس کی نظر سوٹ میں موجود سوراخ پر پڑی۔ اور وہ چونک گئی۔ اس نے اور تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیے۔ پہلے تو ویدی کے منہ سے کراہیں نکلتی رہیں، پھر تھوڑی دیر بعد اس کی تکلیف قابلِ برداشت ہوئی تو شائی نے مشورہ دیا۔

''آپ جتنا تیز بھاگ سکتے ہیں۔ بھاگیے! ایس! ون ٹو تھری۔'' اس کے ساتھ ساتھ اس نے بھی دوڑ لگا دی۔ ویدی بھی جانتا تھا کہ دوڑ اس کے اندر حرارت پیدا کردے گی اور وہ ٹھنڈ کھانے سے بچ جائے گا۔ ورنہ......''

اور اس ورنہ سے بچنے کے لیے وہ، جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا، دوڑا۔ کیمپ پہنچ کر وہ نڈھال سا ہو کر گر پڑا۔ شائی نے جلدی سے کافی کا گرما گرم کپ اس کے کانپتے ہاتھوں میں پکڑایا پھر خود بھی پاس بیٹھ کر اسے پینے میں مدد دینے لگی۔ جیسے جیسے گرم کافی اس کے اندر جا رہی تھی، اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹ کم ہوتی جا رہی تھی اور سانسوں کی روانی بحال ہو رہی تھی۔

اسی اثنا میں وہ سب بھی پہنچ گئے اور سوائے سوری کہنے کے اور کچھ نہ کیا۔

''اب تم ٹھیک ہونا؟'' نمرتا نے اس کے بہت قریب ہو کر گلے میں بانہیں ڈالیں، اور بڑی ادا سے پوچھا تو شائی نے جلتی نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ان کا بلندیوں کا سفر جس قدر جوش و خروش سے شروع ہوا تھا، واپسی کا سفر اتنا ہی مایوس کن تھا۔ ان کے مقاصد تو حاصل نہیں ہوئے لیکن بہت سی جانوں کے نقصان، کئی زخمیوں اور بہت سے سامان کی تباہی کا صدمہ لے کر اب وہ سب اپنے اپنے گھروں کو روانگی کے لیے تیار تھے۔ لداخ

کے دارالحکومت لیہہ میں وہ چھوٹے سے ائرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے اس فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے، جو انہیں دہلی لے کر جانے والی تھی۔
چاروں امریکن، کوہلی اور ان کے چند ساتھی اسی فلائٹ سے جانے والے تھے۔
''کیوں بھئی! یہ سارے رنگیلے ڈاکٹر اور ان کے دوست یہاں کیوں رک رہے ہیں؟ کوئی خاص بات؟'' کوہلی نے ان سب کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کوئی خاص بات نہیں ہے سر! ڈاکٹر چتر ویدی کو خاصا تیز بخار ہے۔ اس حالت میں اس کا سفر کرنا کچھ مناسب نہیں ہے۔ پھر ہم سب اس طرف پہلی بار آئے ہیں۔ لداخ گھومنا بھی چاہتے ہیں۔ ایک دو دن لگیں گے۔ ویدی بھی ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لداخ بھی گھوم لیں گے۔ بس پھر ہم بھی نکل جائیں گے، اپنے اپنے گھر۔'' انشومن نے وضاحت کی۔
''او کے! لیکن ڈاکٹر ویدی کا بہت خیال رکھنا۔ ہمیں دوبارہ پھر جانا ہے چند مہینوں کے بعد۔ مشن ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ یہ بات یاد رہے نہ سب کو۔ ٹیم یہی جائے گی۔ کوئی بھی ڈراپ ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ یہ ایک سیکریٹ مہم ہے، اس لیے اس میں کوئی نیا ممبر شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' کوہلی نے انہیں ہدایات دیں۔
''اگلی بار روانگی کب ہوگی سر؟''
''ابھی کچھ پلان نہیں کیا ہے، لیکن کچھ مہینوں میں ہی جانا ہوگا۔ میں روانگی سے ایک ہفتے پہلے سب کو کال کروں گا۔ تیاری رکھنا اور کوئی لانگ ٹرم پلاننگ نہیں کرنا۔ از دیٹ کلیئر؟''
''یس سر!'' کئی آوازیں آئیں اور اسی وقت فلائٹ کی روانگی کا اعلان دہرایا جانے لگا تو مسافر ہاتھ ہلاتے ہوئے ٹرمینل کی جانب چل دیے۔
شائی بھی اب اپنے گاؤں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکٹروں کے ٹولے، خصوصاً ڈاکٹر ویدی نے اسے روک لیا۔
''شائی! تم مجھے اس طرح بیمار چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟'' اس نے بخار سے تپتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ جز بز سی ہوگئی۔
''آپ کے پاس تین تین ڈاکٹرز ہیں۔ وہ آپ کا بہترین علاج کر سکتے ہیں۔ میرا یہاں کیا کام ہے؟''
''نہیں شائی! ہم ڈاکٹرز ہیں، علاج کر سکتے ہیں۔ دیکھ بھال تو تمہاری ہی ذمے داری ہے۔ ہے نا؟'' شیکھر نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو شائی کو اس کی مسکراہٹ چڑانے والی محسوس ہوئی۔
''میری یہ ذمے داری صرف مہم کے دوران تک تھی۔ اب وہ ختم ہو چکی، تو میری ذمے داری بھی ختم۔ اب تو یہ ڈاکٹر نمرتا کا کام ہے۔ دیکھ بھال کرنا۔'' شائی کے لہجے میں ہلکی سی تپش تھی۔
''اونہہ ہوں! دیکھ بھال تو تم ہی کرو گی۔ میں تو شادی کروں گی اپنی جان سے۔ اب مجھ سے اور دور نہیں رہا جاتا تم سے میری جان!''
اس نے ویدی کے گلے میں بانہیں ڈال کر گال اس کے گال سے لگا کر بھینچا تو ویدی بھی کیف و سرور میں ڈوب گیا۔
''ہاں یار! یہاں شادی بڑی یادگار ہوگی۔ یہاں تم بڑی بڑی مہان جو کھم اٹھا رہے ہو۔ نندا دیوی کو سر کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہاں کی تصویریں اور ویڈیوز وغیرہ جب تم اپنے بچوں کو دکھاؤ گے تو وہ خود کو بڑا پراؤڈ فیل کریں گے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کے ممی پاپا کی شادی بھی یہیں ہوئی تھی تو سوچو! کتنا سرپرائز ہوں گے وہ۔ ہاں!'' انشومن نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا تو ویدی بھی مسکرایا۔
''اپنی راج ماتا کا اکلوتا کنور ہوں میں۔ ان کے دل میں میری شادی کو لے کر بڑے ارمان ہیں۔ اسٹیٹ کے لوگ بھی بڑی بے چینی سے میری شادی کے منتظر ہیں۔ ماتا جی نے تو ایک ہفتے تک کے میری شادی کے پروگرام پلان کیے ہوئے ہیں۔ اگر میں نے چپ چاپ یہاں شادی کر لی تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں یہ پاپ نہیں کر سکتا۔ شادی ہم وہیں اپنی اسٹیٹ میں کریں گے۔ سب کو اچھا لگے گا اور تمہاری بھی اس قدر خاطر داری ہوگی اور پروٹوکول ملے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''
''اونہہ ہوں۔ میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔ تمہارے بنا ایک پل مشکل ہو رہا ہے اور تم......'' نمرتا اس کے کان میں منمنائی تو وہ کچھ الجھ سا گیا۔ ''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ یہاں پنڈت کو بلوا کر ہم پھیرے لے لیتے ہیں، ریسپشن وغیرہ وہاں ہوتے رہیں گے۔'' نمرتا نے یہ کہتے ہوئے اس کے گال پر ایک بھرپور پیار بھی کر لیا۔
شائی سے دیکھا نہیں گیا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔
''ٹھیک ہے نمرتا! تم منالو اپنے ہونے والے پتی کو۔ جب یہ مان جائے تو ہمیں بتا دینا۔ ہم پنڈت کو پکڑ لائیں

گے۔" یہ کہہ کر انشومن اور شیکھر بھی باہر نکل گئے، اس یقین کے ساتھ کہ نمرتا کامیاب رہے گی۔

پھر یہی ہوا کہ شام کو ایک چھوٹے سے مندر میں ان دونوں نے چند لوگوں کی موجودگی میں پھیرے لیے۔ دولہا دلہن ہوٹل چلے گئے۔ انشومن اور شیکھر نے ان کی شادی کے سرٹیفکیٹ اور دوسرے ڈاکومنٹ بنوائے۔ پھر ہوٹل میں ہی ایک اچھی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔

ہال میں روشنیاں تھیں، خوشبوئیں تھیں۔ کھانے اور بہت سی شراب۔ میوزک چل رہا تھا جس کی دُھن پر کئی جوڑے تھرک رہے تھے۔

دولہا دلہن بھی ان کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ نمرتا بہت خوش نظر آرہی تھی اور ویدی چہرے سے بیمار اور کمزور نظر آرہا تھا۔ پھر ڈانس کرتے کرتے وہ بے انتہا تھکن سے نڈھال ہوکر نمرتا کی بانہوں میں جھول سا گیا۔ وہ اسے سہارا دیتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"ویدی! بخار نے تمہیں بہت کمزور کر دیا ہے۔ روم میں چلو۔ میں تمہیں طاقت دینے والا انجکشن لگاتی ہوں۔ تم بہتر فیل کرو گے۔ آجاؤ!"

اگلے تین دنوں میں بخار اتر جانے کے باوجود... طاقت دینے والی دوائیں اور انجکشن لینے کے باوجود ویدی کی جسمانی کمزوری بڑھتی ہی جارہی تھی۔

تیسرے دن انہیں موہن سنگھ کوہلی کی کال موصول ہوئی۔ ان سب کو ایک بہت ہی ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے دہلی طلب کیا گیا تھا۔

"لیکن سر! ویدی کی طبیعت تو کافی خراب ہے۔ ہم لوگوں کی پوری کوشش کے باوجود وہ ریکور نہیں کر رہا ہے۔ شاید اسے ہاسپٹلائز کرنا ضروری ہوگیا ہے۔" ڈاکٹر نمرتا نے کوہلی کو بتایا تو اس نے فوری طور پر فیصلہ سنا دیا۔

"او کے! پھر ایسا کرو اس شہزادے کو فوری طور پر اس کی اسٹیٹ بھجوا دو۔ وہاں اس کی راج ماتا جی اس کے بہترین علاج کا بندوبست کروا دیں گی۔"

"شائی کو اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری دے کر دونوں کو پہلی فرصت میں اس کی فلائٹ میں بٹھا دو۔ اور تم لوگ فوراً یہاں دہلی پہنچو۔"

کوہلی نے احکامات دے کر فون بند کر دیا۔ اور ان احکامات کی تعمیل میں شائی کو ویدی کے ساتھ اس کی اسٹیٹ جانا پڑا۔

ائیرپورٹ پر وہ دونوں جونہی باہر آئے، کئی باوردی اہلکاروں نے آکر انہیں سلام پیش کیا اور بڑی عزت و احترام سے انہیں لاکر گاڑی میں بٹھایا جس پر اسٹیٹ کا مخصوص مونوگرام سنہری حروف میں کندہ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ان کی گاڑی جس محل میں داخل ہوئی، اس کی وسعت اور خوب صورتی نے شائی کو مبہوت کر دیا تھا۔ کئی ایکڑوں پر پھیلا وہ راج محل اپنے آرکی ٹیکچر، سبزہ زاروں اور فواروں سے مزین واقعی قابلِ دید تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ راج ماتا جی آئیں تو انہوں نے بیٹے کی حالت کا بغور جائزہ لیا۔

کنور پرکاش چتر ویدی! یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟ بہت کمزور اور نڈھال نظر آرہے ہیں۔ اس دفعہ یہ مہم آپ کو بہت زیادہ تھکا گئی ہے۔ اب آپ جب تک اچھی طرح ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔" ہلکے موتیا رنگ کی نفیس ریشمی ساڑی میں راج ماتا ایک دبنگ شخصیت محسوس ہوئیں۔

"جی ماتا جی!" کنور نے کھڑے ہوکر اُن کا احترام کیا، تو شائی بھی کھڑی ہوگئی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ شائی ہے ماتا جی! ڈاکٹر ہی سمجھ لیں۔ اس نے میری بیماری اور تکلیف میں میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ ہمارے ٹیم لیڈر مسٹر کوہلی نے اسے میرے ساتھ یہاں بھجوایا ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو ہم دونوں کوہلی رپورٹ کرنا ہے۔"

"شاید آپ نے ہماری بات نہیں سنی کنور! آپ جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے، ہم آپ کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتے اور مسٹر کوہلی سے ہم خود بات کر لیں گے۔ مکمل صحت یابی کے بعد ہی آپ اس بارے میں کچھ سوچیے گا۔ ہم نے اپنے ڈاکٹر سمیر رائے چوہدری کو بلوایا ہے۔ لنچ تک وہ آجائیں گے۔ جائیے آرام کیجیے۔ لنچ پر ملاقات ہوگی۔ شائی کو بھی روم میں پہنچا دو شونل!"

رانی صاحبہ احکامات دے کر باہر چلی گئیں۔ شائی کو شونل نے گیسٹ ہاؤس کے ایک شاندار کمرے میں پہنچا دیا۔

☆☆☆

مائیکل، ایشلے، ٹیرین اور دو دوسرے امریکن واپس چلے گئے تھے۔ آخری میٹنگ میں یہ طے ہوا تھا کہ انڈین کوہ پیما لیڈر کوہلی اور بعض دوسرے منتظمین ان سے رابطے میں رہیں گے۔ جیسے ہی نندا دیوی پر موسمی حالات سازگار ہوں گے، وہ دوبارہ سے پوری تیاری کے ساتھ اس مہم کی ابتدا

کریں گے۔ انہیں یہاں آنے کے لیے صرف ایک ہفتہ پہلے مطلع کر دیا جائے، تو وہ پہنچ جائیں گے۔

تاہم موسم کے تیور بگڑے ہی رہے اور اس کے بہتر ہونے کا انتظار طول کھینچتا چلا گیا۔

ان کی واپسی کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔ کمانڈر کوہلی کو ایک دوپہر ایک کال موصول ہوئی۔

''ہیلو سر! اِٹس ایمرجنسی۔ ایک بہت ہولناک خبر ہے۔ یو نو! ڈاکٹر چتر ویدی جب سے واپس آئے ہیں، مستقل بیمار ہیں۔ یہاں ان کا بہترین علاج ہونے کے باوجود وہ ریکور نہیں کر پا رہے ہیں۔ اور سر......'' کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔

''ہمت کرو شائی! مجھے بتاؤ۔ کیا بات ہے؟''

''سر! ابھی ابھی ڈائیگنوس ہوا ہے کہ...... کہ ان کی باڈی میں...... الفاریڈی ایشن کے اثرات پائے جا رہے ہیں۔ وہ بہت بُری حالت میں ہیں سر! کوئی دوا، کوئی علاج ان پر اثر نہیں کر رہا ہے۔ سر! ہی از سنکنگ...... ہی اِز سنکنگ سر!''

شائی بولتے بولتے اپنا ضبط کھو بیٹھی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''شائی! شائی پلیز! لسن شائی! حوصلہ کرو...... ہمت کرو...... اور غور سے میری بات سنو۔ اس کے ڈاکٹرز کون ہیں؟ مجھے ان کے نام بتاؤ۔ اور تم بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ...... یہ ایک سیکریٹ ہے۔ اِٹس آ گریٹ سیکریٹ۔ یہ کسی بھی طرح، کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ بات اگر پھیل گئی تو ہم سب بہت مشکل میں آ جائیں گے۔ میں پہلی فلائٹ سے وہاں آ رہا ہوں۔ پلیز! ٹیک کلیئر۔ او کے؟''

''او کے سر!'' شائی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

کوہلی اگلے دن ہی پہنچ گیا اور آتے ہی اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے ساتھ تین اور افسر بھی تھے۔ سب سے پہلے تو اس نے ویدی کے روم میں آنے والوں پر پابندی لگائی۔

اس روم میں صرف ایک ڈاکٹر، ایک نرس اور پیرا میڈیکل کا بھی صرف ایک ہی شخص آئے گا۔ اور وہ بھی وہ ہوں گے جن کو راج خاندان کے فیملی ڈاکٹر سمیر رائے چوہدری اجازت دیں گے۔ فوراً ہی کمانڈر کوہلی نے کنور کے معالجوں اور ڈاکٹر چوہدری کے علاوہ شائی کو بھی بلوا کر ایک ہنگامی میٹنگ شروع کی۔ اس میٹنگ میں ان کے ساتھ آنے والے تینوں افسران بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر سمیر کے مشورے پر رانی جی کو بھی شریک کیا گیا۔

''کوئی بھی بات شروع کرنے سے پہلے مسٹر کوہلی! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے پر یہ الفاریڈی ایشن کے اثرات کہاں اور کیسے آئے؟ کیا آپ کی اس مہم میں آپ کی ٹیم کچھ ایٹمی مادّہ لے کر جا رہی تھی۔ اور اگر اس کا جواب ہاں میں ہے، تو ہمیں بتایا جائے کہ تمام ٹیم کو بتا کر اپنے ساتھ لے جایا گیا تھا۔ ان سب کو اس خطرے سے آگاہ کیا گیا تھا۔ جس کے اثر سے ہمارا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ ہمارا اکلوتا بیٹا اور اس راج کا اکلوتا وارث ہے۔ ہم اس معاملے کو کورٹ تک لے کر جائیں گے۔ بتایئے ہمیں کیا آپ ایٹمی مادّہ کیری کر رہے تھے اور ساری ٹیم اس کے بارے میں جانتی تھی؟''

ان کی بات سن کر کوہلی سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے، سر اٹھا کر رانی جی کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے رانی صاحبہ! کنور جی کے ساتھ یہ عجیب حادثہ ہوا ہے۔ ہماری ٹیم کوئی ایٹمی مادّہ کیری نہیں کر رہی تھی۔ یہ بڑا پُراسرار سا معاملہ ہے۔ پوری ٹیم میں سے کوئی بھی اس سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ ہماری وجہ سے ہوتا، تو باقی ٹیم میں سے بھی کچھ نہ کچھ لوگ تو متاثر ہوتے۔ ہمیں اس معاملے کو دیکھنا پڑے گا۔''

''مسٹر کوہلی! مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔ میرے اکلوتے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔ مجھے ہر صورت حقیقت معلوم ہونا چاہیے۔'' رانی جی کے لہجے میں شعلوں کی تپش تھی۔

''رانی صاحبہ! پچھلے سال چین نے ایٹمی دھماکا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے یہ ہماری سرحد کے نزدیک ہی کیا ہو۔ آپ جانتی ہیں لداخ میں ہماری طویل سرحد ان سے ملتی ہے۔ اور اس کے اثرات ہماری سرحد کے اس طرف بھی آ گئے ہوں۔'' کوہلی نے رانی جی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''اور ان اثرات کا واحد شکار ہمارا کنور ہوا ہے۔ دو سو لوگوں میں سے صرف ایک...... ہمارا بیٹا۔ مسٹر کوہلی! ہم سچ جاننا چاہتے ہیں۔ اور سچ جاننے کے لیے ہمیں کسی بھی حد تک جانا پڑا، تو ہم جائیں گے۔''

''ہم بھی حقیقتِ حال جاننے کے لیے آخری حد تک جائیں گے رانی صاحبہ! اور یقینی طور پر معلوم کر لیں گے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم بات یہ

ہے کہ کنور جی کی فوری ریکوری کے لیے کیا کیا جائے؟ آپ کے ڈاکٹر سمیر انڈیا کے بہترین ڈاکٹر ہیں۔ ان کی سربراہی میں کنور جی کا علاج ہوگا اور ڈاکٹر سمیر جو سہولیات چاہیں، کوئی ڈاکٹر جو کتنے ہی ٹاپ کا ہو یا باہر کہیں علاج کروانا ہو۔ ہم سب کچھ فراہم کریں گے۔"

"مسٹر کوہلی! یہ سب کچھ تو ہم خود بھی کر لیں گے۔ آپ ہمیں صرف اس سوال کا جواب ڈھونڈ دیں کہ ہمارے کنور کو یہ روگ لگا کیسے؟ اور اس کا ذمے دار کون ہے؟" رانی جی یہ کہہ کر اٹھ کر چلی گئیں تو کوہلی نے ٹشو اٹھا کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ایک طویل سانس لی۔

"ڈاکٹر! یہ ایک بہت ہائی پروفائل کیس ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس میں ایک کنور متاثر ہوا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اگر یہ بات پھیلی تو لوگوں میں دہشت پھیل جائے گی۔ کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ ہماری گنگا جو کروڑوں لوگوں کو پانی فراہم کرنے کا ذریعہ ہے، وہ انہی پہاڑوں سے نکلتی ہے۔ اگر اس کے پانی نے یہ جان لیوا الفا ریڈی ایشن کی شکل میں موت بانٹنا شروع کر دی تو کروڑوں لوگ انتہائی دردناک جیون جئیں گے اور اس سے بھی دردناک موت مریں گے۔ اس لیے اس صورتِ حال کو ہر صورت میں چھپانا ہے۔ خفیہ رکھنا ہے۔ ہم یہاں سے جا کر ایک دو بہترین ڈاکٹرز کو چیک کرتے ہیں جو اس معاملے کو ہینڈل کرنے میں آپ کے مددگار ثابت ہو سکیں۔ اور انہیں یہاں بھیج دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ کو کوئی بھی ہیلپ درکار ہو تو میں ہر وقت آپ کے کونٹیکٹ میں رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے پوری احتیاط اختیار کریں گے۔"

"ہوپ فور دا بیسٹ۔" کوہلی نے ڈاکٹر سمیر چوہدری کی طرف متوجہ ہو کر کہا اور اس کی ٹیم زیادہ نہیں رکی وہ شام کو واپس دہلی چلی گئی۔

ڈاکٹر سمیر وہاں سے نکل کر ویدی کے کمرے میں پہنچا جس کو اس نے چھوٹے موٹے ہاسپٹل کا روپ دے رکھا تھا۔ ویدی بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ زرد دکھائی دے رہا تھا۔ اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی ڈرپ سے محلول قطرہ قطرہ اس کے ہاتھ پر لگی سوئی کے ذریعے اس کے جسم میں جا رہا تھا۔ شائی اس کے نزدیک کھڑی اداس نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحے رانی جی بھی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"شمیتا! میرا خیال ہے کنور کو اب ہمیں ہاسپٹل لے جانا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے بہت سے ٹیسٹ ہونا ہیں۔ اور ویسے بھی اگر یہ واقعی ریڈی ایشن کا کیس ہے تو دوسروں کو بھی شاید ان سے دور رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔"

ڈاکٹر نے رانی جی کو ان کے نام سے اس طرح مخاطب کیا تو شائی کو اندازہ ہوا کہ شاید وہ دونوں بہت اچھے دوست بھی ہیں۔

"ٹھیک ہے سمیر! اگر تمہیں لگتا ہے کہ یہ ضروری ہے، تو کر لو انتظام۔ لیکن پلیز! کچھ بھی کرو، میرے کنور کی جان بچا لو۔ کسی بھی طرح۔ کیسے بھی کر کے۔ تم جانتے ہو۔ اس پوری اسٹیٹ کا یہ اکلوتا وارث ہے۔ اور میری زندگی کا واحد سہارا۔ بھگوان نہ کرے اگر اسے کچھ ہو گیا۔ تو ہم تو ویسے بھی جی نہیں پائیں گے۔ ہماری پوری اسٹیٹ بھی تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

"پریشان نہ ہو۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں اور ڈاکٹرز سے بھی مشورہ کروں گا۔ شاید کوئی بہتر مشورہ مل سکے۔ انڈیا میں یہ ہے بھی تو اپنی نوعیت کا پہلا کیس۔ کسی کو اس کے علاج کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں ہے۔ میں باہر سے بھی پتا کرتا ہوں۔ لندن میں میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے۔ کراموئیل ہاسپٹل میں۔ میں آج ہی اس سے ویدی کا کیس ڈسکس کرتا ہوں۔ شاید وہ کوئی اچھا مشورہ دے سکے۔ تم فکر نہ کرو۔ دھیرج رکھو۔"

ڈاکٹر نے رانی جی کو تسلی دی اور ویدی کو ہاسپٹل منتقل کرنے کے انتظامات کے بارے میں فون پر متعلقہ لوگوں سے بات کرنا شروع کر دی۔

پھر فون بند کر کے انہوں نے شائی کو مخاطب کیا۔

"شائی! ہاسپٹل میں ویدی کی دیکھ بھال بھی تمہارے ہی ذمے ہو گی۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہم اس بارے میں کسی پر بھروسا بھی نہیں کر سکتے۔ امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔"

شائی نے اثبات میں سر ہلا کر اس ذمے داری کو قبول کر لیا۔

☆☆☆

شائی کچھ دیر پہلے ہی ہاسپٹل سے واپس آئی تھی۔ اسے اپنے کپڑے اور کچھ ضروری سامان لینا تھا۔ شاور لے کر آئی تو کھانا اس کے کمرے میں ہی رکھا تھا۔ ملازمہ نے اسے پیغام دیا کہ کھانے کے بعد رانی جی نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اور وہ بہت غور سے اس کے چہرے کی طرف

دیکھ رہی تھیں، جس پر غم اور اداسی نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''تم کون ہو لڑکی؟ اور کہاں سے آئی ہو؟'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''لداخ سے چار سو میل دور ایک گاؤں ہے لانگ۔ اس کا سردار ہے تمار لینگ۔ میں اس سردار کی بیٹی ہوں شائی لینگ۔''

''اس طرف کے لوگوں کا ناک نقشہ کچھ الگ ہوتا ہے۔ چھوٹی آنکھیں، تھوڑا چپٹا چہرہ، تم ان سے ملتی نہیں ہو۔''

''جی! میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ وہ ناروے کی رہنے والی ہیں۔ ٹریکر ہیں۔ ایک دفعہ ایک کوہ پیما ٹیم کے ساتھ نندا دیوی سر کرنے آئی تھیں۔ ساری ٹیم حادثے کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ وہ طوفانی ہواؤں کے جھکڑوں کی زد میں آ کر، ایوالانچ کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے آ گری تھیں۔ بابا نے انہیں دیکھا تو اٹھا کر گھر لے آئے۔ وید سے ان کا علاج کروایا۔ ٹھیک ہونے میں انہیں سال لگ گیا۔ پھر وہ واپس نہیں گئیں۔ بابا سے شادی کر کے وہیں رہ گئیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ اس لیے الگ لگتی ہوں۔''

''ہم م م م...... تم بھی ٹریکر ہو؟ میڈیکل ٹیکنالوجسٹ ہو۔ ویدی والی ٹیم کے ساتھ اوپر گئی تھیں؟'' رانی جی نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہاری ٹیم میں ڈاکٹر نمرتا بھی تھی۔ اور کون سے ڈاکٹر تھے؟'' انہوں نے کچھ تلخ سے انداز میں پوچھا تو شائی نے سر اٹھا کر انہیں چونک کر دیکھا۔

''انشومن اور شیکھر۔ ایک امریکن ڈاکٹر ٹیرین بھی تھی۔''

''شائی! مجھے اچھی طرح سوچ کر، یاد کر کے ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤ۔ تم نے پہلی بار کب محسوس کیا کہ ویدی کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے اور اس نے کیا بتایا کہ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے؟''

''جی رانی جی! ہم بلندیوں پر پہنچے تو تیز ہواؤں کے طوفانوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمارا اگلا کیمپ تھوڑی دور تھا لیکن طوفان کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں اپنی جانیں بچانا مشکل ہو گیا۔ کئی لوگ اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ ایوالانچ بھی کھسکنے شروع ہوئے تو ہمیں فوری طور پر ایک جگہ کیمپ لگا کر رکنا پڑا۔ پھر ہم سامان اس جگہ محفوظ کر کے واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ کافی نیچے آ کر بھی ہمیں ایک جگہ رکنا پڑا کیونکہ ایوالانچ نے راستہ بند کر دیا تھا۔ ہمیں اس کے پگھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ وہیں ایک دن گھومتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں برف کے اندر ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ ویدی کو نمرتا اور انشومن نے مذاق میں مل کر..... پانی میں پھینک دیا۔ وہ فوراً ہی باہر نکل آئے لیکن شاید کچھ پانی ان کے کپڑوں کے اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں بہت زیادہ سردی لگی اور شولڈر کے نیچے بہت زیادہ جلن محسوس ہوئی۔ اس کے بعد ہی سے ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی۔ نیچے آنے تک وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بعد میں بخار ختم بھی ہو گیا لیکن وہ اتنی زیادہ کمزوری محسوس کرنے لگے کہ چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا۔ ان کے ساتھی ڈاکٹرز انہیں طاقت دینے والی دوائیں، ٹانک وغیرہ دیتے رہے۔ لیکن ان کا اثر وقتی تھا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے، آپ نے بھی دیکھ لیا ہے۔''

''سامان میں کیا کیا تھا؟''

شائی سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کہے؟ اسے وہ حلف یاد آیا جو کوبلی نے ان سب سے لیا تھا کہ وہ اپنے اس مشن کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ کیونکہ یہ راز بھارت ماتا کا راز ہے۔ اس کی امانت ہے۔ تھوڑی دیر سوچ کر اس نے سر اٹھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''کچھ خاص نہیں تھا۔ وہی کھانے پینے۔ گرمی فراہم کرنے کے سامان کے علاوہ میڈیکل سے متعلق سامان تھا۔''

''تم نے بہت دیر کے بعد اور بہت کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا ہے۔ شاید یہ حساب کتاب کرنے میں دیر لگ گئی کہ کیا بتایا جائے اور کیا چھپایا جائے۔''

''میں نے کچھ چھپایا تو نہیں ہے۔ جو تھا، وہ بتا دیا۔'' شائی نے اعتماد سے خالی لہجے میں کہا تو انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم مجھے سچ بتاؤ یا نہیں۔ میں سچ کو ڈھونڈ ہی لوں گی۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جہاں نمرتا اور انشومن ہوں، وہاں کچھ نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

''رانی جی! آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟ ان دونوں نے ایسا کیا کیا ہے؟''

''دیکھو لڑکی! تم اتنے دن ان لوگوں کے ساتھ گزار کر آئی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اندازہ تمہیں بھی ہوا ہوگا۔ وہ لوگ ویدی کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایک کنور ہے۔ ایک اچھی، بڑی اسٹیٹ کا مالک ہے۔ اتنا بڑا اسٹیٹس، اتنی زیادہ دولت۔ وہ دونوں ہمیشہ اس سے فائدے اٹھانے

کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔ نمرتا تو اور بھی نہ جانے کن ہواؤں میں اُڑ رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوگی اگر تم یہ کہو گی کہ تمہیں ان کی نیتوں کا اندازہ نہیں ہوا۔“

رانی جی نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اسے بہت کچھ بتا دیا۔ اور اس حقیقت کا اندازہ وہ بہت اچھی طرح کر چکی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ رانی جی سے یہ اقرار نہیں کر سکی۔ شاید انجانے میں وہ ویدی کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ کنور جی کے دل میں صرف نمرتا ہی بستی ہے۔ اس کے دل کا گداز صرف اس کی ذات تک محدود تھا۔

”شائی جی! تھاپا جی گاڑی لے کر آ گئے ہیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہلوایا ہے کہ انہوں نے جس سامان کا کہا تھا وہ آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔“ شونل نے آ کر اطلاع دی تو وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے۔ ڈاکٹرز سر توڑ کوششیں کر رہے تھے لیکن ویدی کی حالت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ اب وہ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ انہیں علاج کی غرض سے باہر لے جایا جا سکے۔

اس دن بھی وہ گاڑی میں ہاسپٹل سے محل آ رہی تھی تو کنور کی حالت دیکھ کر اس کا دکھ سے بھرا دل برس پڑا اور اس برسات کی نمی اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ ڈرائیور تھاپا نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا اور اس سے اس کی اپنی زبان میں اداسی کا سبب پوچھا تو بے ساختہ چونک پڑی۔

”تھاپا جی! آپ ہمارے علاقے کے رہنے والے ہو؟ مجھے جانتے ہو کیا؟“

”ہاں شائی بی بی! آپ کی بستی لانگ کے قریب ہی میرا گاؤں ہے۔ سردار تمار لینگ کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ انہی کی بیٹی ہو۔ اپنی سی لگتی ہو اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔ آپ کیوں اداس ہو؟ کیا کنور جی کی وجہ سے؟“

”ہاں تھاپا جی! وہ بہت اچھے انسان ہیں اور انہیں اس طرح بے بسی سے موت کے منہ میں جاتا دیکھ کر میں بہت دکھی ہوں۔ کاش میں انہیں بچا سکتی۔“

”بی بی! انہیں جو تکلیف ہے، ہو سکتا ہے اس کا علاج آپ کی بستی کے وہ بوڑھے وید کر سکیں جو اتنے تجربہ کار ہیں کہ ہر مرض کا علاج کر لیتے ہیں۔ اُن سے پوچھ لیں۔“

”ہاں آ آ آں..... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ان کا مجھے خیال تو آیا تھا۔ مگر کنور جی کی تکلیف کچھ اس قسم کی ہے کہ شاید وہ بھی کچھ کر نہ پائیں۔ اور ویسے بھی مجھے کنور جی کی دیکھ بھال کے لیے رکھا گیا ہے۔ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت ملے گی بھی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ ان کی بیماری کی ساری تفصیل کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دیں۔ میں چھٹی لے کر چلا جاتا ہوں اور وید جی سے مل کر انہیں زبانی بھی بتا دوں گا۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس اس کا کوئی علاج ہو۔“

”سچ تھاپا جی! آپ جا سکتے ہیں؟ فوراً۔“ اس نے بچوں کی سی خوشی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا تو تھاپا نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے میں راج محل پہنچتے ہی آپ کو کنور جی کی بیماری کی ساری تفصیل لکھ کر دے دیتی ہوں۔ آپ جس قدر جلدی جا سکیں، نکل جائیے۔ اور واپسی پر کوئی اچھی خبر لے کر آئیے۔ وید جی کا کوئی ایسا نسخہ جو کنور کو دوبارہ ویسا ہی بنا دے جیسے کہ وہ تھے۔“

”ٹھیک ہے شائی بی بی! میں چھٹی لے کر کل ہی نکل جاتا ہوں۔ آپ دعا کریں کہ وید جی کے بس میں کچھ ایسا ہو جو کنور کے لیے زندگی بن جائے۔ میں جلدی آؤں گا۔“

گاڑی رک گئی تھی۔ شائی جلدی سے اتر گئی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آ کر ایک لفافہ تھاپا کو دیا جس میں اس نے ساری تفصیل لکھ دی تھی۔ تھاپا روانہ ہو گیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے لائبریری کے کھلے دروازے سے ڈاکٹر سمیر نظر آئے، تو وہ ان کی طرف چلی گئی۔

”آؤ شائی! اندر آ جاؤ۔ یہ دیکھو! میں نے اپنے دوست ڈاکٹر سنہا سے بات کی تھی۔ یہ آج کل لندن کے کراموئیل ہاسپٹل میں کام کر رہا ہے جو کچھ اس نے بتایا ہے، وہ کچھ تسلی بخش نہیں ہے۔ اور اس نے ریڈی ایشن کے بارے میں تو بہت ہی خوفناک باتیں بتائی ہیں کہ وہ کس طرح انسان کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے۔“

”سر! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔ کیا کرتی ہے یہ انسانوں کے ساتھ؟“

”ریڈی ایشن کے شکار انسان میں پلوٹونیم کے ذرات داخل ہوتے ہیں اور وہ اتنے متحرک ہوتے ہیں کہ پھیپھڑوں اور معدے سے ہوتے ہوئے، جگر اور ہڈیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس الفا ریڈی ایشن سے جگر اور ہڈیاں بھربھری ہو کر گھلنے لگتی ہیں اور یہ کینسر میں مبتلا ہو

جاتے ہیں جس کا اختتام انتہائی تکلیف دہ موت پر ہوتا ہے۔"

"تو کیا کنور بھی......؟" شائی کا لہجہ ڈبڈبایا ہوا تھا۔

"اچھی امید رکھنا چاہیے۔ اس نے اس کے علاج کے لیے کچھ ہدایات دی ہیں۔ کچھ خاص میڈیسنز ہیں، جو وہ وہاں سے بھیج رہا ہے۔ کل تک پہنچ جائیں گی۔ ہم کل سے ہی ان کا استعمال شروع کروا دیں گے۔ ہوپ فار دا بیسٹ شائی! ڈونٹ وری۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر سمیر، شائی کی جذباتی کیفیت دیکھ کر بہت کچھ سمجھ رہا تھا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگلے دن ہی دواؤں کا ایک بڑا سا پارسل آ گیا اور ڈاکٹر سمیر نے فوراً ہی ڈاکٹر سنہا کی حسب ہدایت ویدی کو استعمال کروانا شروع بھی کر دیا۔

شائی اس کے بیڈ کے پاس سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹی۔ وہ اس کی حالت کو لمحہ بہ لمحہ نوٹ کر رہی تھی۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹے وہ اسی امید پر ویدی کی کیفیات کو نوٹ کرتی رہی... کہ شاید اب کچھ بہتری کا عمل شروع ہو جائے لیکن وہ بیڈ پر اسی طرح ساکت پڑا تھا اور اس کے جسم سے متصل تمام کے تمام آلات وہی ریڈنگ دے رہے تھے۔ جو پہلے تھیں۔ جو گراف پہلے جس طرح بن اور بگڑ رہے تھے۔ وہ سب ویسے ہی زاویے دکھا رہے تھے۔

دو دن ایسے ہی گزر گئے تو شائی میں مایوسی کے گہرے سائے پھیلنے شروع ہو گئے۔ اتنے میں ڈاکٹر سمیر آئی سی یو میں داخل ہوئے۔

"اینی پروگریس شائی؟" انہوں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا تو شائی نے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

"اسے سانس لینے میں پرابلم ہو رہی ہے۔ اب اسے وینٹی لیٹر پر لانا پڑے گا۔" ڈاکٹر سمیر نے ہدایت دی تو فوراً ہی اس کے منہ پر آکسیجن فراہم کرنے والا ماسک لگا دیا گیا۔

"شائی! میں یہاں ہوں تم محل جاؤ۔ تھوڑا آرام کرو اور ضروری کام نمٹا کر شام تک آ جاؤ۔ جب تک میں اس کا خیال رکھوں گا۔ او کے! اور ہاں رانی صاحبہ سے ضرور مل لینا، وہ تمہیں پوچھ رہی تھیں۔"

شائی اثبات میں سر ہلا کر آئی سی یو سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

وہ سب انڈین انٹیلی جنس "را" کے انتہائی سینئر افسران اور کارکن تھے۔ بڑے سے ہال میں بڑے بڑے مانیٹرز پر نظر آنے والے مناظر نے اپنی سنسنی خیزی کے سبب ان سب کو اپنی اپنی سیٹ پر فکس کیا ہوا تھا۔ وہ پوری توجہ سے اس چھوٹی سی ٹیم کے ارکان کو برف کے شدید طوفانوں سے لڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ فضا میں معلق ہیلی کاپٹر ان تیز ہواؤں کی زد میں تھرتھرا رہا تھا جس سے لٹکی ہوئی سیڑھی سے وہ چھ افراد ابھی ابھی اس برفانی سطح پر اترے تھے۔ اپنے ریڈی ایشن سے محفوظ رکھنے والے، بھاری سوٹوں میں ملبوس وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے زمین سے وہ سیدھے چاند پر اترے ہیں اور اس وقت چاند کی سطح پر بہت خطرناک قسم کے برفانی طوفانوں میں پھنس گئے ہیں۔

وہ سب مکمل انہماک سے اسکرین پر نظریں گڑائے انہیں آگے بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر انہیں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ اب چھ افراد کی وہ ٹیم ایک دوسرے کو رسوں سے منسلک کر کے سخت جمی ہوئی برف میں کیلیں ٹھونک کر سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہواؤں کے جھکڑ بار بار اُن کے قدم اکھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن وہ جسم و جان کی پوری قوت سے اپنے راستے پر آگے بڑھ رہے تھے۔

ایسے میں ہی اچانک ایک حادثہ ہوا اور سب سے آگے جانے والا ایک ٹریکر آگے قدم رکھتے ہی برف میں کہیں غائب ہو گیا۔ شاید وہاں برف میں چھپی کوئی کھائی تھی، جس نے اسے نگل لیا تھا اور اب باقی دوسرے لوگ بھی، جو رسی کے ذریعے اس سے منسلک تھے آہستہ آہستہ اس اَن دیکھی کھائی کی طرف کھنچ رہے تھے۔ وہ سب اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے، لیکن برف کی پھسلواں سطح پر اپنے آپ کو بچانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ خطرہ بہت بڑا تھا اور اس کا سدِباب کسی کے بس میں نہیں تھا۔ اگر انہیں کسی طرح روکا نہ جا سکا تو وہ چھ کے چھ اس کھائی میں گر کر غائب ہو جانے والے تھے۔

ہال میں موجود سب لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے افسوس میں سر ہلا رہے تھے۔ وہ اپنے اسکرین پر صرف ان مناظر کو دیکھ سکتے تھے۔ وہاں اس برف زار میں ... موجود لوگوں سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ انہیں کوئی ہدایت دے سکتے۔ پھر ان کے چیف نے فون اٹھایا اور ہیجانی لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"ہیلو! اہاں جاپر سے رابطہ کرواؤ۔ جلدی۔ ہری اَپ

مین...... ہری اَپ۔ ہاں گنیش! وہاں پوسٹ پر حادثہ ہوگیا ہے۔ جلدی ان کی مدد کے لیے جاؤ۔ ابھی فوراً۔ اور وہاں پہنچ کر فوراً یہاں ہیڈ آفس میں اطلاع دو۔ گو! گو! گو۔''

ان سب کی نظریں بدستور اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سب اس مختصر ٹیم کے افراد کو موت کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے اور بے حد مضطرب تھے۔ اب دوسرا فرد بھی اس اَن دیکھی کھائی میں داخل ہو رہا تھا اور گرنے سے پہلے وہ بُری طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا آدمی بھی منظر سے غائب ہوگیا۔

''او مائی گاڈ!...... او مائی گاڈ!'' لوگوں کے زیرِ لب بڑبڑانے کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اتنی اہم اور خاص مہم ناکام ہونے جارہی تھی۔

تیسرے نمبر پر رسی سے منسلک شخص نے چھوٹی سی کلہاڑی سے اپنے سامنے موجود اس رسی کو کاٹ دیا، جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی، اور اگلے تین افراد اس اندھی برفانی کھائی کی گہرائیوں میں کہیں دور دفن ہو گئے۔ اب اس جگہ صرف تین افراد نظر آرہے تھے جو موت کے منہ سے بچ جانے پر سکوت کی کیفیت میں آگئے تھے۔ انہیں اس کیفیت سے نکلنے میں کئی منٹ لگ گئے۔

آخرکار بچ جانے والوں کا سفر دوبارہ شروع ہوا تو ہال میں موجود لوگوں نے تالی بجا کر ان کی ہمت کو داد دینے کی کوشش کی۔ اگلے ساڑھے تین گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد آخرکار ٹیم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے برف کو ہٹانا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں مطلوبہ کامیابی کے آثار ملنا شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے برف میں سے جھانکنے والا نیلے رنگ کا پیراشوٹ کینوس کا ایک حصہ دکھایا، تو اس ہال میں پُرجوش تالیاں گونج اٹھیں۔ سب کے چہروں سے جھانکنے والے خوشی کے بھرپور تاثرات بتا رہے تھے کہ مہم کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

اسی وقت فضا میں خصوصی طور پر تیار کیے گئے ہیلی کاپٹر کی آمد ہوئی۔ یہ سخت ترین ٹھنڈ میں بھی تیس سے چالیس منٹ تک ٹھہر سکتا تھا۔ عام چاپر تو اس یخ بستہ زون تک جا بھی نہیں سکتے۔ اتنی بلندی پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کا فیول جم جاتا اور انجن سیز ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ خصوصی ہیلی کاپٹر ہی وہاں تک جا سکتے ہیں۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی وہ فضا میں معلق ہوا۔ اس میں سے ایک رسی لٹکائی گئی اور ٹیم کے تینوں افراد وہاں سے سامان اٹھا اٹھا کر اس سے لٹکتی ہوئی ایک جھولی میں رکھتے رہے۔ فوراً ہی سامان لے کر وہ مخصوص ہیلی کاپٹر واپسی کے لیے روانہ ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسرا ہیلی کاپٹر ٹیم کے باقی ماندہ افراد کو بھی لے کر روانہ ہوگیا۔

یہ بڑی اور بہت خفیہ مہم تھی۔ اس کی کامیابی پر ہال میں موجود تمام افراد بے حد خوش تھے، ایک دوسرے کو گلے لگا لگا کر مبارکباد دے رہے تھے۔ ساتھ ہی اپنے وطن کے لیے نعرے بازی بھی ہو رہی تھی۔ اس خوشی کے سمے ان لوگوں کو کوئی یاد نہیں رہا تھا جو اس راستے پر چلتے ہوئے اپنی جانوں سے گزر گئے۔ اور انہیں مارنے والے وہ لوگ تھے جو اُن کے دوست، ساتھی اور ہم قدم تھے اور جنہوں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے ان کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔

☆☆☆

کمرے کی خاموش اور گمبھیر فضا میں صرف شائی کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ سننے والے ڈاکٹر سمیر اور رانی جی تھے، ڈاکٹر سمیر چہرے پر سنگین سی کیفیت لیے اس کی طرف متوجہ تھے جبکہ رانی جی کے چہرے پر بے انتہا دکھ کے ساتھ ساتھ کچھ اشتعال کی کیفیت بھی نظر آرہی تھی۔ وہ بھی پوری طرح شائی کی طرف متوجہ تھیں۔

''کنور جی تو شاید دل و جان سے انہیں چاہتے ہیں، لیکن نمرتا اکثر اوقات انہیں نظرانداز کر کے انشومن سے بہت بے تکلفی دکھاتی تھی۔ کنور جی اسے دیکھ کر اداس تو ہوتے تھے لیکن نمرتا کو کچھ کہتے نہیں تھے۔ اس دن بھی نمرتا، انشومن اور شیکھر جان بوجھ کر کنور جی کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ کنور جی دکھی ہو کر وہیں ایک جگہ رک کر بیٹھ گئے۔ میں بھی وہیں رک گئی اور ان کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ لطیفے، چٹکلے اور ہلکی پھلکی باتیں۔ پھر ہماری باتیں ہوتی رہیں اور اس دن مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ جو سامان اوپر گیا تھا، اس میں خطرناک تابکار مادّہ پلوٹونیم بھی تھا۔ وہ انسانی زندگی کے لیے اتنا خطرناک ہے کہ اگر بھگوان نہ کرے کوئی انسان اس کی زد میں آجائے تو وہ انتہائی اذیت ناک حالت میں، ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اور یہ کہ اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔

''میں نے کنور جی سے پوچھا کہ ہم جو سامان چھوڑ کر

آئے ہیں وہ سارا پلوٹونیم اسی میں ہے نا۔'' انہوں نے کہا۔
''ہاں۔''
''میں نے کہا کہ یہ بات سب کو پتا تھی سوائے میرے۔''
''نہیں۔ کسی کو معلوم نہیں سوائے انشومن کے۔ اسی نے یہ بات ہم لوگوں کو بھی بتائی۔ اور اسی نے ہمیں اس کا ثبوت بھی دکھایا۔ اس کو روانگی سے پہلے ہی نہ جانے کیسے اس بات کی بھنک مل گئی تھی اس لیے وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈیوائس لایا تھا جو ریڈی ایشن کی موجودگی کی خبر دیتا تھا۔ وہ گھڑی کے مانند اس کی کلائی پر بندھا رہتا تھا۔ اس نے ایٹمی باکس اٹھائے ہوئے مزدوروں کے پاس جا کر دکھایا کہ اس کے ڈیوائس میں نیڈل تھرتھرانے لگتی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آس پاس کوئی تابکار مادہ موجود ہے۔
''پھر ہم دونوں بھی اسی طرف چل پڑے جہاں وہ تینوں گئے تھے۔ انہوں نے ہی وہ چشمہ دریافت کیا تھا جو کسی گلیشئر کے اندر بہہ رہا تھا۔ ہمیں دور سے آتے دیکھا تو نمرتا نے کنور کو آوازیں دے کر وہاں بلایا۔ وہاں پہنچنے پر انہوں نے کنور کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کی۔ پھر نمرتا نے کنور کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالیں اور کھینچ تان میں اس کے بریسلیٹ کا کنڈا کنور جی کے تھرمل سوٹ میں اس بری طرح اٹکا کہ اسے چھڑانے میں وہ سوٹ پیٹھ پر کندھے کے نیچے پھٹ گیا اور مجھے اسی وقت محسوس ہوا کہ کنور جی کا وہ سوٹ جان بوجھ کر پھاڑا گیا تھا، کیونکہ اس سے چند لمحے پہلے میں نے انشومن اور نمرتا کو کچھ معنی خیز اشارے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان تینوں نے شرارت کرتے ہوئے کنور کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کنور تکلیف سے تڑپ اٹھے تھے اور فوراً ہی اس پانی سے باہر نکل آئے۔ لیکن وہ زہریلا پانی ان کے پھٹے ہوئے سوٹ کے اندر چلا گیا تھا اور وہ شدید تکلیف سے بہت بے چین ہو گئے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پانی الفا ریڈی ایشن سے آلودہ تھا۔ اور وہ صرف بے پناہ ٹھنڈ کا اثر نہیں بلکہ تابکاری کے اثرات بھی تھے۔
''اب مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ انشومن جان گیا تھا کہ اس پانی میں تابکاری کے اثرات ہیں۔ ان تینوں نے مل کر شرارت کے نام پر کنور کو جان بوجھ کر اس عذاب میں ڈالا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیوں؟ لیکن جب ہم نیچے اترے تو اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔''
''کیا وجہ تھی؟'' رانی جی نے سوال کیا تو ان کی آواز کے تاثر سے شائی کانپ سی گئی۔
''ان تینوں کو نہ جانے کیوں اس بات کی بہت جلدی تھی کہ کنور اور نمرتا کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ کنور جی نے آپ کے بارے میں بھی بتایا کہ میری ماتا جی کو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کو لے کر بہت ارمان ہیں اور میں انہیں اس طرح شادی کر کے دکھ نہیں دے سکتا۔ لیکن نہ جانے وہ ڈاکٹر انہیں کیا کیا دوائیں دیتے رہے کہ کنور جی کی مزاحمت کرنے کی طاقت کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی اور وہ ان کے سامنے مجبور ہو گئے۔ اس دن لیہہ کے اس ہوٹل میں شادی کے بعد پارٹی چل رہی تھی۔ وہاں پینے پلانے کی چیزیں بڑی فراوانی سے منگوائی گئی تھیں اور وہ سب پی کر مدہوش ہو رہے تھے۔ کچھ ڈانس کر رہے تھے۔ کنور کمزوری کے سبب نڈھال ہو کر گرنے لگے تو نمرتا انہیں لے کر اوپر کمرے میں چلی گئی۔ میں ایک اندھیرے گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی، نزدیک ہی کچھ بڑے گملوں میں لگے پودوں کے اس پار انشومن اور شیکھر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اور وہ نشے میں جو کچھ بول رہے تھے، وہ کچھ ایسا تھا کہ انشومن کنور کی دولت اور اسٹیٹس کے لالچ میں تھا۔ نمرتا بھی انشومن کی ساتھی تھی۔ دونوں مل کر کنور کو پھانس رہے تھے۔ اور نمرتا انشومن کی ہدایت پر کنور سے محبت کا کھیل کھیل رہی تھی۔ کنور اپنی سادگی میں اسے نمرتا کی محبت سمجھ رہے تھے۔
''انہی کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے شادی کے جو کاغذات بنوائے ہیں، اس میں ایسے پیپر بھی کنور نے سائن کیے ہیں کہ اگر کنور...... بھگوان نہ کرے اس دنیا میں نہ رہے تو نمرتا ان کی ساری دولت اور جاگیر کی مالک ہو گی۔ ان لوگوں نے باقاعدہ کورٹ سے نہ صرف شادی رجسٹر کروائی ہے بلکہ دولت اور جاگیر کے مالکانہ حقوق کے ٹرانسفر کی بھی رجسٹریشن، گواہوں کی موجودگی میں کروائی ہے۔ کورٹ کے اپروول کی اسٹیمپ بھی لگ چکی ہے۔ بھگوان نہ کرے اگر کنور کی موت ہو گئی تو نمرتا ان کی ساری دولت جاگیر کی مالک ہو گی اور پھر وہ انشومن سے شادی کر لے گی۔''
یہ کہتے کہتے شائی کا دل بھر آیا اور وہ سسکنے لگی تو رانی جی نے اٹھ کر اسے تسلی دی، گلے سے لگایا۔ پھر بولیں۔
''شائی! تم نہیں جانتیں کہ تم نے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے، یہ سب کچھ بتا کر۔ اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ ہم ان کے ساتھ کرتے کیا ہیں۔ ہمیں سمجھنے میں ان سے بہت بڑی

بھول ہوئی ہے۔ ہمارے کنور کے مجرموں کو ایسی سزا ملے گی کہ دنیا عبرت پکڑے گی اور ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔"

"لیکن رانی جی! کنور؟ ان کا کیا ہوگا؟ بھگوان نہ کرے۔ وہ نہ رہے تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ وہ تو واپس نہیں آئیں گے نا۔"

"ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ سمیر ہیں نا۔ اب جبکہ معلوم ہو گیا ہے کہ کنور تابکاری اثرات کا شکار ہوئے ہیں تو اب علاج بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہ جو سمیر ہیں نا۔ ان کو بھگوان نے اتنی شکتی دی ہے کہ یہ مریضوں کو موت کے منہ سے واپس لے آتے ہیں۔ کنور کو بھی لے آئیں گے۔"

رانی جی کے لہجے میں اعتماد کی بھرپور جھلک تھی۔ جسے ڈاکٹر نے محسوس کیا اور انہیں حقیقت سے آشنا کرنے کو بولے۔

"نہیں سشمیتا! میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ نقصان بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ کنور کو اب ان دواؤں سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے جو میں نے لندن سے منگوائی ہیں۔ دعا کرو...... سنا ہے کہ دعا سے معجزے بھی ہو جاتے ہیں۔ شاید کنور کو بھی کسی کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا واپس لے آئے۔"

رانی جی کے چہرے پر ایک لمحے کو تاریکی سی آئی اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنے آپ کو ضبط پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"او کے لیڈیز! میں ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر سنہا کا فون آیا تھا۔ کچھ نیا ہے جسے وہ ڈسکس کرنا چاہ رہے ہیں۔ سشمیتا! تم ماں ہو۔ تمہاری دعا کنور کے لیے ضرور بہتری لائے گی۔ اور شائی تم آرام کر لو۔ شام تک آ جانا ہاسپٹل۔ او کے؟" شائی نے سر ہلایا اور وہ چلے گئے۔ رانی جی گھٹتے ہوئے چہرے کے ساتھ خلاؤں میں تک رہی تھیں۔ شائی نے انہیں دیکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اب شائی کو بھی چلا جانا چاہیے تھا لیکن وہ بیٹھی رہی تو رانی جی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"شائی! تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

"جی رانی جی! ڈاکٹر سمیر میڈیکل کی دنیا کے مہان اور قابل ترین ڈاکٹر ہیں۔ وہ جو کچھ بہترین کر سکتے تھے انہوں نے کر لیا۔ لیکن ابھی آپ نے سنا کہ وہ بھی اب ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ دعا کے لیے کہہ گئے ہیں۔ آپ ماں ہیں۔ آپ کے تو دل سے بیٹے کی زندگی کے لیے دعائیں نکل رہی ہوں گی۔ لیکن کوئی وقت، کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب میں نے بھی کنور جی کی زندگی کے لیے بھگوان سے پرارتھنا نہیں کی ہو۔ اور بھی بہت ان سے محبت کرنے والے ان کی زندگی کی دعائیں کر رہے ہوں گے۔ لیکن بھگوان کو اس وقت شاید صرف دعائیں نہیں چاہئیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے لیے جو ممکن ہو سکیں وہ کوششیں بھی کریں۔"

"تو کیا ہم ہر ممکن کوششیں نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ کمی ہے ان میں تو تم بتاؤ۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ ہے، جو ہم کر سکیں تو فوراً کہو۔ ہم سب کچھ کر ڈالیں گے۔ اس وقت ہمیں اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اگر اپنی جان بھی دینا پڑے تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بولو۔ کہو۔" رانی جی کے لہجے میں ممتا بے چین تھی۔

"رانی جی میں لداخ سے چار سو کلومیٹر دور ایک بستی لانگ کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گاؤں کے بڑے وید جی، تقریباً سو سال کے ہیں۔ ان کے پاس بہت پرانے اور نادر نسخے ہیں اور بھگوان نے انہیں استعمال کرنے کا ہنر بھی دیا ہے وید جی کو۔ میں نے کنور جی کی حالت کی اطلاع انہیں بھیج کر، ان سے علاج کے لیے پوچھا تھا۔ انہوں نے علاج بھجوایا ہے۔ وہ بالکل دیسی علاج ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ کرنے کی اجازت دیں گی یا نہیں۔ لیکن میری مایوسی کہتی ہے کہ اس وقت کنور کو ہر اُس علاج کی ضرورت ہے جس کے ذریعے تھوڑی بہت بھی راحت اگر انہیں مل سکے تو میں سمجھوں گی کہ شاید بھگوان نے میری سن لی ہے۔ پلیز رانی جی! انکار مت کیجیے گا۔ آپ دیکھیے، اگر کنور کو اس علاج سے کوئی فائدہ نہیں بھی ہوا تو کم از کم ہمیں یہ کسک تو نہیں رہے گی کہ کاش ہم نے وہ علاج کر لیا ہوتا، تو شاید کنور ٹھیک ہو جاتے۔ رانی جی پلیز! منع مت کیجیے گا۔ پلیز اجازت دے دیجیے۔ پلیز!"

رانی جی حیرت سے اس کی اس بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو دیکھ رہی تھیں اور اس کے جذبوں کی شدت کو محسوس بھی کر رہی تھیں۔ ان کو خاموشی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر شائی یہ سمجھی کہ شاید وہ راضی نہیں ہیں۔ اس نے روتے ہوئے آگے بڑھ کر ان کے پاؤں پکڑ لیے اور اس سے شدتِ جذبات میں کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ تو رانی جی نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"شائی تم نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ تم نے یہ کیسے سوچا کہ ہم اجازت نہیں دیں گے۔ ہم اس وقت صرف ماں ہیں۔ ایک ایسی ماں جس کا بچہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ہمیں کہیں سے اگر کوئی جھوٹی امید بھی دلائے گا تو ہم

اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ تم تو ہمیں بھی امید دلا رہی ہو۔ ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ بتاؤ اس علاج کے لیے تمہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے۔"

"تھینکس رانی جی! ویدجی نے یہ نسخہ بھیجا ہے۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر کھولا اور انہیں بتانے لگی۔

"یہ دوائیں کہاں ہیں جو اس رس میں ملانی ہیں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"وہ تھاپا جی کے پاس ہیں۔ وہ گئے تھے ویدجی کے پاس۔ دوائیں بھی لے آئے تھے۔ دراصل ہم دونوں ڈر رہے تھے کہ شاید آپ اجازت نہیں دیں گی۔"

"اوہ! تھاپا اسی لیے چھٹی لے کر گیا تھا۔ ٹھیک ہے شائی! تیار ہو جاؤ۔ میں لیموں لانے اور ان کا رس نکالنے کا حکم دے دیتی ہوں۔ لیکن کنور ہاسپٹل میں ہیں۔ وہاں یہ کام ہو جائے گا یا انہیں محل میں لا کر یہ علاج کیا جائے۔"

"رانی جی! میں یہ چاہتی ہوں کہ اس علاج کا کسی کو پتا نہ چلے۔ کسی کو بھی نہیں۔ تو اگر وہ محل میں آ جاتے ہیں تو زیادہ اچھا ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے شائی! کل کنور یہاں پہنچ جائیں گے۔ لیموں بھی آ جائیں گے اور ان کا رس نکالنے والی مشینیں بھی۔ تم جب چاہو یہ کام شروع کروا سکتی ہو۔" رانی جی نے کہا تو شائی نے ایک لمبی سانس لی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر اٹھائے۔

"ہے بھگوان! تیری کرپا کہ تو نے امید کی روشنی دکھائی۔ بس اب میرے کنور کو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹا دینا۔" اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں دھیمے دھیمے جو الفاظ کہے انہیں سن کر رانی جی جاتے جاتے رک گئیں۔ انہوں نے چونک کر اس بند آنکھوں سے دعا مانگتی لڑکی کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئیں۔ پُرخیال نظروں سے اسے دیکھتی رہیں، پھر مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

وہ تینوں ائرپورٹ سے گاڑی لے کر کنور پرکاش چترویدی کی اسٹیٹ اور پھر سیدھے ہاسپٹل پہنچ گئے۔ کمانڈر کوہلی کے حوالے کے سبب انہیں کہیں روکا نہیں گیا اور وہ کنور کے اسپیشل آئی سی یو میں پہنچ گئے۔

بیڈ پر آنکھیں بند کیے ہوئے، زرد چہرے والا وہ نحیف شخص کہیں سے بھی وہ کنور نہیں لگ رہا تھا، جو اُن کے ساتھ کوہ پیمائی کی مہم پر گیا تھا۔ جس کی زندہ دلی اور خوش مزاجی اس کو بے پناہ محبوبیت بخشتی تھی۔ اس کے بدن سے وابستہ کئی مشینیں الگ الگ مانیٹرز پر ریڈنگز دے رہی تھیں۔

"انشومن! اس کے وائٹل سائنز تو یہ بتا رہے ہیں کہ اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" نمرتا نے کہا تو انشومن نے ایک فون نما ڈیوائس پر دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"ہاں! ایک انسان کا جسم جتنی ریڈی ایشن برداشت کر سکتا ہے، یہ اس کی آخری حدوں پر ہے۔ سارے سسٹمز سلو ہو کر اب کسی وقت بھی کولیپس ہو سکتے ہیں۔ سو مسٹر چترویدی! یور کاؤنٹ ڈاؤن اسٹارٹ ناؤ۔" انشومن نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"اس کی ہارٹ بیٹ چیک کرو یار! سو سلو۔ میں حیران ہوں کہ یہ اب تک زندہ کیسے ہے۔" شیکھر نے مانیٹر پر ای سی جی کے گراف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ وینٹی لیٹر کی وجہ سے ہے۔ اسے ہٹا دو۔ یہ ابھی اوپر نکل لے گا۔" انشومن نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"کول مین...... کول۔ دو نہیں تو چار دن لگیں گے۔ اس نے اوپر جانا ہی ہے۔ بس پھر اس کا سب کچھ میرا۔ اور میرے ساتھ تمہارا۔ پھر...... ہم تم اک کمرے میں بند۔ اور چابی کھو جائے گی۔" نمرتا کی آواز میں کھنک تھی۔

"اچھا! اس کے مرتے ہی تم لوگ تو قبضہ کر لو گے پوری اسٹیٹ پر۔ عیش ہی عیش۔ میرا کیا ہو گا؟ مجھے بھی کچھ ملے گا یا نہیں۔" شیکھر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں بھئی! پلان تو تُو نے ہی بنایا تھا۔ ماسٹر مائنڈ ہے تو۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ اتاؤلا کیوں ہو رہا ہے۔ مرنے تو دے اِسے۔" انشومن نے اسے تسلی دی۔

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے کہ اتنی جلد ہمارے خواب پورے ہونے جا رہے ہیں انشومن! اس پاگل مجنوں کی دولت۔ اور تمہاری محبت۔ سب کچھ اس طرح مل جائے گا مجھے۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ آئی لو یو انشو۔" نمرتا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس کے گال پر پیار کیا۔

"میں بھی انشومن کو اسی طرح مکھن لگاؤں نمرتا! شاید میرا حصہ بھی کچھ بڑھ جائے۔ ہائے شونووووو! لو یو مائی سویٹی۔" شیکھر نے مسخرے پن سے کہا تو وہ دونوں بھی ہنس پڑے۔

اسی وقت ڈاکٹر سمیر اور ڈاکٹر سنہا روم میں داخل ہوئے اور ان تینوں کو وہاں دیکھ کر ڈاکٹر سمیر شدید غصے میں

آ گئے۔

"بوائے! اِدھر آؤ۔ تم لوگوں کو آرڈر دیا گیا تھا کہ اس روم میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دینا ہے۔ پھر یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ انہیں کس نے اندر آنے کی اجازت دی۔" ڈاکٹر سمیر نے غصے سے کہا۔

"سر! وہ ان لوگوں نے کہا کہ سر کوہلی نے انہیں یہاں بھیجا ہے۔ اس لیے ایم ڈی نے الاؤ کر دیا۔" بوائے نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"شٹ اَپ! جسٹ شٹ اَپ! او کے جنٹل مین! ناؤ یو کین گو۔"

"سر! وہ....." انشومن نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر سمیر چلائے۔

"گیٹ..... آؤٹ!" ان کے لہجے میں اتنی تپش تھی کہ وہ تینوں کچھ کہہ نہیں سکے اور انہیں باہر جانا پڑا۔

"شاید اس بڈھے نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ تب ہی تو اتنا ریش ہو رہا تھا۔ اب کیا ہوگا انشو؟" نمرتا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا تو انشومن نے غصے سے سر جھٹکا۔

"مجھے یہاں آ جانے دو۔ سب سے پہلے اس منحوس ڈاکٹر کو مزہ چکھاؤں گا۔" وہ بکتا جھکتا باہر آیا تو ان کے... سامنے ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوا تھا۔

"سر! رانی صاحبہ کا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو ائرپورٹ چھوڑ دیا جائے۔ آیئے!" وہ ابھی کچھ دیر پہلے تو آئے تھے اور ابھی واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ اپنی ہونے والی پراپرٹی کو گھوم پھر کر دیکھنا چاہتے تھے لیکن آس پاس کھڑے گارڈز کی خشمگیں نظروں کو دیکھتے ہوئے انہیں گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ٹنٹیڈ گلاسز والی وہ گاڑی انہیں ائرپورٹ لے جا رہی ہے یا کہیں اور، انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک ویران سی جگہ بنی ہوئی عمارت کے گیٹ پر جا کر رکی تو گیٹ کسی خودکار سسٹم کے تحت کھلتا چلا گیا اور گاڑی عمارت میں جا کر رک گئی۔ ان کے ساتھ آنے والے مسلح گارڈز نے دروازے کھول کر اترنے کے لیے کہا تو وہ سب چونک اٹھے۔

"یہ تم ہمیں کہاں لے کر آئے ہو؟ اور کیوں؟" انشومن نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"یہیں لانے کا آرڈر دیا گیا تھا ہمیں۔ نیچے اترو۔" گارڈ نے گن ہلاتے ہوئے کہا تو ان سب کو خطرے کا احساس ہوا۔

"میں نیچے نہیں اتروں گی۔ واپس چلو۔ مجھے یہاں نہیں اترنا۔" نمرتا نے چلاتے ہوئے کہا تو گارڈز نے ان کو پکڑ کر کھینچ کے اتارا اور دھکے دیتے ہوئے اندر لے گئے۔ مسلح گارڈز کے سامنے ان کی مزاحمت بیکار ثابت ہوئی اور ان تینوں کو لوہے کے پنجرے نما کمروں میں قید کر دیا گیا۔

☆☆☆

"را" کے ہیڈ آفس کے کانفرنس روم میں بند دروازے کے ماتھے پر جلنے والی سرخ لائٹ اس بات کا اشارہ تھی کہ اندر نہایت اہم میٹنگ چل رہی ہے۔ اور جب تک یہ لائٹ جل رہی ہے۔ آندھی آئے، طوفان یا بھونچال۔ یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ ہاں کمانڈر کوہلی کی آمد کے بارے میں بتا دیا گیا تھا کہ وہ جیسے ہی آئیں، انہیں فوراً اندر بھیج دیا جائے۔ کمانڈر کی آمد کے فوراً بعد میٹنگ شروع ہو گئی۔

"کمانڈر کوہلی! امریکن ایف بی آئی کی طرف سے میسج آیا ہے کہ ان کی اور ہماری ادھوری مہم کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی ٹیم روانہ کر رہے ہیں۔ مارچ کے آخری ہفتے میں ٹیم کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ آپ بتایئے انہیں کیا جواب بھجوایا جائے۔"

"اوکے کر دیا جائے۔ ہمیں اس ادھورے کام کو پورا تو کرنا ہی ہے نا۔ مارچ کے آخر میں موسم بھی اچھا ہوگا۔ شاید ہم پہنچ ہی جائیں۔ اوکے!"

"لیکن..... کیا یہ صحیح ہوگا؟" ایک افسر نے کہا۔

"بالکل صحیح ہوگا آفیسر! ہمیں جانا تو ہوگا نا۔ جائیں گے..... اور ضرور جائیں گے۔ آخر امریکی دوستوں کا اتنا قیمتی سامان وہاں پڑا ہوا ہے۔ اسے ریسکیو کر کے چوٹی تک پہنچانا کس قدر ضروری ہے یہ۔ ورنہ وہ چین کی ایٹمی تیاریوں کو کیسے مانیٹر کر پائیں گے۔ ہمیں ان کی مدد تو کرنا ہی پڑے گی نا۔" وہ زیرِلب مسکرایا تو باقی بھی ہلکے سے مسکرائے۔

"تو پھر ٹھیک ہے مسٹر کوہلی! آپ اپنی تیاری کریں اور ہمیں بتائیں..... ہم انہیں بلالیں گے۔"

پھر وہی وقت تھا، وہی جگہ اور وہی لوگ۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ بیس کیمپ آباد ہو گیا تھا۔ رنگ برنگ خیمے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ امریکن ٹیم کے بھی تقریباً وہی ممبر تھے سوائے دو افراد کے۔ جو ڈاکٹر نیرین اور ایک انجینئر ول جونز کی جگہ آئے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں پچھلی مہم میں حادثوں کا شکار ہو کر بچھڑ گئے تھے۔ مقامی لوگوں میں بھی شانی اور ویدی نہیں تھے۔ مزدور بھی نئے

تھے۔ اور اب دوبارہ پھر اسی جوش و ولولے کے ساتھ وہ نندا دیوی کا سر اپنے قدموں میں جھکانے جا رہے تھے۔

سیکنڈ لاسٹ کیمپ سے پہلے انہیں اپنا سامان اٹھانا تھا اور پھر اسے نندا دیوی کی چوٹی تک پہنچانا تھا۔ جہاں انجینئرز ان سینسنگ آلات کو سیٹ کرتے، جنریٹرز کے ساتھ ان کے فیول یعنی پلوٹونیم کے باکسز کو فکس کیا جاتا۔ اور جیسے ہی جنریٹر اسٹارٹ ہوتے، سینسنگ آلات کام شروع کر دیتے۔ اُس پار چائنا کی کیا ایٹمی اور غیر ایٹمی سرگرمیاں چل رہی ہیں، ان کی ساری رپورٹس پینٹاگون کی لیب اسٹیشن میں وصول کی جاتیں اور پھر وہ رپورٹس انڈیا کے ساتھ شیئر کی جاتیں۔ یہی ماسٹر پلان تھا۔

''اس دفعہ ہماری تیاریاں پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہیں۔ وہاٹ اباؤٹ یو مسٹر کوہلی؟'' امریکی ٹیم لیڈر مائیکل جونس نے پوچھا۔

''ہم نے بھی کافی کچھ تیاریاں کی ہیں۔ تاکہ پچھلی مرتبہ جو خامیاں رہ گئی تھیں، وہ ہمیں تکلیف نہ دیں۔ کوشش تو پوری ہے مائیکل! آگے نندا دیوی جانیں۔'' کوہلی نے مسکراتے .... ہوئے اوپر نظر آنے والی نندا دیوی کی چوٹی کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیے۔

''ٹھیک ہے تو پھر کل صبح پانچ بجے ہم روانہ ہو رہے ہیں۔ اعلان کروا دیجیے، تاکہ سب لوگ تیار رہیں۔''

اگلی صبح کے ابھرتے ہوئے سورج نے جو منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ بھاری بھرکم شوخ رنگوں والے تھرمل سوٹ پہنے بہت سے افراد اپنی اپنی پیٹھوں پر بیک پیک لادے ہوئے، نندا دیوی کی عمودی چڑھائیوں پر رواں دواں ہیں۔ آج شام سے پہلے انہیں اپنے پہلے کیمپ تک پہنچ کر وہاں رکنا تھا۔ اور اگلے دن دوبارہ بلندیوں کی جانب سفر شروع کرنا تھا۔ موسم ٹھیک تھا اور ان کا سفر ابتدائی مرحلوں میں اطمینان بخش تھا۔

انہیں معلوم تھا کہ مشکلیں اونچائی پر شروع ہوں گی۔ نیچے چمک دار دھوپ ہونے کے باوجود بلندی پر نندا دیوی کی چوٹی سفید گہرے بادلوں کی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ بادلوں سے اوپر کیسے بھید چھپے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

وہ کنور جی کے کمرے سے منسلک بڑا اور شاندار باتھ روم تھا۔ نیلگوں چمک دار ٹائلوں سے مزین اور امپورٹیڈ سینیٹری فٹنگز کے ساتھ وہ سچ مچ ایک محل کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ باتھ ٹب، جکوزی، شفاف شیشے کے واش بیسن، بڑے اور چمک دار آئینے، دوسری جانب وال ٹو وال وارڈ روب اور ایسی ہی کاسمیٹکس۔

شائی نے پہلے کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا، جو وہ یہاں دیکھ رہی تھی لیکن اس کی ساری توجہ اس طرف تھی کہ وہ کنور جی کو وید جی کی ہدایت کے مطابق بہتر سے بہتر طور پر ان کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق عمل کروا سکے۔ اس وقت بھی وہ ان ملازمین کو ہدایت دے رہی تھی جو اس کی مدد کے لیے رانی صاحبہ نے بھجوائے تھے۔ کنور کا اسٹریچر باتھ روم میں پہنچ چکا تھا۔ اور ملازمین لیموں کے رس کی بالٹیاں لا لا کر ٹب میں انڈیل رہے تھے۔ جب وہ مناسب حد تک بھر چکا تو شائی نے تھاپا جی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے دوسرے ملازمین کی مدد سے کنور کو انتہائی نزاکت اور احتیاط سے لیموں کے رس سے بھرے ٹب میں لٹا دیا۔

شائی باتھ ٹب کے سرہانے کی طرف ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ کنور کے زرد اور بے حس سے چہرے پر نظر ڈالی۔ ان کی گھنی اور سیاہ پلکیں بند تھیں۔

اور ان میں کہیں زندگی کے اشارے نہیں مل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے ایک چھوٹا مگ اٹھایا اور اس میں لیموں کا رس بھر کر کنور کے سر پر اور چہرے کے تمام حصوں پر آہستہ آہستہ انڈیلتی رہی تاکہ وہ بھی پوری طرح تر ہو جائیں۔ رانی صاحبہ اس کی تمام حرکتوں اور اس کے ظاہر ہونے والے جذبوں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

گھڑی نے گجر بجایا۔ ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ شائی نے اشارہ کیا۔ تھاپا جی اٹھ کر دروازے تک گئے، ملازمین نے اندر آ کر کنور کو دوبارہ اسٹریچر پر لٹایا اور اندر کمرے میں لا کر ان کے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس وقت تک کنور کی سانسیں پھر درہم برہم ہونے لگیں تو شائی نے آکسیجن کا ماسک ان کے منہ پر لگا دیا۔ ڈرپ لگائی اور کمبل اُڑھا کر کرسی پر گر سی گئی۔ بہت تھکن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''شائی!'' قریب سے رانی صاحبہ کی آواز آئی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے قریب کھڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''جی...... جی رانی صاحبہ۔''

''کیا تم کنور سے محبت کرتی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''محبت؟...... پتا نہیں رانی صاحبہ! محبت کسے کہتے

ہیں اور کیسے کی جاتی ہے؟ اگر کسی کی تکلیف کو دل سے محسوس کرنے، اس کی راحت کے لیے سب کچھ کر گزرنے اور ہر لمحہ اس کے لیے سب کچھ کر ڈالنے کی خواہش کو محبت کہتے ہیں تو شاید...... لیکن نہیں رانی صاحبہ! یہ ممکن نہیں ہے۔ کنور جی آسمان کا چاند اور میں اس زمین کا چھوٹا سا ذرہ۔ میں اپنی حیثیت جانتی ہوں رانی صاحبہ! میں بھلا ان سے محبت جیسی جرأت کیسے کر سکتی ہوں؟ اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ یہ صرف ان کی خدمت کا جذبہ ہے جس کی آپ مجھے بہت اچھی قیمت دے رہی ہیں۔ ایک دن یہ ٹھیک ہو جائیں گے تو میرا کام ختم ہو جائے گا اور میں چلی جاؤں گی۔ اس میں محبت کہاں سے آ گئی؟"

اس کے لہجے کی آزردگی کو انہوں نے محسوس کیا۔ شاید ان کا دل اس معصوم سی لڑکی کے لیے آزردہ بھی ہوا ہو گا لیکن وہ اسے پُرخیال نظروں سے دیکھتی رہیں۔ کچھ بولی نہیں پھر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

ان کی خوش قسمتی تھی کہ موسم اب تک سازگار تھا۔ ان کا اب تک کی بلندیوں کا سفر تیز رفتاری سے طے ہوا تھا اور اب انہیں اگلے روز اس کیمپ تک پہنچنا تھا جہاں ان کا سامان پڑا ہوا تھا۔ وہاں سے وہ سامان اٹھا کر انہیں چوٹی تک پہنچنا تھا جہاں امریکن انجینئروں نے ان سینسنگ آلات کو فکس کر کے جنریٹر چلانا تھے۔ کام ختم ہوتے ہی انہیں واپس آ جانا تھا۔

مزدوروں نے آگ جلائی ہوئی تھی۔ وہ سب آگ کے آس پاس بیٹھے بلیک کافی پی رہے تھے۔ مزدوروں نے اپنی الگ منڈلی جمائی ہوئی تھی اور وہ سب ایک چھوٹی چلم سے تمبا کو پی رہے تھے۔ جس میں شاید کچھ نشہ بھی تھا۔ تھوڑی دیر میں ان میں سے ایک نے ترنگ میں آ کر ایک زوردار تان اُڑائی۔ جو پہاڑوں میں گونجتی چلی گئی۔ پھر دوسرے بھی مست ہو کر اس کے ساتھ گانے لگے۔ ایک نے کوئی برتن بجانا شروع کیا تو اس کی تال پر رقص کرنے لگے۔

باقی لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے تو کوہلی نے کسی کو اشارہ کیا، اس نے وہ چھوٹی سی چلم لا کر ایشلے کو پکڑا دی۔ اس نے خوش ہو کر ایک زبردست کش لگایا۔ پھر اس کے دھوئیں کو ہونٹوں سے آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس کے سُرور کو محسوس کیا اور جلدی جلدی تیزی سے کئی اور کش بھی لگائے، اور انگریزی میں کچھ گانے لگا۔ بلکہ چلم ہاتھ میں اٹھائے، کھڑے ہو کر رقص کے انداز میں جھومتا بھی رہا۔ سب اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

اچانک ایسے میں برف کی موٹی تہوں کے تڑ تڑ تڑ تڑخنے کی آوازیں گونجیں اور ان کے دونوں گروپوں کے درمیان سے ایک موٹی سی دراڑ دور تک پھیلتی چلی گئی۔ وہ سب خوف زدہ ہو گئے۔ دو مزدور لڑکھڑائے اور اس شگاف کے اندر گرنے والے تھے کہ دوسرے ساتھیوں نے بروقت سہارا دے کر انہیں بچایا۔ ان سب کو اس حادثے کے اثرات سے باہر آنے میں کچھ منٹ لگ گئے۔ صاف آسمان پر چمکتے چاند کی بھرپور چاندنی نے انہیں وہ نظارہ دکھایا کہ وہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔

اس دراڑ میں ایک مزدور کا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ یقیناً پچھلی مرتبہ کی مہم میں حادثے کا شکار ہو جانے والے کسی مزدور کی لاش تھی جو اتنے عرصہ برف میں دبی رہ کر برف ہو گئی تھی، اور اب یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی لاش کو نکال کر اس کے انتم سنسکار کیے جاتے۔ اس لیے وہ سب جو اس کے لیے کر سکتے تھے، انہوں نے کیا یعنی ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے اس کی مکتی کی دعا مانگی اور واپس اپنے خیموں کی جانب چلے گئے۔

وہ سب مزدور کی لاش دیکھ رہے تھے لیکن پروفیسر مائیکل کی دوربین نظروں نے کچھ اور بھی دیکھا تھا۔ وہاں ایک جانب انہیں خاکستری رنگ کے اس کپڑے کی جھلک نظر آئی تھی جس پر مخصوص مونوگرام اس کی بنت میں شامل تھے، اور یہ وہ کپڑا تھا جس میں سینسنگ آلات اور پلوٹونیم کے باکسز کو لپیٹا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کچھ اُلجھ سے گئے تھے۔ رات کو اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹے وہ بڑی دیر تک سوچتے رہے۔

"ہم تو سارا سامان کیمپ میں محفوظ کر کے گئے تھے۔ اس بیگ کا ٹکڑا برف کی گہرائیوں میں دبا ہوا کیسے نظر آ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی ایوالانچ نے اس کیمپ کا رخ کر کے سب تباہ کر دیا ہو۔"

"اوہ مائی گاڈ! اگر ایسا ہوا تو بہت بڑی مشکل میں آ جائیں گے ہم سب۔ اور اگر پلوٹونیم کا کوئی باکس ڈیمج ہو گیا ہو تو؟ اوہ نو۔ نو۔ نو۔ اگر ایسا ہوا تو کیسی تباہی ہو گی۔ گلیشیئر پگھلا تو وہ تابکاری زدہ پانی دریاؤں میں جا کر کروڑوں لوگوں کو، کس طرح متاثر کرے گا؟ او گاڈ! میں اس سے آگے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کے لیے انڈین گورنمنٹ ہمیں الزام دے گی۔ اور ہماری حکومت ہم سے

جواب طلب کرے گی۔ ہم کیا کہیں گے؟ اوہ مائی گاڈ! ہیلپ می۔" مائیکل دیر تک اپنی کن پٹیاں رگڑتا رہا۔ یہ سچ مچ ایک پریشان کن صورتِ حال تھی۔ دریاؤں کا پانی اگر الفاریڈی ایشن کی تابکاری سے آلودہ ہوتا ہے تو کروڑوں لوگ ان کے اثرات سے مہلک اور اذیت ناک صورتِ حال کا شکار ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر انتہائی بھیانک موت کا شکار ہوں گے۔ آنے والے اسی سالوں تک دریا لوگوں میں یہ موت بانٹتے رہیں گے۔ کیا کریں؟" یہ اور ایسے بہت سے سوال تھے جنہوں نے ذہن میں ہلچل مچا کر پروفیسر کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔

☆☆☆

پانچ دن ہو گئے تھے۔ کنور کو لیموں کے رس سے غسل دیتے ہوئے۔ ان میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ زرد اور کمزور سے چہرے پر زندگی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سانسوں کے زیر و بم بھی نسبتاً ہمواری کی طرف گامزن تھے۔

رات کے ان لمحوں میں جب شائی انہیں ہولے ہولے پکار رہی تھی تو انہوں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولی بھی تھیں۔ چند لمحے اس کی طرف نگراں رہ کر وہ آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اس لمحے گویا کر اس پاگل شائی کی خوشی اندر سے پھوٹی اور اسے ایک اچھی امید دے کر، اس کے دل میں کہیں سو گئی۔ پھر جاگنے کے لیے۔

چھٹے دن جب لیموں کے رس کے غسل کا اہتمام کیا گیا تو تھاپا جی وہ دوائیں ساتھ لے کر آئے، جو ویدجی نے اس میں ملانے کے لیے دی تھیں۔ ٹب میں رس ڈال دیا گیا تو تھاپا جی نے تین چار بڑے سائز کی بوتلیں نکالیں، جن میں رنگ برنگ پانی بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک چھوٹے پیمانے سے ناپ ناپ کر اس میں سے وہ محلول نکال کر ٹب میں ڈالنا شروع کیا اور انہیں اچھی طرح مکس کر کے ملازمین کو اشارہ کیا کہ وہ کنور کو اس میں لٹا دیں۔

حسبِ معمول ان کا جسم رس میں ڈوبا ہوا تھا اور شائی چھوٹے مگ سے پانی ان کے سر اور چہرے پر ڈال رہی تھی۔ تھاپا جی سامنے کھڑے ان کو بغور دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ گزر گئے تو ان کی آنکھوں میں تشویش جھلکنے لگی۔ وہ دیکھتے رہے۔ رانی جی کرسی پر براجمان اس سلسلے کو روز کے مانند دیکھ رہی تھیں۔ سب کچھ انہیں حسبِ معمول ہی لگ رہا تھا، لیکن تھاپا جی کے انداز میں تشویش کا تاثر ان کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا۔

"تھاپا! کیا کوئی مسئلہ ہے؟ تم کچھ فکرمند سے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟" رانی جی نے تھاپا کو مخاطب کر کے کہا تو وہ چونکے۔

"نہیں رانی صاحبہ! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس کنور کی بیماری اب بہتر ہو جانا چاہیے۔ وہی دیکھ رہا ہوں۔ وید جی نے بھی بتایا تھا کہ چھٹے دن سے ان میں بہتری آنے لگے گی۔"

وہ بات کر ہی رہے تھے کہ اچانک کنور کے بے حس و حرکت جسم میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ وہ تینوں ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اگلے ہی منٹ وہ حرکت اور بڑھ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کنور بہت بے چین سے ہو رہے ہیں۔ رانی جی بھی کرسی سے اٹھ کر ٹب کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اب کنور نے باقاعدہ تڑپنا شروع کر دیا اور ان کا نہ صرف جسم ہلکے ہلکے پھڑکنے سا لگا بلکہ ان کے منہ سے بھی کچھ کراہنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔ رانی جی بے چین ہو کر چلا اٹھیں۔

"شائی! یہ ہمارے کنور کو کیا ہو رہا ہے؟ اِسے نکالو۔ فوراً نکالو ٹب سے باہر۔"

"رانی صاحبہ! وید جی نے یہی بتایا تھا کہ چھٹے دن کنور کے جسم سے اس زہریلے اثر کا توڑ ہونا شروع ہو گا، تو کنور کا جسم حرکت کرے گا۔ تڑپے گا اور ایسا لگے گا کہ وہ بہت تکلیف میں ہیں۔ لیکن اس تکلیف سے انہیں نقصان کوئی نہیں ہو گا بلکہ وہ آہستہ آہستہ اگلے پانچ دن میں اس تکلیف سے آزاد ہو جائیں گے۔" تھاپا جی نے رانی جی کو تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ پریشان نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"لیکن تھاپا! میرا بچہ جس طرح تڑپ رہا ہے، مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

"رانی صاحبہ! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ مجھ سے۔ پوچھ رہی تھیں نا کہ میں کچھ فکرمند سا کیوں نظر آ رہا ہوں؟ میں واقعی کچھ پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کہ وید جی کے کہنے کے مطابق آج کنور جی کے جسم کو حرکت کرنا چاہیے تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے یہ اب حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن جب دیر ہو گئی اور حرکت نہیں ہوئی تو میں پریشان ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وید جی کا تجربہ ہار رہا ہو۔ لیکن بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وید جی کا علاج بالکل صحیح جا رہا ہے۔ اور اب بھگوان نے چاہا تو ہمارے کنور پانچ دن بعد بالکل ٹھیک

ہو جائیں گے۔ آپ بھی فکر نہ کریں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' تھاپا نے صراحت سے کہا تو رانی جی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔

''تھاپا! تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔ اتنی دور جا کر دوائیں لے کر آئے، اور کنور کی زندگی بچائی۔''

''نہیں رانی صاحبہ! یہ میرا نہیں۔ اس چھوٹی سی، مگر بڑی ہمت والی لڑکی کا کام ہے۔ اس نے اگر مجھے وید جی کے پاس نہ بھیجا ہوتا، تو مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسے کوئی وید بھی ہیں۔ اسی نے مجھے بتایا، اور جانے کے لیے کہا تو ہی میں گیا تھا۔'' تھاپا نے شائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے تحسین آمیز نظروں سے شائی کو دیکھا۔

''اس نے تو مجھے بِن مول خرید لیا ہے تھاپا۔ اس کے کرم کا تو کوئی بدل بھی نہیں، جو میں اسے دے پاؤں۔ سوچتی ہوں کیسے اتاروں گی اس کا قرضہ۔''

''رانی صاحبہ! مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔ بس دعا کریں کہ بھگوان میری ساری محنتوں کا پھل دے اور کنور جی دوبارہ پھر سے ویسے ہی ہو جائیں، جیسے وہ پہلے تھے۔ سمجھیں میری ساری تپسیا سپھل ہو جائے گی۔ مجھے اور کچھ چاہیے بھی نہیں۔'' شائی کے الفاظ میں اس کے دلی جذبوں کی ایسی دلگداز پکار تھی جس نے رانی جی کی آنکھیں نم کر دیں۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد گجر بجا۔ ملازمین اندر داخل ہوئے اور کنور کو ٹب سے نکال کر اسٹریچر پر ڈالا۔ کنور کا بدن صاف کر کے انہیں دوسرے کپڑے پہنائے، اور روم میں لے آئے۔

اسی وقت ڈاکٹر سمیر...... اندر داخل ہوئے اور سیدھے کنور کے بیڈ کی طرف آ گئے۔ دیر تک ان کا معائنہ کرنے کے بعد حیران نظروں سے رانی جی کو دیکھتے ہوئے... بولے۔

''سشمیتا! حیرت انگیز...... بہت حیرت انگیز۔ کنور جس طرح ریکور کر رہے ہیں، ناقابلِ یقین ہے۔ ان پر سے ریڈی ایشن کے اثرات بہت تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ اگر یہی علاج جاری رہا تو بہت جلد یہ بالکل ریڈی ایشن فری ہو جائیں گے۔ شائی! براوو۔ تم نے جادو کر ڈالا ہے۔'' انہوں نے شائی کی طرف دیکھتے ہوئے انگوٹھا اٹھا کر اسے داد دی تو وہ ہولے سے مسکرائی، اور کنور کے جسم سے وابستہ مشینوں کی ریڈنگز لینے لگی جن پر طرح طرح کے گراف، لائنز، سمبلز اپنی اپنی ریڈنگز دے رہے تھے۔

وہ جھکی ہوئی ان کے سر کو تکیے پر ٹھیک پوزیشن پر سیٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، کہ اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ وہ اسی پوزیشن میں بت بن کر رہ گئی۔ اسے صاف محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں بول رہی تھیں، باتیں کر رہی تھیں، پہلے دو مرتبہ بھی انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، لیکن اس وقت وہ بے حس اور بے جان سی نظر آئی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ ان میں زندگی تھی، جذبات تھے، احساسات تھے۔ وہ دم بخود ان آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر وہ آنکھیں مسکرائیں تو وہ بے اندازہ خوشی سے اپنی آنکھیں چھلکانے لگی۔

''رانی صاحبہ! جلدی آیئے۔ کنور کو دیکھیے۔'' شائی نے یہ کہہ کر گویا صور پھونک دیا۔ رانی جی، ڈاکٹر، تھاپا جی۔ سب کے سب دوڑ کر ان کے بیڈ کے گرد آ گئے۔

''کنور پرکاش چتر ویدی! تم ٹھیک ہو گئے۔ تم ٹھیک ہو گئے ہو کنور۔ ہے بھگوان! شکر ہے، شکر ہے۔ میرے بچے نے آنکھ تو کھولی۔'' رانی صاحبہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''سشمیتا! ذرا ہٹو۔ مجھے کنور کو ٹھیک سے دیکھنے دو۔'' ڈاکٹر سمیر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو ینگ مین! ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ؟'' وہ اپنا اسٹیتھوسکوپ اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولے تو کنور کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ لمحے کے چھوٹے سے پل کے لیے نمودار ہوئی اور معدوم ہو گئی۔ ان کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

''کنور!'' رانی جی نے بے قرار ہو کر انہیں پکارا تو ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں تسلی دی۔

''وہ بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ ہمت نہیں دکھا سکتا۔ ٹھیک ہو رہا ہے۔ اگلی مرتبہ زیادہ بہتر رسپانس دکھائے گا۔ فکر کرنے کی نہیں، خوش ہونے کی گھڑی ہے سشمیتا۔ بھگوان کی آرتی کرو، اس نے تمہارے بیٹے کو واپس تمہیں دے دیا ہے۔ اور شائی کا احسان مانو کہ اس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔''

ڈاکٹر کی بات نے سب کے دل میں خوشیوں کے بے شمار دیپک جلا دیے۔

☆☆☆

صبح روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ انہوں نے بلندیوں کی جانب سفر شروع کر دیا۔ آج ان کی تمام حرکات و سکنات

میں ایک دبا دبا سا جوش وجذبہ تھا۔ آج انہیں اس کیمپ تک پہنچ جانا تھا، جہاں وہ پچھلی مرتبہ اپنا سارا سامان محفوظ کر کے گئے تھے۔

موسم اب تک بہترین تھا اور انہیں یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد وہ اس کیمپ تک پہنچ جائیں گے۔ اگلے روز ہی چوٹی کا سفر طے کر کے اپنا مشن مکمل کر کے وہ واپسی کا سفر شروع کر دیں گے۔ سب خوش تھے کہ ابھی تک انہیں بلندیوں پر کسی بھی طوفان کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

''گائیز! ہم اگلے دو گھنٹوں میں اپنے مطلوبہ کیمپ تک پہنچ جانے والے ہیں۔ گو، گو گو یا ہووووووو!''

ایشلے نے اپنے گھڑی نما ڈیوائس پر سمت اور فاصلے کی نشاندہی کرنے والے اشاروں کو دیکھتے ہوئے خوشی کا نعرہ بلند کیا، تو باقی سب نے بھی خوش ہو کر اس کا ساتھ دیا۔ اور وہ نئے جوش وولولے کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ لیکن مائیکل کا دل کچھ انجانے وسوسوں میں اُلجھ رہا تھا۔ برف کی موٹی تہوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے بیگ کا وہ ٹکڑا اسے اندیشوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا اور اس کی اس خاموشی کو کمانڈر کوہلی دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ خود دوسرے ساتھیوں کی خوشی میں خوش تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ واقعی اس مقام پر پہنچ گئے جہاں ان کا وہ کیمپ واقع تھا جس میں انہوں نے اپنا سامان چھوڑا تھا۔ اس جگہ پر برف کے اونچے اونچے ڈھیر تھے جہاں خیموں میں ان کا سامان محفوظ کیا گیا تھا۔ وہ سب وہاں رک گئے۔ مزدوروں نے اسٹوو جلا کر اس پر بڑا پتیلا رکھ کر برف توڑ توڑ کر ڈالی تاکہ وہ پگھل جائے۔ سب کا پیاس سے بُرا حال تھا۔

''چلو بھئی! اب پانی وانی پی لیا ہے تو شروع ہو جاؤ۔ برف کے اس پہاڑ کو ہٹانا ہے اور سامان نکالنا ہے۔ شام سے پہلے پہلے یہ کام پورا کرنا ہے۔ دم لگا کے ہیّا۔ دم لگا کے ہیّا۔'' کمانڈر کوہلی کی آواز میں سب نے آواز ملائی اور اپنے ہلکے پھلکے بیلچوں سے برف ہٹانا شروع کر دی۔

ایک گھنٹا مسلسل برف کھودنے کے بعد انہیں توقع تھی کہ اب سامان نظر آنا شروع ہو جائے گا۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ سامان کی موجودگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو انہیں اندازہ ہوا کہ سامان زیادہ گہرائیوں میں چلا گیا ہے۔ اور برف کھودنا ہوگی۔

انہوں نے تھوڑی دیر کا بریک لیا اور پھر نئے جوش کے ساتھ کھدائی شروع کر دی۔ وہ تقریباً بائیس آدمی تھے جو پوری تندہی سے برف کھود رہے تھے۔ کوہلی مسلسل ان کی ہمت بڑھا رہا تھا جبکہ مائیکل دور سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ان سب کو تشویش آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔

اب تک سامان نکل آنا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں نکلا اور ایسا لگ رہا تھا کہ سامان اب بھی نہیں ملے گا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کچھ انہونی ہو چکی ہے۔ ایسی انہونی جو ان سب کو انتہائی پریشانی میں ڈالنے والی ہے اور اگلے دو گھنٹے میں یہ پریشانی کھل کر سامنے آ گئی۔ سامان غائب ہو چکا تھا۔ وہ سارا سامان جو وہ اس جگہ محفوظ کر کے گئے تھے، غائب ہو چکا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی وہاں نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا زوردار جھٹکا تھا، جو اُن سب کو لگا تھا۔

''سامان کہاں گیا مسٹر کوہلی؟'' مائیکل نے پریشان ہو کر پوچھا تو کوہلی نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔

''میں نہیں جانتا مائیکل! اتنا سارا سامان کہاں غائب ہو گیا؟ کوئی ایک چیز بھی نہیں ہے۔''

''کیا چوری ہو گیا ہے؟''

''چوری؟ یہاں اتنی بلندی پر کون چوری کرنے آئے گا؟ اور ویسے بھی ہماری گورنمنٹ نے اس عرصے میں یہاں کوہ پیمائی پر پابندی عائد کی ہوئی تھی۔ ہمارے اس مشن کے مکمل ہونے تک، یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی پھر چوری کیسے ہو سکتی ہے؟''

''تو پھر سامان کہاں گیا؟'' مائیکل کی آواز میں پریشانی کے ساتھ کچھ جھنجلاہٹ بھی تھی۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی ایوا لانچ اس سارے سامان کو ساتھ لے کر کہیں گہرائیوں میں چلا گیا ہو۔ اگر بھگوان نہ کرے ایسا ہوا تو بہت بڑی مشکل کھڑی ہو جائے گی مائیکل! اگر پلوٹونیم کے باکسز اس دوران ڈیمج ہو گئے تو...... تو پھر کیا ہوگا؟ تباہی اور بربادی کا ایک لمبا سلسلہ۔''

''اوہ نووووووو۔'' کوہلی نے سر پکڑا اور برف پر بیٹھتا چلا گیا۔

''مسٹر کوہلی! کام ڈاون! کچھ سوچتے ہیں...... یہ آخر ہوا کیا ہے؟''

''مائیکل! جانتے ہو اس غلطی کا خمیازہ میری قوم کے کروڑوں لوگوں کو بھگتنا پڑے گا۔ گرمی میں نندا دیوی کے گلیشیر پگھلتے ہیں اور پانی ندیوں، دریاؤں میں جاتا ہے۔ ان دریاؤں کا پانی سارا دیش استعمال کرتا ہے۔ اگر یہ پانی الفا ریڈی ایشن سے آلودہ ہو گیا...... تو...... تو ذرا سوچو کیا ہو

گا۔ کروڑوں لوگوں کا جیون داؤ پر لگ جائے گا۔ اور میری حکومت مجھ سے جواب طلب کرے گی۔ میں کیا کہوں گا مائیکل؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مسٹر کوہلی! میں بھی بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ یہ بہت بڑا خطرہ ہے۔ اور ہم اس بارے میں کسی کو کچھ بتائیں تو کیا کچھ ادارے ہماری مدد کرنے کو آئیں گے؟"

"کیا؟ کہہ رہے ہیں؟ مسٹر مائیکل؟ آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ خبر لیک ہو گئی تو کیا ہوگا؟ میڈیا کو تو آپ جانتے ہیں۔ اگر کوئی یہ خبر لے اُڑا تو پورے دیش میں کتنی دہشت پھیل جائے گی۔ لوگ ہم سب کو پھانسی چڑھا دیں گے۔ نو...... نو مسٹر مائیکل! ایسا نہیں ہو سکتا۔" کوہلی نے اس کی تجویز ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

"اچھا تو پھر ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ ہم ہی اسے تلاش کریں۔ اس وقت تک تلاش کریں جب تک کہ وہ مل نہیں جاتا۔"

مائیکل کی سمجھ میں اس وقت یہی ایک حل آیا۔

"یہی کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔ یہ ایک بڑا حوصلہ شکن کام ہے۔ پتا نہیں ہم کر پائیں گے بھی یا نہیں...... مائیکل! کیا ہمیں ابھی رک کر یہ کام شروع کرنا ہوگا؟" کوہلی نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ابھی تو شاید یہ ممکن نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس راشن اور میلٹنگ میٹریل بہت ناکافی ہے۔ آکسیجن سلنڈرز بھی زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔ اور اتنی بلندی پر آکسیجن اتنی کم ہے کہ اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔ لوگ بھی تھک گئے ہیں۔ زیادہ رکے تو وہ بیمار ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس لیے ہمیں نیچے جا کر نئی تیاریوں کے ساتھ دوبارہ آنا پڑے گا۔" مائیکل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور دور تک پھیلے برف زار میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگا۔

"او مائی گاڈ! ناٹ اگین۔ آخر یہ ہوا کیا ہے؟ کس مشکل میں پڑ گئے ہیں ہم؟" کوہلی نے بھی تھکی ہوئی آواز میں کہا اور وہ بھی برف پر بیٹھا اور پھر لیٹ کر نندا دیوی کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر چوٹی کی جانب کیے اور بڑبڑایا۔

"دیوی جی! دیا کرو۔ ہم سے بڑی بھول ہو گئی کہ تمہارے سر پر پاؤں رکھنے کی کوشش کی۔ ہمارا سامان لوٹا دو...... میں اپنی اگلی نسلوں کو بھی وصیت کر جاؤں گا کہ بھول کر بھی کبھی دیوی جی کے چرنوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ مصیبت میں آ جاؤ گے۔ جیسے ہم آ گئے ہیں۔ شما کرو، شما کرو دیوی جی۔"

ناکامی کے احساس اور اس اعلان نے کہ انہیں دوبارہ آنا پڑے گا، سب کو بے پناہ تھکن کے احساس نے چور چور کر دیا تھا۔ وہ سب بے دلی سے واپسی کی تیاریوں میں جت گئے۔ دوبارہ واپس آنے کے لیے۔

☆☆☆

"وید جی کا بتایا ہوا علاج پورا ہو چکا تھا۔ اور نہ صرف ڈاکٹر سمیر چوہدری، بلکہ پورے بورڈ نے مکمل چیک اَپ کر کے بتا دیا تھا کہ اب وہ الفا ریڈی ایشن کے اثر سے بالکل باہر آ چکے ہیں۔"

"سسشییا! یہ معجزہ ہے۔ تابکاری کے اثرات کا شکار، جسے ہم جدید دور کے ڈاکٹرز نے ناقابلِ علاج سمجھ کر ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ اسے ایک سو سال پرانے وید کے نسخوں نے ٹھیک کر دیا ہے۔"

"اگر یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ تو ٹھیک نظر کیوں نہیں آتا۔ آنکھیں بند کیے بستر پر کیوں پڑا ہے؟ میں اپنے بیٹے کو دوبارہ پہلے جیسا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟" رانی جی پریشان تھیں۔

"دیکھو! وہ کتنے بڑے طوفان سے گزرا ہے۔ جو تباہی اس کے جسم پر گزری ہے، اسے ریکور کرنے میں وقت تو لگے گا نا۔ اس کے سارے ٹیسٹ ہو چکے ہیں اور رپورٹس بس آنے والی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہم یہ فیصلہ کریں گے کہ اب کنور کی کیا میڈیکیشن ہونا چاہئیں۔ یہ خطرے سے باہر آ گئے ہیں۔ بس اب تو ریکوری ہی ہونا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم فکر مت کرو۔" ڈاکٹر نے رانی جی کو تسلی دی اور بورڈ روم کی طرف بڑھ گئے جہاں ڈاکٹرز کا بورڈ ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ کنور کے مسئلے پر ڈس کشن ہونا تھی۔

شائی اور رانی جی وہاں رہ گئی تھیں۔ وہ دونوں سامنے بیڈ پر بے سدھ پڑے کنور کو دیکھ رہی تھیں۔ یا ان مشینوں کو، جن پر ڈیجیٹل ریڈنگز کنور کی کیفیت بتا رہی تھیں۔

وہ دونوں بڑی دیر تک اسی موضوع پر بات کرتی رہیں۔ چائے آ گئی تھی۔ وہ چائے پیتی رہیں پھر نہ جانے کیسے ان کی گفتگو کا رخ نمرتا کی طرف مڑ گیا۔

"اگر نمرتا کو ہماری دولت اور اسٹیٹس ہی چاہیے تھا، تو وہ کنور سے شادی تو کر ہی چکی تھی۔ اسے مارنے کی کوشش کیوں کی؟ بلکہ اپنی طرف سے تو مار ہی دیا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"اسے جیون ساتھی کے طور پر، کنور نہیں بلکہ انشومن چاہیے۔ اور انشومن کو نمرتا کے ساتھ کنور کی دولت اور جائداد بھی چاہیے۔ اس لیے یہ سارا ڈراما رچایا گیا۔ مجھے تو یہ لگا کہ یہ ساری سازش انشومن کی ہی بنائی ہوئی تھی۔ نمرتا پر اس کا بہت اثر ہے۔ جو وہ کہتا ہے، نمرتا وہی کرتی ہے۔ شادی کی ساری تیاریاں بھی اسی نے کی تھیں۔ نمرتا کو تو صرف کنور کو گھیرنے کی ذمے واری دی گئی تھی۔ کیونکہ وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس طرح شادی کر کے آپ کو دکھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ کہہ رہے تھے کہ ہم اسٹیٹ جا کر ہی شادی کریں گے۔ میں ماتا جی کو منا لوں گا۔ وہ تمہیں سویکار کر لیں گی، میری خوشی کی خاطر لیکن انشومن کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔"

"کیسا رسک؟ ہمارے نہ ماننے کا رسک؟" رانی جی کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

"جلدی نہ ماننے کا رسک رانی صاحبہ! کیونکہ وہ کنور جی کے ساتھ جو کچھ کر چکے تھے، اس کے بعد انہیں معلوم تھا کہ کنور کے پاس وقت بہت ہی کم ہے۔ ان کے بیمار ہونے کے سبب شادی بیاہ کا تو کوئی موقع ہی نہیں رہے گا۔ اور وہ اپنے سپنے پورے کرنے کا بہترین موقع ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔ اس لیے جیسے بھی ممکن ہو، انہیں یہ شادی جلد سے جلد کرنی ہی تھی۔ باقاعدہ پورے اہتمام کے ساتھ۔ تاکہ بہت سے گواہ بھی ہوں۔ انشومن نے ہوٹل کا برائڈل سوئٹ بک کروایا تھا۔ ان سب کے ثبوت انہوں نے بہت سنبھال کر اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ مناسب وقت آنے کے انتظار میں۔ اور آپ جانتی ہی ہوں گی کہ وہ مناسب وقت کونسا ہو سکتا ہے۔" شائی نے انہیں پوری تفصیل بتا دی۔

"ان کی یہ ہمت۔ انہوں نے ہمارے کنور کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی اور دھکیل ہی دیا تھا۔ وہ تو تم نے بچا لیا شائی۔ ورنہ ہم تو لاعلمی میں سب کچھ کھو چکے ہوتے، اور ہمیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ اب تم دیکھنا کہ ہم ان تینوں کو کس طرح عبرت کا نشان بناتے ہیں۔ اتنا آسان نہیں ہوگا اب ہمارے انتقام سے بچنا۔" رانی جی کا اشتعال اپنے عروج پر تھا۔

"نمرتا کنور کی قانونی بیوی ہے اور کنور اس سے بہت پیار بھی کرتے ہیں۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کرنے دیں گے۔" شائی نے یاد دلایا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں شائی کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں بروقت حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ ورنہ شاید بے خبری میں ہم واقعی مشکل میں آ جاتے۔ لیکن اب نہیں۔ کنور ذرا بہتر ہوں تو ہم اس طرف توجہ دیں گے۔ ڈونٹ یو وری۔ او کے!" وہ دونوں بڑی دیر تک باتوں میں مشغول رہیں اور اس سلسلے کو ڈاکٹر سمیر چوہدری نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے توڑا۔

"سشما! آخر کار یہ بات متفقہ طور پر سارے بورڈ نے کہہ دی کہ کنور اب بالکل ریڈی ایشن فری ہے۔ مکمل طور پر۔ اس پر الفا ریڈی ایشن کے اثرات بالکل نہیں ہیں۔" ڈاکٹر سمیر نے خوشخبری سنائی تو رانی صاحبہ نے آنکھیں بند کر کے، ہاتھ جوڑ کر اوپر اٹھائے۔ شاید وہ بھگوان کا شکر کر رہی تھیں لیکن شائی کی آنکھیں اس خوشی پر برس پڑیں۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اتنا کمزور کہ وہ باڈی کو ریکوری کی طرف جانے نہیں دے رہا ہے۔ اب ڈاکٹرز کی پوری توجہ اس کے دل کی بحالی

ساشا

زندگی کے نشیب و فراز کی ایک عجیب داستان، کبھی پرخطر جزیروں، دائروں میں قید تو کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکے ہوئے راہی کے مانند، سنسنی خیز حالات سے نبرد آزما......

عمر عبداللہ کے سحر انگیز قلم سے

ایک نئے انداز، نئے رنگ، نئے ڈھنگ میں...... عشق کے دشوار گزار مرحلے...... حسن کے قافلے...... جذبات کا تلاطم...... دریاؤں کی روانی...... سمندر کے طوفانوں اور بھنور میں لپٹی خوبصورت داستان......

بہت جلد

سسپنس کے صفحات پر جلد ہی پڑھیں گے

کی طرف ہوگی۔ سشمیتا! تم دعا کرو اور شائی تم ایک مرتبہ پھر اپنے ویدجی سے رابطہ کرو۔ شاید اس کے لیے بھی ان کے پاس جادو کی کوئی پُڑیا ہو۔'' ڈاکٹر سمیر نے ان دونوں کو کام بتائے، تو ان دونوں نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

یہ ان کا تیسرا چکر تھا۔ اس دفعہ بھی ٹیم میں تیس پینتیس کے قریب لوگ تھے۔ جن میں زیادہ تعداد مزدوروں کی ہی تھی۔ وہی ناراض سرد ترین موسم، وہی چنگھاڑتی ہوئی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ، ٹوٹتی تڑختی برف کی تہوں کی ہولناک آوازیں، اور ان سب سے نبرد آزما چند ایسے انسان، جن کا حوصلہ بھی بار بار کی ناکامیوں سے ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ سب بار بار ان کٹھنائیوں سے لڑنے پر مجبور تھے کیونکہ یہ کروڑوں انسانوں کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

وہ سب اب اس کیمپ تک پہنچ چکے تھے، جہاں انہوں نے اپنا سامان چھوڑا تھا۔ اور کئی گھنٹوں سے وہاں برف کھود رہے تھے۔ لیکن اب تک انہیں کوئی ایسی نشانی بھی نہیں ملی تھی کہ وہ اندازہ لگا سکتے کہ اس سامان کا ہوا کیا؟ اور اسے کہاں ڈھونڈا جائے۔

''مسٹر کوہلی! کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ہم لوگوں کے بعد یہاں کوئی اور آیا ہو اور وہ سامان اٹھا کر لے گیا ہو۔'' مائیکل نے فولڈنگ چیئر کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہوئے تھے اور وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

''مائیکل! شاید تمہیں معلوم نہ ہو لیکن بھارت سرکار نے پہلی مرتبہ ہماری واپسی کے بعد، جب انہیں ہمارے سامان کے کھو جانے کی رپورٹ ملی تو فوری طور پر وہاں کسی بھی ٹیم کے کوہ پیمائی کے لیے جانے پر سخت پابندی لگا دی تھی۔ اور وہاں سخت سیکیورٹی کا انتظام کر دیا گیا تھا، اتنا کہ کوئی پرندہ بھی نہ جا سکے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ وہ سامان کوئی اور لے اڑا ہو، یہ ناممکن ہے۔'' کوہلی نے اس کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن ہم دو مرتبہ یہاں آ چکے ہیں۔ تلاش کی جتنی کوششیں کر سکتے تھے، وہ کیں۔ اس کے باوجود اس سامان کی کوئی نشانی، اس کے کچھ اثرات، اس کا کوئی حصہ۔ کچھ تو ملا ہوتا۔ کوئی نشانی تو ملی ہوتی۔ اس طرح سارے کا سارا سامان غائب ہونا۔ کچھ بڑی عجیب صورتِ حال نہیں ہے مسٹر کوہلی؟''

''تمہیں یاد ہے مائیکل! جب ہم پہلی مہم لے کر آئے تھے۔ تو ہمارے ساتھ میڈیکل ٹیم میں ایک ڈاکٹر چترویدی تھے۔''

''ہاں لیکن اس ٹیم میں تو اور بھی دو انڈین ڈاکٹرز اور ایک میڈیکل ٹیکنالوجسٹ لڑکی بھی تھی۔ کیا ہوا اُن کو۔''

''یہی تو ملین ڈالر کا سوال ہے مائیکل! واپسی میں وہ ڈاکٹر بہت بیمار ہو گیا تھا اور جانتے ہو اس کی بیماری کیا تھی؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ وہ شاید ٹھنڈ کھا گیا تھا بلکہ لداخ پہنچنے تک تو وہ شاید ٹھیک بھی ہو گیا تھا۔ اور شاید اس کی شادی بھی ہوئی تھی اسی کی کولیگ کسی لیڈی ڈاکٹر سے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں پروفیسر! شادی ضرور ہو گئی تھی لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اسے اس کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں اس کا مکمل چیک اپ ہوا اور ڈاکٹرز حیران رہ گئے جب اس کی ٹیسٹ رپورٹس سامنے آئیں۔''

''اچھا! ایسا کیا تھا اس کی رپورٹس میں؟''

''اس پر...... ریڈی ایشن کے اثرات تھے۔ الفا ریڈی ایشن پارٹیکلز اس کی پوری باڈی میں بُری طرح سرایت کر گئے تھے۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ سروائیو نہیں کر پائے گا۔ ہو سکتا ہے جب ہم نیچے پہنچیں تو ہمیں یہ خبر ملے کہ وہ ایکسپائر ہو چکا۔ اور اگر یہ خبر لیک ہو گئی...... تو تم اندازہ کر سکتے ہو مائیکل! کہ پورا میڈیا ہماری کھال اُدھیڑ دے گا۔ اور ہمارے ساتھ تمہیں بھی کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے گا۔ پبلک کا اتنا شدید ردِعمل ہو گا کہ بھارت سرکار کو بھی تمہاری سرکار سے جواب طلب کرنا پڑے گا کہ ایسی بے پروائی کیسے ہوئی کہ تم لوگوں نے کروڑوں لوگوں کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ دونوں حکومتوں میں بھی ٹھن جائے گی۔ اب مل کر سوچو اور فیصلہ کرو کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''او مائی گاڈ! یہ غلطی اتنی خطرناک صورتِ حال اختیار کر جائے گی، یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب ہم کیا کریں گے مسٹر کوہلی؟''

''مجھے تو میرے آفیسرز نے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ اگر وہ باکسز مل جائیں تو واپس آنا ورنہ وہیں رہ جانا۔ خالی ہاتھ واپس آئے تو کروڑوں انسانوں کی زندگی کو خطروں میں ڈالنے کے جرم میں ہم تمہیں نرکھ میں بھیج دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اس منصوبے کے خالق تم اور تمہاری سی آئی اے ہے۔ سپرویژن بھی تمہارا تھا اس لیے زیادہ ذمے داری بھی تمہاری ہی بنتی ہے۔ تمہیں نیچے جا کر اس سلسلے میں ایک سخت قسم کی انکوائری کا سامنا تو لازمی طور پر کرنا ہی پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بھارت سرکار تمہاری حکومت سے یہ مطالبہ بھی

کرے کہ تم نے اپنی ذمے داری میں بے پروائی برت کر بے شمار لوگوں کی زندگی کو شدید خطرات میں ڈال دیا ہے۔ کیوں نا تم پر ان افراد کے قتل کا مقدمہ چلا کر سزا دی جائے۔'' کوہلی نے مائیکل کو ایک نئی پریشانی سے دوچار کر دیا۔

''لیکن میں اکیلا تو اس بات کا ذمے دار نہیں ہوں۔ تم اور دوسرے لوگ بھی اس میں شامل تھے؟'' اس نے بوکھلا کر کہا۔

''بے شک، ہم سب ہی اس میں شامل تھے۔ لیکن ہم سب کی سربراہی تو تمہارے ہی ذمے تھی۔ ہم میں سے ہر شخص صرف تم ہی کو جواب دہ تھا اس لیے اب جواب بھی تم ہی کو دینا ہے۔ میں خود بھی تمہارے احکامات کو فالو کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ مجھے بھی اس بات کے لیے سختی سے پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ہوسکتا ہے کہ سخت ترین سزا کا سامنا بھی کرنا پڑے۔''

''او مائی گاڈ! اب ہم کیا کریں کوہلی؟''

''آج کا پورا دن ہم نے برف کھودنے میں لگا دیا۔ کل اور کوشش کرتے ہیں۔ کل بھی کوئی سراغ نہ ملا تو واپس جانا پڑے گا اور نیچے جا کر ہمیں یہی کہنا ہوگا کہ موسم کی خرابی کے سبب ہم کام ہنڈریڈ پرسنٹ نہیں کر پائے۔ اب جون کی گرمی میں ایک آخری چکر اور لگائیں گے۔ جھوٹی صحیح، پر ایک امید تو دے دیں پھر دیکھتے ہیں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر سمیر آخری راؤنڈ لگا کر جا چکے تھے۔ چیک اپ کرتے ہوئے انہوں نے جس مایوسی سے سر ہلایا تھا، اس نے شائی کے دل پر خراش سی ڈال دی تھی۔ ویسے وہ خود بھی مانیٹر پر دیکھ رہی تھی کہ دل کی رفتار بہت ہی کم اور بلڈ پریشر بھی بہت گرتا جا رہا تھا۔ کوئی علاج، کوئی صورت کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

رانی جی نے تھاپا کو دوبارہ لانگ بستی بھیجا تھا کہ وہ ویدجی سے کوئی نسخہ لے آئیں۔ جو کنور کے دل کو بھی نئی زندگی دے سکے۔ لیکن تھاپا جی اگلے روز ہی واپس آگئے تھے، اس بری خبر کے ساتھ کہ ویدجی کا تو دیہانت ہوگیا۔ اب کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔

مصنوعی سانسوں کے سہارے کنور جی کس حد تک زندہ تھے یہ بات صرف مشینیں بتا رہی تھیں۔ ورنہ ان کے تمام وائٹل سائنز ختم ہو چکے تھے۔

ڈاکٹرز کے بورڈ نے آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ اب اس دل کے ساتھ کنور زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ان کی زندگی چاہیے، تو انہیں نیا دل لگانا پڑے گا اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جس کا بلڈ گروپ اور ٹشوز میچ کرتے ہوں تو اس کے مرتے ہی دل نکال کر کنور کو ٹرانسپلانٹ کر دیا جائے، تب ہی وہ زندگی کی طرف واپس آسکتے ہیں۔ ورنہ......

ڈاکٹر سمیر نے نہ صرف انڈیا بلکہ دنیا کے ہر اُس ملک میں ڈونر تلاش کرنے کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں، جہاں بلڈ اور اورگن بینک تھے۔ لیکن ابھی تک کہیں سے کوئی امید افزا خبر نہیں ملی تھی۔ ہر طرف مایوسی تھی۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر سمیر نے جس طرح مایوس ہو کر کہا تھا کہ بس شاید صرف کل کا دن اور ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ تو شائی کی اپنی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔ وہ بار بار سر اٹھا کر کنور کا چہرہ دیکھتی اور اس زرد اور بے جان چہرے کو دیر تک دیکھتی رہتی۔

''کل تک۔ بس کل تک اور اس چہرے کو دیکھ لے شائی! پھر یہ کبھی نظر آنے والا نہیں ہے۔'' وہ اپنے آپ سے کہتی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔

ڈاکٹر سمیر وہاں سے محل پہنچے تو رانی نے بڑی پوجا کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ بہت سے پنڈت، گیانی اور سادھو گیروے کپڑے پہنے اپنے اپنے کیرتن کر رہے تھے۔ اور ان کے شور سے محل کا وہ حصہ گونج رہا تھا۔ خود رانی بھی زعفرانی ساڑی پہنے ماتھے پر تلک لگائے، ہاتھ جوڑے بھگوان کے سامنے پرارتھنا میں مصروف تھیں۔

سمیر چوہدری خود بھی تھک کر وہیں بیٹھ گئے۔ مایوسی اور بے بسی کی ایسی کیفیت سے وہ کبھی نہیں گزرے تھے۔ کنور اُن کے سامنے کا بچہ تھا۔

اور اپنی بہت اچھی عادتوں کی بنا پر وہ ان کے دل کے بھی بہت قریب تھا۔ اس کے دور چلے جانے کا خیال انہیں بھی بہت آزردہ کر رہا تھا۔

یکا یک ان کے فون پر کال آئی اور وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ سنتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال چلے گئے۔

سادھو اور پنڈت تو رات کے پہلے پہر ہی پوجا ختم کر کے چلے گئے تھے لیکن رانی جی کے دل کو لگی ہوئی تھی، وہ راج محل کے مندر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ رات کا گہرا اندھیرا ہلکا ہونا شروع ہوا تو وہ اٹھ گئیں۔

''نور احمد کو بلاؤ۔'' انہوں نے کسی کو حکم دیا تو اس نے

بتایا کہ نور احمد باہر ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئیں۔

"کہاں جانا ہے نور احمد؟" انہوں نے پوچھا۔

"تھوڑی دور پر حضرت عبداللہ رحیم شاہ کی درگاہ ہے۔ وہاں ایک بزرگ ہوتے ہیں جو عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی سے کلام نہیں کرتے، لیکن اگر وہ کسی کو دعا دے دیں تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے حضور دعا کے لیے حاضر ہو کر مدعا بیان کریں تو شاید وہ کنور کے لیے دعا کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو سب کو یقین ہے کہ کنور ضرور اچھے ہو جائیں گے۔"

"چلو نور احمد! ہم اپنے کنور کے لیے ہر اُس جگہ جائیں گے۔ جہاں سے تھوڑی سی بھی امید مل سکے۔ ہم ان بزرگ کے پاؤں پڑ جائیں گے اور اس وقت تک نہیں اٹھیں گے، جب تک وہ دعا نہیں کرتے۔ چلو۔" وہ ننگے پاؤں درگاہ کی جانب روانہ ہوئیں اور انہوں نے وہی کیا جو کہا تھا، اور آخر کار دعا لے کر ہی انہوں نے سر اٹھایا۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کے بند دروازوں کے ماتھے پر سرخ روشنیاں جل رہی تھیں اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اندر آپریشن چل رہا ہے اور کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

رانی اس روم میں داخل ہوئیں جس کو کنور کے لیے آئی سی یو میں تبدیل کیا گیا تھا، تو وہ وہاں نہیں تھے بلکہ کوئی بھی نہیں تھا۔ گارڈ نے بتایا کہ انہیں کچھ ٹیسٹوں کے لیے لے جایا گیا ہے۔ شائی بھی ان کے ساتھ ہے۔ انہیں کئی گھنٹے لگیں گے۔

"ٹھیک ہے۔ وہ اپنے روم میں آ جائیں تو ڈاکٹر سے کہنا میں ان کے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ محل واپس چلی گئیں۔ پوری رات جاگنے کے باوجود ان کی بے چینی انہیں سونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ ٹہلتی رہیں۔ ایک ایک لمحہ ان کے اضطراب کو بڑھا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے کئی گھنٹے گزرتے چلے گئے۔ دوپہر دو بجے اُن کے فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر سمیر کا فون تھا۔

"کیا ہوا ہے سمیر؟ کیا ہو رہا ہے کنور کے ساتھ؟ وہ کیسا ہے؟ میں بہت پریشان ہوں؟"

"تمہاری ساری پریشانی ختم ہو گئی سشمیتا! ہمیں ڈونر مل گیا تھا اور ہم نے فوری طور پر آپریشن کر کے اس کا دل کنور کو لگا دیا ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ کنور کی باڈی نے اس دل کو قبول کر لیا ہے۔ اب بھگوان نے چاہا تو کنور ایک لمبی زندگی جئے گا۔ بہت مبارک ہو سشمیتا۔"

"ہے بھگوان! سمیر تم نے کنور کو ہی نہیں، مجھے بھی ایک نئی زندگی دی ہے۔ ورنہ میں تو بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی وہ ہوش میں نہیں آیا ہے۔ دو گھنٹے لگیں گے۔ ویسے بھی وہ ویری ویری ان ٹینسیو کیئر میں ہے۔ تم دو گھنٹے کے بعد ہی آنا۔ یہاں میں ہوں۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔"

"آر یو شیور! کہ واقعی سب کچھ بالکل ٹھیک ہے؟ کیونکہ تمہاری آواز اور انداز میں خوشی کے بجائے کچھ اداسی یا کچھ فکر محسوس ہو رہی ہے مجھے۔"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس تھک گیا ہوں بہت۔ پورے گیارہ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہ کر گزارے ہیں میں نے۔ دو گھنٹے بعد ملاقات ہو گی۔"

رانی جی دو گھنٹے سے بہت پہلے اسپتال میں موجود تھیں۔ کنور اپنے روم میں لائے جا چکے تھے۔ وہی ساری مشینیں اب بھی ان کے جسم سے وابستہ تھیں اور اپنی اپنی ریڈنگز کے ذریعے بتا رہی تھیں کہ مریض اب تیزی سے روبہ صحت ہے۔ کنور کے چہرے پر چھا جانے والے مردنی کے آثار بھی کم ہو رہے تھے۔ وینٹی لیٹر ہٹ چکا تھا اور مریض اب خود سانس لے رہا تھا۔

رانی جی کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں اور وہ بے چینی سے اس لمحے کی منتظر تھیں کہ کب وہ آنکھیں کھولتے ہیں۔ پھر ان کی پلکیں لرزنا شروع ہوئیں تو رانی جی لپک کر ان کے نزدیک آ گئیں۔

"کنور! میری جان آنکھیں کھولو۔ آنکھیں کھولو میرے بچے......"

"ویری گڈ! ویری گڈ سائن! اب یہ ہوش میں آ چکا ہے۔ سشمیتا! اب تم اس سے جو کچھ بولو گی، یہ سنے گا بھی اور سمجھے گا بھی۔ آنکھیں کھولنے اور بولنے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔" یہ ڈاکٹر سمیر تھے جو اسی وقت اندر داخل ہوئے تھے اور کنور کی لرزتی پلکوں کو دیکھ رہے تھے۔

"بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ انہوں نے میرا بیٹا واپس لوٹا دیا۔" رانی جی کی ساری توجہ بیٹے کی طرف تھی۔

پھر وہ جادوئی لمحہ بھی آیا کہ کنور کی لرزتی پلکیں اٹھیں اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور رانی جی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کا

چہرہ ہاتھوں میں تھام کر ان کی پیشانی چوم لی۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے، پھر ان میں ایک سوال اترا۔ بہت کمزور سی آواز میں انہوں نے پوچھا۔

''شائی؟''

''شائی؟ ہاں وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ آجائے گی، تم آرام کرو۔ فی الحال بولنے کی کوشش نہ کرو تو اچھا ہے۔ سونے کی کوشش کرو، اٹھو گے تو تمہاری توانائی کافی حد تک بحال ہو چکی ہوگی۔ پھر اپنی ماں سے باتیں کرنا، ٹھیک۔''

''سمیر! اس وقت تو شائی کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ کتنی خدمت کی ہے اس نے کنور کی۔ اس خوشی کے موقع پر یہاں ہونا تو اس کا حق بنتا ہے۔ اس وقت وہ کہاں چلی گئی؟'' رانی جی نے کچھ اُلجھتے ہوئے سوال کیا تو ڈاکٹر نے مبہم سے اشارے سے انہیں اپنے آفس میں آنے کا اشارہ کیا۔

آرام سے بیٹھو سشمیتا! اور دل تھام کر سنو! شائی اب کبھی نہیں آئے گی۔ تمہارے کنور کو اس نے اپنے دل کا نذرانہ دے دیا ہے اور خود بہت دور چلی گئی ہے۔ اتنی دور، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔'' ڈاکٹر نے بھاری لہجے میں بولتے ہوئے جو انکشاف کیا، اس نے رانی کو ہلا کر رکھ دیا۔

''کیوں؟ کیسے؟ وہ مری کیسے؟ اس کا دل تو مرنے کے بعد ہی نکالا گیا ہوگا۔ کیا ہوا تھا اُسے؟'' وہ حیرتوں کی انتہا پر تھیں۔

''محبت...... محبت ہو گئی تھی اُسے۔ تمہارے کنور سے۔ لوگ تو زبانی دعوے کرتے ہیں لیکن اس نے سچ مچ اپنا دل دے دیا ہے اپنے محبوب کو۔ اب وہ ہمیشہ اس کے سینے میں دل کی صورت دھڑکتی رہے گی۔''

''تو...... تو کیا تم نے اُسے مارا...... دل نکالنے کے لیے؟ اس نے تم سے کہا اور تم مان گئے؟''

''نہیں اس نے خودکشی کی ہے۔ رات کو میں کنور کا چیک اَپ کرنے گیا تھا۔ وہ آخری سانسوں پر تھا۔ شائی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے بتا دیا کہ شاید کل ہی آخری دن ہو۔ وہ بہت آزردہ نظر آئی۔ ڈونر کا پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ نہیں ملا ابھی تک۔ پھر پوچھا کہ اگر کوئی مر جائے تو کتنے گھنٹے تک اس کا دل اس قابل رہتا ہے کہ کسی کو ٹرانسپلانٹ کیا جا سکے۔ میں نے بتا دیا کہ آٹھ گھنٹے تک تو اس قابل رہتا ہے۔ پھر میں...... محل چلا گیا تھا تا کہ تمہیں بتا دوں کہ وقت نہیں ہے۔ مل لو جا کر۔ اپنے بیٹے سے آخری بار۔ تم پوجا میں مصروف تھیں۔ میں بیٹھا تھا کہ شائی کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بہت ساری نیند کی گولیاں کھالی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا مرنے میں۔ آپ یہاں آ کر تیاری کریں اور میرا دل نکال کر کنور کے سینے میں لگا دیں۔ میں اپنا ٹشو میچ ٹیسٹ بھی کروا چکی ہوں۔ پوزیٹیو ہے وہ۔ میں ترنت بھاگا۔ یہاں آ کر دیکھا تو واقعی وہ کنور کے سینے پر سر رکھے ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔ بس پھر یہی کرنا تھا۔ سو کیا۔ اب تمہارے کنور کے سینے میں اُس پاگل لڑکی کا دل دھڑک رہا ہے۔''

ڈاکٹر سمیر کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی اور رانی چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر بلک بلک کر رو پڑیں۔ عجیب احساس تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کنور کے جی اٹھنے کی خوشی منائیں یا شائی کا پہاڑ جیسا دکھ اٹھا کر ٹوٹ جائیں۔

☆☆☆

ہال میں تقریباً تیس پینتیس لوگ پوری دلچسپی اور توجہ سے کمانڈر کوہلی کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ ان پرانے دنوں کی یادوں کو دہرا رہے تھے، جب انہوں نے امریکن ٹیم کے ساتھ نندا دیوی کی چوٹی سر کرنے کی مہم میں حصہ لیا تھا۔

''تو دوستو! آپ میں سے زیادہ تر لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ ایک ایسی مہم تھی، جس کے اغراض و مقاصد دیش سے جڑے ہوئے تھے۔ کچھ سامان تھا جسے نندا دیوی کی چوٹی تک پہنچانا اور وہاں فکس کرنا تھا۔ تاکہ چین کے حملوں کے خطرے پر ہر وقت نظر رکھی جا سکے۔ ایک جنگ ہم ان سے لڑ چکے تھے، جس میں بہت تباہی ہوئی تھی۔ آئندہ نہ ہو اس لیے یہ بہت ضروری تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارا وہ سامان جو ہمیں اوپر پہنچانا تھا راستے میں ہی گم ہو گیا۔ اور اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمیں پانچ بار وہاں جانا پڑا تھا۔ اور پھر بھی وہ سامان ہمیں نہیں ملا۔ ریکارڈ پر یہی ہے اور سب یہی جانتے بھی ہیں۔

لیکن آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم وہاں پانچ بار نہیں بلکہ چھ بار گئے تھے۔ جی ہاں! دوسری بار ہم صرف انڈین تھے جو پہلے سفر کے فوراً بعد اس خطرناک راستے پر دوبارہ گئے۔ یہ ایک انتہائی خفیہ مہم تھی۔ وہ جگہ صرف میں جانتا تھا جہاں ہم اپنا سامان چھوڑ کر آئے تھے۔

اس سامان میں موجود وہ ساڑھے تین کلو پلوٹونیم ہمارے لیے اتنا ہی ضروری تھا جتنا سانس کے لیے آکسیجن ضروری ہوتی ہے۔ چین تیزی سے ایٹمی طاقت بن رہا تھا اور اس کے بعد اس نے ہمیں مجبور کر دینا تھا کہ ہم اپنے دیش کو اس کی مرضی کے مطابق چلائیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا

کہ ہم بھی اپنی طاقت کو بڑھائیں، تاکہ اس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر رہ سکیں۔ پلوٹونیم کا حصول ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔

کوئی بھی ملک ہمیں کسی قیمت پر وہ دے نہیں سکتا تھا کیونکہ امریکا کی ہی مرضی کے مطابق دنیا میں ایٹمی طاقت کے پھیلاؤ کو روکنا بہت ضروری تھا۔

ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی اور راہ نہیں تھی کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ساڑھے تین کلو پلوٹونیم، جان پر کھیل کر وہاں سے چُرا کر لے آتے۔ جب میں نے یہ تجویز پیش کی تو سب حیران اور پریشان ہو گئے۔"

''اور وہ امریکن ٹیم؟ کیا وہ سمجھے گی نہیں کہ سامان کس نے اور کیسے چوری کیا؟ کیا وہ اتنے بڑے نقصان کو آسانی سے برداشت کر لیں گے۔ اپنے ملک جا کر شکایت ضرور کریں گے۔ پھر ہماری حکومت کیا جواب دے گی؟''

''امریکا سے ناراضگی مول لینے کا مطلب سمجھتے ہو کوہلی؟'' یہ سوال کیا تھا ہمارے انٹیلی جنس بیورو کے چیف نے۔

''اس کی ناراضگی کو کیسے ہینڈل کرنا ہے، یہ کام پردھان منتری اور اُن کی کیبنٹ کا ہے۔ میں اپنے دیش کا بھگت ہوں اور اس ناتے میں یہ کام ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ میرے دیش کو یہ چینی دوبارہ ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ کس کو کیا جواب دینا ہے؟ یہ جن کا کام ہے، وہ جانیں۔''

بس۔ اگلے روز ہی پردھان منتری کے سامنے میری پیشی ہوگئی۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا تو وہ مسکرائے اور... بولے۔

''ٹھیک ہے کوہلی! جب تک بھارت واسیوں میں تم جیسے دو چار دیوانے نہ ہوں۔ دیش آگے نہیں چل سکتا۔ جاؤ! اور جو کرنا چاہتے ہو۔ کرو۔ ہم دیکھ لیں گے امریکا کو۔''

پھر اس امریکن ٹیم کی اس قدر خطرناک کھنچائی کی گئی کہ وہ پہلے ہی خوف زدہ ہو گئے۔ کہا یہ گیا کہ ان لوگوں نے جب یہ پلان بنایا تھا، تو اسے فول پروف کیوں نہیں بنایا۔ اب جو کروڑوں لوگوں کی زندگی داؤ پر لگ گئی ہے۔ اس کا حل بتاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں اس بھیانک جرم کی سزا خود اپنے ملک میں دیں گے۔ امریکا نہیں جانے دیں گے۔ چاہے تمہاری حکومت کچھ بھی کر لے۔ وہ سب بہت ڈر گئے۔ پھر انہیں مزید خوفزدہ کرنے کے لیے ان کو خفیہ کورٹ میں مقدمہ کا نوٹس بھی بھیج دیا گیا۔ بس پھر وہ اپنی حکومت کی سرتوڑ کوششوں کے بعد جوں توں یہاں سے جان چھڑا کر بھاگے اور پھر کبھی نہیں آئے۔

''تو دوستو! ٹھیک پچاس سال پہلے آج ہی کے دن، میں نندا دیوی کی اونچائیوں سے وہ امرت لے کر آیا جس نے آنے والے وقتوں میں بھارت کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ آج کسی کی ہمت نہیں کہ وہ ہمارے دیش کو ٹیڑھی نظر سے دیکھنے کی جرأت کرسکے۔ آج میں اپنے اس پاگل پن کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ایک دیش بھگت کی اپنے دیش کو ایک چھوٹی سی بھینٹ تھی جو فخر سے آج بھی میرا سینہ چوڑا کر دیتی ہے۔

تو دوستو! آج کے دن کیا میں اس بات کا حق دار ہوں کہ پچاس سال پہلے کے اس یادگار دن کی گولڈن جوبلی مناتے ہوئے، میں اس خوب صورت کیک پر چھری چلا سکوں اور اس کا ایک خوش ذائقہ پیس کھا کر اس گولڈن ڈے کی یاد منا سکوں۔ اجازت ہے؟'' انہوں ربن بندھی ہوئی چھری اٹھاتے ہوئے پوچھا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

چینی صدر کی دعوت پر پاکستانی وزیراعظم اپنے کچھ وزراء کے ساتھ بیجنگ آئے ہوئے تھے۔ عام میٹنگز میں کچھ معاہدوں کے بعد آج ایک ون ٹو ون میٹنگ تھی۔

''آپ کے لیے ایک ٹپ ہے۔'' چینی صدر نے وزیراعظم کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا تو وہ چونکے۔

''انڈیا کچھ ہی عرصے میں ایٹمی طاقت بننے جا رہا ہے۔ آپ کا اور ہمارا مشترکہ پڑوسی ہے۔ سازشی مکار اور ناقابل اعتبار ہے۔ آپ کا ایک مشرقی بازو الگ کر چکا ہے۔ اب باقی ماندہ پاکستان کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔ ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد وہ اپنے پر پھیلائے گا۔ ہم سے مقابلے کے قابل تو نہیں ہے وہ۔ لیکن آپ سوچ لیجیے گا۔''

''انڈیا؟ ایٹمی طاقت؟ لیکن ہمارے پاس تو ایسی کوئی اطلاعات نہیں ہیں۔'' وزیراعظم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''آپ کے پاس تو کبھی بھی وہ اطلاعات نہیں ہوتیں، جن کا ہونا آپ کی بقا کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہم دوست ہیں اس لیے یہ بات آپ کو بتا رہے ہیں۔ امید ہے آپ اس بات کی اہمیت کو سمجھیں گے۔''

ان کی بات سن کر وزیراعظم نے سر ہلایا اور میٹنگ برخاست ہوگئی۔

❖ ❖ ❖

نصف صدی کا قصہ

کبیر عباسی

کچھ لوگ اپنی زندگی پنجرے میں قید پنچھی کی طرح گزار دیتے ہیں۔ خزاں رسیدہ آرزوئیں گویا زخمی پرندوں کی طرح سنہری یادوں کے شجر سے بالآخر ٹوٹ کر گر پڑتی ہیں۔ سالوں سے ماضی کی قید میں زندگی گزارنے والی ایک ایسی ہستی کی کتابِ زندگی جس کے ورق جل چکے تھے... قدموں کی آہٹیں کھو چکی تھیں اور تحریر راکھ ہو چکی تھی مگر خیالات کی لہر تھی... محبت کے سارے سوال تھے... جو فراموشی کی نذر ہو چکے تھے... نصف صدی کا فاصلہ طے کر چکے تھے... مگر اچانک ہی ایک آندھی چلی جس نے ماضی کے رشتوں کو زندہ کر دیا... اور حال کو درگور کر دیا... لمحہ بہ لمحہ ایک نیا رنگ بدلتی... سنسنی خیز کہانی کے زخمی ورق...

پچاس سال پہلے اور پچاس سال بعد رونما ہونے والی ہنگامہ آرائیاں

گولڈن جوبلی پر دوسرے سرورق کا تیکھا رنگ

کمرے میں گہرا سناٹا پھیلا تھا۔ اس سناٹے میں محض ایک آواز گونج رہی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی مسلسل آواز......

گھڑی کی سوئی مخصوص رفتار سے ایک دائرے میں گردش کر رہی تھی۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی مگر اس پر نظریں لگائے عالیان کی نظر میں اس کی منزل طے تھی۔

گھڑی کی سوئی اپنا آخری چکر شروع کر چکی تھی۔ اس کی ہر جنبش پر عالیان کے چہرے کے تاثرات عجیب سے

عجیب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ''کاؤنٹ ڈاؤن'' کرنے لگا۔ پچاس، اُنچاس، اڑتالیس...... اسے گھڑی کی سوئی کی آواز کے ساتھ اب ایک اور مسلسل آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز...... جس کا شور لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔

سُوئی کا چکر مکمل ہوتے ہی گھڑی نے گھنٹا بجایا اور دنیا نئے سال میں داخل ہو گئی۔ عالیان نے گہری سانس لی اور پھونکیں مارنے لگا۔ اس کے سامنے رکھی موم بتیاں تیزی سے بجھنے لگیں۔ پچیس موم بتیوں کو بجھاتے بجھاتے اس کا سانس پھول گیا۔ وہ رک کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان پچیس سالوں نے مجھے کس قدر بوڑھا کر دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کے چہرے پر گہری افسردگی کی چادر پھیل گئی۔ اس کے دل سے سرد آہ نکلی اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ساکت ہو کے رہ گئیں۔

پچیس سال قبل وقت اور حالات نے اسے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کے ایک راستے کا انتخاب کیا تھا لیکن آج تک وہ جان نہیں پایا تھا کہ اس نے درست راستے کا انتخاب کیا تھا یا غلط۔ وہ ہمیشہ کشمکش کا شکار ہی رہا تھا۔ اس مخصوص تاریخ کو اس کی کشمکش ہمیشہ ہی بڑھ جاتی تھی۔ وہ اس دن بیٹھ کے سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھ جاتا تھا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا تھا۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ تھک ہار کے اس نے سوچنا ترک کیا اور پاس رکھی چھری اٹھا لی۔ وہ اس کی دھار کا معائنہ کر رہا تھا۔ دھار پر نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے سامنے رکھے کیک پر دھار آزمائی۔ کیک نرمی سے کٹ گیا۔ وہ اتنے انہماک سے کیک کے ٹکڑے کرنے لگا جیسے سُوئی میں دھاگا ڈالتے ہیں۔ وہ جب سیدھا ہوا تو کیک ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ پورے پچیس ٹکڑوں میں...... اس نے ایک ٹکڑا کاٹ کے منہ میں رکھا۔ اس کا ذائقہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا۔

یہ کیک اس نے خود تیار کیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کو، اس کی شخصیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ پرت در پرت تہوں میں لپٹا۔ جس کی ہر تہ میں مٹھاس کے ساتھ کڑواہٹ بھی موجود تھی۔ وہ ایک ایک کر کے پورے پچیس ٹکڑے کھا گیا۔ یہی اس کا آج کا ڈنر تھا۔ اب وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھی فریم میں بند تصویر نکال کے ایک طرف ڈال دی اور ریپر میں لپٹی ایک اور تصویر نکال کے فریم میں لگانے لگا۔

اب وہ اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ تصویر میں کُل پچیس افراد موجود تھے۔ یہ لوگ سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ سب سے بلند زینے پر ایک معمر عورت کھڑی تھی۔ اس نے جھک کے نچلے زینے پر کھڑے چار مردوں اور چار خواتین کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون بکھرا ہوا تھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر عالیان کے دل سے بے اختیار ہوک اٹھی۔ اس کا دل دھیمی دھیمی آنچ سے سلگنے لگا۔ سب سے نچلے زینے پر سترہ لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر کھلنڈرا پن نمایاں تھا۔ عالیان کی نظریں باری باری سب کے چہروں سے پھسلتے ہوئے آخری چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ ایک تیئس چوبیس سالہ لڑکے کی تصویر تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد چمکدار تھیں۔

''عباد۔'' اس نے زیرِلب اس لڑکے کا نام لیا۔ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات انتہائی عجیب ہو گئے۔

☆☆☆

دارالحکومت کے نواح میں پہاڑیوں پر ایک خوبصورت بستی آباد تھی۔ یہ بستی جنت نگر کے نام سے موسوم تھی۔ یوں تو جنت نگر کا ہر گھر ہی فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا مگر ان تمام گھروں میں جنت محل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ محل ایک پہاڑی کو کاٹ کے تعمیر کیا گیا تھا اور دور دور تک لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔

جنت محل اس وقت بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ محل کے اندر زندگی جوبن پر تھی۔ جنت محل کی روشنیوں سے پورا علاقہ منور تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کوئی بہت خاص دن ہو اور واقعی محل کے مکینوں کے لیے یہ انتہائی خاص دن تھا۔ سال کا آخری دن...... سال بھر محل کے در و دیوار پر ویرانی رہتی تھی لیکن سال کے آخری دن محل کے سارے مکین اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ مل کے گزشتہ سال کو الوداع اور نئے سال کا استقبال کرتے تھے۔ یہ یہاں کا پرانا دستور تھا جو اس گھرانے کی سربراہ جنت بیگم نے قائم کیا تھا۔ یہ دستور اس گھر کے مکینوں کی ایک دوسرے سے لازوال محبت کو ظاہر کرتا تھا۔ یہ علامت تھی ان کے ساتھ ہونے کی ...... یہ وعدہ تھا آئندہ بھی ہمیشہ ساتھ رہنے کا۔

اس محل کے مکین چاہے دنیا کے جس کونے میں بھی ہوتے، اس دن کو ساتھ منانے کے لیے جنت محل کا رخ کر لیتے۔ دن بھر گاڑیوں کی آمد جاری رہتی۔ اس دن جنت بیگم

کے چہرے کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ وہ اپنے پیاروں کا استقبال کرتے نہال ہوجاتی۔ بھی لوگوں کے اکٹھا ہوتے ہی وہ صدر دروازے کی سیڑھیوں میں ایک گروپ فوٹو بنواتے۔ یہ فوٹو سال بھر جنت بیگم کے کمرے کی زینت بنا رہتا۔ جب تنہائی کے ناگ اسے ڈستے تو وہ اس تصویر میں ہی پناہ تلاش کرتی۔ وہ محبت سے تصویر میں مقید چہروں کو دیکھتی جاتی۔ فاصلے مٹ جاتے، وہ سب کو اپنے قریب محسوس کرنے لگتی۔

اس وقت اس گھر کے تمام افراد ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ سب لوگوں کی نظریں مرکزی کرسی پر براجمان جنت بیگم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ جنت کی نظریں ایک دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئی پر۔ سُوئی نے اپنا آخری چکر شروع کر دیا تھا، اس کے ساتھ ہی جنت کے چہرے پر پھیلا سکون بھی گہرا ہوتا جارہا تھا۔ سُوئی کا چکر مکمل ہوتے ہی جنت نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے سامنے لرزتی موم بتی کو پھونک مار کے بجھا دیا۔

اُن کے چہرے خوشی سے کھل رہے تھے۔ جنت کا چہرہ بھی خوشی سے چمک رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی گہرائی میں، بہت گہرائی میں ایک غم ہلکورے لے رہا تھا۔ جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، نہ محسوس کرسکتا تھا۔ سوائے اس کے بیٹے عادل کے...... عادل سب سے زیادہ اس کا مزاج آشنا تھا۔ اس نے دھیرے سے جنت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ یوں، جیسے اسے تسلی دے رہا ہو۔ جنت نے چونک کے اسے دیکھا تاہم کچھ کہا نہیں۔ یہ بھی ہر سال کا معمول تھا۔ وہ بنا کچھ کہے ایک دوسرے کی بات کا مطلب سمجھ جاتے تھے۔

جنت مسکرائی اور کیک کاٹنے لگی۔ کیک کٹتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دینے لگے۔ جنت کیک کے ٹکڑے کاٹنے لگی۔ پورے انہماک کے ساتھ...... اس نے کیک کے پورے پچیس ٹکڑے کاٹے اور اپنے ہاتھوں سے سب کو ایک ایک ٹکڑا کھلایا۔ سب باری باری اپنی نشست سے اٹھتے اور جنت سے دلاسا لیتے۔ وہ انہیں ڈھیر ساری دعائیں اور نئے سال کی مبارکباد دیتی۔ کیک کا ٹکڑا کھا کے سب اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ جاتے۔

اب کیک کا صرف ایک ٹکڑا بچا تھا۔ عادل نے وہ ٹکڑا اٹھا کے جنت کی طرف بڑھایا۔ جنت نے مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا اور کیک کھانے لگی۔ اس کیک میں صرف مٹھاس تھی...... محبت بھری مٹھاس۔ اس انوکھے ذائقے کو

سزا

سردار جی کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ جج نے پوچھا۔ ''تمہاری کوئی آخری خواہش؟''

سردار جی بولے۔ ''ساڈی جگہ تُسی لٹک جاؤ۔''

پشاور سے راجندر سنگھ کی خوشی

محسوس کرتے ہوئے اس کے چہرے پر گہرا سکون بکھرتا جارہا تھا۔ سب لوگ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

جنت نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور آنکھیں بند کر کے ایک دعائیہ گیت گانے لگی۔ اس کی آواز میں محبت کا رس گھلا ہوا تھا جو سیدھا دلوں پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ آواز ہی تھی جس نے اس ہال میں موجود سب لوگوں کو جوڑا تھا...... اور جوڑ کے رکھا ہوا تھا۔ وہ اس آواز کے سحر میں کھوتے چلے گئے۔

گانا ختم ہوتے ہی ایک خوفناک آواز آئی اور سب کے دل دہل گئے۔ باہر بادل زور سے گرج تھے۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ چلی گئی۔ بقعۂ نور بنا جنت محل تاریکی میں ڈوب گیا۔ یو پی ایس کی مہربانی سے محض اس کے چند کمروں میں جلتی مدھم روشنیاں جلتی رہ گئیں۔ جنت کے چہرے پر گہری تشویش چھا گئی۔ ''ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا؟'' اس نے حیرانی سے کہا۔ اس کی آواز انجانے اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

☆☆☆

سورج مشرق سے سر اٹھا رہا تھا جب عالیان نے اپنے گھر کی کال بیل بجائی۔ جب تک دروازہ کھلتا، وہ ہاتھوں کو رگڑ کے گرم کرتا رہا۔ اس نے گرم اوور کوٹ پہن رکھا تھا مگر اس کے باوجود ٹھنڈ اسے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا۔

''کیسی رہی آپ کی نیو ایئر پارٹی؟'' وہ ہر سال عالیان سے دروازے پر یہی سوال پوچھتی تھی۔

''شاندار۔'' اور وہ ہر سال یہی جواب دیتا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں اندر کی طرف بڑھنے لگا۔ عالیہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔

''ناشتا لگاؤں آپ کے لیے؟'' وہ اس سوال کا جواب جانتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے حسبِ معمول

پوچھا۔

''نہیں۔ پتا نہیں کیوں آج بھوک ہی نہیں ہے۔'' عالیان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ عالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔ یہ وہ جواب تو نہیں تھا جو وہ ہر سال دیتا تھا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کے جواب دیا۔

''آپ ہر سال ایسی پارٹی پر جاتے ہی کیوں ہیں، جو آپ کو تھکن سے چور کر دیتی ہے۔'' عالیہ نے خفگی سے کہا۔

عالیان کے چہرے پر بھید بھری خاموشی چھا گئی۔ عالیہ اس کے وجیہہ چہرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ انہیں ساتھ رہتے لگ بھگ پچیس سال ہو چکے تھے مگر وہ اس کے لیے اب بھی انجان تھا۔ انجان اور پُراسرار...... اس کی شخصیت بہت سی پرتوں میں چھپی تھی مگر وہ باوجود کوشش کے کبھی کوئی پرت ہٹا نہیں سکی تھی۔

''آپ بتائیں گے نہیں؟'' اس کی آنکھوں میں امید ہلکورے لے رہی تھی۔

عالیان نے گہرا سانس لیا۔ ''عالیہ، تم ہر سال یہ سوال پوچھتی ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس سوال کا جواب تمہیں نہیں دے سکتا۔''

''میں نے سوچا شاید اس سال کچھ مختلف ہو جائے۔'' اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

''مختلف تو کچھ نہیں ہوا، لیکن میرے خیال میں اب کچھ مختلف کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' اس نے بے حد عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ عالیہ اسے یک ٹک دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

عباد کی آنکھ کھلی تو کمرے میں گہری تاریکی پھیلی تھی۔ اس نے موبائل آن کر کے وقت دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ چونک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پردہ ہٹایا۔

''یہ بارش ابھی تک رکی نہیں۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔ بارش اسے بے حد پسند تھی مگر اس وقت بارش دیکھ کے اس کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔ وہ تو ہمیشہ سے اس صبح چمکتی دمکتی دھوپ دیکھنے کا عادی تھا۔ رات کو اچانک بارش شروع ہونے کا اور بجلی جانے سے سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ کافی دیر بجلی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ یو پی ایس کی بیٹری جواب دے گئی تھی مگر، بجلی نہیں آئی تھی۔ وہ سب کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے تھے اور پھر اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

بارش کے باعث پہاڑیاں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

''ہیپی نیو ایئر مائی ڈیئر۔'' اس نے کال ریسیو کرتے ہی گنگناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کہاں مر گئے ہو اور تمہارا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔'' دانیہ نے غصے سے پھنکارتی آواز میں کہا۔

''خیریت تو ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ جنت محل نہ جانا۔ اس بار نیو ایئر نائٹ ہم ایک ساتھ سیلیبریٹ کریں گے۔''

''میں نے بھی تمہیں کہا تھا کہ یہ ممکن نہیں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''نیو ایئر نائٹ ہم سب گھر والے ایک ساتھ مناتے ہیں۔ یہ اس گھر کا پرانا دستور ہے جو کسی صورت نوٹ نہیں سکتا۔''

''چاہے میرا دل ٹوٹ جائے؟'' دانیہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''سوری، میں تمہاری ہر خواہش مان سکتا ہوں مگر تمہاری کوئی خواہش میری فیملی کی خوشیوں میں حائل ہو تو میرے لیے مقدم میری فیملی ہو گی۔'' اس کے انداز میں قطعیت تھی۔

''تمہارے نزدیک میری کوئی ویلیو نہیں؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''دیکھو ڈیئر۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ ہماری دوستی کو ایک ماہ ہو چکا ہے۔ یہ پورا مہینہ میں نے تمہارے ساتھ گزارا۔ کیا میں ایک دن...... صرف ایک دن بھی فیملی کے ساتھ نہیں گزار سکتا؟''

''تم رہو اپنی فیملی کے ساتھ...... دیکھ لوں گی میں تمہیں بھی اور تمہاری فیملی کو بھی۔'' اس نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں چھپی دھمکی کو محسوس کر کے عباد کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔ وہ اس کے اور اس کے اختیارات کی حد جانتا تھا اور اس کی ضدی فطرت کا بھی اسے اندازہ تھا۔

اس کے تمام دوستوں نے اسے دانیہ سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے بقول دانیہ کے مزاج میں حاکمیت تھی۔ اور تو اور اسے پروفیسر عالیان نے بھی دانیہ سے دور رہنے کا کہا تھا مگر اس نے کسی کی نہ سنی تھی۔ اس کی آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی تھی۔ اس پٹی نے اسے اندھا کر دیا تھا،

وہ اپنے دوست ولید کے تجربے سے بھی سبق حاصل نہیں کر سکا تھا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ سب درست تھے۔ دانیہ نے تو اپنے کسی حرارے کی طرح اسے اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا۔

یہ میرے ٹائپ کی نہیں۔ میں اب اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ بھول جاؤں گا اسے۔ اس نے فیصلہ کیا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ کاتبِ تقدیر اس کے لیے کوئی اور ہی فیصلہ لکھ چکا ہے۔

☆☆☆

دانیہ بے حد غصے میں تھی۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی یوں بھی اسے انکار کر سکتا ہے۔ ''اسے تو مزہ چکھانا پڑے گا۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔ اچانک اس نے میز پر رکھا گلاس اٹھایا اور پوری قوت سے دیوار پر لگے ایل ای ڈی پر دے مارا۔ ایل ای ڈی کی اسکرین تڑخ گئی۔ شور کی آواز سن کے ملازمہ نے دروازے پر دستک کی۔

''بی بی جی کیا ہوا، یہ آواز کیسی تھی؟'' اس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔'' وہ چیخی۔

اُسے کسی پل سکون نہیں مل رہا تھا۔ ''میں ...... میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ جس فیملی سے تمہیں اتنی محبت ہے برباد کر دوں گی اُسے۔'' وہ چلّاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ باہر ملازم سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

دانیہ اور عباد ایک ہی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ دونوں اکنامکس میں ایم فل کر رہے تھے۔ دانیہ نے کبھی کسی لڑکے کو اپنے قابل نہیں سمجھا تھا لیکن عباد میں جانے کیا خاص بات تھی کہ وہ پہلی ہی نظر میں اسے دل دے بیٹھی تھی۔

عباد سنجیدہ مزاج لڑکا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی لائف میں بے شمار لڑکیوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس نے ان تعلقات کو دوستی کی حد تک ہی محدود رکھا تھا۔ دانیہ سے بھی وہ اسی تناظر میں ملتا رہا تھا لیکن اس کے جذبات میں اتنی شدت تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو دوستی تک محدود نہیں رکھ سکا۔ پچھلے ایک ماہ میں وہ تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ اسے احساس ہی نہ ہوا اور وہ دانیہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گیا۔

دانیہ کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے علاقے کے بادشاہ تھے۔ اس نے باپ دادا کے سامنے لوگوں کو بے بسی سے ہاتھ جوڑتے دیکھا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی ان کے سامنے نظریں اٹھا کے بات کرتا۔ اسے بھی حاکمیت ورثے میں ملی تھی۔ اس کے دادا محی الدین نے گزشتہ الیکشن میں پہلی بار حصہ لیا تھا اور پہلی ہی بار وہ نہ صرف ایم این اے کی سیٹ جیتنے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ ایک اہم وزارت بھی حاصل کر لی تھی۔ کڑوے کریلے تو وہ پہلے بھی تھے اب گویا نیم چڑھے بھی ہو گئے تھے۔

دانیہ کو اپنے خاندان کے اثر و رسوخ کا غرور تھا۔ عباد نے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ یہ انتہائی بڑا جرم تھا۔ وہ بھلا کیسے اُسے معاف کر سکتی تھی؟

☆☆☆

جنت محل کے مکین اگلے ہی دن اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے تھے۔ عباد بھی شہر آ گیا تھا۔ اس نے ایک کمرے اور لاؤنج پر مشتمل اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہ اس کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ دانیہ سے جھگڑے کے بعد اس کا موڈ ابھی تک آف تھا۔ اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ دانیہ کا غصہ وقتی تھا مگر اس کی چھٹی حس نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

وہ سرِ شام ہی گھر پہنچا تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول رہا تھا کہ سامنے والے اپارٹمنٹ سے نمرہ نمودار ہوئی۔ وہ سیدھی اس کی طرف آئی۔

اسے دیکھ کے عباد کے دل میں ناگواری کی لہر اٹھی۔

''ہائے سویٹ ہارٹ، کیسے ہو؟'' اس نے اٹھلاتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے حسبِ معمول چست لباس پہن رکھا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے رکھی جواب دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ نمرہ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ عباد کو غصہ تو آیا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ کچن میں گیا اور پانی پینے لگا۔

نمرہ بے تکلفی سے اس کے بیڈروم میں گھس گئی۔ عباد اس کی اس حرکت پر جھلا کے رہ گیا۔ وہ اس کے پیچھے بیڈروم میں داخل ہوا تو وہ سائڈ ٹیبل سے کچھ اٹھا رہی تھی۔ عباد کو دیکھ کے اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟'' اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی غرض سے سوال کیا۔

''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' عباد اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ چلتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے افسردگی سے بولی۔ ''افسوس،

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں تم نہیں ہو۔" عباد اس کی قربت سے گھبرا گیا۔

"پیچھے ہٹو۔ یہ کیا کررہی ہو؟"

نمرہ کھلکھلا کے ہنسی۔ "تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے میں تمہیں کھا جاؤں گی۔" عباد نے بس اسے ناگواری سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"اچھا، چائے بناؤں تمہارے لیے۔"

"میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز، اب تم چلی جاؤ۔" اس نے بمشکل خود کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو چائے کا پوچھ رہی ہوں۔ چائے پی کے ساری تھکن اتر جائے گی۔" وہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

"پی چکا ہوں میں چائے۔ باقی تھکن آرام کرنے سے ہی اترے گی۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"مرضی ہے تمہاری۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "ورنہ تمہاری تھکن تو میں چند منٹ میں دور کرسکتی ہوں۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ عباد نے اسے غصے سے دیکھا۔ وہ ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے...... بھاگ گئی۔ عباد نے گہرا سانس لیا اور دروازہ بند کرنے کے لیے باہر کی طرف بڑھا۔

نمرہ اپنے شوہر کے ساتھ سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھی۔ وہ اس سے اکثر فری ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ عباد اس سے جتنا چڑتا تھا، وہ اتنا اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اکثر وہ اپنے گھر سے اس کے لیے چائے یا کھانا بنا کے لے آتی تھی۔ عباد نے اسے بہت بار منع کیا لیکن نمرہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ اس کا شوہر رات بارہ بجے کے بعد ہی گھر لوٹتا تھا۔ ایک بار اس نے ڈیوٹی سے واپسی پر نمرہ کو عباد کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ نمرہ تیزی سے بھاگ کے اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ وجاہت بھی اسے معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے ان کے اپارٹمنٹ سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ان آوازوں میں نمرہ کی آواز زیادہ بلند تھی۔ ان کے چلانے سے اس فلور کے بیشتر مکین جاگ گئے تھے۔

نمرہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے یکدم خیال آیا کہ وہ اس کی سائڈ ٹیبل سے کچھ اٹھا رہی تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے بات بدل کے عباد کی توجہ اپنی حرکت سے مبذول کرادی تھی۔

"آخر اس نے سائڈ ٹیبل سے کیا اٹھایا؟" وہ سوچتے ہوئے متلاشی نظروں سے سائڈ ٹیبل کے اطراف دیکھنے لگا۔ اس کی نظر بیڈ کے پائے کے پاس پڑی ایک چیز پر پڑی۔ اس کا دماغ گھول اٹھا۔

"میری غیر موجودگی میں یہاں یہ کھیل ہوتا ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔ "لیکن کون؟" اس نے سوچا۔

"کبھی یاور تو کبھی......" یکا یک اس کے ذہن میں پڑوسن کا جملہ گونجا۔ یاور اس بلڈنگ کا مالک تھا۔ اس کا اسی بلڈنگ میں ایک کمرا ٹیک تھا جہاں وہ دن بھر بیٹھا رہتا تھا۔

وہ انتہا درجے کا ٹھرکی تھا۔ یہ بات عباد جانتا تھا مگر وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا اپارٹمنٹ غلط سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا ہے، یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

وہ کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کی نظر یاور پر پڑی۔ وہ اپنے آفس میں داخل ہو رہا تھا۔

"اِدھر میرے ساتھ آئیں۔" عباد نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کے تاثرات دیکھ کے اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں عباد کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی بڑا لمبا سفر کر کے لوٹا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہے تو بعد میں بتانا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"آپ آئیں تو سہی۔" عباد نے اصرار کیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

"یہ کیا ہے؟" عباد نے بیڈ کے پائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی رنگت ایک لمحے کے لیے متغیر ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جوان بندے ہو یار، تمہیں نہیں پتا یہ کیا ہے؟"

"میں دو دن سے گھر میں نہیں تھا۔ تم میرے پیچھے نمرہ کے ساتھ یہاں گل چھرے اڑاتے رہے ہو۔" اس نے تنفر سے کہا۔

"دیکھو جوان، تمیز سے بات کرو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بیوی کو تمہارے کرتوت بتاتا ہوں۔" عباد نے اس کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھا۔

"تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔" اس نے انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی۔ "یہ کام میرا نہیں۔"

"تو اور کس کا ہے۔ میرے کمرے کی چابی تمہارے

علاوہ اور کس کے پاس ہے؟''

''میں تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ کف اُڑانے لگا۔

عباد اس کا غصہ دیکھ کے گھبرا گیا۔ وہ سیدھا سادہ نوجوان تھا اور ہمیشہ لڑائی جھگڑے سے دور رہا تھا۔

''آپ آئندہ میرا اپارٹمنٹ استعمال نہیں کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی بیوی کے ساتھ ساتھ وجاہت کو بھی بتا دوں گا۔'' اس نے جی کڑا کر کے کہا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ ورنہ تم مجھے جانتے نہیں۔ میں کسی کے خلاف ہو جاؤں تو...... اس کا جینا مشکل کر دیتا ہوں۔'' اس کے لہجے کچھ ایسا تھا کہ عباد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ بیڈ پر ڈھے گیا۔

''آج کا تو دن ہی منحوس ہے۔ پہلے دانیہ، پھر نمرہ اور اب یہ۔'' اس نے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

''اسے مار دو۔''

یہ آواز اس کے اندر مسلسل گونج رہی تھی۔ وہ اس آواز کا غلام تھا۔ وہ انتہائی طیش میں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ غصہ عقل کا دشمن ہے۔ اس نے اپنے غصے کو اپنا ہتھیار بنانے کا فیصلہ کیا نہ کہ کمزوری۔ اسے اس امر کا بخوبی ادراک تھا کہ کسی کو قتل کرنے کا مطلب اپنی جان داؤ پر لگانا ہے۔ اپنی جان کے بچاؤ کے لیے اس نے اپنے ذہن کا خوب استعمال کیا تھا۔ منصوبہ بندی سے کام کرنا اس کی عادت تھی اور قتل کرنا مجبوری۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق کھیل کا آغاز کر دیا تھا۔ اگر اس کھیل میں فتح کا انحصار کامیاب منصوبہ بندی پر ہوتا تو اس کی جیت یقینی تھی مگر وہ جانتا تھا جہاں سے دماغ کا کھیل ختم ہوتا تھا، وہاں سے قسمت کی چالبازی شروع ہوتی تھی۔

☆☆☆

نصف شب بیت چکی تھی۔ عباد بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا مگر نیند کی دیوی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ وہ چونک کے اٹھ بیٹھا۔

اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ معاً دروازہ کھلا اور اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ جس کا پھل چمک رہا تھا۔ عباد کی نگاہوں میں خوف جیسے منجمد ہو کے رہ گیا۔ وہ

ذرا بچ کے......اندر بچے کھیل رہے ہیں۔

اس شخص کی خود سے نفرت سے آگاہ تھا مگر اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے خلاف اس حد تک جا سکتا تھا۔ اسے دیکھ کے اسے اتنا گہرا شاک لگا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں سکا تھا۔

آنے والے نے اسے دھکا دیا۔ وہ الٹے قدموں نیچے جا گرا۔ خوف کے باعث اس کی آواز گنگ ہو گئی تھی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آنے والا اس پر جھپٹا۔ اس کی ہتھیلی عباد کے لبوں پر جم گئی۔ اگلے ہی لمحے عباد نے اپنے پہلو میں درد کی ناقابلِ بیان لہر محسوس کی۔ وہ مچلا مگر قاتل کی گرفت انتہائی مضبوط تھی۔ اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔

سوری ای جی...... اب کے برس میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں گا۔ یہ آخری خیال تھا جو اس کے ڈوبتے ذہن میں آیا تھا۔ اس کے بعد اس کے ذہن پر گہری تیرگی چھاتی چلی۔

☆☆☆

پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی، گاڑیوں کے بیچ سے راستہ بناتی تیزی سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ گاڑی میں موجود انسپکٹر حمید پُرسوچ انداز میں داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ یہ اس کے سوچنے کا مخصوص انداز تھا۔ جب بھی وہ گہری سوچ میں گم ہوتا اس کا ایک ہاتھ خودکارانہ انداز میں داڑھی میں رینگنے لگتا۔ اس کی عمر تو پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن چھریرے جسم کی بدولت وہ انتہائی چاق و چوبند دکھتا تھا۔ اس کی شخصیت کی سب سے خاص بات اس کی گہری اور

پُراسرار آنکھیں تھیں۔ کوئی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتا تو بے چینی محسوس کرنے لگتا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ہر دم ایک گہرا دکھ کروٹیں لیتا رہتا، جس کی وجہ اس کے واقف کار ہی جانتے تھے۔ وہ ایک روایتی پولیس مین ہوا کرتا تھا لیکن پھر ایک حادثے نے نا صرف اس کی زندگی میں تبدیلیاں برپا کیں بلکہ اس کے مزاج، اس کے کام کے طریقہ کار کو ہی بدل ڈالا۔ پہلے وہ نوکری میں بھی سب سے مقدم اپنے ذاتی مفادات کو رکھتا تھا، پھر وہ قانون کا رکھوالا بنا مگر قانون کی بالادستی قائم کرنے کے لیے جب اسے نظامِ قانون کے سقم معلوم ہوئے تو اسے گویا قانون سے ہی نفرت ہو گئی۔ اب وہ انصاف کے لیے کام کرتا تھا اور انصاف کے قیام کے لیے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا استعمال بھی دھڑلے سے کرتا تھا۔ وہ مظلوموں کے لیے ڈھال اور ظالموں کے لیے تلوار تھا۔ اس وجہ سے محکمے میں اسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا مگر اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے آفیسرز اسے چھوٹ دینے پر مجبور تھے۔

وہ صبح صبح پولیس اسٹیشن پہنچا تھا کہ اسے قریبی علاقے میں ایک قتل کی اطلاع ملی۔ اطلاع دینے والا اپارٹمنٹ بلڈنگ کا مالک یاور تھا۔ اس کے بقول اس کی بلڈنگ میں رہائش پذیر ایک نوجوان قتل ہو گیا تھا۔ انسپکٹر نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ کسی چیز کو نہ چھیڑے، نہ جائے وقوعہ کے قریب کسی دوسرے شخص کو جانے دے۔

چند منٹ انہیں تیاری میں لگے تھے۔ تیاری کے فوراً بعد وہ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ پولیس کی گاڑی کو دیکھتے ہی بلڈنگ کے سامنے موجود لوگ تتر بتر ہونے لگے۔ گاڑی کے رکتے ہی حمید ملک چھلانگ لگا کے باہر نکلا۔ اس کی نظر ایک ادھیڑ عمر شخص پر پڑی۔ وہ تیزی سے اسی کی طرف آ رہا تھا۔

''میں یاور ہوں۔'' وہ مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو میں نے ہی کال کی تھی۔'' اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

انسپکٹر نے اس سے ہاتھ ملایا اور بلڈنگ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ چار منزلہ عمارت تھی۔ جس کے آگے پانچ فٹ اونچی باؤنڈری وال بنی تھی۔ دیوار کے اوپر خاردار تار لگی تھی۔ ایک طرف وسیع وعریض گیٹ نظر آ رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کے سامنے بیس فٹ کی کشادہ گلی تھی جس میں چند گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔

''تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟'' انسپکٹر نے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا عملہ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

''نہیں سر۔'' یاور نے جواب دیا۔ ''میں نے باقی لوگوں کو بھی منع کر دیا تھا۔''

گیٹ پر چوکیدار پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے اسے بغور دیکھا تاہم کچھ بولا نہیں۔ گیٹ کے ساتھ ایک طرف چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا۔ جو اس وقت اجڑا اجڑا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ دوسری طرف پارکنگ بنی تھی جس میں چند گاڑیاں اور موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ چند قدم کے فاصلے پر عمارت کا داخلی راستہ تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی انسپکٹر کی نظر راہداری میں موجود خون کے تالاب پر پڑی جو دروازے کے نیچے سے بہہ کر باہر آیا تھا۔ خون منجمد ہو چکا تھا۔ اس پر قدموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ جو بڑھتے ہوئے سامنے والے اپارٹمنٹ کے دروازے تک چلے گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص اس خون پر چل کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہو۔ انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے یاور کی طرف دیکھا۔ وہ تھوک نگل کر گویا ہوا۔

''میں نے بھی صبح ہی یہ نشانات دیکھے تھے۔ اس اپارٹمنٹ میں ایک نوجوان جوڑا رہتا ہے۔ وجاہت کی ڈیوٹی ایوننگ شفٹ میں ہوتی ہے۔ مم...... میرے خیال میں وہ رات کو لوٹا تو اندھیرے میں خون کو دیکھے بغیر اس پر چل کے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔'' انسپکٹر کی پُراسرار آنکھوں سے وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

''ہمم......'' انسپکٹر کے چہرے پر سوچ کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا عملہ اس کی ہدایت پر تصاویر بنانے لگا۔ اس کے ایک ماتحت نے اس کے اشارے پر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔

''سر، یہ تو اندر سے لاک ہے۔'' ماتحت کی اطلاع پر انسپکٹر کے چہرے پر بھی الجھن کی لکیر کھنچ گئی۔

انسپکٹر یاور کی طرف مڑا۔ ''تمہارے پاس اس کی چابی تو ہوگی؟''

''نن...... نہیں۔ تینوں چابیوں کا سیٹ میں کرائے دار کے حوالے کر دیتا ہوں۔'' وہ تھوک نگل کے بولا۔

انسپکٹر تالے کا معائنہ کرنے لگا۔ ''بظاہر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے اثرات تو نظر نہیں آ رہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

اتنے میں اس کا ایک ماتحت گاڑی سے چابیوں کا ایک گچھا نکال لایا تھا۔ وہ باری باری ان سے تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

''اس فلیٹ میں کون رہتا ہے؟'' انسپکٹر نے یاور سے سوال کیا۔

اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ''ایک تنہا نوجوان عباد رہتا تھا۔''

''تم نے یہ خون کب دیکھا؟''

''تقریباً سات بجے گوالا دودھ دینے آتا ہے۔ اسی نے خون دیکھا تو مجھے اطلاع دی۔ میں نے فوراً پولیس اسٹیشن کال کر دی۔''

''وہ گوالا کہاں ہے؟''

''وہ ابھی باہر ہی تھا۔ میں نے اسے یہیں رکنے کا کہا تھا۔ آپ کہیں تو اسے بلوا لیتا ہوں؟'' یاور نے موبائل نکالتے ہوئے سوال کیا۔

''رات کو چوکیدار گیٹ پر موجود ہوتا ہے؟'' انسپکٹر نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''جی ہاں۔ چوبیس گھنٹے چوکیدار گیٹ پر موجود ہوتا ہے۔ رات کو گل خان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ گل خان وہی ہے جسے ابھی آپ نے گیٹ پر دیکھا۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''دن کو اسی کے بھائی عجائب خان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ دن کو تو پھر چھوٹا گیٹ اندر سے کھلا رہتا ہے تاہم رات دس بجے کے بعد کوئی بھی آئے چوکیدار ہی گیٹ کھولتا ہے۔''

انسپکٹر کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ ''تمہاری گل خان سے بات ہوئی؟ رات کوئی باہر کا بندہ تو بلڈنگ میں داخل نہیں ہوا؟''

''جی ہاں، آپ کو کال کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے چند بلڈنگ کے مکینوں کے ہی نام لیے تھے۔ باہر کا کوئی بندہ اس کے بقول بلڈنگ میں داخل نہیں ہوا۔''

اتنے میں تالا کھل چکا تھا۔ انسپکٹر نے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کی نظر دروازے کے سامنے ہی لہولہان لاش پر پڑی۔ اس کے مردہ چہرے پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر چونک گیا۔

''عباد۔'' اس کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی آنکھوں کے گوشے گرم سیال سے بھر گئے۔ درد کی ایک ناقابلِ بیان لہر اس کے دل سے نکلی اور پورے وجود میں پھیل گئی۔ یہ درد اس کے لیے جانا پہچانا تھا۔ وہ پہلے بھی اس کا سامنا کر چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔

یاور دم بخود اس کی بدلتی کیفیات کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ اسے جانتے ہیں؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ انسپکٹر نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔ اس کی سرخ دہکتی آنکھیں دیکھ کے یاور جھرجھری لے کے رہ گیا۔

انسپکٹر لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لاش کے گرد منجمد خون تھا جو دروازے سے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں گہرا دکھ ہلکورے لینے لگا۔ نوکری میں آئے دن اس کا واسطہ لاشوں سے پڑتا رہتا تھا لیکن جب بھی وہ کسی نوجوان کی لاش دیکھتا تھا، اس کے ذہن میں اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش گھومنے لگتی تھی مگر عباد...... اس کی لاش دیکھ کر اسے ایسی ہی تکلیف محسوس ہوئی تھی جتنی اپنے بیٹے ولید کو اس حالت میں دیکھ کے محسوس ہوئی تھی۔ اسے بھی انتہائی بیدردی سے چھریوں کے وار کر کے ہی قتل کیا گیا تھا۔ حمید اس کے قاتل کو جانتا تھا مگر وہ سرتوڑ کوشش کے باوجود قانون کے ہاتھوں اسے سزا نہیں دلوا سکا تھا۔ اس کی بیوی جوان بیٹے کی موت کا دکھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ تب سے وہ تنہا ہی زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔

عباد، ولید کا بہترین دوست تھا۔ وہ اُن کے گھر بھی آتا رہتا تھا۔ انسپکٹر حمید کو وہ سنجیدہ مزاج سا نوجوان بے حد پسند تھا۔ ولید کی موت پر عباد جس طرح بلک بلک کے رویا تھا، وہ منظر آج بھی حمید کو نہیں بھولا تھا۔ اس لمحے اسے عباد سے بے انتہا محبت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ عباد اس کے گلے لگتے ہی اپنا رونا بھول کے اسے تسلیاں دینے لگ گیا تھا۔ وہ چالیسویں تک ان کے گھر آتا رہا تھا۔ عباد میں اسے ولید کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اسے دیکھ کے انسپکٹر کو ولید کا غم کم ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ اب بھی کبھار ملنے آجاتا تھا۔ قریباً دو ہفتے قبل ہی اس کی عباد سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اگلی بار وہ اسے لہولہان لاش کی صورت نظر آئے گا۔

اس نے سر جھٹکا اور حال کی دنیا میں آ گیا۔ میڈیکو لیگل آفیسر جھک کے لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ ''میرے خیال میں اسے مرے ہوئے کم سے کم چھ گھنٹے ہو چکے ہیں۔'' اس نے ابتدائی رائے دی۔

انسپکٹر پُرسوچ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر اس نے لاش پوسٹ مارٹم کے

لیے بھجوادی۔ یادر اسے اپنے آفس میں لے آیا۔ انسپکٹر کے کہنے پر وہ گوالے اور چوکیدار کو بھی لے آیا تھا۔ گوالے کے بیان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ چوکیدار نے بھی یہی کہا کہ وہ رات بھر اپنے کیبن میں چوکس بیٹھا رہا تھا۔ انسپکٹر کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ رات کو بارہ بجے کے بعد صرف وجاہت ہی ڈیوٹی سے لوٹا تھا۔ وہ روزانہ کی طرح ساڑھے بارہ بجے پہنچا تھا۔

''ام نے روزانہ کی طرح اس کا گاڑی رکتے دیکھ کے چوٹا گیٹ کول دیا تھا اور اس نے اندر جاتے ہوئے گیٹ خود بند کر دیا تھا۔'' گل خان نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

''تمہاری اس سے کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''نہیں صاحب۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنے فلیٹ میں چلا گیا تھا۔''

''اس نے کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟'' اس نے کچھ سوچ کے سوال کیا۔

''ام نے غور نہیں کیا تھا صاحب۔'' انسپکٹر کی خود پر جمی نظریں محسوس کرتے ہوئے وہ کچھ سوچ کے بولا۔ ''امارے خیال میں انہوں نے گہرے رنگ کا پتلون اور جیکٹ پہنا ہوا تھا۔''

انسپکٹر نے چوکیدار کے کیبن کا معائنہ کیا۔ اس میں کھڑکی موجود تھی جس سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا اور باہر سے اندر بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ چوکیدار سے فارغ ہو کے وہ وجاہت کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے کال بیل بجائی۔

اس کے دو ماتحت بلڈنگ کے دوسرے مکینوں سے بیانات لے رہے تھے۔ کافی دیر تک دروازہ نہیں کھلا تو اس نے دوبارہ بیل بجائی۔ ''کون ہے؟'' اسے ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو۔ پولیس آئی ہے۔'' یادر نے کہا۔

''پولیس۔'' اندر سے گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''یا اللہ خیر۔'' اس نے خود کلامی والے انداز میں کہا تھا۔ دروازہ کھلا تو انسپکٹر کے نتھنوں میں تیز خوشبو گھسی۔ اس نے بمشکل چھینک روکی۔ اس کے سامنے ایک شوخ و شنگ لڑکی کھڑی تھی۔ وہ گھر میں بھی مکمل میک اَپ میں تھی۔ اس نے انتہائی چست لباس پہن رکھا تھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ انسپکٹر نے بمشکل اس کے سراپا سے نظریں چُرائیں۔

''سامنے والے اپارٹمنٹ میں عباد قتل ہوگیا ہے۔ یہ اسی سلسلے میں تفتیش کے لیے آئے ہیں۔'' یادر نے کہا۔

''کیا؟'' وہ چیخی۔ ''عباد قتل ہوگیا؟ کب؟'' انسپکٹر کو اس کے ردِّعمل میں واضح طور پر تصنع نظر آیا۔

''ہمیں اندر آنے دو گی، یا ادھر ہی ہم سوال جواب کر لیں؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ گھبرا گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اندر بیٹھے تھے۔ اتنے میں وجاہت بھی واش روم سے نکل چکا تھا۔ پولیس کو دیکھ کے اس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

اس کے مطابق وہ حسبِ معمول ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچا تھا۔ اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی۔ اس کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی سو وہ اندھیرے میں ہی چل کے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تھا۔ اپنے خون آلود قدموں کے نشانات کے بارے میں آگاہی بقول اس کے، اسے ابھی ہوئی تھی۔

''عباد کو تو آپ لوگ جانتے ہوں گے؟'' انسپکٹر نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ثمرہ نے کچھ کہنے کے لیے تیزی سے لب کھولے مگر وجاہت کی تنبیہی نظر دیکھ کے اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ انسپکٹر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہونے والا پیغامات کا یہ تبادلہ بغور دیکھ رہا تھا۔

''ہم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ بس کبھی کبھار نظر آجاتا تو دعا سلام ہوجاتی تھی۔''

''حالات و واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا قاتل اسی عمارت کا مکین کوئی فرد ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کی یہاں کس سے دشمنی تھی؟''

''نہیں جناب۔ ہم اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔ ہم عباد کے یا اس کے کسی دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' وجاہت بظاہر پُرسکون انداز میں جواب دے رہا تھا لیکن انسپکٹر اس کی بے چینی کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دیر مزید سوال جواب کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ اس کا ایک ماتحت تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خاص کلیو اس کے ہاتھ لگا ہو۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ دروازہ کھلا اور کانسٹیبل فرید کی آمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی۔

''سر، مجرم نے اقبالِ جرم کرلیا ہے۔''

''گڈ۔'' انسپکٹر کے لہجے میں ستائش تھی۔ ''کیا کہتا ہے وہ۔ کیوں قتل کیا اس نے عباد کو؟''

''سر، وہ کہتا ہے کہ وہ مجبور تھا۔ عباد نے کوئی چارہ ہی نہیں چھوڑا تھا اس کے پاس اسے قتل کرنے کے سوا۔''

''ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی اسے؟'' اس نے بھویں اچکا کے دریافت کیا۔

''اس بارے میں اس نے فی الحال اپنی زبان نہیں کھولی سر۔ اس کا حال بُرا تھا۔ مزید تشدد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔''

''ہمم......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''اسے تھوڑا وقت دو۔ جہاں اس نے جرم قبول کیا وہاں وجہ بھی بتادے گا۔''

فرید کے جانے کے بعد اس نے پُرسکون انداز میں نشست کے ساتھ ٹیک لگالی۔ ''قانون...... اونہہ۔'' اس نے زیرِلب کہا۔ اس کا لہجہ تلخی سے بھرا تھا۔ قانون تو بنا مجرموں کی مدد کے لیے ہی ہے۔ قانون کے دائرے میں رہ کر تو سو میں سے ایک مجرم کو ہی سزا دلوائی جاسکتی ہے۔ میں خود کو اس دائرے میں مقید رکھتا تو اس وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوتا۔ تفتیش میں جان کھپا رہا ہوتا اور ساری محنت کے بعد ہوتا کیا؟ چند پیشیوں کے بعد مجرم آزاد۔ اب اس نے اعترافِ جرم کرلیا ہے۔ اب سب کچھ ہمارے حق میں جائے گا۔ اور جو کچھ مخالف جائے گا، اسے حق میں کرنا مجھے آتا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

عباد کی تدفین ہوچکی تھی۔ اس کی موت جنت محل کے مکینوں پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ ابھی چند دن قبل ہی تو انہوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے کا اعادہ کیا تھا۔ اور عباد...... وعدے کا پاس تو اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ پھر کیوں وہ اپنے عہد سے پھر گیا تھا، کیوں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا؟ ان کی خالی خالی نگاہیں ایک دوسرے سے یہ سوال پوچھ پوچھ کے تھک چکی تھیں مگر جواب...... جواب کسی کے پاس ہوتا تو دیتا۔

جنت بیگم کا حال سب سے بُرا تھا۔ وہ تو چند دن میں ہی برسوں کی بیماری نظر آنے لگی تھیں۔ اپنے جس گلشن کو سجانے میں انہوں نے اپنی زندگی تج دی تھی، وہ اتنی جلدی خزاں کا شکار ہوگیا تھا۔ یہ دکھ ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

لگتا ہے روزی پھر پاس کے قالین پر سو رہی تھی۔

عادل اُن کی ڈھارس بندھانے کو ہر پل اُن کے ساتھ موجود رہتا تھا۔

''امی جان، خود کو سنبھالیں۔ تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ ہم سب بے بس ہیں۔ عباد کی عمر اتنی ہی تھی، ہم جتنی جلدی اس تلخ حقیقت کو قبول کرلیں، ہمارے حق میں بہتر ہے۔''

''نہیں عادل، وہ طبعی موت نہیں مرا۔ میرے پھول سے بچے کے جسم کو چھریوں سے پرویا گیا ہے۔ موت اس کا مقدر خدا نے نہیں، کسی ظالم انسان نے بنائی ہے۔ میں کیسے کروں صبر؟'' وہ سسکیاں لینے لگیں۔

''امی جان، اس کا قاتل پکڑا گیا ہے۔ اس نے اگر ہمارے بچے کو مارا ہے تو بچے گا وہ نہیں۔''

''میرا دل نہیں مانتا عادل۔ اتنی سی بات پر کوئی کسی کو قتل کرتا ہے؟'' وہ عادل سے پوچھ رہی تھیں اور وہ نظریں چُرا رہا تھا۔

''میری چھٹی حس مجھے کسی بڑے خطرے کے بارے میں خبردار کررہی ہے۔ میرے خون سے سینچے گلشن کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ بہت بُری نظر......'' ان کا انداز عادل کا دل ہولانے لگا۔

''گستاخی معاف امی جان۔ عباد کی موت نے آپ کو توہمات کا شکار کردیا ہے، خود کو سنبھالیں۔'' اس نے جیسے خود

کو بھی تسلی دی۔

"پتا نہیں کیوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہماری زندگیوں میں یہ زہر اسی ذہریلے ناگ نے گھولا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ عادل کی رنگت میں زردی گھل گئی۔ وہ ان کا اشارہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔

"نہیں امی جان، اسے بھول جائیں اب۔ اسے ہمارا کچھ بگاڑنا ہوتا تو بہت پہلے بگاڑ چکا ہوتا۔ اب اتنے سالوں کے بعد...... نہیں یہ ممکن نہیں۔" اس نے اٹل انداز میں کہا تھا مگر دور اندر کہیں اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ کروٹ لے کے بیدار ہو گیا تھا۔

وہ سب محبت کے رشتے سے جڑے ہوئے تھے، یہ محبت لازوال تھی۔ ان کی طرف کوئی مصیبت بڑھ رہی ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کا دل مطمئن رہتا؟

☆☆☆

انسپکٹر حمید، یاور کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا حال بُرا تھا۔ اس نے عباد کے قتل کی وجہ بھی بتا دی تھی۔

یاور اور عباد کے جھگڑے کی بابت انہیں ایک پڑوسن عورت سے ہی پتا چلا تھا۔ اس کے بقول یاور کے پاس سارے اپارٹمنٹس کی چابیاں موجود تھیں۔ وہ کرائے داروں کی عدم موجودگی میں ان کے اپارٹمنٹس اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ عباد سے اس کے جھگڑے کی وجہ بھی یہی بنی تھی۔

"میں نے خود اپنے کانوں سے اس نامراد کو عباد کو قتل کی دھمکی دیتے سنا تھا۔" اس عورت نے کہا تھا۔ انسپکٹر نے دفتر کی تلاشی لیتے ہوئے چابیاں دریافت کر لی تھیں۔ ان چابیوں میں عباد کے اپارٹمنٹ کی چابی بھی موجود تھی۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ مزید تفتیش کے دوران یاور قتل کے وقت اپنی کہیں اور موجودگی بھی ثابت نہیں کر پایا تھا۔ انسپکٹر نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے اقبالِ جرم بھی کر لیا تھا۔ اس کے بقول عباد نے اسے دھمکایا تھا کہ وہ اس کی سرگرمیوں کی اطلاع اس کی بیوی کو دے دے گا۔ وہ یہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے عباد سے چھٹکارے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے خلاف مضبوط کیس تیار ہو گیا تھا۔ تمام ثبوت اس کے خلاف تھے۔ مگر انسپکٹر کے اندر کی آواز اسے چبھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یاور نے تشدد سے گھبرا کے اقبالِ جرم کیا ہے۔ وہ اپنے اندر کی آواز کو دبانا چاہ رہا تھا مگر اس کے اندر شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر تنگ آ کے اس نے مزید تفتیش کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

"اسے مار دو۔"

اسے ایک بار پھر یہ حکم مل چکا تھا۔ اس بار اس کا شکار عباد کا باپ ظفر تھا۔ جنت محل کے سارے مکین عباد کی موت کے بعد محل میں ہی موجود تھے۔ وہ تو چاہتا تھا کہ سب کو ایک ہی بار ختم کر دے مگر وہ تو حکم کا غلام تھا۔ کیسے اپنی مرضی کر سکتا تھا۔

وہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس بار بھی اس نے جزئیات کا مکمل خیال رکھا تھا۔ اسے اپنی مہارت پر بھروسا تھا لیکن قسمت کی طرف سے ہمیشہ اسے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ جانے کب دغا دے جائے۔

عباد کی بار قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کے پڑوسی وجاہت سے ملا تھا۔ وہ عباد سے اپنی بیوی کی وجہ سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس نے اس نفرت سے ہی فائدہ اٹھایا تھا۔ وجاہت نے اس کے کہنے پر نا صرف اسے عباد کے کمرے کی چابی لا دی تھی بلکہ ایک انتہائی اہم ٹپ بھی دی تھی۔ اس کے مطابق چوکیدار اس کے لیے چھوٹا گیٹ کھول کے سو جایا کرتا تھا۔ وہ جب اندر آتا تھا تو گیٹ کو اندر سے کنڈی لگا دیتا تھا۔ اس نے اسی وقت شکار کے لیے اسی وقت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جب بھی دانیہ کے پاس عباد کو دیکھتا تھا، اس کی نظریں نفرت سے سلگنے لگتی تھیں۔ اس نفرت کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں۔ اب اسے نفرت کا قرض اتارنے کا موقع مل گیا تھا۔

اسے نہ اندر جاتے ہوئے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا اور نہ ہی عباد کو مارتے ہوئے۔ اسے پھر بھی خوف تھا کہ کہیں اس نے سراغ نہ چھوڑ دیا ہو مگر اس وقت اس نے سکون کی گہری سانس لی تھی جب اسے علم ہوا تھا کہ پولیس قاتل کے طور پر کسی اور کو پکڑ کے لے گئی ہے۔ اس کے دل میں چھپا خوف معدوم ہو گیا۔ پہلے اسے خوف نہیں ہوا کرتا تھا لیکن جب سے وہ پکڑ میں آیا تھا اپنی بدقسمتی سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ دوسری زندگی جی رہا تھا سو محتاط تھا۔

وہ ایک بار پھر قسمت کو آزما رہا تھا۔ اسے اپنے ذرائع سے خبر مل چکی تھی کہ ظفر شہر کے لیے نکل رہا ہے۔ وہ تنہا تھا۔ قاتل ویران روڈ پر نظریں جمائے اسی کا منتظر تھا۔ آخرش اسے ظفر کی گاڑی نظر آ گئی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ قاتل کے چہرے پر عیارانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کا سامان کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید تیزی سے پہاڑی راستے پر گامزن تھا۔ چند دنوں میں ہی اس راستے پر دوسری بار سفر کر رہا تھا۔ پہلی بار وہ عبادی کی لاش کے ساتھ آیا تھا۔ اب کی بار وہ جنت محل کے مکینوں کو متوقع خطرے سے خبردار کرنے جا رہا تھا۔ کانسٹیبل نذیر اس کا ہم سفر تھا۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

اچانک اسے بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دور بلندی سے ایک کار نیچے کھائی میں گرتی نظر آئی۔ چرچراہٹ کی آواز اتنی بلند تھی کہ نذیر نے بھی ہڑ بڑا کے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ''کیا ہوا؟'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے رفتار تیز کر دی۔ چند منٹوں میں ہی وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں سے گاڑی نیچے گری تھی۔ روڈ پر ٹائروں کے نشانات نے اس کی راہنمائی کی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی سائڈ پر روکی اور نیچے اتر آیا۔ بدقسمت کار دور نیچے گہرائی میں پڑی اسے نظر آ گئی۔

''ہری اَپ۔'' اس نے کہا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ نذیر بھی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ جوان تھا لیکن اس کے باوجود انسپکٹر حمید سے قدم ملاتے ہوئے دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ گاڑی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ معاً انسپکٹر کی نظر ایک سائے پر پڑی۔ وہ لحظہ بھر میں جھاڑی کے پیچھے اوجھل ہو چکا تھا۔ انسپکٹر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے چیخا۔ ''تم کار کی طرف جاؤ۔''

انسپکٹر کو جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اسے دوبارہ کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ وہ رک کے سانس بحال کرنے لگا۔ اچانک اسے قریب کی جھاڑی میں سرسراہٹ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ بھڑک کے مڑا۔ یہ ایک گیدڑ تھا جو تیزی سے ڈھلوان کی طرف بھاگا تھا۔ انسپکٹر نے گہرا سانس لیا۔ شاید پہلے بھی مجھے کسی جانور کی جھلک ہی نظر آئی ہو۔ اس نے اندازہ لگایا اور جھکے ہوئے قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دور سے ہی نذیر کو دیکھ کے چونکا۔ اس کے چہرے پر سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

آج وہ قسمت کی یاوری سے بال بال بچا تھا۔ قسمت نے ہی اسے پھنسایا تھا اور قسمت نے ہی اس کے بچ نکلنے کا سامان کیا تھا۔ اس کے منصوبے کے عین مطابق ظفر کی گاڑی اس کی پھیلائی ہوئی کیلوں کی وجہ سے بے قابو ہو کے کھائی میں گری تھی مگر گاڑی لڑھکنے کے بجائے جھاڑیوں کو روندتی ہوئی ٹائروں پر ہی تیزی سے نیچے گئی تھی۔ نیچے وہ کسی درخت سے ٹکرا کے الٹ گئی تھی۔

وہ کام مکمل کرنے کے لیے تیزی سے نیچے اترا تھا۔ وہ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے اوپر ہلچل محسوس ہوئی تھی۔ اس نے جھاڑی کی اوٹ سے جھانک کے دیکھا تو اس کا دل جیسے اچھل کے حلق میں آ گیا تھا۔ دو وردی پوش افراد تیزی سے نیچے اتر رہے تھے۔ اس کے لیے وقت کم تھا۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا، جو پہلو کے بل پڑی تھی۔ گاڑی کی ونڈ شیلڈ الگ ہو چکی تھی۔ ظفر اسے سیٹ میں پھنسا نظر آ گیا۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ مکمل محفوظ رہا تھا۔ بس خوف اُس کے چہرے پر جیسے ثبت ہو کے رہ گیا تھا۔

وہ سیٹ بیلٹ سے خلاصی کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک انجان شخص کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔ وہ اسے آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر وہ اسے سیٹ بیلٹ سے نجات دلانے نہیں بلکہ زندگی سے نجات دلانے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے ظفر کی آنکھوں میں اچنبھے کا تاثر ابھرا تھا۔ قاتل نے سکون سے ونڈ شیلڈ سے ہاتھ بڑھا کے چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ ظفر کی آنکھوں میں بے یقینی کے تاثرات منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔

اسے اپنے وار پورا بھروسا تھا۔ اس نے چاقو نکالا اور تیزی سے بھاگا۔ پولیس والے اس کی توقع کے برخلاف بے حد کم وقت میں نیچے پہنچ چکے تھے۔ وہ دیکھ لیا گیا۔ ایک پولیس والا اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے خود کو جھاڑیوں کی اوٹ میں اوجھل رکھا تھا لیکن اس کے بھاگنے سے سرسراہٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی جو پولیس والے کی راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ دبک کے ایک ہی جگہ بیٹھ گیا۔ پولیس والے کے ہانپنے کی آواز اسے اپنے بالکل قریب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ اس کی خوش قسمتی کا سورج ایک گیدڑ کی شکل میں طلوع ہوا۔ وہ اس غیبی مدد پر حیران رہ گیا۔ پولیس والے کے جانے کے بعد وہ دھیرے سے اٹھا اور تیزی سے دور جانے لگا۔

☆☆☆

''تم رہو اپنی فیملی کے ساتھ...... دیکھ لوں گی میں

تمہیں بھی اور تمہاری فیملی کو بھی۔'' اس آواز میں کچھ ایسا تھا کہ انسپکٹر حمید کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ یاور کے خلاف اس نے چالان تیار کر دیا تھا لیکن جانے کیوں اس کا دل اسے قاتل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے اندر کی آواز سے مجبور ہو کے مزید تفتیش کا فیصلہ کیا تھا۔

عباد کا سامان تا حال اس کی کسٹڈی میں ہی رکھا تھا۔ اس نے عباد کا موبائل نکالا۔ اس پر ''پن لاک'' لگا تھا۔ اس نے 'لیب' سے لاک کھلوایا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کی نظر 'کال ریکارڈ ایپ' پر پڑی۔ اس نے کال ریکارڈنگز نکالیں۔ پہلی ہی ریکارڈنگ نے اسے اپنی نشست سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے اندر کی آواز نے اس کی بالکل درست راہنمائی کی تھی۔

اس نے دانیہ کے بارے میں تحقیق کی۔ اس کا تعلق بارسوخ خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے ظلم کے چرچے مشہور تھے۔ وہ یاور کی طرح اسے گرفتار کر کے تشدد کے شکنجے میں نہیں جکڑ سکتا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یاور بے قصور ہے۔ عباد کی اصل قاتلہ دانیہ تھی۔ یاور کو تو اس نے قانون کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا لیکن وہ دانیہ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دادا وفاقی وزیر تھا۔ یہ لوگ قانون سے ماورا تھے۔ اس کا دل سلگنے لگا۔ اس کا بیٹا بھی دانیہ جیسی ہی ایک لڑکی کے چکر میں جان سے گیا تھا۔ اور وہ پولیس میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا بار وہ اب تک اپنے سینے پر محسوس کرتا تھا۔

اگر عباد کی قاتل واقعی دانیہ تھی تو جنت محل کے مکینوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ اپنے سامنے جنت بیگم کے آشیانے کو ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس سے ولید کی موت کے وقت سے واقف تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی انوکھی بات تھی کہ پہلی ہی ملاقات میں انسپکٹر کے دل میں اس کے لیے گہرے احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

عباد کی موت پر اسے اس فیملی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کی آپس میں محبت نے اسے حد درجہ متاثر کیا تھا۔ عباد کی موت پر وہ سب ایک دوسرے کے لیے ڈھال بن گئے تھے۔ یہ گہرا دکھ آپس میں بانٹ لینے سے ان کے لیے قابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

عباد کی موت کا غم تو انہوں نے سہہ لیا تھا، وہ انہیں مزید کسی دکھ سے دوچار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے انہیں خبردار کرنے کے لیے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

راستے میں وہ سوچ رہا تھا، کہیں میرے حالات نے مجھے وہمی تو نہیں کر دیا؟ ہر چیز سے مجھے خطرے کی بُو آنے لگی ہے۔ میں کیوں ایک لڑکی کی ایک دھمکی سے اس قدر خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ کہیں میں جانبدارانہ انداز میں تو نہیں سوچ رہا۔ سفر اسی کشمکش میں گزر گیا تھا۔ اور پھر ظفر کے سینے سے نکلتے خون نے اس کے سارے وہم غلط ثابت کر دیے تھے۔ اسے کشمکش سے تو چھٹکارا مل گیا تھا لیکن اس کا دل سلگنے لگا تھا۔

ظفر کی موت نے اسے دہلا دیا تھا۔ وہ جس بات کو اپنا وہم سمجھ رہا تھا وہ حقیقت بن کے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ دانیہ اپنے طاقتور خاندان کے سہارے خم ٹھونک کے عباد کی فیملی کے پیچھے پڑ چکی ہے اور وہ قانون کا رکھوالا ہو کے بھی بے بس تھا۔ اس کے قانون کے ہاتھ لمبے تو تھے مگر اتنے لمبے ہرگز نہیں تھے کہ وہ دانیہ کی گردن تک جا پہنچتے۔ وہ عباد کے قاتل کے طور پر یاور کو گرفتار کر چکا تھا۔ اس نے دانیہ کا راز اپنے سینے میں ہی دفن کر لیا۔

اس کا سینہ دھویں سے بھر گیا۔ ''نہیں...... مزید نہیں......اب میں کسی ظالم کو مظلوموں کے خون سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ وہ بااختیار ہیں، انہیں قانون کا کوئی خوف نہیں۔ میں اُن سے اپنے طریقے سے ملوں گا۔'' ظفر کی لاش دیکھ کے اس نے دل ہی دل میں پختہ عزم کیا تھا۔

☆☆☆

جنت بیگم لان میں عادل کے ساتھ بیٹھی تھی کہ ملازم نے اسے انسپکٹر حمید کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ انسپکٹر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے ہی اس کا دل ہولنے لگا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات تھے۔ جنت بیگم اسے بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں۔''

''یا اللہ خیر۔'' جنت کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

''آپ کا محبت بھرا آشیانہ تند آندھیوں کی زد پر ہے۔ اسے بچانے کے لیے آپ کو ہمت کرنا ہو گی جنت بیگم۔''

''آپ پلیز، کھل کے بات کریں۔'' عادل نے قدرے سخت لہجے میں کہا تھا۔

انسپکٹر نے عباد کا موبائل نکالا اور انہیں دانیہ کی گفتگو سنانے لگا۔

''یہ کون ہے؟'' جنت کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''یہ معمولی لڑکی نہیں، ایک وفاقی وزیر محی الدین کی پوتی ہے۔'' جنت کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے عادل کی جانب دیکھا۔ اس کی نظروں میں بھی خوف تھا۔

''یہ...... یہ محض دھمکی ہے۔'' عادل نے کہا مگر اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

''کاش یہ محض دھمکی ہوتی۔'' اس نے افسوس بھری نگاہ اُن پر ڈالی اور گویا ہوا۔ ''مجھے آپ لوگوں کی فیملی خطرے میں نظر آرہی ہے۔ میں ابھی آپ کے بھائی ظفر کی لاش دیکھ کے آرہا ہوں۔ اس کے سینے میں بھی ایسے ہی چاقو اتارا گیا ہے جیسے عباد کے سینے میں اتارا گیا تھا۔'' اس نے یکبارگی دھماکا کرنے والے انداز میں اطلاع دی۔ اس اطلاع نے جنت بیگم اور عادل کو گہرے شاک میں مبتلا کر دیا۔ وہ اسے سکتہ زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''کک...... کیسے ہوا یہ سب؟'' عادل بمشکل بولا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہنوز بے یقینی جھلک رہی تھی۔

انسپکٹر انہیں تفصیل بتانے لگا۔ ''میں نے متعلقہ پولیس اسٹیشن خبر کر دی ہے۔ آپ کو خبردار کرنا ضروری تھا اس لیے میں اپنے ایک کانسٹیبل کو لاش کے پاس چھوڑ کے یہاں آ گیا'' وہ آخر میں تھکے تھکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

جنت بیگم کی آنکھوں سے آنسو نکل کے اس کے چہرے پر پھیلتے جا رہے تھے۔

''میں اس کے خلاف ایف آئی آر درج کراؤں گی۔ اسے قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کروں گی۔ میں اپنے بچوں کا خون اسے معاف نہیں کروں گی۔'' وہ گم صم انداز میں کہہ رہی تھی۔ عادل نے اسے چونک کے دیکھا۔

''نہیں امی جان، اس سب کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ الٹا ہمارا نقصان ہے۔'' اس نے بے حد عجیب انداز میں کہا تھا۔

''تو کیا میں اپنی نظروں کے سامنے اپنے آشیانے کو تباہ ہوتے دیکھتی رہوں گی؟''

''نہیں، اس نے ہمیں جتنا نقصان پہنچانا تھا، پہنچا دیا۔ میں اب اپنی فیملی پر مزید آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

☆☆☆

چند دنوں میں ہی جنت محل کا ایک اور مکین ان کا ساتھ چھوڑ کے عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ ظفر کی موت جہاں ان پر پہاڑ بن کے ٹوٹی تھی، وہیں ان سب کی زندگیوں کو لاحق خطرہ بھی کھل کے سامنے آ گیا تھا۔

انسپکٹر نے انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ یقین دلایا تھا کہ وہ دانیہ کے خلاف ہر ممکن حد تک ان کی مدد کرے گا لیکن وہ نظام کی کمزوری جانتے تھے۔ اس نظام میں محی الدین جیسے طاقتور لوگوں کے سامنے ایک پولیس انسپکٹر کی اوقات ہی کیا تھی۔ انہوں نے بھی اپنی لڑائی اپنے طور پر لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

دانیہ اس وقت یونیورسٹی میں موجود تھی۔ صبح سے گرج چمک کے ساتھ بارش برسنے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ سردیوں کی بارش تھی، جسے لوگ گھروں میں بستر میں دبک کے گزارنا پسند کرتے ہیں مگر دانیہ مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ بارش میں وہ گھر میں بور ہو جاتی تھی۔ اسے تو بارش میں سفر کرنا پسند تھا۔ گاڑی کے اندر بیٹھ کے کھڑکی سے باہر جل تھل کرتی بارش اس کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ڈرائیور اور گارڈز کے ساتھ یونیورسٹی کے لیے نکل آئی تھی۔ اسے ہر وقت گارڈز کو دُم چھلا بنائے رکھنا سخت ناگوار گزرتا تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ یہ اس کے باپ نے اس پر مسلط کر رکھے تھے۔

یونیورسٹی کے اندر وہ خود کو آزاد محسوس کرتی تھی، اور آج تو وہ خود کو معمول سے زیادہ آزاد محسوس کر رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے آج یونیورسٹی میں حاضری روز کی نسبت انتہائی کم تھی۔ اس وجہ سے یونیورسٹی کے در و دیوار پر ویرانی برس رہی تھی۔

وہ اس وقت جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، تنہا ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے، کتنی ہی دیر سے برستی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ سر پر اس نے اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی لیکن اسے جیسے سردی کی پروا ہی نہیں تھی۔

اسے عباد کا خیال آیا۔ اسے بھی بارش بے حد پسند تھی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کی راہداریوں میں گھومتے ہوئے بارش سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ عباد کے بعد وہ تنہا تھی مگر مطمئن تھی۔ اس نے عباد سے چھٹکارے کا فیصلہ کیا تھا اور اسے چھٹکارا مل بھی گیا تھا۔ عباد نے جس فیملی کی وجہ سے

اس کا دل توڑا تھا، وہ بھی طوفان کی زد میں آ چکی تھی۔ اس کے بعد اس کا باپ ظفر بھی عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا چکا تھا۔

یہ سب سوچتے ہوئے دانیہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں مگر بارش نے اسے اس طرح سحرزدہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں پا رہی تھی۔

اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ بارش کی بوچھاڑیں اندر تک آنے لگیں۔ وہ چونک کے پیچھے ہٹی۔ وہ راہداری میں چلنے لگی۔ اب اس کا رخ واش رومز کی طرف تھا۔ وہ بیسن پر جھک کے ہاتھ دھو رہی تھی کہ اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اسے سامنے آئینے میں ایک جانا پہچانا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ سیدھی ہوئی ہی تھی کہ اس کے چہرے پر مضبوطی سے ایک ہاتھ جم گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ وہ مچلنے لگی، مگر اس شخص کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ اگلے ہی پل اسے اپنے پہلو میں بے انتہا تکلیف کا احساس ہوا۔ قاتل نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا۔ خون کے چھینٹے اُڑے اور آئینے کو داغدار کر گئے۔ اس کی نظر اپنے پہلو سے بھل بھل بہتے خون پر پڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

قاتل نے اسی پر بس نہیں کی۔ وہ اس کے نازک جسم پر چاقو کے مسلسل وار کرتا چلا گیا۔ اس کے پیٹ سے انتڑیاں باہر آ گئیں۔ اس کا جسم تڑپ تڑپ کے ساکت ہو چکا تو قاتل نے اسے ایک جھٹکے سے نیچے پھینکا۔ وہ واش روم کے فرش پر گری۔ اس کے جسم سے نکلتا خون ٹائلوں پر پھیلنے لگا۔ قاتل نے سکون سے جھک کے اس کے کپڑوں سے اپنا چاقو صاف کیا اور اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ آئینے پر خون کے قطرے بہہ رہے تھے۔ اس نے ایک قطرے پر انگلی رکھی اور اسے اپنی مرضی کی سمت دینے لگا۔

"Feel the Pain."

اس نے خون کے قطروں سے یہ جملہ لکھا تھا۔ یہ لکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید آج چھٹی پر تھا۔ اس نے غسل کیا۔ اب وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا کہ اس کا سیل بجا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"سر، یونیورسٹی میں محی الدین کی پوتی دانیہ کا قتل ہو گیا ہے۔" اس کا ماتحت تیزی سے بولا تھا۔

"وہاٹ؟ تم لوگ پہنچو۔ میں وہیں آتا ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہی اس کی گاڑی یونیورسٹی کے گیٹ پر رک رہی تھی۔ پولیس وین بھی سائرن بجاتی اسی وقت وہاں پہنچی تھی۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ اس وقت بارش رک چکی تھی۔ اس کی نظر اِدھر اُدھر بکھرے طلبا کے ہراساں چہروں پر پڑی۔

ایک طالبعلم کی راہنمائی میں وہ جائے وقوعہ کی طرف بڑھا۔ راہدری میں کیچڑ آلود قدموں کے نشانات بکھرے ہوئے تھے۔ دانیہ کی لاش واش روم کے فرش پر چت پڑی تھی۔ انسپکٹر کو اس کی لاش دیکھ کے جھٹکا لگا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے اردگرد خون اور کیچڑ آلود قدموں کے نشانات پھیلے تھے۔

لاش ایک لڑکی نے ہی دریافت کی تھی۔ اس نے واش روم میں دانیہ کی خون آلود لاش دیکھ کے اتنی چیخیں ماری تھیں کہ پوری یونیورسٹی چند لمحوں میں ہی ادھر جمع ہو گئی تھی۔ اس افراتفری میں قاتل کی طرف اشارہ کرتے تمام نشانات مٹ چکے تھے۔

انسپکٹر کی نظر آئینے پر پڑی۔ اس پر خون کے دھبوں سے ایک جملہ لکھا تھا۔ یہ جملہ پڑھ کے اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے غیر متعلقہ لوگوں کو باہر نکالا اور ضروری کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔

دانیہ کے قتل سے شہر بھر میں ہلچل مچ چکی تھی۔ یونیورسٹی کا گیٹ میڈیا کی گاڑیوں سے بھر چکا تھا۔ اینکر پرسنز چیخ چیخ کے اس قتل کی واردات کی اطلاع اپنے ناظرین کو پہنچا رہے تھے۔ چند دن قبل عباد قتل ہوا تھا، وہ بھی اسی یونیورسٹی کا طالبعلم تھا مگر اس کا تعلق کسی وزیر خاندان سے نہیں تھا اس لیے الیکٹرونک میڈیا نے اس کے قتل کا نوٹس تک نہیں لیا تھا۔ اب یہی میڈیا دانیہ کے لیے انصاف مانگ رہا تھا۔

محی الدین بھی جائے واردات پر پہنچ چکا تھا۔ میڈیا کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس نے خود کو کافی حد تک کمپوز کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں طیش کی سرخی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

انسپکٹر حمید کے پاس بھی کالز کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اس کے آفیسرز اسے جلد از جلد قاتل پکڑنے کی ایسے تاکید کر رہے تھے جیسے وہ قاتل کو جیب میں لے کے گھوم رہا تھا۔ اس

نے محی الدین سے بیان لینے کے لیے اس سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی فیملی کا کوئی فرد نہ اس سے ملا تھا نہ ہی کسی نے تفتیش میں پیش رفت جاننے کی کوشش کی تھی۔

اس کے ذہن میں دانیہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ چند دن قبل ہی وہ عباد اور اس کی فیملی کو تہ و بالا کرنے کا عزم کر رہی تھی اور اب اس کی اپنی زندگی کا ورق دنیا کی کتاب سے پھٹے ہوئے ورق کی طرح علیحدہ ہو گیا تھا۔ اسے بے دردی سے مارتے ہوئے اس کی فیملی کے اثر و رسوخ سے ڈرا تھا نہ اسے قانون نے خوف کا شکار کیا تھا۔ اس نے تو بانگ دہل دانیہ کے ورثا کو تکلیف پہنچائی تھی۔ انسپکٹر حمید کو محی الدین کے تاثرات دیکھ کے دلی خوشی ہوئی تھی۔ کوئی تھا جس نے ظلم سہتے سہتے آخرکار اس پر پلٹ کے وار کر دیا تھا۔ اس صدمے سے سنبھلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

شام کو وہ دفتر پہنچا تو ایس پی ایاز احمد دفتر میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی تفتیش کے نتائج سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

''آئینے پر خون سے لکھا ہوا جملہ واضح طور پر کسی انتقامی کارروائی کی طرف نشاندہی کر رہا ہے۔ کوئی ہے جو دانیہ کو قتل کر کے اس کی فیملی کو تکلیف پہنچانا چاہ رہا ہے۔ اب ان کی دشمنی کس سے ہے اس کے بارے میں وہ ہمیں بتائیں گے تو ہی پتا چلے گا۔ میں نے آج مقتولہ کی فیملی سے بیان لینے کی کوشش کی لیکن کسی نے مجھے وقت نہیں دیا۔''

ایس پی اسے پُرسوچ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''تم فکر مت کرو۔ اب یہ کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ میں لے لوں گا اُن سے بیان۔'' اس نے بے فکری سے کہا۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں تشویش کی لہر اٹھی تھی جسے اس نے آنکھوں سے جھلکنے نہیں دیا تھا لیکن دل سے نہیں نکال سکا تھا۔

☆☆☆

عالیہ ان دنوں بے حد پریشان رہنے لگی تھی۔ عالیان کا رویہ روز بروز عجیب سے عجیب تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے پُراسرار تو پہلے بھی لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی گہرا بھید چھپا ہو مگر ان دنوں اس کا رویہ یکسر ہی بدل گیا تھا۔ اس نے ہنسنا بولنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت وہ خیالات میں گم صم نظر آتا۔ وہ اس سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھ پوچھ کے تھک چکی تھی مگر وہ کچھ بتا کے نہیں دے رہا تھا۔

انہیں ساتھ رہتے پچیس برس بیت چکے تھے۔ عالیہ کی اس سے پہلی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ وہ لیکچرر تھا اور انہیں کیمسٹری پڑھاتا تھا۔ عالیہ اس کی وجاہت پر بُری طرح مرمٹی تھی۔ وہ کلاس کے باہر بھی بہانے بہانے سے اس سے ملنے لگی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اور اپنی کشش سے آگاہ بھی۔ اس نے عالیان کو جلد ہی اپنا اسیر کر لیا۔ وہ بھی اس سے بے تکلفی سے پیش آنے لگا تھا۔

ایک دوسرے کے سنگ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور سال بیت گیا تھا۔ اس ایک سال میں عالیان تو عالیہ کے متعلق سب کچھ جان چکا تھا لیکن عالیہ کے لیے اس کی شخصیت، اس کی فیملی، اس کا بیک گراؤنڈ سب ہنوز پردے میں تھا۔ اسے اس تجسس میں بھی کشش محسوس ہوتی تھی اس لیے اس نے کبھی عالیان کو زیادہ کریدا ہی نہیں تھا۔

عالیہ کے بی ایس سی کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اس کا عالیان سے ملنا مشکل ہو جاتا۔ یہی سوچ کے اس نے عالیان سے کہا کہ وہ اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج کے اسے اپنا لے۔ وہ اس کی بات سن کے چپ ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا؟ کیا آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔'' اس کا رویہ دیکھ کے اس کا دل ہول گیا تھا۔

''نہیں عالیہ، تمہیں اپنانا تو میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے مگر میں اپنے والدین کو تمہارے گھر نہیں بھیج سکتا۔''

''لیکن کیوں؟'' عالیہ کی آواز انجانے اندیشوں سے لرزنے لگی تھی۔

''میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''کیوں؟ آپ کے والدین......؟'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''سوری۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا تھا۔ ''میں ان کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

عالیہ کو اپنے والدین کے متعلق اس کا رویہ عجیب تو لگا تھا تاہم اس کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی تھی۔ وہ جیسا بھی تھا اسے قبول تھا۔ اس نے عالیان کو اپنے والدین سے ملا دیا۔ انہیں بھی عالیان کا کردار پُراسرار محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے عالیہ کو منع کیا مگر وہ ضد کی پکی تھی۔ اس نے انہیں آخرکار رام کر ہی لیا تھا۔

شادی کے بعد عالیہ کو اسے زیادہ قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ وہ یوں تو اسے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس کا ہر دم خیال رکھتا تھا لیکن کبھی کبھار جانے اسے کیا ہو

جاتا۔ وہ یکدم ہی اس سے بات کرتے گم صم ہو جاتا۔ عالیہ اس سے پوچھتی تو وہ چڑ جاتا۔ شروع میں تو وہ برداشت کرتی رہی لیکن پھر اس نے جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ عالیان کا رویہ بھی اس سے تلخ ہونے لگا۔ یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ ان کی شادی کو تین سال بیت گئے مگر وہ ہنوز اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ عالیہ نے اپنا چیک اَپ کرایا تو دھک سے رہ گئی۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

عالیان نے یہ خبر سن کے اسے عجیب سے انداز میں دیکھا تھا تاہم کچھ کہا نہیں۔ عالیہ اپنے اس نقص کی وجہ سے یکدم ہی دفاعی پوزیشن میں آ گئی تھی۔ اسے عالیان کا دوسری شادی کر لینے کا اندیشہ ستانے لگا۔ اس اندیشے کے پیش نظر وہ اس کا معمول سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے تلخ رویّے پر پہلے تو لڑ جھگڑ لیتی تھی مگر اب اس نے اس کی تلخی کو بھی ہنس کے سہنا شروع کر دیا تھا۔ عالیہ یوں تو مطمئن تھی مگر گھر کا سُونا پن اسے بری طرح کھلتا تھا۔ ایک بار اس نے جھجکتے ہوئے عالیان سے بچہ اڈاپٹ کرنے کی بات کی تھی۔

اس کی خواہش جان کے وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے دنوں کے بعد عالیہ کو پُراسراریت نظر آئی تھی۔ وہ اس کے رویّے سے گھبرا گئی تھی۔

''میں تو ایسے ہی بات کر رہی تھی۔ آپ کو اگر بچہ اڈاپٹ کرنا منظور نہیں تو کوئی بات نہیں۔''

عالیان نے بڑی دیر کے بعد اپنی زبان کھولی تھی۔

''عالیہ، بچے مجھے بھی بے حد پسند ہیں مگر کسی کا بچہ پالنا......؟'' اس کی آنکھوں میں انجانا سا اندیشہ لرزنے لگا تھا۔ عالیہ سہمے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے کسی کا بچہ پالنے میں خوف آتا ہے۔ جانے وہ کیسا نکلے؟''

''بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی جس نہج پر تربیت کی جائے، وہ ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔'' عالیہ نے ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی۔

''نہیں عالیہ، تربیت جیسی بھی ہو، خون کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔'' اس کا لہجہ عجیب سا تاثر لیے ہوئے تھا۔ عالیہ بہانے سے اٹھ گئی۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی عالیان سے اس بابت بات نہیں کی تھی۔

وہ ہر سال اکتیس دسمبر کی رات کہیں باہر گزارتا تھا اور اگلے چند دن وہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ اب تو عالیہ اس کے اس معمول کی بھی عادی ہو گئی تھی، مگر اس بار وہ لوٹا تو اس کا رویہ معمول سے زیادہ پُراسرار تھا۔ عالیہ کا خیال تھا کہ چند دن میں وہ معمول پر آ جائے گا مگر اس کا رویہ روز بروز تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ زیادہ وقت باہر گزارنے لگا تھا۔ گھر میں ہوتا بھی تو اپنے اسٹڈی روم میں ہی گھسا رہتا۔

عالیہ کی وجہ سے وہ اولاد سے محروم رہا تھا۔ وہ خود کو عالیان کا مجرم سمجھتی تھی۔ اس وجہ سے اس نے کبھی عالیان کے معمولات میں مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی مگر اب اس کے اندر عجیب سا اضطراب کروٹیں لینے لگا تھا۔ عالیان کا بھید جاننے کی خواہش اس کے دل میں روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس راز کا کھوج لگانے کا فیصلہ کر لیا جو جانے کتنے برسوں سے عالیان کے سینے میں مقید تھا۔

☆☆☆

جنت بیگم اپنے کمرے میں اداس بیٹھی تھی۔ عادل اس کے پاس بیٹھا اس کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھا۔ وہ کافی دیر سے اسے ایک اطلاع دینے کی سوچ رہا تھا لیکن اس کے ردِعمل سے ڈر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر یہ خبر اسے مل ہی جائے گی، جانے اس وقت ان کا ردِعمل کیسا ہوتا۔

''میں کافی دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو، مگر کہہ نہیں پا رہے ہو۔'' وہ اس کی نبض آشنا تھی۔ اس کی کشمکش کے بارے میں جان گئی تھی۔

''جی امی جی۔'' اس نے نظریں اٹھا کے اپنی ماں کے جھریوں زدہ چہرے کی جانب دیکھا۔ ''میرے پاس ایک اہم خبر ہے۔ ہمارے لیے تو یہ خوشی کی خبر ہے لیکن جانے آپ اسے کس تناظر میں دیکھیں۔''

''یہ ہمارے دکھ سکھ الگ کب سے ہو گئے؟'' انہوں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کے لیے جو خوشی کی خبر ہے، وہ میرے لیے خوشخبری کیوں نہیں ہو گی؟''

''آپ کا ظرف بہت بڑا ہے۔ کسی کا نقصان آپ کو خوشی نہیں دیتا۔ ہم کم ظرف ہیں۔ دشمن کو پہنچنے والی تکلیف سے خوشی کشید کرتے ہیں۔'' اس نے نظریں جھکا کے جواب دیا تھا۔

''میں اپنی تکلیف برداشت کر گئی تھی۔ میں نے اُسے بھی معاف کر دیا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا مجھے اس سے محبت تھی لیکن اب اس نے میری اولاد کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں کہ اس کا یہ گناہ معاف کر سکوں۔ میں جس دکھ سے دوچار ہوئی، اسے بھی اسی دکھ سے بلکتا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' ان کی کمزور آواز لرز رہی تھی۔

''آپ کی خواہش پوری ہو گئی ہے، امی جی۔'' عادل

نے دھیرے سے کہا۔ جنت بیگم کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔

''کیسے؟'' ان کے لب کپکپانے لگے۔

''دانیہ کو ایسے ہی چھریوں کے وار کر کے قتل کر دیا گیا ہے، جیسے، ہمارے عباد کو قتل کیا گیا تھا۔''

''کیا؟'' عادل ان کے لہجے میں خوشی کی رمق تلاش کرتا رہا مگر ان کی آواز میں تو صرف حیرانی تھی۔ ''تم نے کرایا یہ سب؟'' وہ اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ عادل ان سے نظریں چُرانے لگا۔

''پتا نہیں کس نے کیا۔ مگر جس نے بھی کیا ہماری خوشی کا ساماں کر گیا۔''

''شاید۔'' جنت بیگم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

دانیہ کا جنازہ اس کے آبائی گاؤں میں پڑھایا گیا تھا۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے تدفین صبح دس بجے ہی کر دی گئی تھی۔ اس کی موت پر ملک بھر سے لوگ آئے تھے۔ جن میں اکثریت سیاسی شخصیات کی تھی۔ دانیہ کا باپ لوگوں کے رسمی تعزیتی الفاظ سن سن کے تھک چکا تھا۔ تدفین کے بعد وہ لوگوں میں گھرا ہوا تھا کہ اسے اپنی پشت پر چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے عقب میں مڑنے کی کوشش کی مگر اسی وقت ایک شخص نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ اس کی پیٹھ تھپک کے اسے دلاسا دے رہا تھا۔ گوہر کو یکدم کمزوری کا احساس ہونے لگا، یہ احساس لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ رش کی وجہ سے کسی کو اس کی کیفیت کا اندازہ تک نہیں ہوا۔ یکدم وہ نیچے گرا۔ لوگ اس پر تیزی سے جھکے۔ اس کی رنگت نیلی پڑ چکی تھی۔

''انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' کوئی چیخا۔ لوگوں نے اسے اٹھایا اور گاڑی میں ڈال دیا۔ اس کا ایک بھائی اور کزن بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور سوالیہ نظروں سے احتشام کو دیکھنے لگا۔

گاؤں میں ناکافی سہولیات کے ساتھ محض ایک ڈسپنسری موجود تھی۔ اس میں ہارٹ اٹیک کی صورت میں زیادہ سے زیادہ فرسٹ ایڈ ہی میسر آسکتی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جب ڈسپنسر موجود ہوتا۔

''شہر چلو۔'' احتشام نے کچھ سوچ کے کہا۔ گوہر اتنی دیر میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے نکلتا نیلا جھاگ دیکھ کے احتشام چونکا۔ ''لگتا ہے اسے کسی زہریلے کیڑے

یہ میرا اسلیپنگ پارٹنر ہے۔ ہر وقت سوتا رہتا ہے۔

نے کاٹا ہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ گوہر کی سانسیں ڈوب رہی تھیں۔ ڈرائیور نے ہر ممکن تیزی کا مظاہرہ کیا تھا مگر وہ فرشتۂ اجل کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ راستے میں ہی گوہر زندگی کی بازی ہار گیا۔ جب اسے ہسپتال پہنچایا گیا تو ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ اس نے بھی موت کی وجہ زہر ہی بتائی تھی۔

اگر دانیہ کو قتل نہ کیا گیا ہوتا تو احتشام اس کی موت کو حادثاتی ہی سمجھتا لیکن موجودہ حالات میں وہ شک کا شکار ہو گیا۔ اس نے پوسٹ مارٹم کرانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے گھر فون کر کے بتایا تو کہرام برپا ہو گیا۔ ابھی تو انہوں نے دانیہ کو لحد میں اتارا تھا کہ ان کا خاندان ایک اور جانی نقصان سے دوچار ہو گیا تھا۔ وہ اس کی موت کو طبعی سمجھ رہے تھے مگر ڈاکٹر کی ابتدائی رپورٹ نے ان کے اندازوں کی تردید کر دی۔ موت زہر کے باعث ہوئی تھی جو اس کے جسم میں انجیکٹ کیا گیا تھا۔ اس کی کمر کے نیچے سوئی کا واضح نشان موجود تھا۔ اس نشان کے گرد ایک دھبہ نمودار ہو گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے ان کے خاندان میں کھلبلی مچا دی۔ محی الدین نے ساری زندگی دوست کم اور

دشمن زیادہ بنائے تھے۔ سیاست میں حصہ لینے کے بعد اس کے دشمنوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا مگر وہ حیران تھا کہ اس کے دشمنوں میں اتنی جرأت کیسے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں خم ٹھونک کے اتر آئے تھے۔ اس کے اندر طیش کا طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اس طیش نے جانے کس کس کو جلا کے بھسم کرنا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید بھی دانیہ کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس جنازے میں شرکت کا اس کا ایک مقصد تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ جب گوہر گرا تھا تو وہ اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس کے گرتے ہی لوگ اس پر جھک گئے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ پیچھے ہٹ آیا تھا۔

اس وقت محی الدین کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ انسپکٹر کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ اس کی بے بسی دیکھ کے اس کے دل کو سکون حاصل ہو رہا تھا۔

جب اسے گوہر کی موت کا اطلاع ملی اس وقت بھی انسپکٹر اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو طیش جاگا تھا اس نے انسپکٹر کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔

اس کی آنکھیں ضبط کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے گرد تعزیت کرنے والوں کا ہجوم تھا مگر ان میں سے کوئی کندھا ایسا نہیں تھا جس پر وہ سر رکھ کے رو سکتا۔ وہ مہمانوں کے بیچ سے اٹھ کے اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ شاید وہ اپنا غم ہلکا کرنے گیا تھا۔

اس کے اندر جاتے ہی مہمان آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کا موضوعِ گفتگو گوہر کی پُراسرار موت تھی۔ وہ اس بارے میں اپنے اپنے اندازے لگانے میں مصروف تھے۔ حمید بے توجہی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

اسے وہیں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ محی الدین مہمانوں کے بیچ بیٹھا تھا جب اسے احتشام کی کال موصول ہوئی۔ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ رپورٹ سن کے محی الدین کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ مہمان ایک بار... پھر چہ میگوئیوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ کچھ دیر کے بعد حمید کو محی الدین کا ایک خاص ملازم غلام حسین اندرونی کمرے میں جاتا نظر آیا۔ حمید اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے نامعلوم سی

بحس تنگ کرنے لگی۔

غلام حسین کی واپسی جلد ہی ہو گئی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کے حمید چونکا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

غلام حسین کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ ایک پیراڈو کی فرنٹ سیٹ پر سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی موڑی۔ اس کی پچھلی نشستوں پر حمید کو گن بردار بیٹھے دکھائی دیے۔

حمید اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔ اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔ پیراڈو گاؤں کے کچے پکے راستوں پر دھول اُڑاتی جا رہی تھی۔ حمید کی سیکنڈ ہینڈ مہران اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا۔ عالیان عام طور پر چھٹی کا دن گھر پر ہی گزارتا تھا مگر آج صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ اس نے عالیہ کو بھی اٹھا دیا تھا۔ وہ ناشتا بنا کے لائی تو عالیان کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل گم صم نظر آ رہا تھا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' عالیہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آج تو چھٹی ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ایک انتہائی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' اس نے بے حد عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ ''شام تک واپسی ہو جائے گی۔''

''ایسا کون سا ضروری کام ہے۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔'' آج طویل عرصے کے بعد اس نے جرح کی تھی۔ عالیان نے اسے چونک کے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرد سا تاثر جاگا مگر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ہر کام بتانا ضروری نہیں ہوتا۔''

''مجھے امی کی طرف جانا تھا۔ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''نہیں عالیہ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میرا روٹ دوسرا ہے۔ تم کیب منگوا لو۔'' وہ تیزی سے چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

''اوکے۔'' اس نے کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔

کچن میں آتے ہی اس نے آن لائن گاڑی منگوانے کے لیے موبائل نکال لیا۔

یہ جاتے کہاں ہیں۔ آج میں جان کے رہوں گی۔

اس نے عزم سے سوچا۔ قریب ترین گاڑی اس سے صرف تین منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے کنفرم پر کلک کر دیا۔

"میں جا رہا ہوں عالیہ۔ دروازہ اندر سے بند کر لینا۔" اس کے کانوں میں عالیان کی آواز پڑی۔ اس نے چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل آئی۔

عالیان گیٹ کھول کے گاڑی میں بیٹھا۔ عالیہ داخلی دروازے پر کھڑی تھی۔

"خدا حافظ۔" اس نے عالیان کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ جواب میں اس نے عالیان کے لب ہلتے دیکھے۔ شاید اس نے بھی خدا حافظ ہی کہا تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی عالیہ نے تیزی سے دروازہ لاک کیا۔ اس کی منگوائی گئی گاڑی گلی میں پہنچ چکی تھی۔ اس نے گیٹ لاک کیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس وقت عالیان کی گاڑی گلی کے سرے سے اوجھل ہو رہی تھی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے میڈم؟" ڈرائیور نے سوال کیا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔

"اس سلور کلر کی جی ایل آئی کے پیچھے چلو۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سوری میڈم، میں ایسا کام نہیں کرتا۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"یہ میرے شوہر ہیں۔" اس نے کھسیائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے یہ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے جا رہے ہیں۔ میں انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی ہوں۔"

ڈرائیور کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کے اس نے پرس کھولا اور ایک ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "پلیز، یہ رکھ لو اور جلدی چلو۔"

ڈرائیور کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ جاگی اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ عالیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بے چینی سے باہر دیکھنے لگی۔

مین روڈ تک پہنچتے ہوئے انہیں عالیان کی گاڑی نظر آ گئی تھی۔ صبح کا وقت تھا اور چھٹی کا دن۔ روڈ پر اکا دکا گاڑیاں ہی چل رہی تھیں۔ عالیان کا پیچھا کرتے ہوئے انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کچھ دیر مین روڈ پر سفر کرنے کے بعد اس نے گاڑی ایک لنک روڈ پر موڑ لی۔

عالیہ کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات پھیل گئے۔ کہیں یہ اپنے پرانے گھر تو نہیں جا رہے۔ اس نے سوچا۔

شادی کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ اسی محلے میں گزارا تھا جس طرف اس وقت عالیان کا رخ تھا۔ جلد ہی عالیان نے نیا گھر لے لیا تھا اور وہ اس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ عالیان نے پرانے گھر کا کیا کیا تھا، نہ یہ کبھی عالیہ نے پوچھا تھا نہ اس نے بتایا تھا۔

عالیان کی گاڑی اب گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ عالیہ کو اپنے اندازے کی درستی کا یقین ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عالیان نے اپنے پرانے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ عالیہ نے بھی گاڑی رکوا لی۔

عالیان تالا کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ خاصا جلدی میں لگ رہا تھا۔

"تم ایک منٹ رکو، میں ابھی آئی۔" وہ ڈرائیور سے کہتے ہوئے تیزی سے نیچے اتر آئی۔ ڈرائیور نے جواب میں کچھ کہا تھا مگر عالیہ نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے گیٹ کو دھکا دیا تو اسے توقع کے مطابق کھلا ہوا پایا۔ وہ ڈرتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ مکان کا داخلی دروازہ بھی کھلا تھا۔ عالیہ دبے قدموں اندر کی طرف بڑھی۔ لاؤنج میں ملگجا سا اندھیرا چھایا تھا۔ اندرونی کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عالیہ کو اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی پُرسوچ انداز میں اندر دیکھ ہی رہی تھی کہ اندرونی کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ عالیان باہر آ رہا تھا۔

عالیہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس کے پاس پلٹنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے خود کو پردے کی اوٹ میں چھپا لیا۔ عالیان جیب میں کچھ ڈالتا ہوا تیزی سے باہر نکلا تھا۔ عالیہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔

اگر یہ مجھے دیکھ لیتا تو...... یہ خیال ہی اس کے لیے روح فرسا تھا۔ عالیان لاؤنج کے وسط میں آ کے رکا۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی پُرسوچ نگاہیں اسی پردے پر ٹکی تھیں جس کی آڑ میں عالیہ نے خود کو چھپایا تھا۔ اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ اس نے سانس روک لی اور دل ہی دل میں دعاؤں کا ورد کرنے لگی۔

عالیان چند لمحے لاؤنج کے وسط میں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر وہ جھٹکے سے آگے بڑھا اور باہر نکل گیا۔ عالیہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ اسی لمحے اسے دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھوں سے ہراس جھلکنے لگا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ عالیان گیٹ کھول کے باہر نکل رہا تھا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ عالیہ کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ عالیان انجانے میں اسے تنہا گھر میں قید کر کے جا چکا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس نے لائٹ آن کی اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی، جب اس نے عالیان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ اس قید خانے سے باہر نکلنے کی تدبیر سوچنے لگی۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید سارے راستے عادل کو کال کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ محی الدین کا ملازم جس انداز میں گن بردارز کے ساتھ رخصت ہوا تھا، اسے جنت محل کے مکینوں کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے حتی الوسع پیراڈو کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی آٹھ سو سی سی کار پیراڈو کا پیچھا نہیں کر سکی تھی۔ وہ اس معاملے میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ وہ کسی اور کے ذریعے سے جنت محل کے مکینوں کو خبردار کر سکتا تھا۔

بہر حال اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے جنت محل کی طرف اپنا سفر جاری رکھا تھا۔ سردیوں کے سورج نے اسے گاؤں کے راستے میں ہی الوداع کہہ کے اُفق کے پار منہ چھپا لیا تھا۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس کا سفر جاری و ساری تھی۔ جب اس نے گاڑی جنت محل کی طرف جانے والے راستے پر ڈالی تو رات کے سات بج چکے تھے۔ اس کے ذہن میں اندیشوں کا ناگ بار بار ڈنک مار رہا تھا۔ وہ خود کو تسلیاں دے دے کے تھک چکا تھا مگر اس کا دل ان طفل تسلیوں سے بہلنے والا نہیں تھا۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اس کی گاڑی بھی ہانپ گئی تھی۔ آج اس نے اس کی بساط سے زیادہ کام لے لیا تھا۔ اس نے ٹمپریچر دکھانے والے پیمانے پر نگاہ ڈالی۔ گاڑی خطرناک حد تک گرم ہو چکی تھی۔ اب وہ کسی بھی وقت بند ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس وقت کم تھا مگر گاڑی کو ٹھنڈا کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس نے سائڈ پر گاڑی لگا کے روک دی۔ اس کے پاس پانی کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ وہ بونٹ کھول کے گاڑی میں پانی ڈالنے لگا۔ اچانک اس نے لہراتی ہوئی روشنیاں دیکھیں۔ وہ چونک کے مڑا۔ پہاڑی راستے سے ایک گاڑی اترتی آ رہی تھی۔ اندھیرے میں روشن ہیڈ لائٹس کے پیچھے وہ محض ہیولے کی صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھا مگر اس کی چھٹی حس اسے اشارہ دے رہی تھی کہ یہ اس کی مطلوبہ گاڑی ہو سکتی ہے۔ وہ بے چینی سے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا...... اس نے موڑ کاٹا تو انسپکٹر کی نظر اس کے عقب میں آتی ایک اور کار کے ہیولے پر پڑی۔ یہ جیسے اچانک ہی نمودار ہوئی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اگلی گاڑی کا ہیولا بھی خاصی حد تک واضح ہو گیا۔ یہ اس کی مطلوبہ گاڑی ہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اس کی کنپٹیوں میں شور مچانے لگی۔

''یا اللہ خیر۔ کہیں یہ......'' اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکا۔

☆☆☆

سرد ٹھٹھرتی رات کے اندھیرے میں ڈوبا جنت محل کا ہیولا پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ ابتدائی راتوں کا چاند اپنی مدھم روشنی سے اندھیرے کو شکست دینے کی بساط بھر کوشش کر رہا تھا۔

وہ اس وقت محل کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ اس نے گرم اوورکوٹ پہن رکھا تھا مگر اس کے باوجود سردی اس کا مزاج پوچھ رہی تھی۔ سر پر اونی ٹوپی چڑھائے، چہرے کو مفلر سے ڈھانپے وہ جانے کتنی دیر سے گیٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ اس نے گیٹ پر لگے تالے کو ایک بار پھر بے یقینی سے دیکھا۔ جانے محل کے مکین کہاں چلے گئے تھے۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ محل کا گیٹ ایک لحظے کے لیے روشنی سے نہا گیا۔ اس نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ اس کی نظر ایک گاڑی پر پڑی۔ وہ جنت محل کی طرف آتے راستے پر سفر کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر گاڑی کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں لے گیا۔ یہاں سے وہ گیٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ پہاڑی پر چڑھتی گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے محل کے گیٹ پر رکتی نظر آئی۔ گاڑی سے چند افراد چھلانگیں مار کے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں گنز دیکھ کے اس کے چہرے پر تفکر کی لکیروں کا جال تن گیا۔

''گیٹ پر تو تالا لگا ہے۔'' اس کے کانوں میں مدھم سی آواز پڑی۔

''لگتا ہے یہ لوگ یہاں سے کہیں چلے گئے ہیں۔

یہاں تو کوئی ملازم تک نظر نہیں آ رہا۔"
"جائیں گے کہاں؟ میں انہیں پاتال کی گہرائی سے بھی نکال لاؤں گا۔" اس آواز میں کچھ ایسا تھا کہ اس کی گدی کے بال کھڑے ہو گئے۔
"وہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی ہم کیا کریں؟"
"ایک منٹ۔" وہ شخص فون نکال کے کوئی نمبر ملانے لگا۔ وہ دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز تو اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی تاہم الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔
"چلو۔" اس نے کال کاٹتے ہی بلند آواز میں کہا۔
"ابھی واپسی کا حکم ملا ہے۔" سب لوگ گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی گھمائی اور واپسی کے راستے پر گامزن ہو گئی۔
وہ ابھی تھوڑا نیچے ہی گئے تھے کہ اس نے بھی گاڑی اسٹارٹ کر کے پیچھے لگا دی۔ فی الحال اس نے ہیڈ لائٹس آن کرنے کا رسک نہیں لیا تھا۔ واپسی پر پیراڈو کی رفتار کم تھی۔
وہ اندھیرے میں محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ جنت محل کے راستے سے الگ ہوتے ہی اس نے ہیڈ لائٹس آن کر دیں اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیراڈو سے اس کا فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی کنپٹی کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور لب بھنچے ہوئے تھے۔
☆☆☆
عالیہ کی اس قید خانے سے رہائی کی تمام کاوشیں بیکار گئی تھیں جس میں وہ اپنی بیوقوفی کے باعث محبوس ہو گئی تھی۔ تمام کھڑکیوں پر مضبوط گرل لگی تھی۔ روشن دان اتنے چھوٹے تھے کہ ان سے گزرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ تھک ہار کے وہ کمرے میں آ گئی اور... بیڈ پر لیٹ گئی۔
تو یہ ہے وہ جگہ جہاں وہ اپنا وقت بتاتا ہے۔ وہ چھت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یکدم ایک خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔
ہو سکتا ہے، یہاں کچھ ایسا ہو جس کی مدد سے مجھے اس کی زندگی کے خفیہ گوشوں تک رسائی حاصل ہو سکے۔ یہ خیال آتے ہی وہ متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی ایک تصویر پر ٹک گئی۔ اس نے تصویر اٹھائی اور دیکھنے لگی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ وہ پُرتجسس انداز میں تصویر میں موجود چہروں کو کھوجنے لگی۔ ان چہروں میں اسے عجیب سی مانوسیت محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ وہ جاننے سے قاصر تھی۔
اس کے ذہن میں چبھن ہو رہی تھی۔ کوئی خیال تھا جو اس کے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھر کے اس کے پردہ شعور کی سطح پر آنا چاہ رہا تھا۔ اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور پیشانی مسلنے لگی۔ اس کا سر دکھنے لگا مگر خیال تھا کہ ابھرتے ابھرتے ڈوب جاتا تھا۔ تھک ہار کے اس نے کوشش ترک کر دی۔ وہ اٹھ کے درازوں کی تلاشی لینے لگی۔ اس نے ایک دراز کھینچی تو پوری باہر نکل آئی۔ اس میں ایک ڈائری رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر آس کے جگنو چمکنے لگے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈائری کھولی۔ ڈائری کے ابتدائی صفحات خالی تھے۔ وہ بے چینی سے صفحے پلٹنے لگی۔ یکدم وہ چونکی۔ اس کی نظر عالیان کی تحریر پر پڑی۔ وہ اس کا خط بخوبی پہچانتی تھی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھمک پیدا کرنے لگا۔
"محبت بھرے رشتوں کو کب نفرت کی دیمک کھا جائے پتا ہی نہیں چلتا۔ میرا بھی جنت محل کے مکینوں سے محبت کا رشتہ تھا۔"
یہ کسی کہانی کا آغاز لگ رہا تھا اور یہ کہانی ہی تھی۔ عالیان کی زندگی کی کہانی...... جو اسرار کی تہ در تہ پرتوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ عالیہ پورے انہماک کے ساتھ یہ پرتیں کھولنے لگی۔ عالیان کی زندگی کے خفیہ گوشے اس کے سامنے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی عالیہ نفرت کی ایک تند و تیز لہر میں بہتی جا رہی تھی۔
☆☆☆
انسپکٹر حمید یک ٹک کھڑا دونوں گاڑیوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ سرد ہوائیں اس کے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اسے اپنا دماغ سن محسوس ہونے لگا۔ معاً ایک موڑ پر پیچھے آنے والی کار ایک دھماکے سے پیراڈو سے ٹکرائی۔ پیراڈو ایک جھٹکے سے کھائی کی طرف گئی۔ ڈرائیور نے بریک لگاتے ہوئے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ رات کے سناٹے میں چرچراہٹ کی سمع خراش آواز بلند ہوئی۔ ڈرائیور پیراڈو کا رخ موڑنے میں تو کامیاب رہا مگر اس کے پچھلے ٹائر روڈ سے نیچے اتر گئے۔ پیراڈو کے اگلے ٹائر ہوا میں بلند ہوئے اور وہ الٹی قلابازی کھاتی ہوئی نیچے جانے لگی۔ پیراڈو میں سوار لوگوں کی چیخیں دل کو دہلانے لگیں۔
انسپکٹر دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ پیراڈو کے نیچے گرتے ہی اس نے موبائل کی ٹارچ آن کی اور تیزی

سے کنارے کی طرف آیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ پیراڈو جھاڑیوں کو روندتی گرتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں اب وہ بس ایک ہیولے کے مانند نظر آ رہی تھی۔ اچانک پیراڈو میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ دھڑا دھڑ جلنے لگی۔

کار سوار بھی گاڑی روک کے نیچے اتر چکا تھا۔ وہ بھی انسپکٹر کے ساتھ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل کی لائٹ انسپکٹر کے چہرے کی جانب کی۔

''انسپکٹر صاحب، آپ؟'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

حمید نے اسے بغور دیکھا۔ مفلر سے جھانکتا وہ ادھورا چہرہ اسے دیکھا بھالا لگا لیکن یاد نہیں آیا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

''موڑ پر اچانک ہی اس نے بغیر انڈیکیٹر دیے رفتار آہستہ کر دی۔ میں نے بریک لگانے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی میری گاڑی اس سے ٹکرا گئی۔'' وہ خود ہی وضاحت دینے لگا۔ انسپکٹر نے اس کی وضاحت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں ان کی مدد کے لیے نیچے جانا چاہیے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ دونوں اپنے موبائل کی فلیش لائٹس میں نیچے جانے لگے۔ راستہ دشوار تھا، اس لیے وہ احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پیراڈو ابھی تک جل رہی تھی۔ قریب کی جھاڑیوں نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔

''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟'' انسپکٹر کو یکدم خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''میں جنت محل کا ہی مکین ہوں۔'' اس نے مبہم لہجے میں کہا۔ ''آپ اِدھر کیسے؟'' ساتھ ہی اس نے بھی سوال جڑ دیا۔

''میں اس پیراڈو کے پیچھے ہی یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لیے آ رہے ہیں۔ عادل کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ سو میں آپ لوگوں کو خطرے سے خبردار کرنے کے لیے ہی آیا تھا۔'' اس نے تفصیلی جواب دیا۔

''ہمیں اس خطرے کا اندازہ تھا اس لیے ہم نے پہلے ہی جنت محل خالی کر دیا تھا۔ بس میں رہ گیا تھا۔'' انسپکٹر نے اس اطلاع پر رگ و پے میں سکون کی لہر اترتی محسوس

خدایا رحم۔ یہ جائزہ لے رہا ہے کہ ہم میں سے کس کو پکایا جائے۔

کی۔ ''ہمیں موت کے منہ میں دھکیلنے کے لیے آنے والے کیسے خود موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

انسپکٹر جانتا تھا کہ انہیں اس کشمکش سے دوچار کرنے والا یہی شخص ہے تاہم اس نے اسے جتلانا ضروری نہیں سمجھا۔

وہ پیراڈو کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جو جل کے ڈھانچا بن چکی تھی۔ فضا میں گوشت جلنے کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک انسپکٹر کی نگاہ گھستے ہوئے ایک وجود پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ شخص اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ انسپکٹر نے اسے سیدھا کیا۔ اُف! اتنا بھیانک چہرہ اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل لرز کے رہ گیا۔ یہ محی الدین کا خاص الخاص ملازم تھا۔ اس کا چہرہ نصف سے زیادہ جل چکا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ وہ چند لمحوں کا مہمان لگ رہا تھا۔

وہ مر جاتا تو بہت سے راز اس کے سینے میں ہی دفن رہ جاتے۔ انسپکٹر اس کے لیے اور تو کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس نے اس کے گناہوں کا بار ہی ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ ''عباد کو تم نے مارا تھا ناں؟''

''ہاں۔'' اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''لیکن کیوں؟'' انسپکٹر چیخا۔

''مجھے حکم ملا تھا۔'' اس کا جواب سننے کے لیے انسپکٹر کو

اپنا کان اس کے ہونٹوں کے پاس لانا پڑا تھا۔
''کس نے حکم دیا تھا۔''
''مالک نے۔'' وہ بمشکل سانس کھینچتے ہوئے بول رہا تھا۔
''اور ظفر کو مارنے کا بھی تمہیں حکم ملا تھا؟''
''ہاں...... میں...... حکم...... کا...... غلام......'' وہ جملہ پورا نہیں کرسکا تھا۔
''اس کا بیان اس کے مالک کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگا ناں؟'' اس کے ساتھ کھڑے شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس نے چونک کے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس کی خاموشی ہی اس کا جواب تھا۔

☆☆☆

عالیان ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل عالیہ کا نمبر ملا رہا تھا۔ وہ اسے اطلاع دینا چاہ رہا تھا کہ وہ آج گھر نہیں آئے گا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی مگر عالیہ کال موصول نہیں کر رہی تھی۔
وہ اس وقت جس موڈ میں تھا، عالیہ کا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے گاڑی کا رخ اپنے پرانے گھر کی طرف موڑ دیا۔ گیٹ کھول کے وہ اندر داخل ہوا تو اس کی نظر کھڑکیوں سے چھنتی روشنی پر پڑی۔
''میں بھی کتنا بھلکو ہوگیا ہوں۔ لائٹس بند کرنا یاد ہی نہیں رہا۔'' اس نے خود سے کہا اور لاک کھولنے لگا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو یکدم اسے جھٹکا لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے، بے یقینی سے اپنے بیڈ پر لیٹی عالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی گود میں ایک ڈائری کھلی تھی۔ یہ ڈائری تو اس کی زندگی کے خفیہ گوشوں کی گواہ تھی۔ جسے وہ ہر ایک سے پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا۔ یہ اس تک کیسے پہنچی؟
وہ خوفزدہ انداز میں ڈائری کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
عالیہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ کے کوئی تاثر نہیں جاگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں۔
''تم نے یہ پڑھ لی؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔
وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔
''تم نے یہ کیوں پڑھی؟'' وہ چیخا۔
عالیہ کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔ ''میں یہ نہ پڑھتی تو کیسے جان پاتی کہ آپ میں ایک راکھشس چھپا ہوا ہے۔''
اس کی آواز گہرے دکھ سے بوجھل تھی۔
''تم یہ سب پڑھ کر بھی ایسا سمجھ رہی ہو؟'' اس نے بے حد عجیب لہجے میں کہا۔
''تو کیا مجھے ایسا نہیں سمجھنا چاہیے؟''
''نہیں۔'' اس نے بھڑک کے کہا۔ ''میں نے مار دیا ہے اپنے اندر کے راکھشس کو۔''
''وہ مر چکا ہوتا تو آپ لوگوں کو نہ مار رہے ہوتے۔'' اس نے شاکی لہجے میں کہا۔
''تم کچھ نہیں جانتیں عالیہ۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ تو بس کفارہ تھا، میرے گناہوں کا۔ میں پچھتاووں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک چکا تھا۔ مجھے یہ بوجھ اتارنے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا۔ تم نے صرف میری نفرت دیکھی۔ اس نفرت کی تہ میں چھپی محبت کیوں تمہاری نظروں سے اوجھل رہی...... کیوں؟'' وہ بال نوچتے ہوئے نوحہ کناں تھا۔
''کچھ بھی ہے۔ آپ کا یہ گھناؤنا روپ دیکھ کے میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''
''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''
''ہاں۔ آخری فیصلہ۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا۔
عالیان کی آنکھوں میں طیش کی سرخی چمکی۔ عالیہ خوفزدہ انداز میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

انسپکٹر گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ ٹی وی آن کیے اس کے سامنے بیٹھا تھا لیکن اس کی توجہ ٹی وی کی طرف نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں تو آج پیش آنے والے خیالات کی ریل چل رہی تھی۔
پیراڈوکا کوئی سوار بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ وہ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے آئے تھے مگر خود ہی آگ کا شکار ہو کے جل کے بھسم ہوگئے تھے۔ اس نے جنت محل کے مکین کے طور پر تعارف کرانے والے شخص سے بھی کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ روڈ پر پہنچ کے وہ اپنے راستے پر ہولیا تھا اور انسپکٹر اپنے راستے پر۔ ویسے بھی اس کے خیال میں اس شخص نے جو بھی کیا تھا، درست کیا تھا۔ اپنے گھر کی طرف بڑھنے والی آگ کو بجھانے کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا؟
وہ اس سارے واقعے میں خود کو ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے گھر آگیا تھا۔ اچانک ٹی وی پر اس نے بریکنگ نیوز کے الفاظ چمکتے دیکھے۔ وہ چونک گیا۔ نیوز اینکر اپنے مخصوص انداز میں خبر دے رہا تھا۔

''وفاقی وزیر محی الدین پر فالج کا اٹیک۔ ان کی حالت انتہائی تشویشناک بتائی جاتی ہے۔ ناظرین ہم آپ کو اطلاع دیتے چلیں، کہ محی الدین پے در پے صدمات سے نڈھال تھے۔ پچھلے دنوں ان کی جواں سالہ پوتی دانیہ کو یونیورسٹی میں چھریوں کے وار کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ ابھی یہ صدمہ تازہ تھا کہ آج دانیہ کی تدفین کے موقع پر ان کے بیٹے گوہر کو زہر دے کر قتل کر دیا گیا۔ ابتدائی تفتیش سے یہ کسی انتقامی کارروائی کا شاخسانہ لگتا ہے تاہم ابھی تک پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔''

انسپکٹر حمید دم بخود بیٹھا یہ خبر سن رہا تھا۔

محی الدین نے چند دن قبل عباد اور ظفر کو قتل کرتے وقت سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس کے نتائج اس کے لیے کتنے بھیانک ہوں گے۔ وہ جن کو چیونٹیوں کی طرح مسل دینا چاہتا تھا، انہوں نے جب پلٹ کے وار کیا تو ظلم کی طاقتور سلطنت چند جھٹکوں میں ہی نیست و نابود ہو گئی تھی۔ انسپکٹر سوچتا جا رہا تھا، اس کے دل میں سکون کی لہر پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کا انتقام لینے میں تو کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن ظالم کے سامنے مظلوم کی فتح نے اسے خوش کر دیا تھا۔

اب امید ہے جنت محل کے مکین بھی سکون سے رہ سکیں گے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔ یہ اس کی خوش گمانی تھی جو تھوڑی دیر بعد ہی دور ہو گئی تھی۔ اسکرین پر محی الدین کا بیٹا، احتشام دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

''قاتل جو کوئی بھی ہے، قانون کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔ میں اپنے بھائی اور بھتیجی کا خون اسے معاف نہیں کروں گا۔ میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا کے رہوں گا۔'' وہ پُرسکون انداز میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس پُرسکونی کی تہہ میں جو غیظ و غضب کروٹیں لے رہا تھا وہ محسوس کر کے انسپکٹر کے چہرے پر گہری تشویش چھا گئی۔

☆☆☆

عالیان، عالیہ کی ضد پر اُسے میکے چھوڑ آیا تھا۔ وہ اسے چھوڑ تو آیا تھا مگر اب اسے خالی گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ یہ عالیہ ہی تھی جس نے اس کی ویران زندگی میں رنگ بھرے تھے۔ ورنہ اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ پچھلے پچیس برس میں اس کی تلخ زندگی میں اگر کوئی مٹھاس تھی تو وہ عالیہ کی ہی بدولت تھی۔

''میں ایک بار پھر وہی غلطی دہرا رہا ہوں۔ مجھے عالیہ کو منا لینا چاہیے، اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے۔'' وہ خود سے کہہ رہا تھا۔

وہ اگلے ہی دن عالیہ کے گھر جا پہنچا تھا۔ وہ اسے دیکھ کے حیران رہ گئی تھی۔

''عالیہ، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس گھر کی ویرانی مار دے گی۔'' وہ بلک بلک کے کہہ رہا تھا۔

''آپ معافی کے قائل ہیں؟'' اس نے بے حد عجیب لہجے میں کہا۔

''میں مانتا ہوں، میں گناہ گار ہوں۔ دنیا میں مجھ جیسا گھٹیا شخص کوئی نہیں ہوگا مگر میں تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔ پلیز، مجھے مت دھتکارو۔''

''آپ نے تو جنت بیگم کو نہیں بخشا۔ جس نے آپ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔''

''تم جنت بیگم نہ بنو پلیز، ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔''

''کیا آپ نے ان سے کبھی معافی مانگی؟'' عالیان اس سوال پر نظریں چُرا کے رہ گیا۔

☆☆☆

محی الدین اپنی آبائی حویلی میں موجود تھا۔ وہ ایک دن قبل ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کے آیا تھا۔ فالج کا حملہ شدید تھا لیکن ایک ماہ میں وہ اس جھٹکے سے خاصی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اب وہ سہارے سے چل بھی سکتا تھا اور اسپیچ تھراپی کی بدولت اس کی بول چال میں کافی بہتری آ چکی تھی۔ گو کہ اب بھی بولتے ہوئے وہ اٹکنے لگتا تھا، اس کی رال بہنے لگتی لیکن ڈاکٹرز نے وقت کے ساتھ مزید بہتری کی امید دلائی تھی۔ وہ اسپتال میں پڑا پڑا تھک چکا تھا۔ احتشام اس کی ضد پر ہی اسے حویلی واپس لے آیا تھا۔ ڈاکٹرز، نرسیں اور تھراپسٹ بھی اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔

وہ بستر پر دراز اس وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ دانیہ کے قتل کے فوری بعد گوہر کی موت نے اس کے وجود کو دہکتا ہوا آتش فشاں بنا دیا تھا۔ اس آتش فشاں کو جنت بیگم اور اس کی فیملی کے لہو کے چھینٹے ہی سرد کر سکتے تھے۔

جنت بیگم سے اس کا حساب بہت پرانا تھا۔ وہ تو اسے بھول ہی چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جنت بیگم زندگی کے کسی موڑ پر اسے پھر یوں ٹکرائے گی۔ غلام حسین کو اس نے دانیہ کی سیکیورٹی پر مامور کر رکھا تھا۔ وہ تھا تو سیکیورٹی گارڈ لیکن وہ اس کی ہدایت پر اسے دانیہ کی تمام

سرگرمیوں سے باخبر رکھ رہا تھا۔ دانیہ کا عباد سے میل جول غلام حسین کی نظر میں آ گیا تھا۔ اس نے محی الدین کو بتایا۔ اس سے قبل دانیہ کبھی کسی لڑکے کے قریب نہیں ہوئی تھی۔ اب اگر وہ کسی لڑکے سے تعلق جوڑ رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے متعلق سنجیدہ تھی۔ محی الدین دانیہ کو جانتا تھا۔ اسے اس سنجیدہ تعلق پر اعتراض نہیں تھا، تاہم وہ یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ عباد اس کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

اس نے غلام حسین کو عباد کا بائیوڈیٹا اکٹھا کرنے کا حکم دیا۔ اس نے چند دن بعد ہی تفصیلی رپورٹ اسے پیش کر دی۔ اس رپورٹ میں عباد کی پوری فیملی کا تصاویر سمیت مکمل بائیوڈیٹا موجود تھا۔ وہ ایسے ہی باریکی اور تفصیل سے کام کرنے کا عادی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پر حد درجہ اعتماد کرتا تھا۔ وہ جنت بیگم اور اس کی فیملی کی تصاویر دیکھ کے ششدر رہ گیا تھا۔

''تو یہ عورت اب مجھ سے انتقام لے گی؟'' اس کے ذہن میں خیال سرسرایا تھا۔ ''اس نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ اس نے برسوں کی ریاضت سے خوابوں کا جو محل تیار کیا ہے، میں اسے ایک جھٹکے سے مسمار کر دوں گا۔ لیکن نہیں ...... یہ تو کوئی بڑی سزا نہیں ہو گی۔'' اس کا ذہن خیالات کا جنگل بنا ہوا تھا۔ ''اس نے میرے حکم کی رُوگردانی کی تھی۔ میں اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ اس نے جو سپنے لیے میرے خلاف تیار کیے میں انہیں چن چن کے ماروں گا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خوابوں کے محل کی ایک ایک اینٹ گرتے دیکھے گی۔ تب اسے پتا چلے گا کہ محی الدین سے ٹکراؤ کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' یہ خیال اس کے دل کو لگا تھا۔ اسے غلام حسین اور اس کی صلاحیتوں پر کامل یقین تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے اسی کو منتخب کیا تھا۔

اس نے غلام حسین کو بلا کے عباد کے متعلق کہا تھا۔

''اسے مار دو۔''

غلام حسین نے اس کے حکم کے مطابق انتہائی صفائی سے عباد اور بعد ازاں ظفر کو راہ سے ہٹا دیا تھا۔ اس کا منصوبہ کامیابی سے جاری و ساری تھا کہ جانے کیسے یکدم بازی پلٹ گئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جنت بیگم یوں پلٹ کے بھی وار کر سکتی ہے۔ وہ بدلے میں اس کے بیٹے اور پوتی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ اس نے جنت کو ''انڈر اسٹیمیٹ'' کیا تھا اور یہ غلطی اس نے دوسری بار کی تھی۔

''ان سب کو مار دو۔ ایک ہی بار مار دو۔'' گوہر کی موت کے بعد اس نے غلام حسین کو کھولتے ذہن کے ساتھ حکم جاری کیا تھا۔ وہ اس کے حکم کا غلام تھا۔ بلا چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا تھا اور وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پھرنے لگا تھا۔ وہ گوہر کی تدفین سے پہلے جنت بیگم کو اس کی فیملی سمیت مردہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن غلام حسین نے فون پر اپنا مشن کامیاب ہونے کی نوید سنانے کے بجائے اسے جنت محل کے مکینوں کے بھاگ جانے کی اطلاع دی تھی۔ اس کا بی پی پہلے سے ہائی تھا، یہ خبر سن کے برداشت نہیں کر سکا تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ وہ نہ بول سکتا تھا نہ حرکت کر سکتا تھا۔ دن رات تکلیف دہ سوچوں کے ناگ اسے ڈستے رہتے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، عمل سے خود کو برباد کرنے والے دشمنوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن قدرت نے بھی اس سے کیا خوب انتقام لیا تھا۔ وہ عمل نہیں کر سکتا تھا، محض سوچ سکتا تھا۔

دن بھر اس کی آنکھیں غلام حسین کی راہ تکتی رہتیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ جنت محل کے مکینوں کو ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ انہیں اس کے حکم کے مطابق عبرت کا نشان بنا دے گا لیکن جانے وہ کہاں مر گیا تھا۔ وہ تو اسے دیکھنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی نگاہیں سب سے التجا کرتی رہتیں کہ ''غلام حسین کو بلاؤ'' مگر نگاہوں کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ ساری زندگی لوگوں کو اپنی انگلی کے اشارے پر نچانے والا اس قدر بے بس ہو چکا تھا۔

ڈیڑھ ہفتے بعد جب وہ زبان کو کسی قدر ہلانے کے قابل ہوا تو اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سب سے پہلے غلام حسین کے بارے میں ہی پوچھا تھا۔

''اباجی، اس کی گاڑی تو اسی دن حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ جس دن آپ کو فالج ہوا تھا۔ اس حادثے میں غلام حسین اور اس کے ساتھ جانے والے ہمارے سارے ملازم جاں بحق ہو گئے تھے۔'' احتشام کے جواب نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔

غلام حسین اس کا غلام تھا، اس کا سب سے قابلِ اعتبار اور ذہین غلام۔ وہی تھا جو اس کے راز سے کسی قدر آگاہ تھا۔ وہ اور کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی موت کی خبر سن کے ایسا لگا تھا جیسے وہ اپنے بازوؤں سے محروم ہو گیا ہو۔ اس کی بے بسی میں اضافہ ہو گیا۔

احتشام جنت بیگم اور اس کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ وہ اسے بتا سکتا تھا۔ اس نے پولیس کے ساتھ مل کے قاتل تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی مگر

پولیس بھی دانیہ اور گوہر کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

محی الدین اپنے تئیں قاتل کے بارے میں جانتا تھا، وہ اسے اپنے ہاتھ سے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا تھا مگر قدرت نے نہ صرف اس کے جسم سے جان نکال دی تھی بلکہ اسے غلام حسین سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اس کے پاس غلاموں کی کبھی کمی نہیں رہی تھی لیکن غلام حسین جیسا غلام اسے پھر نہیں مل سکتا تھا۔ جس کے ذمے کوئی بھی کام کر کے وہ بے فکری کی نیند سو جاتا تھا۔

وہ بستر پر پڑا سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ ملازم نے اسے کسی مہمان کی آمد کی خبر دی۔ مہمان کا نام سن کے اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔ ''کون آیا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جنت بیگم، اس خاتون نے اپنا نام جنت بیگم بتایا ہے۔'' ملازم ہاتھ جوڑے کہہ رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

جنت بیگم گاڑی میں بیٹھی پُرشکوہ حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ اس حویلی کی دیواریں اسے کانوں میں سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جیسے بہ زبانِ خاموشی اسے ڈرا رہی تھیں، اندر جانے سے منع کر رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

اس کے ڈرائیور نے گیٹ پر موجود چوکیدار کے ذریعے اس کی آمد کی اطلاع اندر بھجوا دی تھی۔ وہ اندرونی کشمکش سے لڑتی بلاوے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ محی الدین کے خوف سے پچھلے ایک ماہ سے ایک ہی جگہ محبوس تھے۔ اس طرح وہ ساری زندگی خوف کے سائے میں رہ کے بسر نہیں کر سکتے تھے۔ جنت بیگم کے ذہن میں اس مسئلے کا بس ایک ہی حل آیا تھا۔ محی الدین سے مل کے اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنا۔ وہ اسی مقصد کے لیے اس وقت یہاں موجود تھی۔

کیا پتا جیسے اس نے مجھے پچاس سال قبل دھتکار دیا تھا۔ اب بھی ملنے سے انکار کر دے۔ اس نے سوچا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ماضی کے اوراق کھلتے چلے گئے۔ یہ اوراق ایک کہانی کے امین تھے۔ اس کہانی کا آغاز پچاس برس قبل تب ہوا تھا جب محی الدین نیا نیا جوان ہوا تھا۔ اس کی عیاش فطرت نے ایسی ایسی کہانیوں کو جنم دیا تھا کہ آج پچاس برس گزر جانے کے باوجود تاریخ کے اوراق ان کہانیوں پر شرمندہ نظر آتے تھے۔

کیسا ستم ظریف تھا چور...... لکھا ہے کہ تمہاری جیولری بہت بھونڈی ہے۔

جنت بیگم کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ ساز و آواز اور جسموں کے بیوپار سے ان کا رشتہ قدیم تھا۔ اس کی بھی تربیت اسی نہج پر ہوئی تھی۔ بچپن سے ایک استاد اسے گائیکی کا فن سکھانے آیا کرتا تھا۔ چودھویں سن میں قدم رکھتے ہی اس نے محفلوں میں گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز میں شوخی اور کھلنڈرا پن تھا۔ اس کا استاد اس سے شکوہ کناں رہتا۔ وہ اس کی آواز میں ٹھہراؤ چاہتا تھا مگر اس نے تو کبھی ریاض بھی سنجیدگی سے نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں بہار بیگم بھی اس کی غیر سنجیدہ فطرت سے نالاں تھی۔

''اری جوان ہو گئی ہے تو...... اب تو کچھ سیکھ لے۔ تیری عمر میں تو ہم نے مردوں کو سنبھالنے کا فن سیکھ لیا تھا تجھ سے اپنی آواز نہیں سنبھالی جا رہی۔'' وہ ایسے ہی اسے ہر وقت کوستی رہتی تھی اور وہ ایک کان سے سنتی دوسرے سے نکال دیتی۔

اس کی گائیکی تو متاثر کن نہیں تھی مگر وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ ابھی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم دھرا ہی تھا کہ اس کے حسن کے چرچے دور دور تک پھیل گئے۔ لوگ اسے سننے کے بہانے دیکھنے آتے۔ اس کے شائقین میں عموماً پکی عمر کے لوگ ہوتے، شاید اسی لیے وہ اپنی محفل میں ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان کو پہلی بار دیکھ کے چونک گئی۔ اس لڑکے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچنے لگی تھی۔ وہ گاتے ہوئے چور نظروں سے اسے دیکھتی گئی۔ اس کی نگاہیں بھی بے باکی سے اس کے سراپا کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ ان نظروں سے پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔ گاتے ہوئے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ محفل کا اختتام ہوا۔ سب لوگ اٹھ کے چلے گئے مگر وہ لڑکا بیٹھا رہ گیا۔

"واہ، بہار بیگم...... کیا ہیرا چھپا کے رکھا ہے۔" لوگوں کے جاتے ہی وہ اس کی ماں سے اوباشانہ انداز میں بولا تھا۔ اس کا چہرہ اپنی تعریف پر گلنار ہو گیا۔ وہ اس کے بدلتے رنگ دیکھ کے محظوظ ہو رہا تھا۔

"اس کی نتھ اتروائی یا کوری ہے ابھی؟" لڑکے کی عمر تو کم تھی لیکن اس کا انداز دیکھ کے لگتا تھا کہ اسی دشت کی سیاحی میں عمر کاٹی ہو۔

"ابھی کہاں۔ ابھی تو پھل کچا ہے۔" اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچا پھل کھانے کا تو مزہ ہی اور ہے۔" اس نے آنکھ میچ کے کہا تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑدھڑا رہا تھا۔ وہ بھاگ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جلد یا بدیر اس کے جسم کی بولی لگنی ہی تھی۔ یہ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ صرف محبت کی قیمت پر اپنا آپ اس لڑکے کے حوالے کر دیتی۔ جسے دیکھ کے اس کا دل پہلی بار دھڑکا تھا۔ لیکن یہ اختیار اس کی ماں کے پاس تھا، وہ جب چاہتی جس کے حوالے اسے کر دیتی۔

وہ پوری رات ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی۔ اگلے دن وہ اٹھی تو اس کی ماں مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"آج تیری نتھ اتروائی کی رسم ہے۔ تیاری کر لے۔" اس کی ماں نے اسے اطلاع دی۔

"کس سے؟" بے اختیار اس کی زبان سے پھسلا۔

"وہی جو رات کچا پھل کھانے کی خواہش کر رہا تھا۔" بہار بیگم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ حیا سے اس کی پلکیں جھک گئی تھیں۔ یہ حیا بھی محبت کی عطا کردہ تھی، ورنہ ان کے ہاں شرم و حیا محض ایک ادا کے طور پر تو دکھائی جاتی تھی، چہرے سے نہیں پھوٹتی تھی۔

نتھ اتروائی کی رسم کے لیے اسے دلہن کی طرح تیار کیا گیا تھا۔ وہ بھی خوب دل لگا کے تیار ہوئی تھی۔ اب وہ سجی سنوری بیٹھی اپنے "سہاگ" کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آیا اور اس کے جسم پر کسی فاتح کی طرح اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتا چلا گیا۔ وہ مفتوح تھی مگر خوش تھی کہ اس کے جسم کو پہلی بار اس شخص نے چھوا جسے اس کے دل نے چاہا تھا۔ جنت کی وارفتگی و محبت اس کے دل میں بھی گھر کر گئی تھی۔ وہ بھی اس کا دیوانہ ہو گیا۔ وہ ہر روز ہی اس کے پاس آنے لگا۔ وہ بھی دن بھر بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔

پہلے پہل تو وہ روز آتا تھا مگر ڈیڑھ دو ہفتوں کے بعد اس کی آمد میں وقفہ پڑنے لگا۔ جس رات وہ نہ آتا وہ بن پانی کی مچھلی طرح تڑپتی رہتی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے بغیر جی نہیں پائے گی۔ اس کی محبت نے بُری طرح سے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

انہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ وہ گھبرا گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے وجود میں محی الدین کی محبت کی نشانی پلنے لگی ہے۔ اس نے سارے جہاں سے یہ خبر چھپالی۔ اس بار محی الدین آیا تو وہ اس سے شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"آپ جانتے تو ہیں کہ ہم آپ کے بنا ایک ایک لمحہ گن کے گزارتے ہیں پھر کیوں ہمیں اتنا ستاتے ہیں۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "جب آتا ہوں تو ساری کسر بھی تو نکال دیتا ہوں۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

"ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیں، ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

وہ ہنسا۔ "طوائف تو ہر ایک سے یہی کہتی ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ تڑپ کے رہ گئی۔ "آپ ہماری محبت کی توہین کر رہے ہیں۔"

"توہین تو تم میری کر رہی ہو۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ طوائف کو ہم بستر کی زینت تو بناتے ہیں، گھر کی نہیں۔" اس نے حقارت سے کہا۔ جنت نے اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہماری کوکھ میں آپ محبت کی نشانی پل رہی ہے۔ اسی کے صدقے ہمیں بھی اپنا لیں۔" وہ اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی تھی۔

"کیا؟" وہ ایک لمحے کے لیے چونکا۔ "اسے مار دو۔" اگلے ہی پل اس نے بے پروائی سے کہا۔ وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔ "یہ آپ کی اولاد ہے۔ ہماری اور آپ کی محبت کی نشانی۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "میری ایسی نشانیاں اس محلے کے ہر گھر میں بکھری ہوئی ہوں گی۔ میں کس کس کو اپناؤں؟" اس نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا تھا۔ وہ اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

"یہ آپ کا اپنا خون ہے۔"

"لیکن طوائف کی کوکھ میں ہے۔ میں اسے اپنا کے اپنے خاندان کو گندہ نہیں کر سکتا۔"

"کوکھ یا خون کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز تربیت اور ماحول ہوتا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں، میں اس

کی تربیت ایسے کروں گی کہ آپ اس پر فخر کیا کریں گے۔''

''ایک طوائف کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ چاہے جس ماحول میں رہے وہ رہتا طوائف کی اولاد ہے۔ اس کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا تھا۔

اُف! اتنی نفرت...... وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

''تم ابھی کم عمر ہو۔ تمہاری جوانی تمہارے لیے سونے کی کان ہے۔ بچہ تمہاری اس جوانی کو برباد کر دے گا۔ اِسے ماردو۔'' وہ بے پروائی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا۔

اس کا خیال تھا وہ اسے اپنی اولاد کے لیے ہی سہی اپنا لے گا مگر اسے تو نہ اپنے خون کی پروا تھی نہ اس کی محبت کی۔ وہ اسے چھوڑ گیا تھا ہمیشہ کے لیے۔ یہ اس کی آخری ملاقات تھی محی الدین سے۔

اس کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک اس کی راہ تکتی رہی تھی۔ ہر روز وہ نئے سرے سے امید سجاتی اور اس کے انتظار میں پلکیں بچھا کے بیٹھ جاتی لیکن نتیجے میں اسے مایوسی ہی ملتی۔ جلد ہی اسے یقین آ گیا کہ وہ ہنس نہیں تھا جو سوکھے تالاب پر اپنی جان دے دیتا ہے۔ وہ تو بھونرا تھا، جو ہر کلی، ہر پھول کا رس چوستا تھا اور اُڑ جاتا تھا۔ اس نے یہ حقیقت قبول تو کر لی مگر اندر سے بجھ کے رہ گئی۔ اس ہرجائی کی محبت نے اس کے دل کو ایسا روگ لگایا تھا کہ روز بروز اس کا جسم گھلنے لگا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا لگنے لگی۔ اس کی آواز میں شوخی کی جگہ گہرے کرب نے لے لی۔ اب وہ گاتی تو سننے والوں کو رُلا دیتی تھی۔ اب لوگ اسے دیکھنے نہیں سننے آتے تھے۔

اس کی ماں اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی مصروفیات میں مگن رہتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کی بیٹی کو گانا آ گیا ہے۔ اس کی محفل آباد ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کے اندر کی ساری محفلیں تو کب کی ویران ہو چکی ہیں۔

انہی دنوں ایک فلم پروڈیوسر نے اسے فلم میں گانے کی پیشکش کی۔ بہار بیگم اس پیشکش پر خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس محلے کی لڑکیوں کو تو چار دیواری کے اندر ہی سنا جاتا تھا۔ جنت کی آواز چاروں طرف راج کرنے والی تھی۔ اس نے ماں کے کہنے پر اسٹوڈیو میں جا کے دو گانے ریکارڈ کرا دیے۔ پروڈیوسر نے اس کی آواز سن کے اسے کوئل کا لقب دیا تھا۔ بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئی۔

جنت نے چار ماہ تک اپنی ماں کو اپنی کوکھ میں پلتے وجود سے بے خبر رکھا تھا۔ لیکن آخر کب تک، اس کا جسم خود چیخ چیخ کے اس خبر کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا جسے اس نے اپنے سینے میں ایک راز کی طرح دفن کر رکھا تھا۔

اس کی ماں کو خبر ہوئی تو وہ خوب چیخی چلّائی۔ اسے مارا پیٹا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہی تھا۔ اس نے یہ سوچ کے خود پر صبر کر لیا کہ آنے والا مہمان لڑکی ہو گی مگر اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ جنت نے نو ماہ بعد بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام عادل رکھا تھا۔ اس کے نقوش میں محی الدین کی شباہت تھی۔ 'کہیں اس کی فطرت بھی تو.....' اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکی تھی۔ 'نہیں، نہیں' میں اس کے وجود کو محبت کی مٹی سے گوندھوں گی۔ میں ثابت کروں گی کہ تربیت سے فطرت بدل سکتی ہے۔ اس کے باپ نے مجھے طوائف کا طعنہ دے کے دھتکارا۔ اسے اپنا خاندانی ہونے کا زعم تھا۔ میں اسے ایسا بناؤں گی کہ لوگ اس کے خاندانی ہونے کی مثالیں دیا کریں گے۔' اس نے ایک عزم سے سوچا تھا۔

فلم میں اس کے گانے سپرہٹ ہوئے تھے۔ اس کی آواز میں چھپے کرب نے لوگوں کے دلوں کو چھو لیا تھا۔ ہر زبان پر ان دنوں اس کے گانے ہی رہتے تھے۔ اسے فلموں میں تواتر سے کام ملنے لگا۔ اس کی ماں اس کی ترقی سے خوش تھی، اب تو محفلوں میں بھی اس کا ریٹ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کا مہارانیوں کی طرح خیال رکھنے لگی مگر اس کا جی اس ماحول سے اوب گیا تھا۔ وہ اس محلے کو چھوڑ کے کہیں دور جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ سکون سے اپنے بچے کی پرورش کر سکتی لیکن اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی ماں تھی۔ وہ بھلا کیسے سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے گنوا سکتی تھی۔ اس کی جڑیں تو اس محلے میں پیوست تھیں۔ وہ اسے بھی یہیں باندھ کے رکھنا چاہتی تھی۔

وہ ماں کے ہاتھوں مجبور زندگی کے دن جیسے تیسے کاٹ رہی تھی کہ یکدم اس کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ زندگی گزارنے کا ایک بڑا مقصد اسے نظر آ گیا تھا۔

وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''بیگم صاحبہ، آپ کو اندر بلایا گیا ہے۔''

''تم یہیں رکو۔'' وہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی تھی۔

گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا وجود ایک لمحے کے لیے کانپا تھا مگر جی کڑا کر کے اندر کی طرف بڑھی۔ ملازم کی معیت میں راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل سینے کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ دھڑ دھڑاتے

دل کو سنبھالتے بمشکل قدم گھسیٹ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت اس کی ہمت جواب دے سکتی ہے، اس کی ٹانگیں اس کے وجود کا بوجھ سنبھالنے سے انکار کرسکتی ہیں مگر خیریت گزری وہ محی الدین کے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ ملازم اسے چھوڑ کے باہر چلا گیا۔ وہ جھکی نظروں کے ساتھ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی پلکوں پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ اس نے بمشکل اپنی لرزتی پلکیں اٹھائیں۔ اس کی نگاہ بستر پر دراز محی الدین کے چہرے پر پڑی۔ اس کی نظروں میں اس کے لیے بے پناہ نفرت وحقارت تھی۔ اس کے بدن نے جھرجھری لی۔ محی الدین بغور اس کی کیفیات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں؟" اس کے لہجے سے عیاں ہوتی نفرت نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔

عادل صحیح کہتا تھا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا مگر اب وہ غلطی سے سہی، یہاں تک آچکی تھی۔ اب جیسے تیسے اسے اپنی بات تو کرنا ہی تھی۔ اس نے اپنے خشک گلے کو تر کیا اور ہمت کر کے بولی۔

"آپ کی آنکھوں پر بندھی بدگمانی کی پٹی ہٹانے آئی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔

"آپ نے مجھے پہلے بھی غلط سمجھا تھا۔ اب بھی غلط سمجھ رہے ہیں۔" اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"کھل کے بات کرو۔ میں پہیلیاں بوجھنے کا عادی نہیں۔" وہ اٹک اٹک کے بول رہا تھا مگر لہجہ رعب دار تھا۔

"آپ کی پوتی اور بیٹے کے قتل کی ذمے دار میں یا میری فیملی کا کوئی فرد نہیں۔" محی الدین سپاٹ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اس بات پر یقین نہ کیا ہو۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو اس پر حیران ہوں کہ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ ہمارا تو آپ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر کوئی تعلق تھا بھی تو آپ نے خود ہی توڑ دیا تھا۔ پچاس برس قبل......" اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔

"کیا واقعی میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں؟" اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ جنت بیگم گڑبڑا گئی۔ وہ جی کڑا کر کے بولی۔

"بالکل بھی نہیں۔ آپ ٹھہرے خاندانی آدمی...... آپ ہم جیسوں سے وقتی تعلق تو جوڑ سکتے ہیں مگر......" اس کا لہجہ تلخ تھا لیکن آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"جنت بیگم مجھے بہلاؤ مت۔ تم نے میرے خون کو میرے ہی مقابلے میں لاتے کے لیے جو طویل پلاننگ کی، میں وہ سب جانتا ہوں۔"

جنت کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کے لیے متغیر ہوئی۔ "آپ کچھ نہیں جانتے۔ میں نے یہ سب نفرت میں نہیں محبت میں کیا تھا۔" اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ محی الدین چونکا۔ اس نے تو ساری زندگی نفرتیں ہی بانٹی تھیں۔ محبت کے اس انوکھے رنگ کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے طیش کے عالم میں کہا۔ "مجھے کہانیاں مت سناؤ۔ تم نے میری پوتی کے پیچھے اپنے پوتے کو کیوں لگایا تھا؟" اس کے لبوں سے رال بہنے لگی۔ جنت بیگم کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔ اس کا وجود محبت کی مٹی سے گندھا تھا۔ وہ ایسے ہی دشمن کی بھی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی، یہ تو پھر بھی وہ شخص تھا جس سے اس نے کبھی محبت کی تھی۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھایا جو اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جنت نے اسے افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔

"تو آپ نے اس لیے عباد کو مروا دیا؟"

"عباد کو بھی اور ظفر کو بھی، میں تمہارے خاندان کے ہر فرد کو چن چن کر ختم کروں گا۔" جنت کی آنکھوں میں طیش جاگا۔

"اور تم ایسا کیوں کرو گے؟" وہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے بلند آواز میں بولی تھی۔ محی الدین ایک لمحے کے لیے حیران نظر آیا۔ اگلے ہی پل اس کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں۔

"تم نے بدلہ لینے کے لیے میری اولاد کو قتل کرایا۔ میں تمہیں کیسے معاف کرسکتا ہوں؟"

"میں نے بدلہ نہیں لیا۔" وہ چلائی۔ "یہ سرشت تمہاری ہے۔ میں نے تم سے بدلہ لینا ہوتا کئی برس پہلے لے چکی ہوتی۔ میرے پاس تمہیں برباد کرنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ تم ساری زندگی دوسروں سے منہ چھپاتے پھرتے۔"

محی الدین اسے یک ٹک دیکھتا رہ گیا، وہ اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ میں نے یا میری فیملی نے کبھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ میں تمہیں اپنی اولاد کا قتل معاف کرتی ہوں مگر آج کے بعد

تمہاری طرف سے میری فیملی پر کوئی آنچ آئی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تمہارا خاندان صدیوں تک کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ میں کر سکتی ہوں۔'' وہ انگلی اٹھائے کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ محی الدین کی تن فن رخصت ہو چکی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ابھی روک لوں تو؟''

''تو روک لو۔'' اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پیچھے میری فیملی کھڑی ہے۔ وہ سب تمہارے بارے میں جانتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے جھٹکے سے مڑی۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس کی نظر احتشام پر پڑی۔ وہ اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جنت اسے نظر انداز کرتے ہوئے باہر نکلتی چلی گئی۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ اندر جاتے ہوئے وہ خوفزدہ تھی مگر اب وہ مطمئن تھی۔ اس نے محی الدین کے وجود کی دیواریں ہلا دی تھیں۔

احتشام اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر اپنے باپ کے زرد ہوتے چہرے پر پڑی۔ وہ گہری سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔

''ابا جی، یہ کون تھی؟''

محی الدین نے اسے چونک کے دیکھا۔ ''اسے جانے نہ دینا۔'' اس نے اٹک اٹک کے کہا تھا۔

''لیکن یہ ہے کون؟''

اس نے طیش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ احتشام ان نظروں کا مفہوم سمجھتا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ جنت ایک راہداری سے مڑ رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔

☆☆☆

جنت مستحکم قدموں چلتے ہوئے باہر کے راستے پر گامزن تھی کہ اس نے اپنے عقب سے آتی چلاتی ہوئی آواز سنی۔

''رکیں۔'' وہ ٹھٹک کے رک گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ یہ احتشام تھا جو اس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کے رکا۔ ''آپ کو ابا جی بلا رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' اس کے چہرے پر اچنبھے کا تاثر ابھرا۔

''وہ...... وہ شاید آپ سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔'' اس کے ذہن میں یہی بہانہ آیا تھا۔ جنت نے اسے بے یقینی سے دیکھا تاہم بغیر کچھ کہے اندر کی طرف ہو لی۔ اس کے اندر کا خوف ختم ہو چکا تھا۔

وہ کمرے میں پہنچی تو محی الدین اسے چبھتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تو شرمندگی کا کوئی تاثر ہی نہیں تھا۔ وہاں تو نفرت تھی، طیش تھا۔ یہ اس کے فطری اوصاف تھے۔ جو شاید کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ اس کے عقب میں کھڑے احتشام سے بولا۔

''اسے مار دو۔''

جنت نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''یہ جملہ تو تم پچاس برس قبل دہرایا کرتے تھے۔''

''تم نے اس وقت میرا حکم نہیں مانا تھا۔ اب سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے سرد انداز میں کہا۔

جنت نے ایک لمحے کے لیے اسے رک کے دیکھا۔ اب اسے کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''صرف میں نے نہیں بہت سی لڑکیوں نے تمہارا حکم نہیں مانا تھا۔ تمہیں اپنے جس خاندانی خون پر ناز ہے، اس سے جانے کتنے طوائف زادے پیدا ہوئے تھے۔ میں نہ ہوتی تو آج وہ اسی بازار کے کوچوں میں دلالی کر رہے ہوتے۔ یہ میں ہی تھی جس نے تمہارے 'خاندانی'' خون کی حفاظت کی۔ انہیں اپنے خون سے سینچ کے بڑا کیا۔ ان کی ایسی تربیت کی وہ تمہارا خون ہونے پر شرمندہ ہیں اور اس عورت کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہیں جسے تم طوائف کہہ کے ٹھکرا آئے تھے۔''

محی الدین کے چہرے پر ایک رنگ آ اور ایک جا رہا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اس کے بیٹے کے سامنے اسے برہنہ کر دے گی۔ احتشام بھی دم بخود اسے سن رہا تھا۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' اس نے لرزتی آواز میں سوال کیا تھا۔ محی الدین اس سے نظریں چرا کے رہ گیا۔

''یہ کیا بتائے گا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس کے ذہن میں ماضی کے ورق پلٹ رہے تھے۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب اس نے اپنی ماں کی دہلیز چپکے سے چھوڑ دی تھی۔ اس کا مددگار فلم پروڈیوسر عرفان تھا۔ وہ اس کی آواز کا دیوانہ تھا اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کوئل گھونسلا نہیں بناتی لیکن اس نے اپنی کوئل کی خواہش پر اس کے لیے ایک گھر خریدا تھا۔

جنت اس گھر میں منتقل ہو گئی تھی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ عادل کے علاوہ ایک سے چار سال کی عمروں کے پانچ لڑکے تھے۔ یہ سارے بچے محی الدین کا خون تھے۔ ان کی مائیں محی الدین کے حکم سے انہیں مار تو نہیں سکی تھیں

لیکن وہ انہیں پالنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ جنت کو جب ان بچوں کی خبر ہوئی تو اس نے انہیں اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ محی الدین پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اصل چیز تربیت ہوتی ہے، خون کی تاثیر یا طوائف کی کوکھ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس نے اپنی زندگی اپنے محبوب کے بچوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اب یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

اس نے بچوں کو ان کے ماضی سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ ان کے بچپن سے ہی وہ انہیں ان کے ماضی کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔ اس چیز نے اس کے بچوں میں اس کے لیے مزید احترام پیدا کر دیا تھا۔

اس دوران وہ فلمی دنیا کی ٹاپ کی سنگر بن چکی تھی۔ لوگ اس کی آواز کے دیوانے تھے مگر وہ کبھی پردۂ اسکرین پر جلوہ گر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنا آپ دنیا کی نگاہ سے چھپا لیا تھا۔ عرفان بلا کسی غرض کے اس کی ہر لحاظ سے مدد کر رہا تھا۔ وہ اس کے پیسوں سے اپنی فلموں میں سرمایہ کاری بھی کر رہا تھا۔ حاصل شدہ منافع وہ جنت کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتا۔ جنت کی دولت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دولت کی بھوکی نہیں تھی تاہم اس کا ایک خواب تھا۔ وہ ان بچوں کے لیے خوابوں کا ایک محل تیار کرنا چاہتی تھی۔ جنت محل...... جو اس کے لیے، اس کے بچوں کے لیے واقعی جنت ہوتا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر پانے میں دو دہائیاں لگی تھیں۔ اس دوران اس کے بچے جوان ہو چکے تھے۔ وہ عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ انہوں نے جس شعبے میں جانے کا فیصلہ کیا تھا، جنت نے انہیں سپورٹ کیا تھا۔ عادل اور ظفر کی شادی بھی ہو چکی تھی۔

وہ اکتیس دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی دوپہر میں جنت محل میں منتقل ہوئے تھے۔ یہ اس علاقے کا پہلا گھر تھا۔ اس محل کی مناسبت سے وہ علاقہ ہی جنت نگر کہلانے لگ گیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ اسے بغیر کسی دشواری کے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ اس کے بچے بھی اس کی خوشی میں خوش تھے۔ انہوں نے شب کے بارہ بجے کیک کاٹا تھا۔ اسی شب انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ تادمِ حیات نئے سال کا آغاز ایسے ہی کریں گے۔ وہ جہاں بھی ہوں گے نئے سال کی شب اکٹھے ہوں گے۔

وہ مطمئن تھی کہ اس نے اپنے بچوں کے وجود کو محبت کی مٹی سے گوندھ کے بڑا کیا تھا۔ ان کے خون کی تاثیر کبھی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اطوار سے اس کی تربیت کی خوشبو آتی تھی۔

وہ اپنی رُوداد سناتے ہوئے یکدم رک گئی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا کرب جھلکنے لگا۔ اس کے ذہن کے پردے پر اس رات کے مناظر گھومنے لگے جب اس کی خوش فہمیوں کا محل ایک جھٹکے سے زمین بوس ہو گیا۔ وہ انہیں یہ سب نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے بات بدل دی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں محی الدین سے کہہ رہی تھی۔

''میں نے تم سے محبت کی تھی۔ تمہاری اولاد کو بھی در بدر بھٹکتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے انہیں اپنا لیا تھا۔ میں نے اپنے خون سے ان کی آبیاری کی اور تم اپنے ہی لہو سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔''

احتشام دم بخود اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اپنے باپ کے مکروہ کارناموں سے وہ آج آگاہ ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کا ماضی تو وہ سیاہ باب تھا جو منظرِ عام پر آ جاتا تو اس کا خاندان صدیوں تک کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اس نے اپنے باپ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ سپاٹ انداز میں اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کے وہ بولا۔

''یہ عورت ہمارے لیے تباہی ہے۔ اِسے مار کے ایسی جگہ گاڑ دو کہ قیامت تک کسی کو اس کا سراغ نہ ملے۔''

احتشام کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ پُرسوچ انداز میں جنت کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

عالیہ تنہا گھر میں پریشان پھر رہی تھی۔ آج پھر عالیان صبح سے کہیں نکلا ہوا تھا۔ اس کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ وہ اسے آخر کار منا ہی لایا تھا۔ اسے روتا بلکتا دیکھ کے اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے ایک شرط پر اسے معاف کیا تھا۔ وہ اس شرط کی تکمیل میں روز ہی گھر سے نکلتا تھا لیکن مایوس لوٹتا تھا۔

اب اسے عالیان سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کے لیے اس کی شخصیت اسرار بھری نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے سارے خفیہ گوشے کھنگال چکی تھی۔

عالیان نے اسے گھر لانے کے بعد اپنی ڈائری خود اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ ''میں نے یہ مکمل کر دی ہے۔ تم اسے پڑھو، بار بار پڑھو۔ مجھ سے جتنی نفرت کر سکتی ہو، کرو۔ چند دن بعد تمہیں میری خطائیں معمولی لگنے لگیں گی۔''

اس نے عالیان کے مشورے پر عمل کیا تھا اور واقعی چند دن بعد ہی ڈائری پر لکھے واقعات اس کے لیے اپنا اثر کھو بیٹھے تھے۔ اب تو چیدہ چیدہ واقعات اسے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں انہیں دہراتی رہتی تھی۔ اس وقت

بھی وہ ایسے ہی وقت گزارنے لگی۔ اس کے ذہن میں عالیان کی زندگی کے اوراق الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔

''محبت بھرے رشتوں کو کب نفرت کی دیمک کھا جائے پتا ہی نہیں چلتا۔ میرا بھی جنت محل کے مکینوں سے محبت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے سے ہمیں جنت بیگم نے جوڑا تھا۔ وہ ہماری کچھ نہیں تھیں اور ہمارا بھی کچھ تھیں۔ ہمیں ہمارے خون کے رشتوں نے دھتکار دیا تھا مگر جنت بیگم نے ہمیں اپنا لیا تھا۔ ہم سب اپنے باپ کی ہوس کی نشانی تھے۔ اس کی عیاشیوں کے ثبوت، اس کی ناجائز اولاد...... یہ بات ہمیں جنت بیگم نے ہمارے بچپن میں ہی بتا دی تھی مگر انہوں نے کبھی یہ بات ہمارے لیے آزار نہیں بننے دی تھی۔ انہوں نے ہمیں ایک ایسے گھرانے سے جوڑ دیا تھا کہ ایک دوسرے کی محبت کے سنگ ہمیں زمانے کا ہر دکھ ہیچ نظر آنے لگا تھا۔ ان کے بچوں میں، میں واحد تھا جس نے بچپن میں بھی انہیں خوب تنگ کیا تھا۔ وہ میری محبت میں میرے پیچھے ماری ماری پھرتی تھیں لیکن انہیں تنگ کر کے نجانے مجھے کون سی تسکین ملتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے ان سے محبت نہیں تھی، میں بھی اپنے باقی بھائیوں کی طرح ان پر جان چھڑکتا تھا۔ انہیں کبھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شاید یہ میرے خون کی تاثیر تھی، یہ میرے اندر کا شیطان تھا جو مجھے بہکاتا رہتا اور میں ان کی نافرمانی کر جاتا۔ میرے بھائی بھی میرے شر سے محفوظ نہیں تھے لیکن میری شر انگریزیوں کے باوجود انہوں نے مجھ پر محبت چھڑکنا کم نہیں کی تھی۔

وقت گزرتا رہا، میں کیمسٹری میں ماسٹرز کر کے ایک کالج میں لیکچرر لگ گیا۔ اس دوران اپنی شخصیت کے تضاد نے مجھے ہمیشہ کشمکش سے دوچار رکھا تھا۔ ایک طرف میری ماں جنت بیگم کی تربیت تھی جو مجھے اچھے کاموں پر اکساتی اور دوسری طرف میرے اندر کا شیطان مجھے بہکاتا رہتا۔ میں اچھائی اور برائی کے پلڑوں میں ڈولتا ہوا جوان ہوا۔ ابھی تک خیریت گزری تھی، میں چھوٹی موٹی برائیوں کا شکار تو ہوتا رہا تھا تاہم مجھ سے کوئی بڑا گناہ سرزد نہیں ہوا تھا لیکن کب تک؟ میرے اندر کا شیطان تو کسی موقع کی تلاش میں تھا اور پھر آخر کار اسے موقع مل ہی گیا۔

یہ اکتیس دسمبر کی رات تھی۔ سال کی آخری شب۔ اس شب ہم سب جنت محل میں اکٹھے ہوتے تھے۔ نئے سال کا استقبال کرنے، آئندہ ساتھ رہنے کے وعدے کرنے۔ یہ جنت محل کی تیسری سالگرہ تھی۔ میں صبح سے بے انتہا ایکسائیٹڈ تھا۔ ہوسٹل میں میرا روم میٹ کسی نیو ایئر پارٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے بھی ضد کر رہا تھا لیکن میں وعدے کی ڈور سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بھلا کیسے جا سکتا تھا۔

میں اس کے ساتھ تو نہیں گیا تھا لیکن اس سے وہسکی کی ایک بوتل پکڑ لایا تھا۔ شراب میرے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ میں خاص مواقع پر اس سے دل بہلاتا رہتا تھا لیکن اس سے قبل میں اسے لے کے کبھی اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ دسمبر کی آخری شب کی ٹھنڈک میں اپنے وجود کو گرم رکھنے کے لیے مجھے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہی سوچ کے میں نے ایک بوتل اپنے پاس رکھ لی تھی لیکن اُس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں اپنی بربادی کا سامان اپنے ساتھ لے کے جا رہا ہوں۔

کیک کاٹنے کے بعد سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ چاندنی رات کے فسوں میں کھو کے مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب نشہ میرے دماغ کو چڑھنا شروع ہو گیا۔ میں اندر پہنچا تو سب محفل سجائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میرے بھائی ظفر کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ سب سے اجازت لے کے اندر جانے لگی۔ میرے اندر کے شیطان نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا لہراتا وجود مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔

وہ کمرے کی بتی بجھا کے سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ اسے خود پر ٹوٹنے والی افتاد کا اندازہ تک نہ ہو سکا۔ وہ جب تک سنبھلتی مجھ سے شیطان وہ کام کرا چکا تھا جس کا عام حالات میں، میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل رہا تھا کہ جنت بیگم کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مجھے ظفر کے کمرے سے نکلتے دیکھ کے حیران نظر آ رہی تھیں۔

میں ان کی کیفیات سے بے خبر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبح مجھے ہوش آیا تو رات کے واقعات میرے ذہن میں کسی خواب کے مانند گھوم رہے تھے۔ میں ان واقعات میں کھویا ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور مجھے جنت بیگم کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے پر میں نے ہمیشہ محبت کا رنگ ہی چھایا دیکھا تھا مگر اس وقت یہ چہرہ غم و غصے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

''تم ابھی اور اسی وقت اس گھر سے رخصت ہو جاؤ۔ میں دوبارہ یہاں کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''لیکن کیوں، امی جان؟'' میں نے احتجاج کیا۔

''تم نے اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ جو کچھ کیا، اس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔'' میں حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''میرا خیال تھا کہ خون کی تاثیر اپنا اثر نہیں رکھتی مگر تم نے میرے چہرے سے خوش فہمی کی پٹی ہٹا دی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ سانپ کو چاہے دودھ پلاؤ، وہ اس سے زہر ہی بنائے گا۔ میں نے اس گھرانے کو بڑی مشکل سے جوڑا تھا۔ اب میں اس پر تم جیسے گندے خون کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

ان کی باتوں نے مجھے بھی طیش میں مبتلا کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو پھر ایسا سہی۔ میں بھی کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔'' میں یہ کہہ کے جنت محل سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا تھا۔

چند دن تک میرا غصہ ہی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ مجھے پچھتاوے کے ناگ ڈسنے لگے۔ مجھے اپنے آپ سے کراہت آنے لگی۔ میں جنت بیگم سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن میری انا نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ میں نے شادی کر لی۔ عالیہ نے میری زندگی ہی تبدیل کر کے رکھ دی۔

میں اپنی فیملی خود بناؤں گا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا۔

جنت محل کے مکینوں میں میرا رابطہ صرف عادل سے تھا۔ وہ مجھے کبھی کبھار فون کر لیتا تھا۔ اس کے بقول جنت بیگم نے سب کو مجھ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کی انہوں نے کیا توجیہہ پیش کی تھی، یہ کبھی مجھے عادل نے نہیں بتایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے گناہ سے باخبر تھا لیکن اس نے مجھے کبھی جتلایا نہیں تھا۔

نویں مہینے کے اختتام پر اس نے مجھے ظفر کے گھر ایک بچے کی پیدائش کی خبر دی تھی۔ اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔

ظفر کی شادی کو دو برس بیت چکے تھے لیکن وہ ابھی اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ تو کیا ظفر کے گھر جنم لینے والا بچہ میرا خون ہے؟ میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا لیکن میں اسے اپنا نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ میری طرح میرا بچہ بھی میرے جیسا نصیب لے کے ہی دنیا میں آیا تھا۔

مجھے اپنی انا میں قید پورا سال بیت گیا اور اکتیس دسمبر کی شب آ گئی۔ اس رات تو مجھے جنت محل میں پہنچنا تھا۔ ہمیشہ ان کے ساتھ رہنے کے وعدے کا اعادہ کرنا تھا مگر میں اپنے ہاتھوں سے اسی شاخ کو کاٹ بیٹھا تھا جس پر میرا آشیانہ تھا۔ اس رات میری کیفیت دیکھنے والی تھی۔ میں اپنی اس کیفیت سے عالیہ کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے نیو ایئر پارٹی کا بہانہ کر کے باہر نکل آیا۔ میرا دل جنت محل جانے کے لیے ہمک رہا تھا لیکن انا میرے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ میں نے یہ شب تنہا ہی منائی تھی۔ اس رات میں کرب کے جس گہرے سمندر سے گزرا تھا، اس کی تند لہریں میری انا کو راکھ سمیت بہا کے لے گئی تھیں لیکن اسی رات مجھ پر ایک نیا عقدہ وا ہوا تھا۔ میرا وجود وہ گھن تھا جو جنت محل کی خوشیوں کو چاٹ سکتا تھا۔ جنت بیگم کا وجود تو محبت کی مٹی سے گندھا تھا، وہ تو مجھے معاف کر سکتی تھیں لیکن ظفر کی بیوی...... وہ چاہ کے بھی کبھی مجھے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کی عزت کا لٹیرا تھا، مجھے اپنے آس پاس دیکھ کے اس کی خوشیاں تاراج ہو جاتیں۔ میرے وہاں جانے سے جنت محل کا محبت بھرا ماحول یقینی طور پر متاثر ہوتا۔ میری ذات سے جتنا یہ ماحول متاثر ہو چکا تھا، کافی تھا۔ میں نے دل پر بھاری پتھر رکھ کے جدائی کی راہ قبول کر لی۔ اس پوری رات میں تنہا بیٹھا سود و زیاں کا حساب کرتا رہا تھا۔ اب یہ تنہائی ہی میرا نصیب تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا یہ نصیب قبول کر لیا۔ یہ نفع کا سودا تھا یا نقصان کا یہ تو میں نہیں جانتا تھا لیکن میں اپنے وجود کو جنت محل کے مکینوں کی خوشیوں میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہتا تھا۔ اس فیصلے نے مجھے توڑ کے رکھ دیا تھا لیکن جنت بیگم کے گھرانے کو جوڑے رکھنے کے لیے میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھا۔

قدرت نے اسی پر بس نہیں کی تھی۔ اس کے ترکش میں مجھے میرے گناہوں کی سزا دینے کے بہت سے تیر باقی تھے۔ میں ساری زندگی اولاد کی نعمت سے محروم رہا تھا۔ دوسری طرف میرا بچہ عباد جوان ہو چکا تھا۔ اس نے میری یونیورسٹی میں ہی داخلہ لیا تھا۔ مجھے اس سے حد درجہ محبت تھی مگر یہ محبت ہی تھی جو مجھے اس سے دور رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ انہی دنوں وہ اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ زیادہ دیکھا جانے لگا۔ میں دانیہ سے واقف تھا۔ وہ میرے ناجائز باپ محی الدین کی پوتی تھی۔ میں اس کا سایہ بھی اپنے بیٹے پر نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔ عباد کو اس کے قریب ہوتا دیکھ کے میری زندگی ایک بار پھر آندھیوں کی زد میں آ گئی۔

عباد اس طوفان سے بے خبر تھا۔ میں جنت بیگم کے خوشیوں بھرے گھرانے کی طرف بڑھتے اس طوفان کی چاپ سن رہا تھا مگر بے بس تھا۔ میں نے عباد سے بات کی

لیکن اُس کی آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی تھی۔ اس نے میری ... بات ان سنی کر دی تھی۔ اس سے مایوس ہو کے میں نے عادل سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میرا جب تک اس سے رابطہ ہوتا، دیر ہو چکی تھی۔ عباد ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ توڑ کے منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ اس کی موت نے مجھے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ پولیس نے اس کے قتل کے شبے میں اس کے مالک مکان کو پکڑ لیا تھا۔ اس کے خلاف پولیس کو ٹھوس ثبوت ملے تھے۔ اس کے قاتل کی گرفتاری سے میرے دل پر چھائے اندیشوں کے بادل چھٹ گئے لیکن یہ میری بھول تھی۔ ظفر کی موت کے ساتھ ہی اندیشوں کے ناگ ایک بار پھر پھن پھیلائے مجھے ڈس رہے تھے۔

محی الدین کے برپا کیے طوفان نے جنت محل کی دیواروں کو لرزا دیا تھا۔ میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں تھا۔ اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے خود کو اس میں جھوک دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ جنت محل کا مجھ پر قرض تھا۔ اب یہ قرض اتارنے کا وقت آ گیا تھا۔

محی الدین نے جنت بیگم کے بیٹے اور پوتے کو مارا تھا، میں نے بدلے میں دانیہ اور گوہر کو مار کے حساب برابر کر دیا۔ جنت بیگم تو یہ تکلیف سہہ گئی تھی مگر وہ اس تکلیف پر بلبلا اٹھا تھا۔ اس نے غلام حسین کو جنت محل کی طرف فوراً دوڑا دیا تھا۔ میں اس بار چوکس تھا۔ جنت محل کے مکین تو محل خالی کر گئے تھے لیکن وہاں میں انہیں موت بن کے ملا تھا۔ محی الدین یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔

فون کی بیل عالیہ کو خیالات سے باہر کھینچ لائی۔ اسکرین پر عالیان کا نام چمکتا دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے بیتابی سے کال موصول کی۔ عالیان کی بات سنتے ہوئے اس کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی تھی۔
''کیا؟'' اس کے لبوں سے لرزتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

☆☆☆

عالیان، محی الدین کی حویلی کی جانب رواں دواں تھا۔ اس کے لب بھینچے ہوئے تھے جو اس کے اندرونی طیش کے غماز تھے۔ وہ پچھلے پورے ماہ سے جنت محل کے چکر کاٹ رہا تھا لیکن محل کے مکین محی الدین کے خوف سے جانے کہاں جا چھپے تھے۔ اس نے انہیں تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ انہیں ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ اب اس کے پاس ایک ہی حل بچا تھا۔ وہ ان کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کرنے والے شخص کو ہی قتل کر دیتا، تبھی اس کے خوف کے حصار سے جنت محل کے مکینوں کی رہائی ممکن تھی، تبھی وہ سکون سے اپنی زندگیاں

گزار سکتے تھے۔
محی الدین جب تک اسپتال میں تھا، اس کے لیے صفائی سے کام کرنا مشکل تھا لیکن ایک دن قبل اسے خبر ملی تھی کہ اسے حویلی منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہاں وہ چانس لے سکتا تھا۔ یہی سوچ کے اس نے محی الدین کی حویلی کا رخ کیا تھا۔
وہ حویلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یکدم اسے جھٹکا لگا۔ بے اختیار ہی اس کا پاؤں بریک پیڈل پر گیا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے سامنے کا منظر دیکھنے لگا لیکن اس کے ایسا کرنے سے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
اس کے سامنے حویلی کے گیٹ پر جنت بیگم کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور موجود تھا تاہم جنت بیگم کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ یہ یہاں، دشمنوں کی کچھار میں؟ بے اختیار اس کے ذہن میں خیال آیا تھا۔
جنت بیگم کی عالیت اسے خطرے میں لگ رہی تھی۔
اچانک گیٹ کھلا۔ اس نے آس بھری نظروں سے سامنے دیکھا۔ اسے جنت کی آمد کی توقع تھی مگر گیٹ پر چوکیدار کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔
''تم گاڑی لے کے اندر آ جاؤ۔ تمہیں بیگم صاحبہ اندر بلا رہی ہیں؟'' چوکیدار کا مخاطب ڈرائیور تھا۔ اس نے گیٹ پورا کھول دیا۔ ڈرائیور چہرے پر اُلجھن کے تاثرات لیے گاڑی اندر لے گیا۔
اسے اندر جاتے دیکھ کے چوکیدار کے چہرے پر جو سکون پھیلا تھا، وہ عالیان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ ڈرائیور کو اندر لے جانے کی توجیہہ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔
کہیں، ایسا تو نہیں انہوں نے جنت بیگم کو روک لیا ہو، اور اب ڈرائیور کو بہانے سے اندر بلا لیا ہو۔ یہ خیال ہی اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ محی الدین کو مارنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کے لایا تھا۔ اسے مارتے ہوئے وہ جان سے بھی چلا جاتا تو اسے پروا نہیں تھی لیکن جنت بیگم کی زندگی اس کے لیے بے حد قیمتی تھی۔ وہ اس کی زندگی کو خطرات سے دوچار نہیں کر سکتا تھا۔
اسی اُدھیڑ بُن میں اسے وہاں بیٹھے کافی وقت گزر گیا لیکن جنت بیگم واپس نہیں آئی۔ آخر کچھ سوچ کے اس نے گیٹ بجایا۔ اسے چوکیدار کا سوالیہ چہرہ دکھائی دیا۔
''میں عادل ہوں، جنت بیگم کا بیٹا۔ انہیں اندر سے بلوا دو۔''
چوکیدار کے چہرے پر اُلجھن کا تاثر اُبھرا۔ وہ اس کے عقب میں کھڑی گاڑی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ''میں پیغام بھجواتا ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے گیٹ بند کر دیا۔
عالیان دوبارہ گاڑی میں آ کے بیٹھ گیا۔
اگر انہوں نے جنت بیگم کو نہ آنے دیا تو؟ وہ آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ اس کے دماغ میں لاوا دہک رہا تھا جو کسی بھی وقت آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔

☆☆☆

احتشام پُرسوچ انداز میں جنت بیگم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی ان کے لیے خطرے کی علامت تھی، اور اس کی موت میں بھی ان کی تباہی تھی۔ یہ ہڈی ان کے گلے میں بُری طرح پھنس چکی تھی جسے نہ وہ اُگل سکتے تھے نہ نگل سکتے تھے۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات دیکھ کے محی الدین پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔
''دیکھ کیا رہے ہو۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں، اسے مار دو۔''
اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔ یہ ایک ملازم تھا۔
''بی بی کو ان کا بیٹا عادل بلا رہا ہے۔'' جنت بیگم کے مردہ ہوتے وجود میں یکدم زندگی کی لہر دوڑی۔
''عادل......'' وہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔ ''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں اعلان کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ محی الدین کے چہرے پر اضطراب جاگا۔
احتشام کے کندھے جھکے ہوئے انداز میں ڈھے گئے۔
''اباجی، میرے خیال میں ہمیں اب سب کچھ بھلانا پڑے گا۔ اب میڈیا کا دور ہے۔ ہمیں احتیاط کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اس دور میں رائی کا پربت بنتے دیر نہیں لگتی اور یہاں تو......''
جنت بیگم کے کانوں میں ابھرتی اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر جا رہی تھی۔ اسے عادل پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ وہ اس وقت اس کے لیے غیبی فرشتہ بن کے آیا تھا جب وہ خود کو موت کے منہ میں دیکھ رہی تھی۔
وہ داخلی دروازے سے باہر نکل رہی تھی کہ اسے اپنے عقب سے احتشام کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنی رفتار دھیمی تو کر دی لیکن رکی نہیں۔ وہ اس کے قریب آ کے بولا۔ ''اباجی کی طرف سے میں آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ انہوں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو ہماری طرف سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

وہ اس کی طرف مڑی۔ ''میں اس کے سارے گناہ معاف کرتی ہوں، حتیٰ کے اپنے بچوں کا خون بھی مگر یہ معافی مشروط ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو صرف محبت کرنا سکھائی ہے لیکن آئندہ ہماری راہ میں کوئی آیا تو ہم محبت کا سبق بھول جائیں گے۔'' یہ کہہ کے وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

عالیان نے گیٹ پر جنت بیگم کا چہرہ دیکھا تو اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ جنت اسے دیکھ کے چونکی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر لب کپکپا کے رہ گئے۔ آج وہ دونوں پچیس سال بعد آمنے سامنے آئے تھے۔

عالیان اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''امی جی، مجھے معاف کر دیں۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کے رو رہا تھا۔ جنت نے اسے کندھے سے پکڑ کے اٹھایا۔ آنسو اس کے گالوں سے بھی دھاروں کی صورت بہہ رہے تھے۔ اس نے عالیان کو گلے سے لگالیا۔

اس کے گلے سے لگ کے عالیان کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے تک کتنی بڑی نعمت سے محروم رہا تھا۔ اس کی باہوں میں اسے جو سکون ملا تھا، اس کے سامنے دنیا کی ساری دولت ہیچ تھی۔

اتنے میں ڈرائیور بھی گاڑی باہر نکال لایا تھا۔ جنت گاڑی کی طرف بڑھنے لگی تو عالیان بولا۔

''امی جی، پلیز آج میرے ساتھ بیٹھ جائیں۔'' اس نے لحظہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر عالیان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''پچیس سال ہو گئے تمہاری راہ تکتے۔ تم لوٹ کے کیوں نہیں آئے؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہی جنت شکوہ کناں انداز میں بولی۔

وہ تڑپ گیا۔ ''کیسے آتا امی، میں آپ کا سامنا کرنے کے قابل ہی کہاں تھا؟'' وہ اسے اپنے پچیس سال کے نوحے سنانے لگا۔

''امی جی، پچیس سال ہو گئے مجھے اپنے جرم کی سزا کاٹتے۔ اب مزید میں آپ لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز، مجھے اپنا لیں اور میری بیوی عالیہ کو بھی۔ وہ بھی آپ سے بے تحاشا محبت کرتی ہے۔'' وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''معافی تو تمہیں صبا سے مانگنی ہوگی۔''

''میں بھابی سے بھی مانگ لوں گا معافی۔ آپ انہیں کہیں گی تو وہ آپ کو منع نہیں کر سکیں گی۔ کریں گی ناں میرے لیے بات؟'' وہ امید بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''ہاں، میں اس سے کہوں گی لیکن تمہیں اپنا مقدمہ خود لڑنا ہوگا۔''

امید و بیم سے لرزتا عالیان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''میں ابھی عالیہ کو بتاتا ہوں۔'' اس نے فون نکال لیا۔

''عالیہ، میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے۔ امی نے مجھے معاف کر دیا ہے۔'' فون ریسیو ہوتے ہی وہ خوشی سے لرزتے لہجے میں بولا تھا۔ عالیہ بھی حیران رہ گئی۔

☆☆☆

سال کا آخری دن تھا۔ ہر سال کی طرح جنت محل برقی قمقموں سے روشن تھا۔ دن بھر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری رہی تھی۔ نئے سال کے استقبال کی تیاریاں کرتے عالیان کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں۔ وہ پچھلے پچیس سال سے اس موقع کے لیے ترس رہا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی رات تھی جب اس کے گناہ کی پاداش میں اسے اس جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ ایک طویل سزا کے بعد اسے جنت میں واپسی کا پروانہ ملا تھا۔

اس کی سزا کا یہ آخری سال انتہائی ہنگامہ خیز رہا تھا۔ ان ہنگاموں میں جہاں کئی لوگ جان سے گئے تھے وہاں اسے اس کی سزا سے رہائی مل گئی تھی۔

احتشام نے جنت کو جانے دیا تھا۔ محی الدین یہ بات برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اسے پھر سے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے بیڈ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

شام کو وہ سب گروپ فوٹو بنانے کے لیے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے۔ آج پھر اس فوٹو میں پچیس افراد تھے۔ محبت کی یہی خاص بات ہے، جو اس کے حصار میں ایک بار مقید ہو گیا پھر کبھی نہیں نکل سکا۔ عالیان بھی اس دائرے سے تو نکل گیا تھا، اس کی کشش سے دور نہیں جا سکا تھا۔

شب کے بارہ بجتے ہی جنت بیگم نے کیک کاٹا۔ ہال ہیپی نیو ایئر...... کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ جنت نے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھا کے عالیان کی طرف بڑھایا۔

''ہیپی نیو ایئر۔'' اس نے مسکرا کے کہا تھا۔ عالیان نے منہ کھول کے کیک کا ٹکڑا کھایا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون چھا گیا۔ اس کیک میں تلخی نام کو بھی نہیں تھی، صرف مٹھاس تھی، محبت بھری مٹھاس۔ یہ مٹھاس اس کے منہ میں گھلی تو اس کے اندر تک جیسے گہرا سکون اترتا چلا گیا۔

❖❖❖

''بہت جلد ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ میں اسے حاصل کرلوں گا اور آخر میں نے اسے پالیا بلکہ اپنی وہ منزل پالی جس کی مجھے تلاش تھی۔'' اس کے لہجے میں اپنی فتح کا غرور جھلک رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے جگنو اک عجیب لے میں دمک رہے تھے، وہ اپنی ہی دھن میں بولے چلا جارہا تھا، وہ آج اسے کچھ بھی بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا وہ اک عجب سرشاری کے عالم میں تھا یہ جانے بغیر کہ آج پہلی بار زوباریہ کے اندر کچھ بڑی تیزی سے ٹوٹا تھا شاید...... شاید کوئی بھولی بسری اک جھوٹی آس، آنکھوں کی لو جو تیرتی نمی سے مدھم پڑ چکی تھی اس نے اپنے چہرے کا رخ دوسری جانب موڑ لیا اور ہمیشہ کی طرح اس کے حال سے غافل وہ اسے اپنی شادی میں آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

جو لوگ محبت کے جذبوں کی قدر نہیں کرتے محبت میں ان کی منزلیں ہی اتنی سہل کیوں ہو جاتیں ہیں اور جو جو لوگ محبت کو سینچ سینچ کر رکھتے ہیں وہی لوگ تشنہ دل بن کر کیوں رہ جاتے ہیں۔

ہاں شاید...... شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں اور قسمت کا کشکول ہر کسی کا بھرا ہوا نہیں ہوتا، کچھ لوگ کاسہ دل میں خالی رہ جاتے ہیں۔

اور آج کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد آج میری بات حقیقت کا روپ دھاڑے کھڑی ہے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں ماضی کے گرد و پیش سے میں حال میں لوٹ آئی اخبار میں موجود اس تصویر کو دیکھا جس کے نیچے لکھا تھا۔

''معروف بزنس مین کی بیٹی کی جائیداد اپنے شوہر کے نام نا کرنے پر جھگڑا، شوہر کا بیوی کے جوس میں زہر ملا کر مارنے کی کوشش ناکام، ملزم گرفتار۔''

نفس کے غلام لوگ...! جانے کیسے محبت کے دعوے دار بن جاتے ہیں، وہ ٹہر کر کھڑکی میں آ گئی جہاں چاند کی بے مدھم پڑتی روشنی اس بات کی نوید دے رہی تھی کہ نیا دن طلوع ہونے والا ہے وہ اپنا محاسبہ کرتی لان میں آ گئی۔

موحد آفندی میری قسمت میں نہ تھا اس لئے اللہ نے مجھے ایک بڑے نقصان سے بچالیا اور جو میری قسمت میں ہونا چاہیے اسے دروازے پر بھیجا گیا اور میں اپنی قسمت سے انکاری ہوئی رہی۔

''تو کیا اب بھی تم زوباریہ غضنفر تم خدا کی رضا میں راضی ہونے کا دعویٰ کرو گی؟'' اسے خود سے شرمندگی محسوس ہونے لگی شادی کے انکار پر ماں جو اس کی بہت اداس رہنے لگی تھی اسے اپنی ماں کو رضامندی کا اظہار کرنا تھا ماں کے اداس پژمردہ چہرے پر نئے سال کی نئی صبح میں اک نئی خوشی دیکھنی تھی۔

ماں باپ ہمیشہ ہمارے لئے جو فیصلہ کرتے ہیں وہ ہمارے ان فیصلوں سے لاکھ درجے بہتر ہوتا ہے جو ہم جذباتیت کی روح میں بہہ کر اپنے لئے سوچتے ہیں، اس نے خزاں رسیدہ خشک پتے کو دیکھا اور آسمان پر چمکتی سورج کی پہلی کرن کو نئے سال کی نئی کرن کو، ابھی وقت اس کے ہاتھ میں تھا وہ نئے سال کی روشن ساعتوں کو اپنی مٹھی میں قید کر کے باقی زندگی خدا کے چنے ہوئے بندے دانیال کی محبت میں اس کی شریک حیات بن کر گزارنا تھے، وہ نئے سال کی نئی صبح میں فیصلہ کر چکی تھی بس ادراک کے لئے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے گزرے سالوں کو فراموش کر کے وہ اندر کی جانب بڑھ گئی کیونکہ اسے اپنی ماں کو سال نو کی نئی نوید سنانی تھی نئے سال کا سورج کھل کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆